معالم القرآن

جلد ششم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

نام	معالم القرآن
موضوع	تشریح و تفسیر
ملکیت	ادارہ تعلیماتِ قرآن، سیالکوٹ
تالیف	حضرت مولانا الحاج محمد علی صاحب الصدیقی الکاندھلوی
عناوین	۳۸۸
آیات	۱۱۱
طابع	محمد اسلم قریشی
تزئین و آرائش	سید محمد انور حسین نفیس رقم، لاہور
کتابت	محمد نور احمد صوفی، گوجرانوالہ
ناشر	قاری عبدالرحمان، ایم اے
صفحات	۷۳۶
تاریخِ اشاعت	شوال المکرم سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء
مطبع	

قیمت ۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ۔ دارالعلوم الشہابیہ، رنگ پورہ روڈ، سیالکوٹ، پاکستان

دریا بحباب اندر

سورت کا نام

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی چھٹی جلد کو جس میں اُمت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک قوامیت اور شہادت علی الناس کے منصبِ جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ مدد یا دِلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تادیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبدالرحمٰن ایم۔اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

حرفِ آغاز

الحمد للہ وحدہ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ ، اللہ سبحانہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ معالم القرآن کی جلد ششم کی تکمیل کا سامان فرمایا۔ معالم القرآن کی پانچویں جلد شوال ۰۹ھ مطابق اکتوبر ۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اب پورے چھ ماہ بعد اس کی جلد ششم آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس کی تالیف زیادہ تر سفر میں ہوئی ہے۔ گوجرانوالہ کے الحاج عبدالغنی صاحب مالک الیوم الوطن شوخ کویت کی دعوت پر کویت جانا پڑا۔ حاجی صاحب موصوف ہی کی فیکٹری میں صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک تفسیر کا کام روزانہ معمول بن گیا۔ نومبر کے آغاز میں حاجی صاحب کے دوش ہمت پر سوار ہو کر اس جگہ پہنچنے کا ارادہ ہو گیا جہاں کی سرزمین پر نہ تو سبزہ کا فرش ہے اور نہ اس کی آغوش میں نہروں اور ندیوں کی ریل پیل ہے، اس کے چاروں طرف جلے ہوئے پہاڑ کھڑے پہرہ دیتے ہیں۔ لیکن بقول حفیظ ؎

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

ارادے کو عمل کا جامہ پہنانے کی ساری کوشش حاجی عبدالغنی کی مخلصانہ ہمدردی کی رہینِ منت ہے۔ خبر نہیں کہ لوگوں کو اس سلسلہ میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں مگر میں الحمد للہ ان سب جھمیلوں سے بے نیاز رہا۔ حاجی صاحب موصوف کی ہمت اور ریاض صاحب کی محنت سے تاریخ مقررہ پر دوستوں کے جلو میں جہاز پر سوار ہوا اور احباب کے پرخلوص نرغے میں جدہ پہنچ گیا۔ عزیز طارق کی معیت میں حرم پاک میں پہنچا۔ پہلے بھی چار مرتبہ مجھے یہاں آنے کی سعادت نصیب ہوئی مگر اس بار میرا قلب عجیب کیفیات سے دوچار تھا۔ عمرہ کیا اور کچھ روز کے بعد حج کی سعادتوں سے ہمدوش

ہونے کا بھی موقع مل گیا۔ عرفات میں جب اس بار دعا کے لیے کھڑا ہوا تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دراجابت وا ہو چکا ہے اور رحمت گنہگار بندوں کو پیار کر رہی ہے۔ اسی وقت میرے دل میں خیال آیا کہ ابھی کائنات انسانی میں اللہ کی عبادت کرنے والی مسلمانوں کے سوا کوئی قوم نہیں۔ اللہ اکبر کیا نسبت ہے دنیا کی قوموں کی رسوم عبادات کو اس عبادت سے جسے ہم حج کہتے ہیں کفن بردوش ننگے سر ننگے بدن بال بڑھے، چہرہ خاک آلود، لاکھوں انسان بلبلا رہے ہیں، آہیں بھر رہے ہیں۔ اس آہ و فغاں کے شور میں جب فضا میں یہ ترانے گونجتے ہیں لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک اور لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ تو روح پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر حج نہ ہوتا تو انسانیت کا اپنے مولا سے عاشقانہ تعلقات کا ظہور نہ ہوتا۔ اور پوری انسانیت سوز و گداز، ذوق و شوق والی عبادت سے بیگانہ ہوتی۔ عرفات سے چل کر مزدلفہ پہنچے۔ رات گزاری مزدلفہ سے منیٰ کی طرف پیدل مارچ کر دیا۔ منیٰ پہنچ کر مجھے بخار ہو گیا۔ قربانی کا کام الحاج نذیر احمد اور قاری عبدالرحمٰن نے اپنے ذمے لے لیا۔ طواف کے لیے قاری صدیق مجھے حرم لے گئے۔ طواف اور سعی سے فراغت ہوئی، احرام کے کپڑے اتارے نہیں بلکہ جنوں کی وادیوں سے نکل کر فرزانگی میں آتے، کپڑے پہن کر پھر منیٰ روانہ ہو گئے۔ بخار زوروں پر تھا مجھے تو علم نہیں مگر بتانے والے بتاتے ہیں کہ ۱۰۳ بخار ہے۔ الحمد للہ حج کے سارے ارکان بخیر و خوبی پایہ تکمیل کو پہنچے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بخار اور کمزوری کے باوجود کوئی نماز بھی بغیر جماعت کے نہیں پڑھی۔ ۱۳ کو مکہ میں واپسی ہوئی لیکن بخار اسی طرح رہا، وہاں سے یہ خیال کر کے جدہ آ گیا کہ تبدیل ہوا سے شاید بخار ہٹ جائے لیکن یہاں چند روز قیام میں طبیعت اور بگڑ گئی۔ یہاں احباب کی موجودگی سے اگرچہ دل باغ و بہار رہا لیکن کمزوری میں اضافہ ہو گیا۔ یہاں جن دوستوں کی اخلاص کیشی سے میں متاثر ہوا اور جو مجھے پوری زندگی نہ بھولے گی ان میں قاری عبدالرحمٰن ایم اے، حاجی نذیر صاحب، حکیم محمد عبداللہ مولانا سعید احمد، حاجی محمد بشیر، حاجی محمد نفیس اور پروفیسر عصمت اللہ اور محمد طارق صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بالآخر ۲۰ نومبر کو کویت روانہ ہو گیا۔ عزیز عبدالرشید خاقان کے پاس فروانیہ میں قیام کیا۔ الحمد للہ جاتے ہی دو روز کے بعد طبیعت سنبھل گئی اور بخار ختم ہو گیا۔ مکہ کے زمانہ قیام میں تفسیر کا کام بالکل بند رہا۔ کویت پہنچ کر پھر تفسیر کا کام شروع کیا۔ پورا دسمبر اور جنوری کی پندرہ تاریخ تک کام کیا۔ حج سے واپسی تو ہو گئی مگر نشاط کی کیفیت سے محرومی پر دل کڑھتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بخار کی مزاحمتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو کام چھوڑ آیا ہوں پورا کر دوں اور شوق کے پروں پر

اٹھتا ہوا مدینہ منورہ کی طرف چلوں۔ محبت اور وفا کی کشش مجھے مدینہ منورہ کھینچ رہی تھی۔ پھر جناب حاجی عبدالغنی کی دریادلی نے میری ہمت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ انہوں نے اپنی کار اور اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن سلمہٗ کو اس کے لیے تیار کر دیا۔ بالآخر ۱۲ صفر المظفر مطابق ۱۲ جنوری سہ شنبہ صبح ۸ بجے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بعد نماز مغرب الخبر پہنچا۔ یہاں ملک عباس حسین اور عزیزان قاری محمد صدیق، ماسٹر انور، رشید اور بابر مصطفیٰ بٹ پہلے سے چشم براہ تھے۔ رات کو قیام کیا اور صبح ۸ بجے وہاں سے روانہ ہو کر رات کو ۹ بجے الریاض پہنچا۔ یہاں محمد رفیق صاحب کو انتظار تھا۔ رات کو یہاں قیام کر کے صبح ۶ بجے مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ظہر کی نماز بریدہ میں پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر شوق مدینہ نے سفر کو جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً پہنچا رات کے دس بج چکے تھے۔ حرم نبوی بند ہو چکا تھا۔ فندق الزہراء میں قیام کیا۔ صبح ۳ بجے بیدار ہو کر اپنی حاجات ضروریہ وضو اور چائے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ حرم سے اذانِ تہجد کی آواز بلند ہوئی فوراً حرم پہنچا۔ سب سے پہلے مسجد نبوی میں دو رکعت نماز ادا کی اور سعادت کے نصیب ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا۔ آپ پر درود و سلام پیش کیا اور گواہی دی کہ بے شک آپ نے اللہ کا پیغام کما حقہٗ پہنچا دیا۔ درود و سلام سے فارغ ہو کر ریاض الجنۃ میں آیا۔ یہ زمین کا حصہ حضور انور کی خواب گاہ اور منبر کے درمیان چھوٹا سا قطعہ ہے۔ جہاں انوار و رحمت برستے ہیں اور جہاں سے اسلام کے جاں نثاروں کی یادیں وابستہ ہیں۔ نمازِ تہجد ادا کی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر قبا گیا۔ قبا کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی۔ عصر کی نماز کے بعد جنت البقیع کی طرف گیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر اُحد گیا۔ یہی میدان ہے جہاں ایمان و یقین اپنی اصلی صورت میں نظر آیا۔ نماز عشاء کے بعد حضرت شیخ الحدیث جناب مولانا محمد زکریا صاحب کی زیارت کی۔ حضرت شیخ نے کھانے کی دعوت دی، دوسرے روز ان کے یہاں کھانے میں شریک ہوا۔ جمعرات کے روز صبح قیام گاہ میں غسل کر کے احرام کے لباس میں ملبوس ہو کر مکہ کے لیے تیار ہو گیا۔ ۸ بجے مدینہ سے مکہ کی طرف روانگی ہو گئی۔ راستہ میں شہداء بدر کی زیارت کی اور بالآخر بعد نماز عصر مکہ میں پہنچا۔ عمرہ ادا کیا یعنی بیت اللہ کا طواف کیا۔ سعی بین الصفا والمروہ کی۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد جناب فضل حق صاحب کے یہاں قیام کیا۔ یہ باغ و بہار شخصیت ہیں۔ ہر بار پرتپاک خیر مقدم پر اصرار ان کی طبیعت کا تقاضا بن گئی تھی۔ اس سفر میں الحمد للہ تفسیر کا کام جاری رہا۔ جہاں بھی قیام کیا۔ کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا۔ اس بار مکہ کے قیام میں جن احباب کے صدق و صفا اور مہر و وفا سے سابقہ پڑا ہے ان میں جناب الحاج

فضل حق صاحب مالک فضل میڈیکل سٹور کے علاوہ جناب پروفیسر عصمت اللہ صاحب، جناب الحاج عزت اللہ صاحب، جناب الحاج محمد طارق صاحب، جناب الحاج مولانا محمد سعید صاحب، جناب الحاج محمد بشیر صاحب، جناب الحاج محمد نفیس صاحب، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۳۱ جنوری کو مکہ سے واپس ہو کر طائف از لغی، الریاض ہوتا ہوا الخبر پہنچا۔ الخبر میں دو روز قیام کے دوران ملک عباس حسین صاحب کے اصرار سے دو تبلیغی اجتماعات سے خطابات کا موقعہ ملا۔ جمعہ کے روز نماز کے بعد ملک صاحب موصوف قاری محمد صدیق، بابر مصطفیٰ بٹ اور ماسٹر محمد انور سے رخصت ہو کر رات کے ۹ بجے کویت پہنچ گیا۔ کویت میں اکرم قاب میں جناب الحاج محمد الیاس صاحب کے مکان پر قیام کیا اور وہیں تفسیر کا کام کیا۔ میں مولانا احمد القاسم خطیب مسجد کارپوریشن کویت کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے تفسیر کے کام میں مجھ سے کتابی تعاون کیا اور تفسیر کی ۲۰ کتابیں مجھے عاریۃً دیں فجزاہم اللہ عنی خیر الجزاء۔

الحمد للہ یہ طویل سفر تفسیر کے کام پر اثر انداز نہیں ہوا۔ ۲۸ فروری کو کویت سے چل کر سیالکوٹ پہنچا اور باقی کام پورا کیا۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے مزید استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ محاسن التاویل	علامہ الشام محمد جمال الدین القاسمی۔
۲۔ تثبیت دلائل النبوۃ	قاضی عبدالجبار بن احمد الہمدانی ۴۱۵ھ
۳۔ المجموع شرح المہذب	للامام النووی
۴۔ الجواب الصحیح	للامام الحافظ ابن تیمیہ
۵۔ ہدایۃ الحیاری	للامام الحافظ ابن القیم
۶۔ اعلاء السنن	الشیخ المحدث ظفر احمد العثمانی
۷۔ ازالۃ الخفاء	الشیخ الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۸۔ شہادۃ القرآن	حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
۹۔ کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ	حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی
۱۰۔ ازالۃ الشکوک	مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی۔
۱۱۔ اظہار الحق	″ ″ ″
۱۲۔ عقیدۃ الاسلام	مولانا السید انور شاہ کشمیری

مقدمہ

الحمد للہ سبحانہٗ والسلام علیٰ من بعث الی الناس کافۃً، معالم القرآن کی جلد ششم پیش خدمت ہے قرآن کے معجزانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے جس طرح یہ ماضی میں دنیا کی بڑی طاقتوں کے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا جیسا کہ علامہ عبد الجبار ہمدانی نے بتایا ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ کو اس قرآن کے ذریعے تن تنہا ہوتے ہوئے غلط فکر، غلط کردار، غلط اخلاق، غلط معیشت، غلط سیاست پر ہونے کا چیلنج کیا اور اعلان کیا کہ جو نظام میں لے کر آیا ہوں یہی حق ہے اور یہی غالب ہو کر رہے گا۔ اس کے مقابلے میں سارے نظام پاش پاش ہو جائیں گے۔

ٹھیک اسی طرح جیسا کہ حضرت علی مرتضیٰ نے بتایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل کو سامنے رکھ کر قرآن کا یہ چہرہ پیش کیا ہے کہ،

> آگاہ ہو جاؤ ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس فتنے سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے۔ فرمایا کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلی امتوں کے واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں ان کا حکم اور فیصلہ ہے۔ وہ قول فیصل ہے، وہ فضول بات اور یاوہ گوئی نہیں ہے۔ جو کوئی جابر و سرکش اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر رکھ دے گا اور جو کوئی ہدایت کو اس کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے گمراہی آئے گی۔ قرآن ہی حبل اللہ المتین اور مضبوط نصیحت نامہ ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔ وہی وہ حق مبین ہے جس کے اتباع سے خیالات کبھی

محفوظ رہتے ہیں اور زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کر سکتی ہیں۔ اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے اور وہ کثرت مزاولت سے کبھی پرانا نہ ہو گا اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے اور تو اور اسے سن کر تو جنوں کو ایمان لانا پڑا، جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا اور جس نے قرآن کی دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہو گئی۔

(جامع ترمذی، مسند دارمی)

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات عملاً صاف واضح اور متعین ہیں۔ اور زمانہ مابعد میں انسانی تحریفات کی آمیزش اور تصرفات سے پاک ہیں اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسانی کی الہامی تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے۔ اسی لیے قرآن خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا علمی معجزہ ہے۔ سارے اختلافات کے باوجود اس پر امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں کہ قرآن نے اہل عرب کی عام شاہراہ سے ہٹ کر اپنا انداز بیان الگ اختیار کیا یہ طرز بدیع اور اسلوب عجیب عرب میں موجود نہ تھا۔ ان کے کلام کا تمام تر نمونہ شعر اور نثر تھا۔ شعراء شعر کے ذریعے اپنے تاثرات ظاہر کرتے جبکہ خطباء نثر کو اظہار جذبات کا ذریعہ بناتے۔ قرآن نے دونوں راہوں سے ہٹ کر نظم و نثر کے درمیان ایک ایسا پسندیدہ اسلوب اختیار کیا جو بلغائے عرب کے تخیل میں بھی نہ تھا۔ قرآن کے مطالع مقاطع اور فواصل حد اعجاز کا شاہکار ہیں۔

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور تعبیر میں بھی معجزہ ہے۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں ہیں کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اگر وحی ہیں تو اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنے کے لحاظ سے وحی ہیں۔ نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام و عبارت کے لحاظ سے معجزہ کہا ہے چنانچہ اسی لیے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحی موسوی تورات اور وحی عیسوی انجیل نے ظہور کیا مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہو گئی۔ تورات کی زبان عبرانی کو جو حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلی تھی بخت نصر کی آگ کھا گئی اور ارامی و سریانی زبان کا قالب اختیار کر لیا اور آخر صدہا سال بعد حضرت عزیر نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا۔ اور انجیل کے متعلق ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اس

کی اصل زبان کیا تھی اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی۔ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ فلسطین میں بولتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور ان کے الفاظ کے خدائی الفاظ ہونے کا دعویٰ کیوں کر ہو سکتا ہے برخلاف اس کے دنیا میں وحی محمدی یعنی قرآن سب سے پہلی اور آخری وحی ہے جس نے اس حیثیت سے اعجاز کا دعویٰ کیا چنانچہ قرآن حکیم کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا اور وہ ہر قسم کی تغیر و تحریفات سے پاک ہے اس لیے اس کا شمائل، اس کی تعبیر، اس کے کلمات، اس کے الفاظ تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی کتاب آسمانی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ خود دائمی ہے اس کے افکار و نظریات دائمی ہیں۔ اور جس مدلول کی اس عالم میں یہ دلیل بن کر آیا وہ دائمی ہے یعنی رسالت محمدیہ علی صاحبہا السلام لہٰذا ہمارے لیے تو یہی کافی ہے اور یہ بھی اللہ کا خاص انعام ہے کہ اس کی کچھ خدمت کر کے اپنے سیاہ اعمال نامہ کو دھونے کے لیے آب رحمت کے چند قطرے فراہم ہو جائیں۔

پارہ ششم ایک نظر میں

صفاتِ الٰہی

اللہ جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے	۶۴
اللہ کی ذات سراپا رحمت ہے	۳، ۳۴، ۳۹، ۴۲، ۶
حساب لینا، جزا و سزا دینا اور انتقام لینا اللہ کا کام ہے	۲، ۴۲، ۱۴، ۱۸، ۴۰
اللہ ہی جیسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے	۱۷
اللہ کی ذات ہی علم و خبر کا خزانہ ہے	۱۴۰، ۱۶۷، ۷، ۸، ۵۴، ۶۷۔
معاف کرنا اللہ کا کام ہے	۱۴۸، ۳، ۱۸، ۳۴، ۳۹
قوت، قدرت، غلبہ، اختیار اللہ کا ہے	۱۴۹، ۱۵۸، ۱۶۵، ۱۷، ۱۹، ۳۸، ۴۰
حاکمیت و اقتدار اور بادشاہی اللہ کی ہے	۱، ۴۹
کارسازی اور وکالت اللہ کا کام ہے	۱۷۱
اللہ کی ذات حکمت و دانائی والی ہے	۱۵۸، ۱۶۵، ۱۷۰، ۳۸
اللہ کی ذات ہی اعمال کی نگران ہے	۷۱
اللہ کی ذات وسعتوں والی ہے	۵۴
اللہ سننے والا ہے	۱۴۸، ۷۶
ہر طرح کے مالکانہ اختیار اللہ رکھتا ہے	۱۴۰، ۱۷۱، ۱۷، ۱۸، ۴۰
اللہ کی ذات تمام کمزوریوں سے پاک ہے	۱۷۱

توحید الوہیت و ربوبیت

رسالت و نبوت

دستوری قواعد

صحابہ کا چہرہ

اسلامی شعائر

اجتماعی قوانین

اخلاقی قوانین

معاشی قوانین

سیاسی قوانین

عدلیہ کے ضوابط

دفاعی قوانین

ایمان کے تقاضے

نفاق کا چہرہ

فوجداری قوانین

معاشرتی قوانین

آخرت کی زندگی

قرآن کا تعارف

قرآنی اصطلاحات

آیات اللہ

قرآن حکیم نے انبیاء کے معجزات کو عموماً آیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا فرمائے ہیں وہ درحقیقت صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے۔ دُنیا میں جس قدر چیزیں ہم جانتے اور پہچانتے ہیں صرف آیات و علامات سے جانتے ہیں۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک ہمارا پھیلا ہوا علم وہ محض آیات کا رہین منت ہے بلکہ ہمارے تمام تجربے اور مشاہدے، طبیعیات، کیمیائیات، نباتات، حیوانات، ارضیات، ہندسیات، ریاضیات وغیرہ جو کچھ علوم ہیں وہ صرف علامات شناسی کا مجموعہ ہیں۔ قرآن میں آیت کا لفظ اس معنے میں بڑی بہتات سے آیا ہے۔ جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندے اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے سے اپنے تعلق و رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ سے نمایاں کرتا ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو اللہ سبحانہٗ اور پیغمبر کے درمیان رابطہ خاص اور علاقہ مخصوص کو نمایاں کرتی ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادہ الٰہی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کی نظر میں اصل چیز معجزات نہیں بلکہ اصل چیز نبوت ہے اس لیے وہ لوگوں کو قدم قدم پر اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے نہایت وضاحت صفائی اور تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور معجزات میں کوئی تلازم نہیں اور یہ معجزات اصل نبوت سے خارج ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور

ہدایت ہیں۔ عام لوگوں میں انبیاء کے معجزات کو دیکھ کر یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے نہایت شدت سے اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ قل انما الایات عند اللہ اور وما کان لرسول ان یاتی بآیۃ الا باذن اللہ۔

اتباع ظن

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں ظن اس خیال کو کہتے ہیں جو علامات دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر قوی ہو گیا تو علم ہو جاتا ہے اور اگر بہت کمزور رہا تو وہم کے مرتبہ میں رہ جاتا ہے اور یہ سب سے کمزور درجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظن لغت کے لحاظ سے یقین اور شک کے خلاف کسی حالت کا نام نہیں بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینہ کا نام ہے۔ اس کے بعد وہ واقعات کے لحاظ سے یقین اور وہم دونوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ صحابہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کو ٹھیک ان موقعوں پر استعمال کرتے تھے جہاں ہم اردو میں اٹکل بولتے ہیں۔ واقعی بات کو علم اور تخمینی بات کو ظن کہتے ہیں یہی کو قرآن کی اصطلاح میں ظن کہتے ہیں مالھم بہ من علم الا اتباع الظن اس قسم کی آیات میں ظن ان ہی خیالات کو کہا گیا ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیے جائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی محاورے میں بیشتر ظن کا اطلاق بے تحقیق بات پر ہوتا ہے۔ یہاں عیسائیوں کے بارے میں ایک ہی فقرے میں دو باتیں فرمائی ہیں، ایک یہ کہ وہ بے خبر ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اٹکل اور اندازے کے تیر چلا رہے ہیں، اسی لیے ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک متفق علیہ بات نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے علم ہیں اور اس معاملہ میں وہ اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ

مسیح نہ تھا جبکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر مسیح ہی چڑھایا گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی تھی بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے حواریوں سے ملے۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر الوہیت کی روح جو اس میں تھی وہ اٹھالی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوتے اور جسم سمیت اٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

بہرحال ظن کے معنے اٹکل اور اندازے کے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک روز خطبہ میں فرمایا۔ لوگو! دین کے بارے میں رائے تو صرف حضورؐ کی صواب تھی ہم تو صرف اٹکل کے تیر تکا تے اور تکلف کر کے خیال جماتے ہیں انما ہو منا الظن و التکلف۔ ان مختصر الفاظ میں حضرت عمرؓ نے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

لہٰذا جو رائے خدا کی ارادہ کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور جو محض اپنی اٹکل ہو اس کا نام ظن اور تکلف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ جب کسی معاملہ کے متعلق انہیں کتاب و سنت میں کوئی فیصلہ نہ ملتا فرماتے کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور گمان سے بتلادوں اسی ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے اور اسی معنے میں قرآن نے رائے زنی سے منع کیا ہے۔ یعنی محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں۔ اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

اتباع ھوی

جیسے ساری فکری گمراہیوں اور کج رویوں کا شجرہ نسب بالواسطہ اور بلاواسطہ اتباع ظن سے جا ملتا ہے ٹھیک اسی طرح عمل کی ساری گمراہیوں کا سرچشمہ اتباع ہوی ہے۔ وہاں ظن کے

مقابلہ میں اگر یقین ہے تو یہاں ہویٰ کا مد مقابل ہدیٰ ہے۔ قرآن عزیز اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے یعنی جو متبع ہویٰ ہے وہ متبع ہدیٰ نہیں ہو سکتا اور جو متبع ہدیٰ ہے وہ متبع ہویٰ نہیں ہو سکتا۔ اتباعِ ہدیٰ کے لیے اتباعِ ہویٰ کا چھوڑنا ناگزیر ہے۔ ہدیٰ اور ہویٰ اپنی اپنی جگہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے دونوں انسان کے سامنے رکھ دیئے وہاں دونوں میں سے ایک پر چلنے کا اور دوسرے سے بچنے کا حکم ہے۔ ہدیٰ نبوت کا دیا ہوا علم و عمل ہے۔ اس کی اتباع میں محکومیت کا داغ لگتا ہے اور ہویٰ اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے ماننے میں حاکمیت کا مزا آتا ہے۔ کچھ سادہ لوح کوشش کرتے ہیں کہ ہدیٰ اور ہویٰ کے درمیان اتفاق و سازگاری ہو جائے یعنی۔

قفس بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

لیکن یہ کوشش بیکار بھی ہے اور مذموم بھی۔ قرآن نے پہلے ہی اعلان کر دیا ہے کہ یہ دو راہیں الگ الگ ہیں۔ ایک کا سرا زمامِ ہدایت محمد رسول اللہ کے ہاتھ میں اور دوسری کا زمامِ ضلالت شیطان کے ہاتھ میں ہے ایک کا منتہیٰ جنت ہے اور دوسرے کا دوزخ۔

ہویٰ کا محرک چونکہ خود نفسِ انسانی ہے اس لیے وہ جسمِ انسانی میں جان کی طرح رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کی ہوئی ہے اس کا خلاف اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ جسم کو جان کا۔ ان میں اسی طرح فطری جاذبیت ہوتی ہے جیسا کہ لوہے اور مقناطیس میں۔ اور جب اس پر قرآن کا لیبل لگا دیا جائے تو اب وہی ہویٰ ٹھیک ہدیٰ کی صورت میں نظر آنے لگتی ہے ان دونوں کی اس مصالحت و ہم آہنگی سے جو خوشی میسر آتی ہے وہ گنگا و جمنا کے سنگم جیسا لطف آنے لگتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر انسان اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ تلاشِ حق کا لفظ بھی سننا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ اسی لیے سورہ جاثیہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے بطورِ امتنان فرمایا ہے کہ دیکھئے اتباعِ ہویٰ کی اس گرم بازاری میں ہم نے آپ کو ہدیٰ پر قائم رکھا ہے یہ کتنا بڑا احسان ہے تو اب آپ ان بے خبروں کی اہواء کا ساتھ نہ دیں۔ ہویٰ کے اسی غیر معمولی اثر اور برقی تیزی کی اس ارشادِ نبوت میں نشاندہی کی گئی ہے۔

آئندہ میری امت میں کچھ لوگ ہوں گے کہ جن میں یہ اہواء اس طرح رچی ہوں گی جیسے کتے کاٹے کے جسم میں زہر رچ جاتا ہے کہ جسم کی کوئی رگ اور کوئی جوڑ ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری گھسی ہوئی نہ ہو۔

واقعی ہوئی جب انسان کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر ہوئی ہی اس کو حدیٰ معلوم ہونے لگتی ہے اس لیے اس کو توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی ہے کیونکہ توبہ کی توفیق اس وقت ہوتی ہے جبکہ قلب کا کوئی گوشہ ہوئی سے خالی ہو لیکن جب رگ رگ میں ہوئی سرایت کر جاتے تو پھر توبہ کی توفیق کہاں سے آئے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ،

جو شخص تم میں سے اپنے دین کی قدر کرنا چاہے اسے شیطانی افعال اور اصحاب اہواء سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی بیماری خارش سے زیادہ اثر کر لگتی ہے۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ

اصحاب اہواء سے بات چیت نہ کرو نہ ان سے جھگڑا کرو کہ وہ تمہارے دل میں فتنہ کا بیج ڈال دیں گے۔

یہ ہوئی ہے جو فرقہ بندی کو جنم دیتی ہے اور ہدایت کی صراط مستقیم سے ہٹ کر سینکڑوں راہیں بنا لیتی ہے اور یہ سب راہیں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ ان بہت سے غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں ہو اور سیدھی ہو جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس کے تمام جذبات کے ساتھ اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو جس کے اندر کوئی ٹیڑھ کوئی بھی کسی پہلو کی بے رعایت اور کسی پہلو کے ساتھ ظلم نہ ہو اور بے انصافی نہ ہو یہی وہ الہدیٰ ہے یہی انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء اور اس کی کامیابی بامرادی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی فطرت اس کی طالب ہے۔ اسی کی نبوت رہنما بن کر آئی ہے۔ اسی کو قرآن سواء السبیل اور الصراط المستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک سیدھی جاتی ہے جو اس پر چلا وہ یہاں الذین انعمت علیہم میں داخل ہے اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے۔

الارض المقدسہ

ارض مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب نے آوازہ حق بلند کیا۔ چونکہ توحید اور خدا پرستی کی آواز سب سے پہلے اسی علاقہ میں گونجی تھی۔ اس وجہ سے اس کو ارض مقدس

کہا ہے اور اسی لیے ان تمام جگہوں کو جہاں اہل حق نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے محنتیں کی ہیں ان کو مقدسہ کہتے ہیں۔ مثلاً مکہ مقدسہ، مدینہ مقدسہ وغیرہ اور شاید یہیں سے مسجد اقصیٰ کو البیت المقدس کہنا شروع کر دیا ہے۔ جن بزرگوں نے ارض مقدسہ سے مراد شام لکھا ہے وہ بھی درست ہے کیونکہ پہلے کنعان اور فلسطین شام ہی کے علاقے شمار ہوتے تھے۔ تورات میں ارض مقدس کے بارے میں وعدوں کی صراحتیں موجود ہیں۔ مثلاً

"دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عنایت کی، داخل ہو اور اس زمین کو جس کی بابت خداوند نے تمہارے باپ دادوں ابراہام اور اسحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا میراث میں لو۔" (استثنا ۱-۸)

"تو اس سرزمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں ابراہام اور اسحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہیں دوں گا سکونت کرے۔" (استثنا ۳۰-۲۰)

"مضبوط ہو جاؤ اور دلاور ہو جاؤ خوف نہ کھاؤ اور ان سے نہ ڈرو کیونکہ خداوند تیرا خدا وہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے وہ تجھ سے غافل نہ ہوگا اور نہ تجھ کو چھوڑے گا۔" (۳۱-۶)

استقسام بالازلام

استقسام کے معنے ہیں حصہ، قسمت یا تقدیر معلوم کرنا۔ ازلام زلم کی جمع ہے جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے وہ غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے وہ گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے۔

اللباب میں ہے کہ قسمت معلوم کرنے والے تیر سات ہوتے تھے ان میں ایک پر لکھا تھا کہ امرنی ربی میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے۔ ایک پر لکھا تھا نہانی ربی میرے رب نے مجھے روک دیا ہے۔ ایک پر لکھا تھا منکم تم میں سے ہے۔ ایک پر لکھا تھا من غیرکم اجنبی حلیف ہے ایک پر لکھا تھا ملصق ملا لگا ہے۔ ایک پر لکھا تھا العقل دیت ہے اور ایک پر لکھا تھا غفل کچھ نہیں ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی سفر کا، تجارت کا، شادی کا ارادہ کرتا یا نسب میں اختلاف ہوتا یا کسی مقتول کے بارے میں اختلاف ہوتا یا دیت کا مسئلہ معلوم کرنا ہوتا تو لوگ مکہ کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس تین سو درہم مقررہ فیس لے کر آتے

اور اس شخص کو دیتے جس کی تحویل میں یہ تیر ہوتے وہ ان تیروں کے ذریعے ان کو پیش آمدہ مسئلہ کا جواب دیتا۔

تیروں کے ذریعے جوا کھیلنے کی یہ صورت تھی کہ اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے اور ان ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں،

فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلی، منافس، منیح، نصیح وغد

ان میں سے ہر تیر کے مختلف حصے مقرر کر دیے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصب دار شخص کے ہاتھ میں دیتے تھے اور وہ ان کو گڈ مڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے وہ ناکام ہوتے تھے۔ اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ سخاوت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لیے جوئے کی ان مجالس میں شریک نہ ہونا باعث عار تھا۔

قرآن نے یہاں استقسام بالازلام کو حرام کر کے ان دونوں پر قدغن قائم کی ہے یعنی مشرکانہ فال گیری جس میں قسمت کا فیصلہ معلوم کیا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے۔ جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھا جائے!

انجیل

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ العزیز اظہار الحق میں رقمطراز ہیں کہ امام قرطبی نے الاعلام بما فی دین النصاری من الفساد والاوہام کے باب سوم میں لکھا ہے کہ جو کتاب عیسائیوں کے ہاتھوں میں انجیل کے نام سے ہے یہ وہ ہرگز انجیل نہیں جس کا تذکرہ اللہ سبحانہ نے حضور کی زبانی قرآن میں کیا ہے۔

کشف الظنون کے مصنف نے انجیل کے بارے میں لکھا ہے کہ

وہ ایک کتاب تھی جس کو اللہ نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔

پھر ایک طویل عبارت میں ان اناجیل اربعہ کے اصلی انجیل ہونے کی تردید کی ہے الخ

کہا ہے کہ "حضرت عیسیٰ جو انجیل لے کر آئے تھے وہ ایک ہی انجیل تھی جس میں اختلاف اور تناقض کوئی نہ تھا ان عیسائیوں نے اللہ پر اور اس پیغمبر حضرت عیسیٰ پر جھوٹی تہمت رکھ دی۔

کتاب تخجیل من حرف الانجیل کا مصنف اپنی کتاب کے باب دوم میں ان مشہور اناجیل کی نسبت لکھتا ہے۔

یہ انجیلیں وہ سچی انجیل نہیں ہیں جن کو لے کر سچا رسول بھیجا گیا تھا اور جو خدا کی جانب سے اتاری گئی تھی۔ اور سچی انجیل تو صرف وہی ہے جو مسیح کی زبان سے نکلی ہے۔ پھر باب ۹ میں عیسائیوں کی قباحتوں کے سلسلے میں رقمطراز ہے۔

اس پولس نے ان کو اپنی لطیف فریب کاری سے دین سے قطعاً محروم کر دیا کیونکہ اس نے ان کی عقلوں کو ایسا کمزور پایا کہ جیسے چاہے ان کو بہکایا جا سکتا ہے اس لیے اس خبیث نے تورات کے نشانوں تک کو مٹا دیا۔

ان موجودہ اناجیل اربعہ کے زمانہ تصنیف کے متعلق واہی تباہی بلاسند کہانیاں ہیں۔ ہورن اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۲۲ء جلد چہارم قسم ۲ کے باب دوم میں کہتا ہے:

ہم کو مورخین کنیسہ کی معرفت اناجیل کی تالیف کے زمانے کے جو حالات پہنچے ہیں وہ ناقص اور غیر معین ہیں جن سے کسی مقرر چیز تک رسائی نہیں ہوتی اور مشائخ متقدمین نے واہی روایات کی تصدیق کی اور ان کو قلم بند کر ڈالا۔ بعد کے آنے والے لوگوں نے ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو ان کی تعظیم کی وجہ سے قبول کر لیا اور یہ سچی جھوٹی روایتیں ایک کاتب سے دوسرے کاتب تک پہنچتی رہی ہیں۔ مدت مدید گزر جانے کی وجہ سے اب ان کی تنقید اور کھرا کھوٹا معلوم کرنا بھی دشوار ہو گیا۔

پھر اسی جلد میں لکھتا ہے،

پہلی انجیل سنہ ۳۸ یا سنہ ۴۳ یا سنہ ۴۸ یا سنہ ۶۱ یا سنہ ۶۳ یا ت ۶۴۔ میں تالیف کی گئی۔ دوسری انجیل سنہ ۵۶ اور اس کے سنہ ۶۵ تک کسی وقت میں اور غالب یہ ہے کہ سنہ ۶۰ یا سنہ ۶۳ میں تالیف ہوئی، تیسری انجیل سنہ ۵۳ یا ت ۶۳۔ یا سنہ ۶۴ میں تالیف ہوئی۔ چوتھی انجیل سنہ ۶۸ یا سنہ ۶۹ یا سنہ ۷۰ یا سنہ ۹۸ میں تالیف ہوئی۔

اِہلال لغیر اللہ

اہلال کے معنے عربی زبان میں نامزد کرنے اور شہرت دینے کے ہیں۔ مشہور لغوی علامہ ابوالفتح

ناصر بن عبد السید المطرزی نے مغرب میں اھلال کے معنے یہ بتائے ہیں۔

چاند دیکھنے کے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے اس کو اھلال کہتے ہیں اور اسی طرح بچہ جب پیدائش کے وقت آواز بلند کرے تو اسے استھلال کہتے ہیں۔

اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ

چاند دیکھتے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے اسے اہلال کہتے ہیں اور یہ مطلقاً ہر آواز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اسی سے پیدائش کے وقت بچہ کے رونے کی آواز کو بھی اہلال کہتے ہیں اور ما اھل بہ لغیر اللہ کے معنے یہ ہیں کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو اور وہ اصنام کی خاطر ذبح کیا جائے۔

اور لغت کی کتاب صراح میں علامہ ابوالفضل محمد بن عمر قرشی لکھتے ہیں

ما اھل بہ لغیر اللہ کے معنے یہ ہیں کہ غیر اللہ کا نام اس پر لیا جائے اور اہلال کے اصل معنے آواز بلند کرنے کے ہیں۔

مشہور محدث امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

ما اھل بہ اس کو اس لیے کہا گیا ہے کہ اہل جاہلیت جب اپنے حاجت رواؤں کے تقرب کے لیے جانوروں کو ذبح کرنے کا ارادہ کرتے تو ان جانوروں پر اپنے معبودوں کا نام لیتے اور بلند آواز سے اس کی تشہیر کرتے۔

اور شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ اھل کو ذبح پر محمول کرنا خلاف لغت و عرف ہے۔ اہلال عربی محاورہ اور لغت میں بمعنی ذبح نہیں آیا ہے بلکہ اھلال کے معنے لغت عربی میں آواز بلند کرنے اور شہرت دینے کے ہیں۔ جیسے آواز طفل نو اور شہرت چاند وغیرہ۔ اھللت للہ اگر کوئی بولے گا تو اس سے کبھی یہ نہ سمجھا جائے گا کہ میں نے اللہ کے نام پر ذبح کیا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اہلال کے معنے ذبح کے ہرگز نہیں ہیں بلکہ شہرت دینے اور تقرب کے طور پر نامزد کرنے کے ہیں۔

اگر اہلال کے معنے بھی ذبح کے ہوں تو پھر ما ذبح علی النصب جس کے معنے ہی یہ ہیں وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیے جائیں میں کوئی معنویت نہیں رہتی۔ اگر ما اھل بہ لغیر اللہ کا مطلب بھی یہی ہو تو واو عطف کے ساتھ ما ذبح علی النصب بے معنے ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ امام قرنوی الکلیل فرماتے ہیں:

صنم اور بت کی قید مشرکین کی تردید کے لیے ہے ورنہ مراد مطلقاً غیر اللہ

ہے خواہ وہ صنم ہو یا کوئی اور۔
علامہ ابو حیان الاندلسی نے مختلف اقوال نقل کرکے لکھا ہے :

جو چیز اس آیت کریمہ سے ظاہر ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ جو جانور بھی غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے وہ حرام ہے۔ لفظ غیر اللہ میں بت اور حضرت مسیح سب ہی شامل ہیں اور اس کو اہلال اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگ ذبح کے وقت اس شخص کا نام بلند کرتے تھے جس کے لیے جانور ذبح کرتے تھے پھر اس میں یہ وسعت اور کثرت آگئی کہ ہر ذبیحہ پر اس کا اطلاق ہونے لگا جیسے تلبیہ کہنے کو اہلال کہتے ہیں اور یہ ہر احرام والے کی علامت ہے۔

اہل کتاب

قرآن کے سوا جن آسمانی کتابوں کے نام قرآن میں آتے ہیں ان کے پیروؤں کو اہل کتاب الذین اوتوا الکتاب کہا جاتا ہے یا یوں کہو کہ جو قرآن کو تو آسمانی کتاب نہیں مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں آیا ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہوں خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی۔ یہ بات کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے کے لیے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح اور پر اصلی تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہوں یا صرف تورات اور انجیل کو ماننے والے بھی اہل کتاب ہی شمار کیے جائیں۔ قرآن کی تصریحات بتاتی ہیں کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کو مانتے ہوں اور اس کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہوں۔

قرآن حکیم نے جن کو اہل کتاب کہا ہے ان کے ہی بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ آسمانی کتاب میں تحریف کرتے تھے اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ عزیر کو خدا کا بیٹا اور مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ان اوصاف کے باوجود قرآن نے ان کو اہل کتاب کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی ساری برائیوں کے باوجود قرآن کے نزدیک اہل کتاب ہیں۔ خبر نہیں لوگوں نے یہ بات کہاں سے معلوم کرلی ہے کہ :

آیت میں مسیحی یا عیسائی ہرے سے مراد ہی نہیں بلکہ نصاریٰ سے مراد نصاریٰ ہی ہیں جو کہ حضرت عیسیٰ کو نبی ماننے والا نہ کہ آپ کو ابن اللہ قرار دینے والا ایک قدیم فرقہ ہوا ہے۔

حالانکہ خود قرآن ہی میں نصاریٰ کے بارے میں یہ انکشاف موجود ہے وقالت النصاریٰ المسیح ابن اللہ۔ الجصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت فاروق اعظم کے دور خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر آپ سے دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت کی تعظیم کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ فاروق اعظم نے بتایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا فرقہ ہیں۔ بہرحال قرآن کی اصطلاح میں اہل کتاب وہ ہیں جو قرآن کے سوا تورات، انجیل اور زبور کو مانتے ہوں۔ یہ لوگ جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے وفادار شہری ہو سکتے ہیں اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے ان کو وہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں گے جو مملکت کے دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں۔ ان کے معابد اور مذہبی عمارات محفوظ ہوں گے۔ ان کو مذہب لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی مسلمان حکومت حفاظت کرے گی ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ ان کا جائز کھانا مسلمان کھا سکتے ہیں اور مسلمان اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

یہیں سے ایسے لوگوں کے لیے جو قرآن، تورات، زبور اور انجیل کو تو خدائی کتاب نہیں مانتے مگر وہ اپنی جگہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، اسلامی قانون شہریت میں شبہ اہل کتاب کی اصطلاح رونما ہو گئی۔

جاہلیت

احادیث میں اکثر جاہلیت کو اسلام کا مدمقابل بنا کر استعمال کیا ہے۔ قرآن میں ما انزل اللہ کے مقابلے پر لفظ جاہلیت آیا ہے اور کہیں احادیث میں اسلامی نظام جماعت کے مقابلہ پر یہ لفظ بولا گیا۔ اسلام کے مقابلہ پر یہ لفظ اس لیے آیا ہے کہ اسلام سرتاسر علم ہے کیونکہ اس کی صرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

عرب کے زمانہ قبل اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنے میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے بغیر محض وہم و قیاس اور گمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کیے تھے۔ گویا جاہلیت ہر وہ دور ہے جس میں افکار و عقائد، اتباع ظن اور اعمال و

اخلاق کا سانچہ اتباعِ ہوا پر استوار ہو۔ یہ طرزِ عمل جہاں اور جس وقت بھی ہوگا سے جاہلیت ہی کہا جاتے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ محض ایک اتباعِ ظن ہے اور کسی معنی میں علم نہیں ہے لہٰذا خدا کے دیئے ہوئے علم سے بے نیاز ہوکر جو فکر اس اتباعِ ظن پر قائم ہوگا اور جو نظامِ زندگی اتباعِ ہویٰ کی آمیزش کرکے بنایا جائے گا وہ بھی اسی طرح کی جاہلیت قرار دیا جائے گا جو اسلام سے پہلے تھا۔ اسی بنا پر سورۃ مائدہ میں جاہلیہ کا لفظ ما انزل اللہ کے مقابلہ پر آیا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ قانون جو خدا کے دیئے ہوئے قانون کے خلاف ہے وہ جاہلیت کا قانون ہے۔

مسند امام احمد میں حارث اشعری کی حدیث میں اسلام کا نظامِ عمل بیان کیا ہے اس کے مقابل نظامِ عمل کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا ایسا شخص دوزخی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو، فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور اپنے خیال میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

جہر بالسوء

بدگوئی پر زبان کھولنا خدا کو پسند نہیں ہے لیکن مظلوم کو اس کی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کاروائیوں کو علانیہ بیان کرے۔ یہ صرف اجازت ہے پھر بھی افضل یہی ہے کہ بدگوئی پر زبان نہ کھولے۔ ہر حال میں برائی سے بچ کر رہے کیونکہ مومن ہونے کی حیثیت میں بندے کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ یہ مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم ہے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ غیبت و بدگوئی اور قانون کی زبان میں ہتک عزت بالکل ناجائز ہے اور فرد و جماعت اور شخص و ملت دونوں کو صلاح و فلاح کی یہ ایک راہ بتاتی ہے۔ جہر بالسوء میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر اور اس کے روبرو تلخ کلامی دونوں داخل ہیں۔ بلا ضرورت اور بلا مصلحت شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں جائز نہیں، نہ سامنے نہ پیچھے۔ لیکن مظلوم کو

اس کی اجازت ہے کہ وہ ظالم کی کاروائی کو علانیہ بیان کرے۔ اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی۔ فقہائے نے تصریح کی ہے کہ جھوٹی بات کی تشہیر کی مظلوم کو بھی اجازت نہیں ہے۔

غلو فی الدین

غلو کے معنے بڑھنے، زیادہ ہونے، حد سے زیادہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے قیمتوں کے گراں ہونے کے لیے غلا السعر بولا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہود و نصاریٰ دونوں نے غلو کیا ہے۔ ایک نے تفریط میں دوسرے نے افراط میں۔ افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔

مطرف بن عبداللہ نے اچھی بات فرمائی ہے،

لا تغل فی شیء من الامر واقتصد

کلا طرفی قصد الامور ذمیم

غلو عقیدہ میں ہو یا عمل میں دونوں میں دین کے تعلق سے مذموم ہے۔ دین میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے جو چیز پاؤ سیر ہے وہ من بھر کر دی جائے جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتی ہے اس کو فرض و واجب کا درجہ دے دیا جائے۔ جو شخص ایک فقیہ یا مجتہد ہے اسے امام معصوم بنا دیا جائے جس کو اللہ نے نبی یا رسول بنایا ہے اس کو شریک خدا یا خدا بنا ڈالا جائے۔ جس کی صرف تعظیم و تکریم کا حکم ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ یہ اور اس قسم کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں۔ اور جس طرح دین میں تفریط بہت بڑا جرم ہے اسی طرح افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے مذہب کا وہ مزاج جو سرتاسر اعتدال ہے بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ خدائی ترکیب جو اس کے اجزاء کو حسن و جمال کا ایک دلآویز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس غلو میں ساری امتیں مبتلا ہوئی ہیں۔ ہم مسلمان بھی افکار، اعمال، اخلاق اور احوال میں اس سے نہ بچ سکے لیکن نصاریٰ کو اس میدان میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصل بیماری یہی ہے کہ انہوں نے اپنے اس غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ دیا۔

فترۃ من الرسل

فترت کے لفظی معنے انقطاع عمل یا سکون کے ہیں۔ اصطلاح میں دو نبوتوں کے درمیانی

زمانے کو کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا ہے۔ حضور انور کا سال ولادت ۵۷۰ء اور سال رسالت ۶۱۰ء ہے۔ حضور اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں ابوہریرہ کے حوالے سے جو حدیث نقل کی ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے فرمایا کہ میں ابن مریم کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔ یہ ارشاد نبوت ان لوگوں کے موقف کو غلط قرار دیتا ہے جو کہتے ہیں کہ حضور کے اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ لیکن بعض روایات میں یہ ضرور آتا ہے کہ جرجیس اور خالد بن سنان نبی تھے جو حضرت عیسیٰ کے بعد ہوئے۔ مگر ابوہریرہ کی صحیح روایت کے مقابلہ میں ان کی تاریخی حیثیت کوئی نہیں ہے۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے اس موضوع پر ایضاح الفطرہ فی اہل الفترہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت کا منشا زمانہ بعثت کی دنیا کا نقشہ پیش کرنا ہے۔ مفتی محمد عبدہ مصری نے اپنے رسالہ توحید میں اس دور کی بلیغ انداز میں عکاسی کی ہے۔ ایک انگریز سیرت نگار اررادی سی برونے نے اپنی کتاب پیغمبر میں زمانہ فترت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک واقوام کا تذکرہ کیا ہے۔

قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزاع کا دور تھا جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اول ہی تباہ ہو چکی تھیں یا اپنے شاہی دور کے اختتام پر تھیں، یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت ایران کی عظمت اور روما کی شوکت و جلال سے متحیر تھی اور کوئی ایسی ایک شے یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

غرضیکہ ساتویں صدی مسیحی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی قدروں کی حامل ہو نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو اور نہ ایسا کوئی دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں محمد رسول اللہ بشیر و نذیر بن کر تشریف لائے۔ اس عالمگیر تاریکی کا نقشہ قرآن نے علی فترۃ من الرسل سے مختصر

جملہ کے ذریعہ پیش کیا ہے ۔

قربان

قربان یہاں قربانی یعنی ذبیحہ کے معنے میں نہیں ہے بلکہ لفظی معنے اور وسیع مفہوم میں جیسے نذر و نیاز کے مفہوم میں ہے ۔ راغب اصفہانی نے مفردات میں اور الجصاص نے احکام القرآن میں یہی معنے بتاتے ہیں، سب نے ہی یک زبان ہو کر لکھا ہے ما یتقرب الی اللّٰہ یعنی قربان وہ چیز ہے جس کے ذریعہ اللہ کا قرب تلاش کیا جائے ۔ اسلام و کفر میں حد فاصل صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے صدقہ، نذر و نیاز اور قربانی کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتا ہے جبکہ کافر یہی غیر اللہ کے لیے کرتا ہے ۔ یہ غیر اللہ مشرکین مکہ کے بت ہوں یا عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ہوں یا یہودیوں کے حضرت عزیر ہوں اور یا مسلمانوں کے شیخ جیلانی ہوں ۔ اشخاص و افراد کی تبدیلی مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے ۔ شاہ عبدالعزیز نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے :

> کھانے پینے کی چیزیں اور اسی طرح دوسرے اموال کو غیر اللہ کے تقرب کی نیت سے دینا حرام اور شرک ہے ۔ (فتاوی عزیزی)

کلالہ

کلالہ جس کا نہ والد ہو نہ اولاد ہو ۔ یہ تکللہ النسب سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نسب نے اس کو گھیر لیا ۔ کچھ کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو نہ میت کا والد ہو اور نہ اس کی اولاد ہو ۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ باپ بیٹا آدمی کے دو کنارے ہیں تو جب مرتے وقت نہ باپ چھوڑے نہ بیٹا تو گویا دونوں کنارے اس کے مٹ گئے اس لیے اس کو کلالہ کہتے ہیں اور کچھ کی رائے ہے کہ جو چیز گھیرے اس کو اکلیل کہتے ہیں اور میت کو کلالہ اس لیے کہا ہے کہ دوسرے وارث اس کو گھیر لیتے ہیں ۔ قانون کی اصطلاحی زبان میں کلالہ اس میت کو کہتے ہیں جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو ۔ یعنی نہ بالائی رشتہ ہو نہ زیریں ۔ صدیق اکبر نے کلالہ کی یہی تعریف کی ہے اور ابن کثیر فرماتے ہیں یہی حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت کا ارشاد ہے ۔ تابعین میں امام شعبی، ابراہیم نخعی، حسن بصری، قتادہ، جابر بن زید اور الحکم کی یہی رائے ہے ۔ اہل مدینہ، اہل کوفہ اور اہل بصرہ کا یہی فیصلہ ہے ۔ فقہاء سبعہ اور

اور اربعہ کا یہی موقف ہے بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔ اس کے برعکس اہل لغت کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں کہ جو میت کا نہ باپ ہو اور نہ اولاد ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ بظاہر اصطلاح شریعت اور اہل لغت کے مابین تضاد ہے لیکن دونوں درست ہیں کیونکہ جس میت کے بلا واسطہ وارث نہ ہوں بلکہ دوسرے ہوں تو میت کا رشتہ دوسروں سے کمزور ہوگا کیونکہ بالواسطہ ہوگا۔ اسی لیے ان وارثوں کا رشتہ میت سے کمزور ہوگا جو میت کی اولاد میں سے نہ ہوں اور باپ بھی نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کلال کے معنے ضعف کے ہیں اور بالواسطہ رشتہ بلا واسطہ کے مقابلے میں ایک کمزور رشتہ ہے اس لیے دونوں پر اطلاق صحیح ہے۔

دراصل کلالہ کی اصل کلال ہے اور کلال کے معنے کمزوری کے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے ؛

فالیت لا ارثی لہا من کلالۃ
ولا من حفا حتی تلاقی محمداً

میں نے قسم کھائی ہے کہ اونٹنی پر اس کی تھکاوٹ اور فرسودہ پائی کی وجہ سے اس وقت تک رحم نہ کروں گا جب تک وہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ تک نہ پہنچا دے گی اسی سے وہ زبان جس میں گویائی نہ ہو اور وہ آنکھ جس میں بینائی نہ ہو وہ تلوار جو کند ہو گئی ہو اور وہ شخص جو بوجھ نہ اٹھا سکے۔ کلیل اور کل کہلاتے ہیں۔

خدیجۃ الکبریٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ونک لتحمل الکل آپ تو ان کو اٹھاتے ہیں جو گرے پڑے ہیں اور کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے اور یہی معنے ہیں اس ارشاد کے کہ من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلا فالی وعلی جو شخص مال و اسباب چھوڑ جاتے وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو بوجھ چھوڑ کر جاتے وہ میرے ذمہ ہے۔ توسیع استعمال کے بعد عرف میں کلالہ سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں۔ جو منقطع الطرفین ہوں یعنی ان کے والدین ہوں اور نہ اولاد ہو۔ اور جو شخص آباؤ اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو جاتے اس کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؛

ورثتم قناۃ الملک غیر کلالۃ
عن ابنی عبد مناف عبد شمس وھاشم

عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے حکومت کا نیزہ تمہیں ایسا وراثت

میں ملا ہے جو کند نہیں ہے لیکن تم خود ان خصوصیات سے بے بہرہ ہو۔ قریب کے رشتہ کو چھوڑ کر دور کے رشتہ کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ الجصاص رقمطراز ہیں کہ احادیث میں کلالہ مورث اور وارث دونوں معنے میں آتا ہے۔

یہ لفظ دو مرتبہ آیا ہے ایک بار سورہ نساء کے آغاز میں پارہ ۴ میں اور دوسری بار سورہ نساء کے آخر میں پارہ ششم کے آغاز میں۔ بھائی بہن تین طرح کے ہیں، سگے جن کو عینی کہتے ہیں سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہوں جن کو علاتی کہتے ہیں اور وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں۔ سورہ نساء کے آغاز میں اخیافی بہن بھائی کی میراث کا ذکر ہے اور اس پر اجماع ہے اور سورت کے آخر میں علاتی اور عینی بہن بھائیوں کی میراث کا ذکر ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝

اللہ سبحانہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ برا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو، اور اللہ سبحانہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔[۲۱۹] اگر تم لوگ بھلائی کھلم کھلا کروگے یا چھپا کر کروگے یا برائی سے درگزر کروگے تو بلاشبہ اللہ ہی معاف کرنے والا صاحب قدرت ہے۔[۲۲۰]

قانون ازالہ حیثیت عرفی

کسی کو برا کہنے کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ذرت شو ونبر سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند۔ بے باک، نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں۔ مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن وجمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

کسی کو برا کہنے کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدال کے موقع پر پیش آتی ہے۔ گالی گلوچ کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو برا بھلا کہتا ہے۔ اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے۔ کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز بیماری مثلاً برص جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے۔ بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی برا برتاؤ کیا گیا ہے تو اس کا اظہار کرتا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت کی ہے۔ گویا یہ آیت قرآنی قانون ازالہ حیثیت عرفی کی بنیاد ہے۔ پچھلے کئی رکوعوں میں منافقوں کے حالات کو کھول کر بیان کیا ہے۔ اب یہاں اہل ایمان کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق بت پرست اور یہودی سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریق سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوتے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نور کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں میں نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا اللہ کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ تم مظلوم ہو۔ اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ علانیہ ہو یا خفیہ ہر حال میں بھلائی کے لیے کام کیے جاؤ اور برائیوں سے درگزر کرو کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم و بردبار ہے۔ سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے قریب تر ہونے کے لیے تم بھی عالی اور وسیع الظرف بنو۔

۲۱۹ - اللہ سبحانہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ برا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو اور اللہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔ یعنی اگر کسی میں دین و دنیا کا عیب معلوم ہو تو اس کو مشہور نہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سب کی بات سنتا اور سب کے کام جانتا ہے، ہر ایک کو اس کے موافق جزا دے گا۔ اسی کو غیبت کہتے ہیں، البتہ مظلوم کو رخصت ہے کہ ظالم کا ظلم لوگوں سے بیان کرے ایسے ہی بعض اور صورتوں میں بھی غیبت روا ہے اور یہ حکم یہاں شاید اس لیے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ کسی منافق کا نام مشہور نہ کریں۔ اس میں یہ گمان کہ شاید بے باک ہو جاتے بلکہ مبہم نصیحت کریں۔ اس طرح

منافق آپ سمجھے گا یا تنہائی میں نصیحت کریں کہ شاید ہدایت قبول کرے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے کسی کا نام لے کر مشہور نہ کرتے تھے۔ [1]

اصل ارشاد میں الجهر بالسوء من القول آیا ہے۔ جہر کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے ۔۔۔ بینائی کی افراط سے ہو یا اشنوائی کی مگر یہاں مراد صرف اعلان ہے خواہ زبان دہن سے ہو یا زبان قلم سے۔ سوء برائی، آفت، گناہ، برا کام، عیب سُوءٌ سے اسم ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ سوء آفات اور امراض کا ایک جامع نام ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔ سوء ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دیتا ہے خواہ دنیوی امور سے ہو یا اخروی۔ احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ سے یا ان حالات میں سے ہو جو کہ جاہ و مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں اس کا استعمال جن معانی میں ہوا ہے۔ حافظ سیوطی نے ان کو تفصیل کے ساتھ الاتقان فی علوم القرآن میں قلم بند کیا ہے فرماتے ہیں:

سوء کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ شدت اور سختی کے لیے یسومونکم سوء العذاب کونچیں کاٹنے کے لیے لا تمسوها بسوء زنا کے لیے من اراد باهلك سوءا برص کے لیے بیضاء من غیر سوء عذاب کے لیے ان الخزی الیوم والسوء علی الکافرین شرک کے لیے ما کنا نعمل من سوء گالی گلوچ کے لیے لا یحب اللہ الجهر بالسوء گناہ کے لیے یعملون السوء بجهالة برے کے معنے میں لهم سوء الدار نقصان اور ضرر کے معنے میں و یکشف السوء شکست اور ہزیمت کے معنے میں لم یمسسهم سوء۔

اس آیت میں بھی اسی طرح کی ایک تنبیہ ہے جیسے آپ پیچھے پانچویں پارے میں لا تقولوا لمن القی الیکم السلام لست مومنا میں پڑھ آئے ہیں۔ جس طرح وہاں منافقین سے جب اعراض کا نبوت کو حکم ہوا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو تمہیں سلام کرے تم اس کے سلام کا جواب دو اور مقصود اس سے یہ تھا کہ مبادا پُرجوش مسلمان ان لوگوں سے سلام کلام ہی بند کر دیں جن پر ان کو منافقت کا شبہ ہو جاتے۔ اسی طرح یہاں بھی منافقین کے لیے ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان علانیہ سخت الفاظ میں منافقین کی برائیوں کا اعلان شروع کر دیں گے۔ اس بنا پر یہ ہدایت کی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا۔

جماعتی زندگی کا ایک اہم مسئلہ

یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے اہم مسائل میں سے ہے اس لیے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی ایسی برائی جڑ پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے۔ اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت اس کے بدنتائج اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تاکہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ جماعت کے عام افراد، عام عنوان سے کہی ہوئی بات کو صرف اپنے اندازے، قیاس اور گمان کی بناء پر خاص اشخاص پر منطبق کرنا شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ افراد تہمتوں کا نشانہ بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار و فساد پیدا ہونے کا بھی خطرہ ہے۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں دیکھ لیجیے بالکل عام انداز میں بیان ہوئی ہیں اور مقصد یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس حد تک یہ چیز نہ صرف یہ کہ ٹھیک ہے بلکہ جماعتی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن اگر یہی چیز یہ شکل اختیار کر لے کہ اس کو دلیل بنا کر عام افراد تعین کے ساتھ ایک دوسرے کو طعنوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیں کہ تو منافق ہے۔ تو کافر ہو گیا اور فلاں فی الدرک الاسفل من النار کا سزاوار ہے تو پوری جماعت میں ایک طوفان بپا ہو جائے گا۔ اسی فتنہ کے سدباب کے لیے یہ ہدایت فرما دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس پر شخصاً ظلم ہوا ہو۔ اس صورت میں ظلم ظالم اور مظلوم تینوں متعین ہوں گے اور قانون اس کا مداوا کر سکے گا جب یہ شکل نہ ہو بات کا انداز عمومی ہونا چاہیے جیسے قرآن نے منافقین کے ذکر میں اختیار کیا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی جب اس طرح کی کوئی بات آتی تو آپ ہمیشہ عام انداز اختیار فرماتے مثلاً مابال قوم یفعلون کذا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو اس طرح کے کام کرتے ہیں۔ البتہ جب کوئی متعین شخص کسی متعین جرم کے ساتھ سامنے آتا تو آپ اس پر قانون کے مطابق گرفت فرماتے۔

اللہ کو پسند نہیں کا مطلب

آیت نے اخلاق کی اصطلاح میں بدگوئی اور قانون کی زبان میں ہتک عزت کو بالکل ناجائز قرار دیا۔ اور فرد و جماعت، شخص و ملت دونوں کے ہاتھ میں فلاح و اصلاح کی ایک بڑی اصل دی۔ الجہر بالسوء من القول کے تحت میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر آگئی اور اس کے روبرو تلخ کلامی بھی۔ اللہ پسند نہیں کرتا کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو برے الفاظ لعنت، ملامت، گالی گلوچ، ہجو، مذمت اور اسی طرح کی جملہ بدگوئیوں سے آلودہ کرنا ممنوع اور خدا کی ناراضگی کا باعث ہے جن سے ایک طرف تو انسان کی بے قدری ہو اور دوسری طرف اس کی بے شرمی، بدطینتی اور بد تہذیبی کا اعلان اور اس کی اس بے ضمیری کا اظہار ہو کہ وہ اپنے نفس کو جاہلانہ جذبات اور شیطانی وسوسے مثلاً عجب و غرور، تضحیک و تحقیر اور ہزل گوئی و بدکلامی وغیرہ اخلاقی رذائل سے اپنی زبان کو روکنے پر قابو نہیں رکھتا۔ بدگوئی کی شناعت اور گرانی کا اندازہ آیت قرآنی کے اس بلیغ اور مؤثر انداز بیان سے کیجئے جو اس کی ممانعت کے لیے اس نے اختیار کیا ہے۔ اس ممانعت کا عام اور معمولی طریقہ بیان تو یہ تھا کہ یوں کہہ دیتا لا تجھروا بالسوء من القول بری بات نہ کہو، لیکن اس کے بجائے لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول کا اسلوب اختیار کر کے دراصل حکیمانہ طور پر اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ چیز ناراضی خدا کا باعث ہے۔ اس لیے خواہ کچھ ہو اس کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔

بدگوئی کا یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک استثنا بھی رکھا ہے اور مظلوم کو ظالم کے خلاف زبان ملامت کھولنے کی اجازت دی ہے۔ یہ بات بہت سے مصالح پر مبنی ہے۔ مظلوم اگر ظالم کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بددعائیں دے، نالہ و فریاد کرے اور اس کی برائیوں اور مظالم کو بیان کرے تو اللہ تعالیٰ کو مظلوم کی یہ بدگوئی ناپسند نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ لوگ اس کی مظلومیت اور بے بسی پر ترس کھائیں اور ظالم کو اس کے ظلم سے روکیں یا ایسا ہو کہ بدنامی اور رسوائی کے خوف سے ظالم خود ہی باز آجائے۔ اس کے علاوہ تقاضائے فطرت ہے کہ زخم خوردہ اور مظلوم انسان اگر کچھ نہیں کر سکتا تو کم از کم مظالم پر لعنت بھیج کر اور ظالم کو برا بھلا کہہ کر ہی اپنے غم و غصہ کی آگ بجھا لیتا ہے اور اس استثنا کی دوسری اہم وجہ اور مصلحت جس پر ادنیٰ تامل سے نگاہ پہنچ سکتی ہے یہ ہے کہ ظلم بدترین گناہ اور ظالم ایک حیوان صفت انسان ہے جو اللہ کے نزدیک سخت مغضوب، ذلیل اور اس کی عنایتوں سے محروم ہے حتیٰ کہ اس کی ملامت اور بدگوئی کرنا بھی اللہ کو ناپسند نہیں ہے۔

بدزبانی سے بچنے کے مصالح

قرآن وحدیث میں جابجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں مثلاً اول یہ کہ بدزبانی میں لوگ عموماً زیادتی کرتے ہیں۔ یعنی اگر ایک شخص ایک بار کسی کے بارے میں بدزبانی کرتا ہے تو دوسرا دو بار کرتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کے بارے میں بدزبانی کرتا ہے تو دوسرا اس کے باپ اور ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے۔ اس لیے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریق یہ ہے کہ کسی کے بارے میں بدزبانی نہ کی جائے۔ اللہ سبحانہ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم۔

مسلمانو! ان لوگوں کو بُرا نہ کہو جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں کہ یہ لوگ بھی نادانی سے بڑھ کر خدا کو بُرا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت بھیجے کہا گیا یا رسول اللہ! کوئی اپنے ماں باپ پر کیوں کر لعنت بھیج سکتا ہے فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو بُرا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو بُرا بھلا کہے گا۔ (بخاری کتاب الادب)

دوسرے یہ کہ بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا۔ آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ اپنے قبیلہ میں یہ نہایت بُرا آدمی ہے لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو بُرا کہا۔ پھر اس سے نہایت لطف ومحبت سے ملے۔ فرمایا۔ عائشہ تم نے مجھے بدزبان کب پایا۔ خدا کے نزدیک قیامت کے روز ان سب سے بُرا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اسے چھوڑ دیں۔ (بخاری کتاب الادب)

تیسرے یہ کہ بدزبانی دور وحشت وجہالت کی یادگار اور تہذیب وشائستگی کے خلاف ہے ایک بار حضرت ابوذر نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع

ہوئی تو فرمایا تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ (صحیح بخاری)

امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں اور نوکروں سے بدزبانی کرنا جائز نہیں ہے۔

چوتھے یہ کہ رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل خلاف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کی بجائے السام علیکم (تم کو موت آئے) کہا۔ حضرت عائشہ نے جواب میں کہا علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا کہ اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی و بدزبانی سے بچو۔ (بخاری کتاب الادب)

پانچویں یہ کہ بدزبانی سے روکنے کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے۔ اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کو سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا۔ ارشاد ہے کہ بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی حیا کے خلاف ہے۔

چھٹے یہ کہ بدزبانی سے لوگوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (مسلم کتاب الایمان) مُردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مُردوں کے عزیز و اقارب کو تکلیف ہوتی ہے۔ (ترمذی)

ساتویں یہ کہ بدزبانی باہم لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا کفر ہے اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق ضرور ہے۔ اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر ہے۔ (بخاری کتاب الادب)

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ بدزبانی قرآنی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی اللہ کی پسند کے مطابق بسر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا کبھی گوارا نہیں کرے گا۔

اخلاق اور محبت الٰہی

ذرا ٹھہر جائیے اور یہاں اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ دین و دُنیا کی سب سے بڑی نعمت اللہ سبحانہٗ کی محبت ہے یعنی وہ پیار جو اللہ سبحانہٗ کو اپنے بندے سے ہو۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن راہوں سے حاصل ہوتی ہے ان میں دیگر ضروریات دین کے علاوہ سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی محبت پر زور تو تورات اور انجیل میں بھی ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ اور یہ دولت انسان کو کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں صاحب خلق عظیم داعی خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ارشادات احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں لیکن قرآن نے اس مختصر جواب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے نام بنام بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں میں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں۔ حسن خلق یہی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے۔ بداخلاقی یہی ہے

قرآن نے منفی اور مثبت دونوں پہلو پیش کیے ہیں منفی پہلو کی حد تک اس کی پکار اگر یہ ہے کہ کفر، بدگوئی، بدلا لینے میں حد سے آگے بڑھ جانے، فخر و غرور، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف ظلم اور گناہ وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبت الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔ تو مثبت پہلو کی حد تک اس کا اعلان یہ ہے کہ ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور جہاد وہ اخلاق حسنہ ہیں جو محبت الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

بدزبانی علانیہ اور پوشیدہ دونوں حرام ہیں

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علانیہ بُرا کہنے کو ناپسند کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ کو خفیہ بدزبانی پسند ہے۔ علانیہ اور جہر بالسوء کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے اور منافقین کے یہاں مفاسد کی مناسبت سے ہے ورنہ جیسے جہر بالسوء اللہ کو پسند نہیں ہے ایسے اسرار بالسوء بھی اللہ کو پسند نہیں ہے قرآن میں سرگوشی بالاثم والعدوان کی ممانعت آئی ہے اور پھر قرآن نے صراحۃً متعدد آیتوں میں کسی کے بارے میں بدزبانی کے مختلف طریقوں کی بُرائی بیان کی ہے۔

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ ہر شخص جو لوگوں کی عیب چینی کرتا اور ان پر آوازے کستا ہے اس کی بڑی تباہی ہے۔

اس آیت میں بدزبانی کے جن معنی اور دل خراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں :

۱۔ ھمز سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا۔

۲۔ ھمز خاص طور پر لوگوں کے نسب کی بُرائی بیان کرنا۔

۳۔ ھمز ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے بُرائی کرنا۔

۴۔ ھمز زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے بُرائی کرنا۔

۵۔ ھمز بُرے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

۶۔ لمز آنکھ، ہاتھ، سر، ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی بُرائی کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

آخر میں ارشاد ہے وکان اللہ سمیعا علیما، اس میں تنبیہ فرمادی۔

اولاً یہ کہ مظلوم کے علاوہ اگر کوئی شخص بدزبانی سے احتیاط نہ کرے گا تو اس کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ سبحانہ اس سے بے خبر اور ناواقف نہیں ہے بلکہ اس کی شان یہ ہے کہ وہ تمہاری بدزبانی کو سنتا اور جانتا ہے اس لیے اگر تم اس عادت کو نہ چھوڑو گے تو اس کی پاداش بہرحال تمہیں بھگتنی ہوگی۔

ثانیاً، سمیع میں ایک طرف تو ظالم کو تنبیہ ہے کہ مظلوم کہیں فریاد کر جاتے نہ جانے اللہ تو بہرصورت اس کی سُن ہی رہا ہے اور دوسری طرف مظلوم کو بھی ترغیب ہے کہ مخلوق کے سامنے خواہ مخواہ زیادہ واویلا نہ کرے یقین رکھے کہ اللہ تو سُن رہا ہے اور علیما کی صفت لا کر بھی ظالم و مظلوم دونوں کو یاد دلایا ہے کہ کوئی زبان سے بولے یا نہ بولے اللہ پر ظلم کی نوعیت و حقیقت عیاں ہے

ثالثاً، اس میں اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف روش اختیار کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اللہ سبحانہ سننے والا اور جاننے والا ہے یعنی اس پر وہ گرفت کرے گا۔

فضائلِ اخلاق کی ترغیب

۲۲۰۔ اگر تم لوگ بھلائی کھلم کھلا کرو گے یا چھپا کر کرو گے یا بُرائی سے درگزر کرو گے تو بلاشبہ اللہ سبحانہ معاف کرنے والا صاحب قدرت ہے۔ اس آیت میں مظلوم کو معافی کی رغبت دلائی

منظور ہے کہ حق تعالیٰ زبردست اور قدرت والا ہو کر خطا والوں کی خطا بخشتا ہے۔ بندۂ زیر دست عاجز کو بطریق اولیٰ دوسروں کی خطاؤں کو معاف کر دینا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینا جائز ہے مگر افضل یہ ہے کہ صبر کرے اور بخش دے۔ آیت میں اشارہ ہے اس طرف کہ منافقوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہو تو ان کی ایذا اور شرارت پر صبر کرو اور نرمی اور پردہ سے ان کو سمجھاؤ، ظاہر کی لعن وطعن سے بچو اور کھلا مخالف نہ بناؤ۔[1]

اس آیت میں اہل ایمان کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دی گئی۔ یہاں تین درجے بیان کیے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کرتا ہے اور ساتھ ہی وہ اس کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ یہ ایک درجہ ہے لیکن بالکل ابتدائی اور سطحی قسم کا درجہ ہے ان تبدوا خیرا کا مفہوم یہی ہے۔ خیر سے مراد ہر قسم کی نیکی ہے نفقہ، کی کرد، کی صدقہ و خیرات کی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ نیکی کرے اور اس کا اظہار نہ کرے بلکہ اپنے عمل کا تمام تر منشاء رضائے الٰہی رکھے یہ اونچا مرتبہ ہے اور ارشاد میں او تخفوہ سے اسی طرف اشارہ مقصود ہے۔ نیکی میں اصل اور ضابطہ کی بات یہی ہے کہ اس کی پابجائی ہو۔ یہ بات کہ نیکی کا چھپانا افضل ہے یا ظاہر کرنا۔ نیکی کرنے والوں کے احوال کے اختلاف سے تعلق رکھتی ہے۔ زندگی میں ایسے مواقع ضرور پیش آتے ہیں جہاں نیکی کا اعلان و اظہار بھی ضروری ہے۔ ایک شخص بھوک پیاس سے نڈھال ہے یا بیماری میں مبتلا سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ آپ قریب سے گزر رہے ہیں اور آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ اسے کھانا کھلا کر یا دوا پلا کر از سر نو زندہ کر دیں لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں آپ کی اس خدمت کا شمار ریاکاری میں نہ ہو جائے، اس کے پاس سے کتراتے گزر جاتے ہیں۔ یہ تقویٰ نہیں عین معصیت اور وہم پرستی ہے۔ یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی ہے خواہ اس کا اعلان ہی کرنا پڑے۔ جن لوگوں نے نیکی کے اہتمام یا اخفا کی تاکید حد سے زیادہ کی ہے اور خدمت خلق کو مخفی رکھنے کے ساتھ محدود و مقید کر دیا ہے ان کی تعلیم یقیناً ناقص، ناتمام یک طرفہ ہے اور انہوں نے زندگی میں پیش آنے والے بکثرت واقعات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ضابطہ یہی ہے کہ عمل خیر کے اعلان و اخفا میں اختیار ہے اور ساتھ ہی فضیلت اخفا کی ہے جب اظہار و اعلان میں خاص مصلحت نہ ہو۔

تیسرا امر تبہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ ان کو نظر انداز کر جائے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

برائی کرنے والے سے بدلہ نہ لیا جائے یہ نفس کے لیے بہت شاق ہے اور اس کا درجہ سلوک و اخلاق کے منتہی کو ملتا ہے اور آخر میں عفواً قدیراً کا اضافہ کر کے بتا دیا کہ جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور یہاں یہ بلیغ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ تمہارا خدا تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہرحال معاف ہی کرنا چاہیے۔ امام رازی نے یہاں یہ بات خوب ارشاد فرمائی ہے کہ آیت کے ان دو مختصر جملوں میں اخلاق و سلوک کا سارا خلاصہ آگیا ہے۔

قانون اور اخلاق کی مجموعی تعلیم

زیر نظر آیت کی تشریح تشنہ رہ جائے گی۔ اگر ہم اس پر مجموعی حیثیت سے ایک نظر نہ ڈالیں پہلی آیت میں مظلوم کو دادرسی کی خاطر بدلہ لینے کی اجازت دی ہے۔ اور اس آیت میں مظلوم کو معاف کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس حیثیت سے یہ آیت بتا رہی ہے کہ اسلام قانون و اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحب حق کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو تورات کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کی جگہ اس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتقام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کا پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعے سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں کسی طرح حارج نہیں، وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے۔

موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے۔ اس کا معنی یہی ہے کہ موسویت اور عیسائیت میں قانون اور اخلاق الگ ہیں اور اسلام ان دونوں کی ترکیب کا نام ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں ہے لیکن اگر وہ قانون محمدی کے ساتھ اخلاق محمدی کو سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نام پر جو تعلیم پیش کی ہے وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق

اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ اس حیثیت سے آپ پورے اسلامی نظام پر نظر ڈالیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ سیاسی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام، مالیاتی نظام اور عائلی نظام میں ہر جگہ کس خوبصورتی سے قانون و اخلاق میں مناسبت کی گئی ہے۔

الغرض قانون و اخلاق یعنی انتقام و عفو میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے۔ اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کی کوئی چیز نہ رہے حالانکہ وہ ہی ایک اچھے اور صحیح نظام حیات کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے قرآن نے ایک ایسی تعلیم پیش کی ہے جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے، چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا۔ تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے بہرحال انتقام و عفو دونوں کا اپنی اپنی جگہ مقام ہے۔ قانون کی حد تک انتقام ہے لیکن عفو کا درجہ اخلاق و احسان کا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون موجودہ ترقی پذیر ملکوں کے قوانین سے زیادہ نرم زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے لیکن عفو کی عام تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اخلاق کی سب سے بڑی بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر شاق گزرتی ہے وہ عفو و درگزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ کو بھی نہایت آسانی سے طے کر دیا ہے اور قرآن نے ایک سے زیادہ آیات میں صبر و برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا ہے۔ اہل ایمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے بلکہ یگانے تو بیگانے قرآن نے تو ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بیگانوں اور اپنے دشمنوں کو بھی معاف کر دیں۔

قل للذین آمنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ۔

اے پیغمبر اہل ایمان سے کہہ دو کہ وہ ان کو معاف کر دیں جو ایام اللہ کی امید نہیں۔

(ایام اللہ، خدا کی گرفت کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ وہی ہیں جو کافر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کفر کے خلاف اسلام کے جذبات کس قدر شدید ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کر دیں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں۔ کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ زیر تشریح آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر اہل ایمان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے کہ تمہارے لیے بہتر اور اچھی اور پسندیدہ روش یہی ہے کہ اچھے جذبات دل میں پرورش کرو اور دوسروں کی برائیوں سے درگزر کرو۔ کیونکہ

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ
اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ
أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ
وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٥١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ
يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٥٢﴾

جو لوگ خدا سے اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور
خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں اور
کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے[۲۲۱]، اور ایمان
و کفر کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ بلاشبہ
پکے کافر ہیں[۲۲۲]۔ اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت والا
عذاب تیار کر رکھا ہے[۲۲۳]۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے

پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان کسی میں فرق نہیں کیا ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان کے اجر عطا کرے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۲۲۴

ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے

اہلِ کتاب اور منافقوں میں یہ چیز قدرِ مشترک تھی کہ وہ خدا اور رسول کی باتوں کو علم کی حد تک مانتے تھے مگر عمل کی حدود میں انکار کرتے تھے۔ اور اہلِ کتاب میں یہودیوں میں یہ چیز زائد تھی کہ وہ کچھ رسولوں کو مانتے تھے اور کچھ کو نہیں مانتے تھے۔ اسی مناسبت سے منافقین کے ذکر کے خاتمہ پر ربطِ مضمون کے لیے یہود اور عیسائیوں کا تذکرہ کیا ہے اور پھر منافقین کے نفاق کا سارا دارومدار اہلِ کتاب سے تعلقات تھے۔ ان سے سیاسی تعلقات، مقدمات میں ان کی عدالتوں سے بستگی، منافقین یہ روابط اہلِ کتاب سے کاٹنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ وہ اپنے اس رویہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حیلہ تراشتے تھے کہ اہلِ کتاب بہرحال اہلِ کتاب ہیں۔ ان میں دینی لحاظ سے کچھ خرابیاں ہیں لیکن ان خرابیوں کی وجہ سے ان کو بالکل کافروں کی صف میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں نہایت صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ پکے کافر یہی ہیں کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ اللہ نے جن کو رسول بنا کر بھیجا ہے ان میں سے جس کو چاہتے ہیں مانتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نہیں مانتے۔ قرآن کی زبان میں اسی کا نام تفریق بین الرسل ہے۔ یعنی خدا کے رسولوں میں باعتبارِ تصدیق تفرقہ و امتیاز کرنا یعنی یہ سمجھنا کہ ان میں سے فلاں سچا تھا فلاں سچا نہ تھا۔ یا کسی ایک کی تصدیق کر لی باقی سب سے انکار کر دیا۔ سب کی تصدیق کر لی کسی ایک کا انکار کر دیا۔ قرآن کہتا ہے ہر راست باز انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام دعوتوں پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ راہیں صرف دو ہیں ایمان کی اور انکار کی۔ ایمان کی یہ ہے کہ سب کو مانو، انکار کی یہ ہے کہ

سب کا یا کسی کا انکار کر دو۔ کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے۔ قرآن کے الفاظ پر غور کیجئے یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ کسی ایک رسول کا انکار بھی آخری درجہ کا کفر ہے اور اس ایک انکار کی موجودگی میں باقی سارے انبیاء کا اقرار بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

۲۲۱ - جو لوگ خدا سے اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ یہاں سے ذکر ہے یہود کا چونکہ یہود میں نفاق کا مضمون بہت تھا اور آپ کے زمانے میں جو منافق تھے وہ یہود تھے یا یہود یوں سے ربط اور محبت رکھنے والے اور ان کے مشورے پر چلنے والے تھے اس لیے قرآن شریف نے دونوں کا ذکر اکٹھا فرمایا ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں یعنی اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتے اور بعض رسولوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ لہ

مطلب یہ ہے کہ یہ خدا پر ایمان اپنی شرائط پر لانا چاہتے ہیں نہ کہ خدا کی شرائط پر۔ حالانکہ ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ سبحانہ کی شرائط پر ہو۔ اگر ایمان کی شرطیں بھی مقرر کریں گے اور رسولوں کا انتخاب یہ اپنے ہی صوابدید اور اختیار تمیزی سے کریں گے تو پھر خدا کی خدائی کہاں رہی پھر تو خدائی کا منصب انہوں نے خود ہی سنبھال لیا۔

دراصل اس آیت میں ان پر جو فرد جرم عائد کی گئی ہے وہ یہ ہے۔

اولاً یہ کہ اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کرتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ وہ کچھ پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں۔

اللہ و رسول سے کفر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ خدا کے رسولوں کو مانتے ہیں۔ صاحب روح نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زبان سے صراحۃً خدا اور رسول کا انکار کرتے ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ خدا اور رسول کے بارے میں ان کے افکار و اعمال کا تقاضا ہی ان کا انکار ہے یعنی ان کے فکر و عمل کا لازم یہ ہے کہ وہ خدا اور رسول کو نہیں مانتے ہیں۔

لہ انوارات شیخ الاسلام

اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کو مانتے ہیں مگر خدا کے رسولوں کو نہیں مانتے۔ یا یہ کہ خدا کے رسولوں میں سے کچھ کو نہیں مانتے اور کچھ کو مانتے ہیں۔ اور یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ اللہ کی بات مانتے ہیں اور اللہ کے رسول کی بات نہیں مانتے۔

احکام دین، تفریق کی حرمت

اور یہ بھی اس کا مدلول ہے کہ زندگی کی مختلف شاخوں میں سے کچھ شاخوں میں اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں اور کچھ میں نہیں مانتے۔ حالانکہ خدا اور رسول کو ماننے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ احکام میں پیروی کی حد تک ہرگز کوئی تفریق نہ کی جائے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ احکام تو اطاعت کے لیے ہی دیئے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے حکم سب برابر ہیں۔ آج تک کہیں بھی محکوم اور غلام کا یہ حق تسلیم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ آقا کے احکام کی بجاآوری میں من مانی کر سکتا ہے۔ چاہے تو ان احکام کو حسب خواہش دو حصّوں میں بانٹ دے۔ ایک حصے کو واجب الاطاعت سمجھ کر اس کی اطاعت کرے اور دوسرے کو غیر ضروری اور زائد قرار دے کر پس پشت ڈال دے۔ پھر فرمانروائے مطلق آقائے حقیقی کے محکوموں اور غلاموں کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کے کچھ احکام کی تو وہ تعمیل کریں اور کچھ کو نظر انداز کر دیں۔ یہ طرز عمل اللہ کی اطاعت نہیں ہے اس کی نافرمانی ہے۔ منافقین اور یہود کی یہ مشترک بیماری تھی۔

اس مسئلہ کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے۔ یہ بات دلائل کی پوری قوت سے ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو عقل اس کے سوا کچھ مان ہی نہیں سکتی کہ انسان کو اپنے مالک اور معبود کی جانب سے جو احکام ملے ہیں خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، معروف ہوں یا غیر معروف، مذاق عام والی مذہبیت کا رنگ ان پر نمایاں ہو یا نہ ہو، انسان کے ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن سے، ذکر یا پرستش کی نوعیت کے ہوں یا تمدنی و اجتماعی نوعیت کے سب کے سب عبادت کا یہ پیدائشی وظیفہ انجام دینے کی خاطر ملے ہیں ان میں سے کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس فریضہ کی ادائیگی کے معاملے سے بالکل غیر متعلق ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اس لیے حقیقت واقعہ یہی ہے کہ انسان کی اپنے فرائض حیات سے سبکدوشی ان سارے ہی احکام کی تعمیل پر موقوف ہے جو اسے عطا ہوتے ہیں، اور صرف کسی خاص حصے کی بجاآوری کے نتیجہ میں اسے اپنے اس فرض سے سبکدوش نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس مجموعہ احکام کا ایک

ایک جزء اس کی پیدائشی غرض و غایت سے متعلق ہے اور کسی نہ کسی پہلو سے اس کی تحصیل و تکمیل لازماً مطلوب ہے۔ کسی اور تصور دین کے تحت احکام دین میں تفریق کی گنجائش ہو تو ہو لیکن قرآنی تصور دین کے تحت اس کے ایک ایک حکم کی تعمیل دینداری ہے، اللہ کی اطاعت ہے تقویٰ ہے، عبادت ہے۔ اسے نظرانداز کر کے کمال بندگی کا مقام پالینا محال ہے اور تکمیل بندگی کے لیے اسے غیر ضروری اور غیر اہم سمجھنا کفر ہے۔

قرآن نے احکام دین میں تفریق کی ممانعت کو بڑے مؤثر اور بلیغ انداز میں پیش کیا ہے مثلاً۔

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس آیت میں اطاعت کرنے کے لیے اطاعت میں داخل ہونے کی بلیغ تعبیر اختیار کی ہے۔ کسی چیز میں داخل ہو جانے کے معنے یہ ہیں کہ داخل ہونے والے کا پورا وجود اس کے اندر سما چکا ہے ہر طرف سے اس نے اسے ڈھک لیا ہے، اور اب اس کا کوئی جزء بھی اس سے باہر نہیں ہے اس لیے اسلام میں یا اللہ و رسول کی طاعت میں داخل ہو رہنے کا مطالبہ بداہتہ اس بات کا مطالبہ ہے کہ اہل ایمان کتاب و سنت کے ایک ایک حکم کی بجاآوری کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھیں۔ اور چھوٹی بڑی کوئی ہدایت بھی فراموش نہ ہونے پائے۔

ایک اور جگہ تنبیہ کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے۔

واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک

اس بات سے ہوشیار رہو کہ کہیں یہ خدا فراموش لوگ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس ہدایت کے کسی جزء کی پیروی سے نہ روک دیں جسے اللہ نے تم پر نازل کیا ہے۔

بہر حال تفریق بین اللہ و رسلہ کے منطوق، مدلول اور مفہوم میں یہ ساری باتیں داخل ہیں، یہ بھی کہ اللہ کو مانتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کو نہیں مانتے۔ یہ بھی کہ اللہ کے رسولوں میں سے کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے اور یہ بھی کہ اللہ کی بات مانتے ہیں اللہ کے رسول کی بات نہیں مانتے اور یہ بھی کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں کچھ کو مانتے اور کچھ کو نہیں مانتے۔ اور ارشاد یقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے کے زیادہ مناسب تفریق بین الرسل اور بین الاحکام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ توحید کے قائل ہیں مگر رسالت کو نہیں مانتے۔ اور جو لوگ رسالت کو مانتے ہیں مگر کسی رسول کو نہیں مانتے اور جو لوگ اللہ کی بات مانتے

ہیں مگر رسول کی بات نہیں مانتے اور بالآخر جو لوگ اپنی زندگی کی کچھ شاخوں میں اللہ اور اس کے رسول کی بات نہیں مانتے وہ سب یفرقون بین اللہ و رسلہ کا مصداق ہیں کوئی صراحۃً کوئی دلالۃً اور کوئی اشارۃً۔ اگرچہ تؤمنون ببعض وتکفرون ببعض کا قرینہ بتاتا ہے کہ مراد دو ہی قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کچھ رسولوں کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے، دوسرے وہ جو احکام کی حد تک تفریق روا رکھتے ہیں۔

قرآن نے اس غلط کار طبقہ کا چہرہ پیش کیا ہے جس نے احکام الٰہی میں تفریق کی روش اپنا رکھی تھی اور اسے ان لفظوں میں سرزنش کی ہے۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الاخزی فی الحیاۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب۔

تو کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو لہٰذا تم میں سے جو لوگ بھی ایسا کریں گے ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیوی زندگی میں ان کے لیے ذلت و خواری ہو۔ اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔

کوئی شک نہیں کہ ان آتشیں الفاظ کی حیثیت ہوش مند پیروان قرآن کے لیے ایک مستقل اور معنے خیز تنبیہ کی سی ہے جو بر آن انہیں چوکنا رکھنا چاہتی ہے کہ خبردار اس مہلک غلط فہمی غلط کاری کے قریب ہرگز نہ جانا کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بڑا خوفناک جرم ہے جس کا ارتکاب بڑے سنگین نتائج پیدا کرتا ہے اس کے معنے کتاب الٰہی کے ایک حصہ سے کفر کے ہیں، دوسرے لفظوں میں فریضہ عبادت کی ذمہ داریوں سے انکار کے بھی ہو سکتے ہیں اور اس کی پاداش آخرت میں سخت ترین عذاب اور دنیا میں دردناک ذلت و خواری کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

غرض جس طرح انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے اور خواہش سے جس نبی کا چاہے انکار کر دے اسی طرح اس کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام دین کی پیروی میں اپنے ذوق یا خواہش کے تحت کسی طرح کے امتیاز سے کام لے۔ جن احکام کو چاہے عمل کے لیے منتخب کرے اور باقی سے بے پروا ہو رہے اس طرح کی کوئی بھی تفریق ایمان کے قطعی خلاف ہے۔

سنگین فیصلہ اور اس کی وجہ

۲۲۲۔ اور ایمان و کفر کے درمیان راہ نکالنا چاہتے ہیں یہی لوگ بلاشبہ پکے کافر ہیں مطلب یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک نیا مذہب اپنے لیے نکالتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اصلی اور ٹھیٹ کافر ہیں ان کے لیے خواری اور ذلت کا عذاب تیار ہے۔ اللہ کا ماننا جب ہی معتبر ہے کہ اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے اور اس کا حکم مانے۔ بدون تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے اس کا اعتبار نہیں بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے۔ یہود نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو حق تعالیٰ کی اور تمام انبیاؑ کی تکذیب کرنے والے قرار دیے گئے اور پکے کافر سمجھے گئے۔[1]

بظاہر یہ ایک سخت فیصلہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت کا تقاضا یہی تھا کہ فیصلہ اس کے سوا کچھ اور نہ ہو اور ایک نبی کے انکار کو بھی اس سے کم تر درجے کا جرم نہ قرار دیا جائے۔ جب یہ معلوم ہے کہ خواہ کوئی بھی رسول ہو وہ اللہ سبحانہٗ ہی کی طرف سے آتا ہے اور اسی کے احکام لوگوں کو سناتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کائنات کے حقیقی فرمانروا ہی کی طرف سے مقرر کیا ہوا حاکم مجاز ہوتا ہے تو اس کا انکار دراصل اس کا انکار نہیں ہے بلکہ فرمانروائے کائنات کے حق فرماں روائی کا انکار ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے اور اس انکار و اعلان بغاوت کی موجودگی میں دوسرے انبیاؑ کا اقرار بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی حکومت کے مقرر کیے ہوئے دوسرے افسروں کو تو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کر لیا جائے اور پھر اسی حکومت کے کسی ایک افسر کو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ یہ حکومت کی اطاعت تو نہ ہوئی اپنی رائے اور خواہش کی اطاعت ہوئی۔ اس کے تو معنے یہ ہیں کہ جن افسروں کو حکومت کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کا یہ تسلیم کیا جانا بھی دراصل حکومت کے حق اطاعت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اپنے جی کی خواہش کی وجہ سے ہے اس لیے اس تسلیم و اقرار کی بھی فی الواقع کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو کسی ایک رسول کا انکار کرتے ہیں سارے رسولوں کا منکر قرار دیا ہے مثلاً قوم نوح کے بارے میں اس نے فرمایا ہے کہ جب انہوں نے ہمارے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رسولوں کو جھٹلایا تو ہم نے بھی انہیں غرق کر دیا۔ وقوم نوح لما کذبوا الرسل اغرقناھم حالانکہ از روئے واقعہ انہوں نے صرف ایک رسول حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی، باقی رسولوں کا تو ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ آپ پانچویں پارے میں یہ پڑھ آئے ہیں کہ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ جو رسول بھی آتا ہے اسی لیے آتا ہے کہ اس کی طاعت کی جائے اذنِ خداوندی کے مطابق اور یہ بھی سن آئے ہو من یطع الرسول فقد اطاع اللہ کہ جو اللہ کے رسول کی طاعت کرتا ہے در اصل اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ جب واقعہ اور حقیقت یہ ہے تو کیا اس کا کھلا اور واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی رسول کو نہ ماننا فی الواقع اذنِ خداوندی کو ٹھکرانا اور اللہ کی اطاعت کا انکار ہے۔ ایسی حالت میں ایک رسول کا انکار بھی کفر و بغاوت کا آخری درجہ کیوں نہ ہوگا۔ اور اللہ کے ایک ایک رسول کو رسول برحق ماننے بغیر ایمان کی سند کا ملنا اصول اور انصاف کی بات کیسے ہوگی؟

کافروں کے لیے اخروی سزا

۲۲۳۔ اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہاں دو باتیں غور طلب ہیں، ایک یہ کہ کافرین پر الف لام لا کر ان تمام کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی خدا کو نہ ماننے والے اور رسالت کو تسلیم نہ کرنے والے۔ یا خدا کو ماننے والے اور رسول کو نہ ماننے والے۔ یا خدا کی بات کو ماننے والے خدا کے رسول کی بات نہ ماننے والے یا خدا کے رسولوں میں سے کچھ کو ماننے والے اور کچھ کو نہ ماننے والے یا پھر اپنی زندگی کے کچھ گوشوں میں نبوت کے علم و عمل کو ماننے والے اور کچھ میں نہ ماننے والے، سب کے لیے عذاب مھین تیار کیا ہوا ہے، دوسری یہ کہ ان کے لیے عذاب تیار کرنے کی علت ان کا کفر ہے۔ اگر ان کے دامنوں میں کفر نہ ہوتا تو اللہ ان کے لیے عذاب تیار نہ کرتا۔ ذلت آمیز عذاب تیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے خیالات و نظریات کی تہ میں اصل روگ اپنی بڑائی کا ہوتا ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ بہر حال یہ لوگ سمجھتے یہی ہیں کہ ان کی عقل وحی الٰہی کے مقابلے میں زیادہ وزن دار ہے اور انبیاءؑ سے معاذ اللہ جو کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان کی تلافی یہ اپنی عقل آرائیوں سے کر دیں گے، اسی کبر و خود بینی کی سزا انہیں آخرت میں یہ ملے گی کہ علاوہ جسمانی تعذیب کے یہ مخلوق کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہوں گے۔

قانون پر معتبر ایمان

۱۵۲۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاتے اور ان میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان کے اجر دے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے یعنی اور جن لوگوں نے کسی نبی کو جدا نہیں کیا بلکہ ایمان لاتے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بڑے ثواب عطا فرمائے گا۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب نبیوں پر ایمان لاتے ہیں[1]

یہ آیت پہلی آیت کے مقابلے میں ہے مگر اس آیت میں اولئك هم المؤمنون حقاً نہیں فرمایا، صرف اجر اور ثواب کا ذکر فرمایا، وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں فقط ایمان کا ذکر ہے اور اعمال صالحہ کا ذکر نہیں ہے اور بغیر اعمال صالحہ کے مومن کامل نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے،

انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم واذا تليت عليهم آياته زادتهم ايمانا وعلى ربهم يتوكلون الذين يقيمون الصلاة ومما رزقناهم ينفقون، اولئك هم المؤمنون حقا لهم درجات عند ربهم ومغفرة ورزق كريم۔

مومنوں کی شان تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں، اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے ایک حصہ ہماری راہ میں بھی خرچ کرتے ہیں، بلاشبہ یہی لوگ سچے اور پکے مومن ہیں، ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں مرتبے ہیں، اور بخشائش، اور بڑی خوبی وعزت کی روزی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں جس ایمان کے موضوع پر کفر کے مقابلہ میں گفتگو ہو رہی ہے وہ قانونی ایمان ہے جس پر نجات موقوف ہے اور مذکورہ بالا آیت میں جن لوگوں کو ھم المومنون حقاً کہا ہے وہ صفات فاضلہ والے اہل کمال ہیں۔ تقابل مطالعہ کرتے ہوتے یعنی ایمان کا کفر سے مقابلہ کرتے ہوتے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کو اپنا واحد معبود اور مالک تسلیم کر لیں اور اس کے بھیجے ہوتے تمام رسولوں کی نبوت کو مان لیں، صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں وہ جس درجہ کا عمل صالح کریں گے اسی درجہ کا اجر پائیں گے، رہے وہ لوگ جنہوں نے خدا کی لاشریک الوہیت و ربوبیت ہی کو تسلیم نہیں کیا یا جنہوں نے خدا کے نمائندوں میں سے بعض کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے کا طرز عمل اختیار کیا تو ان کے لیے کسی عمل پر کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے [1]

قرآن کی اس آیت سے جس سے ایمان کا یہ قانونی موقف معلوم ہوا ہے کہ تمام انبیاء کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے، سب خدا کی سچائی کے پیامبر تھے، سب نے ایک ہی قانون و اصل کی تعلیم دی ہے۔ پہلی آیت میں اہل کتاب کو ان کے جس طرز عمل کی بنا پر الکافرون حقاً کہا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ جہاں دوسرے کو اللہ کے رسول مانتے تھے، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے حالانکہ جس طرح اللہ کے رسول وہ حضرات تھے اسی طرح آپ بھی تھے۔ پھر یہی چیز ہے جس کو ایمان و کفر کے درمیان کی راہ بتایا ہے کیونکہ دوسرے انبیاء کو مان کر اگر وہ ایمان باللہ کے تقاضے پورے کرتے نظر آ رہے تھے تو رسالت محمدی کا انکار کر کے اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کو وہ ٹھکرا بھی رہے تھے۔ پھر اسی رویہ کو اللہ و رسول کا کفر کرنا بھی کہا گیا، کیونکہ خدا کے کسی رسول کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا دراصل نہ خدا کو ماننا ہے نہ کسی رسول کو ماننا ہے بلکہ محض اپنی خواہش نفس کو ماننا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وحدتِ ادیان کا نظریہ لغو اور مہمل ہے۔ اس نظریہ کا فلسفہ یہ ہے کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ کسی اور چیز کو اپنانا کیوں ضروری ہو، وہ اپنی جگہ حق یہ اپنی جگہ حق۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فلسفہ کو اللہ تعالیٰ یفرقون بین اللہ ورسلہ فرما کر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ

---

[1] تفہیم القرآن

اسے صاف طور سے کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے اور انہیں یہ بھی حق وہ بھی حق کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر ٹھہراتا ہے۔

بہرحال اس موضوع پر جہاں تک قرآن فیصلہ کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں وحدت ادیان کے نظریہ کو باطل قرار دے کر نبوت محمدیہ کی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرط نجات قرار دیتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جسے آپ کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو یہ بات خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے معلوم ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی

لا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان

من اصحاب النار۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت میں سے جس کسی شخص تک مثلاً یہودی یا نصرانی میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہو گیا۔

(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

اس میں لا یسمع بی کی قید لگا کر آپ نے یہ بات واضح فرما دی کہ جس شخص تک آپ کا پیغام نہیں پہنچا ہے وہ مستثنیٰ ہے کیونکہ اس صورت میں وہ معذور ہو گا اور جب تک ایک شخص فی الواقع معذور ہو اور اس کے پاس امر حق پہنچا ہی نہ ہو اس وقت تک اس پر اس کی پیروی کی ذمہ داری ڈالنا اور اسے اس بارے میں جواب دہ قرار دینا یقیناً بے انصافی ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اسے نہ مانیں ان کا پکڑا جانا کسی طرح بے انصافی نہیں ہے بے انصافی اگر ہے تو یہ کہ انہیں نہ پکڑا جائے کیونکہ ان کا نہ ماننا کسی چھوٹی بات اور کسی معمولی حق کا نہ ماننا نہیں ہے بلکہ دنیا کی سب سے بڑی بات اور سب سے بڑے حق کا نہ ماننا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق فرماں روائی کا نہ ماننا ہے۔ اس لیے یہ کھلی ہوئی دھاندلی ہو گی کہ ایسے لوگوں کے پکڑے جانے کو انصاف اور معقولیت کے خلاف سمجھا جائے۔ دنیا کسی ایسے حکمران کا تصور تک نہیں کر سکتی جس نے اپنی رعایا کو اس بات کی کھلی چھٹی دی ہو کہ وہ اس کے فرمانوں کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق سلوک کرے چاہے تو اس کے موجودہ گورنروں اور رائج الوقت قانونوں کو تسلیم کرے اور چاہے تو رد کرے اور ان کے بجائے اس کے ریٹائر ہونے والے گورنروں اور منسوخ شدہ

قوامین کرمانتی ہے۔ پھر کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ ایسے لوتصور کو اس حکمران کی طرف منسوب کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا جائے جو سارے حکمرانوں کا حکمران اور پوری کائنات کا حقیقی فرماں روا ہے! آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اپنے جن پیغمبروں کا دور ختم کر دیا اور اپنی جن شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ ان ہی کی اطاعت اور پیروی پر اصرار کرنے والوں کو وہ اپنا وفادار اور فرمانبردار بندہ تسلیم کرتا ہے اور اپنے اس پیغمبر کی اطاعت اور اپنی اس شریعت کی پیروی سے انکار کے باوجود انہیں بغاوت کی سزا نہ دے جسے وہ اس دور کے لیے اپنا جہانی اور ابدی پیغمبر اور اپنی عالمگیر شریعت قرار دے چکا ہے۔ یہ عجیب بندگی اور فرمانبرداری ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی پرستش اور اطاعت و رضا طلبی کے لیے فریدکو اپنا ہادی بنانے کا حکم دے مگر آپ کہیں نہیں ہم تو اس غرض کے لیے وحید کا دامن پکڑے رہیں گے۔ اس کی یہ روش کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔

بہرحال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے لیے نبوت کی تصدیق ضروری ہے تیسرے یہ کہ تمام نبیوں اور رسولوں کی واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت ہے یعنی خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا اللہ کا دین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ قرآن ہی میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہا گیا ہے فان اسلموا فقد اهتدوا اگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو انہوں نے سیدھی راہ پالی۔ اور البقرہ میں ہے فان امنوا بمثل ما امنتم به فقد اهتدوا اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لے آئے تو انہوں نے سیدھی راہ پالی۔ اس سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت کا مدار ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جن آیتوں میں ایمان و عمل صالح پر خوف و غم نہ ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے ان میں ایمان سے مقصود توحید کامل ہے اور اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ کیا خود مسلمان اس اسلام کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ کے ذریعے سے دنیا میں آئی ہے۔ یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی و عیسائی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کا پیروی کا مدعی ہو لم یفرقوا بين احد منهم کا یہی مقصود ہے۔

وحدتِ ادیان کا غلط تصور

قرآن کی اس آیت میں لم یفرقوا بین الله و رسله کا صریح اعلان جیسے دین کی وحدت کو تباہ

ہے ایسے ہی یہ وحدت ادیان کی بھی مکمل تردید کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اب صرف محمد رسول اللہ کی پیروی کو برحق اور شرط نجات تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرے آسمانی مذاہب بھی حق اور عنداللہ مقبول اور ذریعہ نجات تھے مگر اس وقت ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو باطل کی آمیزشوں سے یکسر پاک ہو۔ اور اللہ کے حضور اب بھی قابل قبول اور ذریعہ نجات ہو۔ اس کے باوجود کہنے والے کہتے ہیں کہ سارے مذاہب آج بھی یکساں حق ہیں کیونکہ سب خدا ہی کی پرستش کی تلقین کرنے والے اور اس کی بارگاہ تک پہنچانے والے ہیں۔ اسی طرح بنیادی اصول اور سچائیاں سب مشترک ہیں، فرق جو کچھ ہے وہ الفاظ اصطلاحات کا ہے یا زیادہ سے زیادہ رسوم وظواہر کا اور یہ چیزیں ہرگز مدار حقانیت نہیں ہیں (معاذ اللہ)

اس نظریے کے علمبردار جاہلے دنیادار اور دیندار دونوں ہی قسم کے لوگ ہیں۔ دنیادار تو یہ نظریہ اپنے آخری مفہوم تک اپنا چکے ہیں۔ لیکن اس کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ دہلی کے ایک مغل بادشاہ اکبر نے کفر واسلام کو ملا کر ایک دین الٰہی ایجاد کیا تھا اور پھر تین پشتوں کے بعد ایک اور شہزادہ داراشکوہ نے بھی کچھ اسی قسم کی کوشش شروع کی تھی اور بعض ملحد طبع ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد ہندوستان میں بھی شرک و توحید اور اسلام و کفر کو مخلوط کر کے قسم قسم کے خوشنما ناموں کے ساتھ ایک نئے دین کی اختراع کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے تو اس کے اسیر اور قتیل ہر جگہ موجود ہیں۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً اس کا سیاسی عنصر تیزی سے اس نظریہ کو قبول کر رہا ہے۔ ان کے صحافی، ان کے لیڈر کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی کھلم کھلا اس کا درس دینے لگے ہیں۔ گیتا اور گرنتھ کا تو پتہ نہیں مگر قرآن کا یہ نظریہ ہرگز نہیں ہے۔ قرآن وحدت دین کا تو یقیناً قائل ہے مگر وہ وحدت ادیان کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے ہی کو حق اور واجب الاتباع قرار دیتا ہے۔ یہ تو اس موضوع پر دنیاداروں کا حال ہے باقی رہے دیندار لوگ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وحدت ادیان کے بارے میں ان کا تصور کیا رہا ہے لیکن ان حضرات کے کلام سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ حضرات اس نظریے کے اثر سے بالکل محفوظ رہے ہیں۔ آخر ہماری دینی ادبیات میں جو اس قسم کے اشعار بھرے پڑے ہیں انہیں کس ذہنیت کا مظہر فکر کہا جائے گا۔

کفر و اسلام در رہت پویاں
وحدہ لاشریک لہ گویاں

یا

ہر کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست
ہر جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

یا

بازیچۂ کفر و دین بطلاں بسپار
بگذر ز مقامے کہ خدا ہم حرفیست

یا

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں چرا است
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

یا

اگر کافر ز بت آگاہ گشتے
یکے از سالکان راہ گشتے

یا

مسلمان گر بدانستے کہ بت چیست
یقین کردے کہ دیں در بت پرستیست

ان جیسے اشعار کو محض ہفوات نہ سمجھئے کیونکہ یہ اچھے خاصے بزرگوں کے فرمائے ہوئے ہیں جو ایک خاص دینی فلسفہ کے ترجمان ہیں۔ اچھا مان لیجئے کہ یہ شاعرانہ مبالغے ہیں جو شعر و شاعری کے باب میں نظرانداز کر دینے کے لائق ہیں مگر اس طرح کے سنجیدہ ارشادات کے کیا معنے ہوں گے اور انہیں کیا کہہ کر نظرانداز کیا جائے گا۔

حق یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت کی آواز ساری دنیا میں گونج رہی ہے۔

گیتا ہندوستان کا قرآن ہے اور قرآن عرب کی گیتا،

یہ قول غوث اللہ شاہ قلندر قادری کی طرف منسوب ہے اور اسے وحدتِ ادیان کے ایک ممتاز مبلغ پنڈت سندر لال نے اپنی کتاب گیتا اور قرآن کے سرورق لکھا ہے۔ اور اس طرح گویا انہوں نے اپنے نظریہ کے برحق ہونے پر ایک مسلمان بزرگ کا یہ قول دلیل اول کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

بہرحال قرآنی تصورِ دین کی رو سے وحدتِ ادیان کا نظریہ سرتاسر باطل ہے اور اس آیتِ قرآنی کے قطعاً خلاف ہے۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى
سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ
وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِى
السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ فَبِمَا نَقْضِهِمْ
مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا
بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ
عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ

مِّنۡهُ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ
يَقِيۡنًا ۝ بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ۝
وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَ
يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ۝

اے پیغمبر! اہل کتاب آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آسمان سے کوئی کتاب ان پر نازل کرا دو[225]۔ بلاشبہ وہ اس سے بڑی فرمائش حضرت موسیٰ سے کر چکے ہیں، انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھلا دو تو ان کی شرارت کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے ان کو آ پکڑا[226]۔ پھر واضح دلائل آنے کے باوجود انہوں نے گوسالہ پرستی کو اختیار کر لیا، ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو واضح اقتدار دیا تھا[227]۔ اور ہم نے ان پر کوہ طور بلند کر کے ان سے عہد لیا تھا[228]۔ اور ہم

نے ان کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو[۲۲۹]- اور یہ بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ سبت کے دن کے بارے میں قانون کی حد بندی نہ توڑو اور ہم نے ان سے پکا عہد لیا تھا[۲۳۰] - پھر ان کی عہد شکنیوں کی وجہ سے اور اللہ کی آیات کا کفر کرنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے، نیز اس بنا پر کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ معدودے چند آدمیوں کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں[۲۳۱] نیز ان کے کافرانہ طرز عمل اور حضرت مریم پر بہتان طرازی کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے[۲۳۲] - حالانکہ انہوں نے نہ حضرت مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا

بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حقیقتِ حال ان پر مشتبہ ہو گئی[۲۲۳]۔ اور

بلاشبہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ

شک و شبہ میں پڑے ہوتے ہیں، ظن و گمان کے سوا

ان کے پاس کوئی علم و بصیرت نہیں ہے[۲۲۴]۔ اور یقیناً

انہوں نے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ نے

ان کو اپنی طرف اٹھا لیا ہے، اللہ سب پر غالب اور اپنے

کاموں میں حکمت والا ہے[۲۲۵]۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی

نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے

اور قیامت کے روز وہ ان پر شہادت دینے والا ہوگا[۲۲۶]۔

یہودیوں پر فردِ قرار دادِ جرائم

یہاں سے بیان کا رُخ یہودیوں کی طرف پھر رہا ہے کیونکہ مدینہ کے منافقوں میں زیادہ تر یہودی تھے۔ یہودی کہتے تھے کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو ان پر آسمان سے ایک کتاب اس طرح کیوں نازل نہیں ہوتی کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اس پر ان کو تنبیہ ہے اور تنبیہ بھی اتنی سخت ہے کہ لفظ لفظ جوشِ غضب میں ڈوبا ہوا ہے۔ پوری تقریر از اول تا آخر فردِ قرارداد

جرائم پر مشتمل ہے۔

اس پورے رکوع میں بلاغت کا یہ اسلوب قابل توجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنا دی گئی ہے لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی ہے کہ اس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے۔ جرائم کی فہرست میں ایک جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ان کے جرائم کی داستان شروع ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملہ معترضہ آگیا ہے۔ اور اس کے خاتمہ پر فہرست جرائم شروع ہو گئی۔ یہ انداز بیان متکلم کے زور بیان، سامع کی ذہانت، دعوے کی قوت اور فیصلہ کے دلیل سے بے نیاز ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ عرب خطبات میں اس کی شاندار مثالیں موجود ہیں۔ اس انداز کے پر زور کلام کو ایک صاحب ذوق سامع تو سمجھ سکتا ہے لیکن اس کے زور اور اس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔

مقصود یہ ہے کہ یہود آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے کتاب اتارو کہ وہ اس کا اترتے ہوتے مشاہدہ کریں۔ ان کا یہ مطالبہ ان کی تاریخ کے طالب علم کے لیے تعجب خیز نہیں ہے۔ یہ جن اسلاف کے خلف ہیں وہ اپنے پیغمبر سے اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر چکے ہیں۔ جن کی تاریخ یہ ہے، جن کا قولی مزاج یہ ہے ان سے کس خیر کی امید کی جا سکتی ہے ان کے ان مسلسل جرائم کی وجہ سے جن کا سلسلہ اسلاف سے لے کر اخلاف تک کہیں ٹوٹا ہوا نہیں ہے۔ خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے اب کوئی معجزہ بھی ان کو دکھا دو، ایمان کی سعادت ان کو نصیب نہ ہوگی۔ یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے رہے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہیں گے۔ جو طالب حق ہوتا ہے وہ کبھی ایسی فرمائشیں نہیں کرتا بلکہ یہ بات دیکھتا ہے کہ جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ کیسی ہے اور جو تعلیم دینے والا ہے اس کا حال کیسا ہے؟

۲۲۵۔ اے پیغمبر! اہل کتاب آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آسمان سے کوئی کتاب ان پر نازل کرا دو۔ یہودیوں کے چند سردار آپ کی خدمت میں آتے اور کہا کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایک کتاب لکھی لکھائی یکبارگی آسمان سے لا دو۔ جیسے حضرت موسیٰ توریت لائے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1] مطلب یہ ہے کہ مدینے کے یہودی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عجیب و غریب مطالبے کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اُس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ لا جائے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں ان پر ایمان لاؤ۔ ؎

حافظ ابن جریر نے سدی، محمد بن کعب القرظی، اور قتادہ کے حوالہ سے ان فرمائش کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے یہ ہے کہ سدی کہتے ہیں کہ یہود نے یہ درخواست پیش کی کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو حضرت موسیٰ کی طرح لکھی ہوئی کتاب آسمان سے لائیے۔ محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا مطالبہ تھا کہ جیسے حضرت موسیٰ اللہ کی جانب سے تختیاں لے کر آئے تھے آپ بھی اللہ کی جانب سے تختیاں لائیے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ان کی طلب یہ تھی کہ خصوصی کتاب آسمان سے اتاری جائے۔ اور ابن جریج کہتے ہیں ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم آپ کی دعوت کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک آپ فلاں فلاں کے نام اللہ کی جانب سے یہ خط لے کر نہ آئیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ بات خواہ کچھ ہو اتنی بات صاف ہے کہ یہودیوں نے سوال کیا تھا اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ سوال کرنے والے عوام نہیں بلکہ ان کے علماء ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لو آمن بی عشرۃ من الیھود لآمن بی الیھود یعنی اگر مجھ پر دس یہودی ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔ وہ خود ایمان نہ لاتے تھے اور اس قسم کے سوالات کر کے عام مسلمانوں میں بے چینی پیدا کرتے تھے۔ مسند احمد کی روایت میں اس کی توضیح آئی ہے کہ دس یہود سے مراد یہودی علماء ہیں۔ چنانچہ الفاظ یہ ہیں۔ لو آمن عشرۃ من احبار الیھود اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے علماء تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے رؤساء یہود میں سے مشاہیر کے حسب ذیل نام لکھے ہیں۔

عبداللہ ابن سلام، ابو یاسر بن اخطب، حی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی الحقیق، عبداللہ بن ضیف، فنحاص، رفاعہ بن زید، زبیر بن باطیا، کعب بن اسد، شمویل بن زید۔

اس سلسلے میں کعب اور ابو ہریرہ کی روایت میں یہ اختلاف ہے کہ حضور انور صلی اللہ

تفہیم القرآن

علیہ وسلم نے علماء یہود میں دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا ، کعب کا رجحان بارہ کی جانب ہے جب کہ ابوہریرہ دس بتاتے ہیں ۔ یحییٰ بن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں ہو سکتا ہے کہ کعب نے پورا عدد ذکر کیا ہو اور ابوہریرہ نے صرف ان کا ذکر کیا ہو جو حلقہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تھے ۔ عبداللہ بن سلام اور مخیریق اسلام قبول کر چکے تھے ۔ بہرحال خلاصہ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار کلمۂ اسلام قبول کر لیتے تو جو یہود ان کو ارباب کہتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لیے ان کے علماء کو بھی بہت کم اسلام کی توفیق ہوئی ۔ اسی فطری شقاوت کی وجہ سے انہوں نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا ، ان کو تکلیفیں دیں ۔ حضرت موسیٰ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو ۔

بہرحال یہود نے از راہ تعنت حضور انور سے یہ سوال کیا ۔ ان کا مقصد طلب حقیقت نہیں بلکہ وہ از راہ شرارت ایسا کر رہے تھے ۔

بے باکی و سرکشی کی سنگین سزا

۲۲۶ ۔ بلاشبہ وہ اس سے بڑی فرمائش حضرت موسیٰ سے کر چکے ہیں ۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دیجیے تو ان کی شرارت کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے ان کو آ پکڑا ۔ اس تمام رکوع میں الزامات کو ان کے جواب میں ذکر فرمایا ہے ۔ اس کے بعد تحقیقی جواب دیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہودی جو تم سے عناداً ایسی کتاب طلب کرتے ہیں ان کی یہ بے باکی اور سرکشی تعجب کی بات نہیں ہے ان کے بزرگوں نے اس سے بھی بڑی اور سخت بات اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے طلب کی تھی کہ خداوند تعالیٰ کو آشکارا ہم کو دکھا دو ورنہ ہم تمہارا یقین نہ کریں گے جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزرا ۔ اس پر یہ ہوا کہ ان کہنے والوں پر بجلی آن پڑی اور سب مر گئے ۔ پھر حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی دعا سے ان کو زندہ کر دیا ۔[1]

یہاں واقعہ کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست کی طرف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اشارہ مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں۔
خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں نے آپ سے صرف یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو اور انھوں نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارا اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ دراصل بنی اسرائیل شک کے لیے بیمار تھے کہ انہیں کسی طرح یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ اللہ سبحانہٗ تمہیں یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ جب تم سے خدا کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم بھی اسے آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے بغیر ہم تمہاری بات کی صحت کیسے مان لیں۔

یہود کے مطالبہ اور حضرت موسیٰ کے شوق میں فرق

یہود نے دیدارِ الٰہی کا مطالبہ کیا اور حضرت موسیٰ نے دیدارِ الٰہی کا شوق ظاہر کیا۔ لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس بات میں کہ یہ خواہش شرحِ صدر اور اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے ہو اور اس بات میں کہ اس کو انکار و تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیکھنا چاہا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے تاکہ دعوت کے بارے میں ان کو پورا پورا شرحِ صدر اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ اسی لیے اللہ سبحانہٗ نے رَبِّ اَرِنِیْ کی درخواست پر حضرت موسیٰ کو ملامت نہیں کی بلکہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میرے جمال کا نظارہ نہیں کر سکتے صرف میری صفات ہی کو دیکھ سکتے ہو۔

اس کے برعکس یہود کا مطالبہ دید محض ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان پر عتاب ہوا۔

یہودیوں کی جانب سے سوال حضور انور سے کتاب کا ہو یا حضرت موسیٰ سے اللہ کی دید کا ہو دونوں کا منشا جہالت اور عناد ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ حضور انور سے آسمانی کتاب کے لیے نزول کی درخواست یا تو اس لیے ہے کہ وہ نبوت و رسالت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اور ان کو انبیاء کے معجزات اور دوسرے عجیب و غریب امور کے درمیان فرق تمیز ہی معلوم نہیں ہے۔ یہ خلافِ واقعہ ہے ان کو نبوت و رسالت کی حقیقت بھی معلوم

ہے اور ان کی کتابوں نے یہ بات ان کے سامنے وضاحت سے پیش کر دی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا یہ سوال جہالت پر مبنی ہے۔

یا ان کے پیش نظر عناد کی وجہ سے صرف نبوت کو عاجز کرنا اور لاجواب کرنا ہے۔ وجہ خواہ کچھ ہو ان کے سوال میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ سے دیدار الٰہی کے مطالبہ کی پاداش میں ان پر عتاب ہوا عتاب کا ذکر البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہاں بھی فلفظ تھم الصاعقۃ بظلمھم کہہ کر اسے بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل الاعراف میں آ رہی ہے۔

گوسالہ پرستی کا جرم

۲۲۷۔ پھر واضح دلائل آنے کے باوجود انھوں نے گوسالہ پرستی کو اختیار کر لیا ہم نے اس سے بھی درگزر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو واضح غلبہ دیا تھا۔ یعنی ایسی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر پھر یہ کیا کہ بچھڑے کو پوجنے لگے۔ بالآخر حق تعالیٰ نے اس سے بھی درگزر فرمائی۔ واقعہ سورہ بقرہ میں کسی قدر تفصیل سے گزر چکا ہے۔[1]

واضح دلائل سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مشاہدے میں آچکی تھیں ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا وہ کوئی گائے کا بچہ نہ تھا بلکہ اللہ رب العالمین تھا مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جھکی تو اپنے محسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مورت ہی کے آگے جھکی۔[1] مطلب یہ ہے کہ انھوں نے باوجود اس قدر انعامات کے منعم سے تعلق توڑ کر بچھڑے کی مورتی سے عابدانہ تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ کتاب خروج باب ۳۲ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں لیکن یہود نے اپنی عادت کے مطابق اس میں حضرت ہارون کو بھی ملوث کر لیا ہے جس کی قرآن نے دوسرے موقع پر تردید کی ہے۔

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر کی تو وہ ہارون

---

[1] افادات شیخ الاسلام ؒ تفہیم القرآن

کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا ہے کیا ہو گیا۔۔۔ تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو مصر سے نکال لایا بگڑ گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے۔ انہوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا ہے اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو گردن کش دیکھتا ہوں اس لیے تو مجھے چھوڑ دے کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں ان کو بھسم کر دوں۔

(باب ۳۲ آیات ۱-۷)

ارتداد کی سزا

اس کے بعد ارشاد ہے فعفونا عن ذالک ہم نے اسے معاف کر دیا۔ اس معافی اور درگزر کی تفصیل البقرہ میں گزر چکی ہے وہاں بتایا جا چکا ہے کہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کا جرم کیا تھا ان کے بارے میں حکم ہوا تھا کہ فاقتلوا انفسکم اس کے معنے یہ نہیں کہ اپنی تلواریں اپنی گردنوں پر چلا دو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنۂ شرک اور گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں۔ اپنے قبیلہ میں سے ان لوگوں کی گردنیں ماردیں جنہوں نے قوم کے لیے اس فتنۂ ارتداد کی راہ کھول ہے۔ یہ حکم دینے میں چند مصلحتیں تھیں۔

اول یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کر لی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ دیا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحید کی اہانت کی تھی۔

دوم یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پورے طور پر واضح ہو گئی گویا شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے دایاں ہاتھ کا فرض ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ دے۔

سوم یہ کہ ہر قبیلہ اور ہر خاندان کے اچھے لوگ اگر اپنے اپنے قبیلوں کے برے افراد پر تلوار اٹھائیں گے تو اس سے خاندانی عصبیت ختم ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی قریب قریب یہی بات نکلتی ہے چنانچہ تورات کی کتاب خروج میں ہے

جب حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہوگئے کیونکہ ہارون نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کرایا تو موسیٰ نے لشکرگاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف ہے وہ میرے پاس آجائے تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوگئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکرگاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں تین ہزار مرد کھپ آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔ (باب ۳۲)

اگرچہ تورات کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے مرتدوں کے قتل کے کام پر بنی لاوی کو مقرر کیا تھا لیکن عبادت کا آخری حصہ ہمارے موقف کی تائید کر رہا ہے کہ ہر قبیلہ کے موحدین یہ کام کریں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو اور لوگ سبق حاصل کریں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت میں ارتداد فوجداری کا ایک سنگین جرم تھا مستوجب قتل، جیسا کہ ارتداد کی سزا شریعت اسلامیہ میں بھی قتل ہے۔

آخر میں فرمایا واتینا موسیٰ سلطاناً مبیناً ہم نے موسیٰ کو واضح اقتدار دیا تھا۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں اور دیا ہم نے موسیٰ کو غلبہ صریح۔

یہ اقتدار و غلبہ کیا ہے؟ شیخ الاسلام فرماتے ہیں، غلبہ یہ کہ حضرت موسیٰ نے اس بچھڑے کو توڑ کر کے آگ میں جلا دیا اور اس کی راکھ ہوا میں دریا پر اڑا دی اور ستر ہزار آدمی بچھڑے کو سجدہ کرنے والے قتل کیے گئے۔ [1]

بچھڑے کے موضوع پر تفصیلی مباحث سولہویں پارے میں آرہے ہیں باقی مقتولین کی تعداد تو مفسرین قرآن نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے اور حضرت علی کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر دفتر حدیث میں ایک حرف منقول

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے۔ تورات نے تصریح کی ہے کہ مقتولین کی تعداد تین ہزار تھی۔ تاہم ہمارا مفسر قرآن جو واقعہ پیش کر رہا ہے اس کی عبرت تعداد پر نہیں بلکہ فعل پر ہے۔ اور مولانا آزاد فرماتے ہیں اور موسیٰ کو قیام حق و شریعت میں ظاہر و واضح اقتدار دیا۔ ہمارے نزدیک میں سلطان مبین سے یہاں دبدبہ، غلبہ اور اقتدار مراد ہے۔ اور اس فقرے کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن میں اتارنا چاہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے گوسالہ پرستی کے سنگین جرم پر ایکشن لیا اور ان کو سزا دی۔ علامہ آلوسی نے اسی کو اولیت کا درجہ دیا ہے۔ اگرچہ حافظ ابن جریر نے یہاں سلطان مبین سے معجزات مراد لیے ہیں۔

کوہ طور کے سایے میں عہد

۲۲۸۔ اور ہم نے کوہ طور کو بلند کر کے ان سے عہد لیا تھا یعنی جب یہود نے کہا تھا کہ تورات کے حکم سخت ہیں ہم نہیں مانتے تو اس وقت کوہ طور کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق قائم کر دیا تھا کہ ان حکموں کو قبول کرو اور مضبوطی سے پکڑو ورنہ پہاڑ ڈالا جاتا ہے[1] موثق اور میثاق کے معنے عہد و پیمان کے ہیں۔ اس لفظ کی روح وثوق اور استحکام ہے۔ اس وجہ سے یہ خاص طور پر اس عہد و پیمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اہم معاملہ کے لیے پورے شعور اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ اظہار و اقرار کیا گیا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کی پابندی کا لیا گیا۔ اللہ کی شریعت خود خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو میثاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس معاہدے کا قرآن حکیم اور تورات دونوں میں ذکر ہے کہ بنی اسرائیل کے سرداروں سے کوہ طور کے نیچے عہد لیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ اگر زلزلے کے وقت آدمی کسی اونچی دیوار کے زیر سایہ یا پہاڑ کے دامن میں ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہاڑ یا دیوار سائبان کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں اور اوپر گرا چاہتے ہیں اس حالت کو قرآن نے پہاڑ کو ان کے سروں پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فاتحانہ سرشاریاں اور ان کا علاج

۲۲۹۔ اور ہم نے ان کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ یہود کو حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخل ہو سجدہ کر کے اور سر جھکائے ہوئے۔ انہوں نے سجدے کے بدلے سرین پر سرکنا اور پھسلنا شروع کیا۔ جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا، دوپہر میں قریب ستر ہزار مر گئے۔ [1]

یہاں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔ اس فقرے میں جس واقعہ کا ذکر ہے اس پر تفصیلی تبصرہ پہلی جلد میں ہو چکا ہے وہاں مطالعہ کیا جائے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ باب سے مراد شہر کا پھاٹک ہے۔ قدیم شہروں کے اردگرد ایک بلند چہار دیواری شہر پناہ کے نام سے موسوم ہوتی تھی۔ شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ سے گزرنا ہوتا تھا۔ سجداً یہاں اپنے لغوی معنے میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ۔ سجدہ نماز کی ہیئت مخصوص مراد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شہر کے دروازے میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ داخل نہ ہوں بلکہ عاجزانہ اور سرافگندہ ہو کر داخل ہوں۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی و شادابی سے پوری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں لیکن شہر میں داخل ہونے کے وقت خدا کا شکر کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔ لیکن جس طرح انہوں نے ہر نعمت کی ناقدری اور ہر ہدایت کی خلاف ورزی کی، اسی طرح اس نعمت اور اس ہدایت کی بھی ناقدری کی جیسے ان کو سجداً کے ذریعے کردار کا پیمانہ بتایا تھا ویسا ہی حطۃ کے ذریعے گفتار کا پیمانہ بھی ان کے لیے مقرر کیا تھا۔ حطۃ کا لفظ ایک پورا جملہ ہے اس کا مبتدا محذوف ہے۔ زمخشری نے اس کی وضاحت یوں کی ہے مسئلتنا حطۃ ہماری مانگ حطۃ ہے حطۃ حط سے ہے اس کے معنے جھاڑ دینے کے ہیں یہاں اس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبری دونوں کے قریب المآخذ ہونے کی وجہ سے کچھ بزرگوں نے یہ گمان کر

---

[1] از دعوت شیخ الاسلام

لیا ہے کہ یہ مادہ جھاڑ لینے اور بخش دینے کے مفہوم میں عبری میں بھی استعمال ہوا ہے اور یہ ان کے ہاں استغفار اور توبہ کے کلمات میں سے تھا۔ وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا ہے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ دعا کے لیے گفتار کا جو پیمانہ ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کو انہوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل دیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں الفاظ کی تبدیلی مراد نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ ابو مسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی کی طرف اشارا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ بنی اسرائیل کے بدبختوں نے حطہ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف مفہوم والے لفظ سے بدل لیا تھا۔

نقضِ عہد کی ایک مثال

۲۳۰۔ اور یہ بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ سبت کے دن کے بارے میں قانون کی حد بندی نہ توڑنا اور ہم نے ان سے پکا عہد لیا تھا۔ یہودیوں کو حکم تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں اور سب دنوں سے زیادہ ہفتہ ہی کے دن مچھلیاں دریا میں بکثرت نظر آتیں۔ یہودیوں نے یہ حیلہ کیا کہ دریا کے پاس حوض بناتے۔ ہفتہ کے دن جب مچھلیاں دریا سے حوضوں میں آتیں تو ان کو بند رکھتے پھر دوسرے روز حوضوں میں سے شکار کرتے۔ اس فریب اور عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بندر بنا دیا جو جانوروں میں بہت خسیس اور مکار ہے۔[1]

اصحاب سبت کا ذکر پہلی جلد میں گزر چکا ہے اور مفصل زیرِ جلد سورہ اعراف میں آنا ہے۔ سبت کی حرمت کے متعلق موسوی قانون میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایات تھیں۔

پھر خداوند نے موسیٰ سے ہمکلام ہو کر کہا کہ تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لیے کہ یہ میرے اور تمہارے قرنوں میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ میں خداوند تمہارا پاک کرنے والا ہوں، پس تم سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے۔ چھ دن کام کرنا لیکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ساتواں دن آرام کے لیے ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے پس بنی اسرائیل سبت کو مانیں اور نسل در نسل اپنی پشت در پشت عہد ابدی جان کر اس میں آرام کریں۔ میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے۔

(خروج باب ۳۱ آیات ۱۲-۱۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا۔ اور اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے تھے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے یہ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادت الٰہی میں صرف کرتے۔ قدرتی طور پر مچھلیاں چند روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی اللہ سبحانہ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوت ایمانی کا امتحان لیا۔ حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا۔ اور چھٹے دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام و نشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے آتیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں ہی سے باسانی گرفت میں آجاتیں۔

کچھ عرصہ تک تو یہودی اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے آخر زچ ہو گئے اور ان میں سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کیے کہ جس سے یہ ظاہر ہی نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

پھر تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جاتے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے ان میں آجاتیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو اتوار کی صبح کو ان مچھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال لیتے۔

اور کچھ یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے ڈال دیتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے۔ چنانچہ جب ان کے علمائے حق اور مخلصین امت نے ان کو ان کی اس حرکت سے روکا تو انہوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ سبت کے روز شکار نہ کرو لہٰذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ

تورات کے رد و بدل کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کچھ روپی جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتے کہ ہماری یہ ترکیب خدا کے ہاں ضرور چل جائے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ رو دین کے احکام پر صداقت کے ساتھ عمل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ قرآن نے ان کے اسی کردار کو یہاں عدوان فی السبت کہا ہے۔

یہودیوں سے میثاق کی کہانی

آخر میں ارشاد ہوا ہے واخذنا منھم میثاقاً غلیظاً ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا تھا۔ یعنی اس بات کا عہد لیا تھا کہ تورات کو اپنانا ہے اس پر عمل کرنا۔ اس میں بیان کردہ حدود الٰہی کو قائم کرنا ہے۔ تاریخ میں اگرچہ ایک سے زیادہ مواثیق کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں موقعہ و محل کی مناسبت سے میثاق سے مراد تورات پر عمل کا عہد ہے اور تورات کے مشتملات کو ماننے اور قبول کرنے کا میثاق ہے۔ اسی میں حضرت عیسیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری بھی داخل ہے۔ آج جو تورات موجود ہے اس میں حضرت موسیٰ کی پانچویں کتاب جو استثنا کے نام سے موسوم ہے اس فصل ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۳۱ اور ۳۲ میں ہمیں اس عہد و میثاق کے آثار ملتے ہیں۔

(۱) فصل ۲۹ کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے۔

یہ اس عہد کی باتیں ہیں جو خداوند نے موسیٰ کو حکم دیا کہ موآب کی سرزمین میں بنی اسرائیل سے باندھے۔ اس عہد کے سوا جو اس نے ان کے ساتھ حورب میں باندھا تھا۔ (استثنا باب ۲۹ آیت ۱)

اس کے بعد آیت نمبر ۱۴ میں ہے:

اور میں فقط تمہارے ساتھ ہی یہ عہد اور قسم نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ جو آج کے دن خداوند ہمارے خدا کے آگے یہاں موجود ہے۔

اس کے بعد باب ۳۱ کے آخر میں ہے:

اور ایسا ہوا کہ جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور وہ تمام ہوئیں تو موسیٰ نے لاویوں کو جو خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھاتے تھے فرمایا کہ اس شریعت کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو تاکہ وہ تمہارے برخلاف گواہ رہے۔ کیونکہ میں تیری بغاوت اور تیری گردن کشی

کو جانتا ہوں۔ دیکھو ہنوز کہ میں جیسا اور آج کے دن تک تمہارے ساتھ ہوں تم نے خداوند سے بغاوت کی ہے تو میرے مرنے کے بعد کتنا زیادہ کرو گے۔ اپنے فرقوں کے سارے بزرگوں اور منصب داروں کو مجھ پاس جمع کرو تاکہ میں یہ باتیں ان کے کانوں تک پہنچاؤں اور آسمان اور زمین کو درمیان لاکے ان پر گواہ کروں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تم اپنی تئیں خراب کرو گے اور اس راہ سے جس کی بابت میں نے تم کو حکم دیا تھا۔ پھر جاؤ گے اور کہ آخری دنوں میں تم پر بدی پڑے گی اس لیے کہ تم خداوند کے حضور بدی کرو گے کہ اپنے ہاتھ کے کاموں سے اسے غصہ دلاؤ گے۔ سو موسیٰ نے اس گیت کی باتیں اسرائیل کی ساری جماعت کو کہہ سنائیں یہاں تک کہ وہ تمام ہوئیں۔ (استثنا۔ باب ۳۱ آیات ۲۹ تا ۳۰)

حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر ان کی تورات اور ان کے صحیفہ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے بنی اسرائیل کو یہ فرمائی۔

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کی چوٹیوں پر وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔ (استثنا ۳۳۔ ۱۔ ۲۔ ۳)

نقض عہد کی پاداش

۱۳۱۔ پھر ان کی عہد شکنیوں کی وجہ سے اور اللہ کی آیات کا کفر کرنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں، نیز اس بنا پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ معدودے چند لوگ میرے بھی سب ایمان سے محروم ہیں۔ یعنی یہود نے اس عہد کو توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس عہد شکنی پر اور آیات الٰہی سے منکر ہونے پر اور انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں ان پر سخت سے سخت عذاب مسلط کیے

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ہدایت کی تو کہنے لگے کہ ہمارے دل پردے میں ہیں۔ تمہاری بات وہاں تک پہنچ نہیں سکتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے جس کی وجہ سے وہ نعمت ایمان سے محروم ہیں مگر تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہے۔

یعنی یہودیوں کی عہد شکنی کی وجہ سے اور آیات الٰہیہ کے کھلم کھلا انکار کی وجہ سے اور انبیاء علیہم السلام کے ناحق خون بہانے کی وجہ سے اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اللہ نے ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جس کے وہ ان سنگین جرائم کی پاداش میں مستحق تھے۔ اللہ کی لعنت، اللہ کا غضب، ذلت و مسکنت، آزادی اور حکومت کا زوال وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ ان گناہوں نے ان کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور ان کی اجتماعی زندگی کو تار تار کر دیا تھا۔ ان کی قوت و شوکت پامال ہو گئی اور ان کی زندگی اخلاقی گراوٹوں کا گہوارہ بن کر رہ گئی تھی۔ یہ سب کچھ عہد شکنی کفر اور عصیان کے ناگزیر نتائج تھے۔

فبما نقضھم فعل محذوف کے متعلق ہے چاہے متعلق عام نکال لیجئے جیسا کہ علامہ آلوسی کا خیال ہے اور چاہے خاص یعنی لعنت ۔ بلاغت کا یہ اسلوب عربی زبان میں زیادہ ہے۔

اظہارِ تکبر یا اظہارِ معذرت

قلوبنا غلف کے معنے ہیں ہمارے دل غلافوں میں ہیں شارحین قرآن نے اس کی دو صورتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ اغلف کی جمع ہے دوسرے یہ کہ غلاف کی جمع ہے۔ غلاف کی جمع ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل تو علم و حکمت یعنی نقلی اور عقلی علوم و فنون کا گہوارہ ہیں۔ پتہ نہیں کہ آپ کی دعوت کیا ہے ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گنجینۂ علوم ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت ہماری اجتماعی زندگی کی ضرورت نہیں ہے اور پہلی صورت میں یعنی جب غلف اغلف کی جمع ہو۔ معنے یہ ہیں کہ آپ کی دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ غلاف میں محفوظ چیز کو اغلف کہتے ہیں جیسے میان میں محفوظ تلوار کے لیے سیف اغلف بولا جاتا ہے ابن عباس، قتادہ اور مجاہد نے دلوں کے غلافوں میں ہونے کا یہی مطلب بتایا ہے کہ آپ کی دعوت

ﻟﮧ افادات شیخ الاسلام

ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

دونوں صورتوں میں جوہری فرق ہے۔ پہلی صورت میں یہود کا یہ کہنا اظہار تعجب ہے اور دوسری طرف اظہار معذرت ہے۔ اظہار تعجب کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل و دماغ اس قسم کی لایعنی باتوں کے لیے نہیں بنے ہیں اس لیے آپ کی دعوت کسی صورت میں ہمارے دلوں میں نہیں اترتی ہے۔ اگر آپ کی دعوت میں ذرا بھی معقولیت ہوتی تو ہم ضرور مان لیتے اور اظہار معذرت کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ باتیں جو نبوت پیش کر رہی ہے ہمارے دل میں تو کسی طرح نہیں اترتی اگر یہ خدا کی طرف سے ہیں تو خدا کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ آخر وہ ہمارے دلوں کو ان باتوں کے لیے کیوں نہیں کھول دیتا۔

اگرچہ ہمارے شارحین قرآن نے غلف کو اغلف کی جمع قرار دے کر اسی معنے کو ترجیح دی ہے۔ کہ تمہاری دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یعنی اظہار معذرت کو اپنایا ہے اور ہم نے بھی جلد اول میں اسی کی ہمنوائی کی ہے لیکن آیت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہاں دوسرے مفہوم میں یعنی اظہار تعجب کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کے اس قول قلوبنا غلف کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہاں بل طبع اللہ اور پہلے پارے میں بل لعنھم اللہ جو فرمایا ہے اس سے واضح تائید اسی کی ہوتی ہے یعنی وہ تو اپنے گھمنڈ اور غرور کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت کی باتیں ایسی ہیں جو کسی معقول آدمی کے دل میں نہیں اترتی ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ باتیں تو نہایت معقول اور نہایت دلنشین ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے کفر اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ہے اس وجہ سے اب ان کے اندر ان معقول باتوں کے قبول کرنے کے لیے کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے یہ مہر ابتداء کبھی نہیں لگتی جزاءً ہی لگتی ہے اور یہاں تو اس کی تصریح بھی موجود ہے بکفرھم

آخر میں فرمایا ہے فلا یومنون الا قلیلا اس کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ وہ لوگ سارے ایمان سے محروم ہیں صرف تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں، دوسرا یہ کہ ان لوگوں میں اہل ایمان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ پہلی صورت میں قلیل کا موصوف ایمان محذوف ہوگا اور دوسری صورت میں قلیل کا موصوف عدد محذوف ہوگا۔ ایمان کی صفت ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو ایمان نجات کے لیے ضروری ہے اس میں عقائد کے ساتھ معاملات، اخلاق اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعدد اجزا ہیں۔ یہود دینی زندگی کے سارے اجزا میں سے صرف چند اجزا تک

کتاب الٰہی کو مانتے تھے اور یہ کتاب الٰہی کے سارے مطالبات میں سے چند کو مانتے تھے۔ کتاب الٰہی کے وہ مطالبات جن کا تعلق حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ کی نبوت سے تھا۔ ان کو وہ اعتنا نہ سمجھتے، اور عدد کی صفت ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان کی بڑی تعداد ایمان سے محروم تھی صرف چند آدمی ایمان رکھتے تھے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

یہود کے دیگر سنگین جرائم

۲۳۲ ۔ نیز ان کے کافرانہ طرز عمل اور حضرت مریم پر بہتان عظیم کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے حضرت مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا ہے۔ یعنی اور نیز اس وجہ سے کہ حضرت مسیح ابن مریم سے جو کفر دوسرا کفر کیا اور حضرت مریم پر طوفان عظیم باندھا اور ان کے اس قول پر کہ فخریہ کہتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو مار ڈالا ان تمام وجوہ سے یہود پر عذاب اور مصیبتیں آئیں لیے

اس فقرے میں یہودیوں کے تین سنگین جرائم بتلائے گئے ہیں

اول: کفر

دوم: حضرت مریم پر بہتان

سوم: حضرت عیسیٰ ابن مریم کو قتل کا دعویٰ

کفر سے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر مراد ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں الکفر بعیسیٰ، قرطبی فرماتے ہیں بکفرہم المسیح، قاضی بیضاوی رقمطراز ہیں ای بعیسیٰ ابن مریم۔ صاحب المنار السید رشید رضا فرماتے ہیں والمراد بالکفر ـــــ الکفر بعیسیٰ۔ قرآن یہاں یہودیوں کے سنگین جرائم میں ایک جرم یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح ابن مریم سے کفر کا جرم کیا تھا اور نبوت کا انکار قرآن کے نزدیک سنگین جرم ہے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو۔ یہود کا دوسرا جرم جسے قرآن نے یہاں بیان کیا ہے وہ حضرت مریم پر بہتان ہے۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا مسئلہ یہودیوں میں ذرا برابر مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے۔ اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا لیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت

لہ افادات شیخ الاسلام

کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزہ کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف بنا اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی۔ اور بڑے چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کر کے آ گئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے دیکھا اور کہا کہ اس بچے سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا انی عبد اللہ اتنی الکتاب وجعلنی نبیاً میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے اس شبہ کی جڑ کاٹ دی تھی جو ولادت مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریم پر زنا کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریاکاری پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ اور اس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا۔ تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ تھیں اور عیسیٰ علیہ السلام ولد الزنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی شبہ کی بنا پر نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے کفر قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔ لہ

قرآن نے حضرت مریم پر یہودیوں کے اس الزام کو بہتان عظیم قرار دے کر حضرت مریم کی

لہ تفہیم القرآن

پاکدامنی کا اعلان کیا ہے۔

یہود کا تیسرا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ ہم نے مسیح ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا۔ یہاں لفظ رسول اللہ کے بارے میں شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے لفظ رسول اللہ استہزاً کہا ہے مطلب یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ کو رسول خدا تو نہیں مانتے تھے یہاں وہ حضرت عیسیٰ کو رسول اللہ بطور تمسخر کہہ رہے ہیں۔ جیسے فرعون نے کہا تھا ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون۔ اسی طرح یہود بطور فخر طنزاً کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو جو خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے قتل کر دیا۔ اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ کا لفظ یہود کے قول کا جزو نہیں بلکہ ان کے جرم کی سنگینی واضح تر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کہا لیکن زیادہ اچھا یہ ہے کہ یہ یہود ہی کا قول ہے اور ان کی جرأت مجرمانہ اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے ہوئے قتل کے اقدام کا اعلان کر رہے ہیں اور فخریہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے اور گوسالے کے واقعہ کا جو ذکر کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انہوں نے حضرت عیسیٰ میں مشاہدہ کیں ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ لطیف بات سمجھنے کی اور توجہ کی مستحق ہے کہ اس پوری آیت میں کچھ کاموں اور کچھ باتوں کو یہودیوں پر لعنت کا سبب بتایا ہے۔ کام یہ یہ ہیں نقض میثاق، کفر بآیات اللہ، قتل انبیاء اور باتیں یہ ہیں۔ ان کا کہنا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ ان کا حضرت مریم پر تہمت لگانا اور ان کا یہ کہنا کہ ہم نے حضرت مسیح عیسیٰ رسول اللہ کو قتل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتل مسیح ان کے افعال میں سے نہیں بلکہ اقوال میں سے ہے۔ اگر یہود نے فی الواقع حضرت مسیح کو قتل کیا ہوتا تو ان کا یہ فعل قابل لعنت ہوتا اور تعبیر یوں ہوتی وقتلھم المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تعبیر یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے وقولھم انا قتلنا المسیح یہاں صرف قول کو موجب لعنت قرار دینا اور افعال کی فہرست میں اس کا ذکر نہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ یہودیوں کا مجرد افترا ہ

بہتان ہے۔ ان کا یہ قول ہی ان کی ملعونیت کا سبب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر فعل قتل صورت فعلیہ میں وہاں فی الواقع موجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ فعل کو سبب لعنت قرار دیتا، نہ کہ صرف قول کو۔ اور یہاں یہود کی صرف اس لاف زنی کو سبب لعنت بتا کر اشارہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح کی نسبت یہ بات بھی ناپسند ہے کیونکہ یہود کا یہ دعویٰ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں اللہ سبحانہ کے اس کردار کی جڑ اکھاڑ رہا ہے رفعہ اللہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا تکذیب کرتا ہے۔

حضرت مسیح نہ مقتول ہیں نہ مصلوب

۲۳۳۔ حالانکہ انہوں نے نہ حضرت مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کیا حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ ان کو اشتباہ و التباس ہو گیا۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرمائے ایک ما قتلوہ جس میں قتل کی نفی فرمائی۔ دوسرے ما صلبوہ جس میں صلیب پر چڑھائے جانے کی نفی فرمائی۔ کیونکہ اگر صرف ما قتلوا کہتے تو یہ احتمال باقی رہ جاتا کہ ممکن ہے قتل نہ کیے گئے ہوں بلکہ صلیب پر چڑھائے گئے ہوں۔ اور ایسے ہی اگر صرف ما صلبوہ فرماتے تو یہ احتمال رہتا کہ ممکن ہے صلیب پر نہ چڑھائے گئے ہوں بلکہ قتل کر دیے گئے ہوں علاوہ ازیں بعض مرتبہ یہود یہ بھی کرتے تھے کہ اول قتل کر دیتے اور پھر صلیب پر چڑھا دیتے اس لیے قتل اور صلب دونوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا اور پھر ایک حرف نفی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ حرف نفی یعنی لفظ ما کو قتل اور صلب ہر ایک کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا تاکہ دونوں کی الگ الگ نفی اور ہر ایک کی مستقل تردید ہو جائے اور خوب واضح ہو جائے کہ ہلاکت کی کوئی بھی صورت پیش نہیں آئی نہ مقتول ہوئے نہ مصلوب ہوئے اور نہ مقتول ہو کر صلیب پر چڑھائے گئے۔

ما قتلوہ کہنے کے بعد ما صلبوہ کے اضافے سے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت کو قتل کر دینا تو الگ رہا یہود تو واقعۃً اتنا بھی نہ کر سکے کہ اس زمانے میں اس ملک میں جو طریقہ سزائے موت کا رائج تھا اسی تک آپ کو پہنچا دیتے۔ یعنی وہ آپ کو سولی پر چڑھا تک نہ سکے۔ صلب کے اصل معنی جیسا کہ اہل لغت نے تصریح کی ہے سولی پر چڑھانے کے ہیں۔ اردو میں یہ مفہوم سولی دینے سے نہیں سولی پر چڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبد القادر، شاہ

رفیع الدین نے اپنے تراجم میں اس کی خاص رعایت کی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

وکشتند او را و بردار نکردند او را

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

اور اس کو مارا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا

اور شاہ رفیع الدین لکھتے ہیں۔

نہیں مارا اس کو اور نہ سولی دی اس کو

مولانا شیخ الہند لکھتے ہیں :

نہیں مارا اس کو اور نہ سولی پر چڑھایا۔

ان تمام معتبر قرآن کے تراجم کردہ ہے جن صاحب کے مطابق سولی پر چڑھانے کے لیے موت اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھا رہا ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کو نہ قتل کیا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ محض ان کی زبانی دعویٰ اور قول ہی قول ہے۔ اس میں یہ بھی اشارا ہے کہ یہود محض اس کہنے کی وجہ سے اللہ کے غضب اور لعنت کا شکار ہو چکے ہیں اگر فی الواقع وہ قتل کر لیتے تو نہ معلوم کس قدر غضب اور لعنت کے مستحق ہو جاتے اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہوا کہ آج بھی جو شخص کہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مقتول اور مصلوب ہوتے ہیں وہ بلاشبہ ملعون اور مغضوب ہے۔

قتل وصلب کی غلط توجیہ

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں مطلق قتل اور صلب کی نفی مراد نہیں بلکہ ذلت اور لعنت کی موت کی نفی مراد ہے لیکن ایسا سوچنا درست نہیں ہے کیونکہ آیت قرآنی میں مطلق قتل اور صلب کی نفی بلا قید کی گئی ہے۔ قید کا اضافہ اپنی جانب سے ہے نہ قرآن حکیم میں اس قید کا نام و نشان ہے اور نہ کسی صحیح اور ضعیف حدیث میں اور نہ کسی صحابی اور تابعی کے اثر اور قول میں اس کا کوئی نشان ہے محض وہم و گمان سے قرآن کے اطلاق کو کیسے مقید کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ سوچا جائے کہ یہود اس کے قائل ہیں تو جواب یہ ہے کہ یہود تو ہزار ہا اباطیل کے قائل ہیں تو کیا قرآن حکیم کی

تفسیر کرنا ان کے مزعومات فاسدہ اور خیالات باطلہ کے تابع کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جاسکے تو پھر بھی اس آیت میں یہود کا بھرپور رد ہے اس لیے کہ یہود کا گمان یہ تھا کہ جھوٹا نبی ضرور قتل ہوتا ہے اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ حضرت مسیح قتل ہی نہیں کیے گئے اور نہ صلیب پر چڑھائے گئے کیونکہ وہ خدا کے سچے نبی تھے۔

علاوہ ازیں اگر یہود کے اس مزعوم کی رعایت کی جائے تو قتلهم الانبیاء اور یقتلون النبیین کے یہ معنے کیے جائیں گے کہ معاذ اللہ وہ انبیاء ذلت اور لعنت کی موت مرے۔

وہم کا ازالہ

پہلے فقرے کے معنے یہ ہوئے کہ یہود نے مسیح علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا۔ اس انداز بیان کا منطوق یہ اور صرف یہ ہے کہ مقتول اور مصلوب حضرت مسیح نہیں ہیں۔ یعنی قتل کی نفی مفعول پر مقصود ہے۔ یہ بتانا مقصود نہیں کہ وہاں قتل کا کوئی واقعہ نہیں ہوا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قتل وصلب کا واقعہ ہوا ہے لیکن مقتول ومصلوب حضرت مسیح علیہ السلام نہیں ہیں۔ یہاں ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر حضرت مسیح مقتول ومصلوب نہیں ہیں تو پھر کون ہے کیونکہ قتل وصلب دونوں حسی امر ہیں ذہنی اور خیالی نہیں ہیں اس لیے کوئی نہ کوئی تو ضرور مقتول ومصلوب ہے۔ اسی ذہنی وہم کا ازالہ کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے ولکن شبه لهم یعنی مقتول ومصلوب حضرت مسیح نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔

شاید یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر یہی مطلب ہے تو پھر فعل شبه میں اسناد کس طرف ہے اور اس فعل کا مسند الیہ کون ہے کیونکہ اگر اس کا مسند الیہ حضرت مسیح کو قرار دیا جائے تو مسیح اس صورت میں مشبه بہ ہوں گے اور یہاں ذکر مشبہ کا ہے۔ اور اگر یہاں کسی اور مقتول ومصلوب کو مسند الیہ بنایا جائے تو اس کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

اس کا جواب بالاتفاق جمہور مفسرین وہ ہے جو امام رازی نے مفاتیح الغیب میں دیا ہے کہ شبہ کا مسند الیہ ضمیر ہے اور ضمیر کا مرجع وہ مقتول ہے جو ما قتلوہ کا مدلول ہے اس اعتبار سے مقتول مذکور ہے اور فعل مجہول کی ضمیر کا مرجع ہے۔

اس کے علاوہ انا قتلنا المسیح میں بھی اس مقتول کا ذکر ہے جیسا کہ قاضی بیضاوی کی رائے ہے چنانچہ قاضی صاحب رقمطراز ہیں۔

اس فعل کا مسند الیہ ضمیر ہے اس کا مرجع وہ مقتول ہے جو انا قتلنا کا مدلول ہے۔
یا یوں کہہ دیجئے جیسا کہ خود قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ
شبہ کا مسند الیہ جار مجرور ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ ان کو حضرت عیسیٰ اور مقتول
میں مشابہت نظر آئی۔

پہلی صورت میں معنے یوں ہوں گے کہ مقتول کو حضرت عیسیٰ جیسا بنا دیا گیا اور دوسری صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ یہودیوں کے لیے اصل معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا۔ پہلے معنی کی رعایت سے حضرت شاہ عبد القادر اس طرح ترجمہ فرماتے ہیں لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس سے باسناد صحیح منقول ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مکان کے کسی دریچے سے آسمان پر اٹھا لیا اور انہی میں سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ کے مشابہ بنا دیا۔ یہودیوں نے اُسے حضرت عیسیٰ سمجھ کر قتل کر دیا۔ (ابن کثیر) یہ روایت حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے اور اس کے راوی علی شرط البخاری ہیں۔ جس طرح فرشتوں کا بشکل بشر متمثل ہونا اور موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا قرآن عزیز میں مذکور ہے تو پھر ایک شخص کے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ہو جانے میں کیا استبعاد ہے۔ احیاء موتیٰ کا اعجازی کارنامہ القاء شبہ کے معجزہ سے بہت زیادہ بلند ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے احیاء موتیٰ کے معجزہ کو ماننا اور القاء شبہ کے معجزہ کا انکار بڑا ہی عجیب ہے۔ اور دوسرے معنے کی رعایت سے مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ صورت حال ان کے لیے مشتبہ ہو گئی۔ یہ ان یہودیوں کے بارے میں ہے جو اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں کہتے چلے آ رہے تھے کہ حضرت مسیح کو سُولی دے دی گئی۔ یہ شبہ ان میں پہلے زمانہ مسیح میں یہودیوں کے علماء کو ہوا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ہاتھوں سے نکل گئے تو انہوں نے کسی غلط آدمی کو پکڑ کر پھانسی دے دی اور کسی کو لاش دیکھنے نہ دیا اور پھر دفن کر دیا اور لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ حضرت عیسیٰ کو پھانسی دے دی گئی اس سے صورت حال مشتبہ ہو گئی۔ سید انور شاہ کشمیری نے عقیدۃ الاسلام میں حافظ ابن حزم کی الملل والنحل سے یہی بات نقل کی ہے۔ بہر حال مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکہ ہوا اور وہ حضرت عیسیٰ کے دھوکہ میں کسی اور کو سُولی پر چڑھا گئے لیکن یہ شخص کون تھا اور دھوکہ کی صورت کیا ہوئی اس کا تصریحی جواب نہ قرآن عزیز میں ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کی جزئیات کو یکجا کیا جائے۔

تاریخ کی روشنی میں اشتباہ کی نوعیت

اس موضوع پر مولانا دریابادی نے مبسوط بحث کی ہے۔ ہم یہاں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ان کا بیان پیش کرتے ہیں۔

پہلی بات اس سلسلے میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ یروشلم کے لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح نہ پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لیے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ اس ضرورت کے لیے کافی ثابت نہ ہوا۔ بلکہ آپ کی شناخت کے لیے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق و غدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے لیکن امام المفسرین امام رازی اس راز سے بھی واقف ہیں۔ فرماتے ہیں وان الناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم ما کان قلیل المخالطۃ للناس (کبیر) متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار، کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک "بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے" سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لیے انہیں یہودا منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یسوع نے اُن سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو، وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا، میں تم سے تو کہہ چکا ہوں" (یوحنا ۱۸: ۷-۸)۔ حضرت مسیح "کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ معاصر مخالفین و معاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نامی ایک بدنام و غیر معروف مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا۔ اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے۔ اسی کی تلاش میں! دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو (یا بالفاظ یہود یسوع ناصری کو) تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں حضرت کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے "چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انہیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور اُن کے سامنے اُس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا" (متی ۱۷: ۱-۲) جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہوگئی" (لوقا ۹: ۲۹) نیز مرقس ۹: ۲) یہ معجزہ تھا یا نہ تھا یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہرحال آپ کو نفس قدرت اس پر حاصل تھی

تیسرے اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کر لیا جائے کہ ملک (شام و فلسطین) کی آبادی اس وقت اسرائیلیوں، یہود کی تھی اور اس برادری کے ایک فرد آپ بھی تھے لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے علیحدہ تھے۔ بلکہ صورت شکل، وضع و لباس، زبان و معاشرت وغیرہ میں ان سے ویسے ہی الگ تھے جیسے آج انگریز ہندوستانیوں سے مختلف و ممتاز ہیں اور جس طرح آج ہندوستانیوں کو سب فوجی گورے یکساں اور گوروں کو سارے "کالے" ایک سے معلوم ہیں، بدیسی رومی سپاہیوں اور فوجیوں کی نظر میں سب یہود یہود۔ اور اسرائیل اسرائیل بھی ایک ہی تھے۔ چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملائیے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ وہ سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپے کے بڑے حرف (ٹی) T کے مشابہ یا ویسے شکل سے ملتی جلتی ہوتی تھی۔ وہ سولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوتی تھی صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑھا ہوا رہتا تھا۔ باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی پڑتی تھی۔ اس کے لیے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی یہاں تک جو کچھ عرض ہوا اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آئیے۔ ۱۔ حکم جب سنایا گیا ہے جمعہ کا دن تھا اور دن آخر ہو رہا تھا اور یہود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پاکر شام سے شام گھر واپس آجائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے ان کا یوم السبت شروع ہو جاتا تھا اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی وغیرہ ممنوع تھی اور پھر یہود کا اہم تہوار عید فسح ( ) بھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہود کو اس کی بہت ہی عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔ ۲۔ لاغر و ناتواں مجرم (یعنی خود حضرت مسیح) اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور شریر قسم کے یہود خود ہی قدم قدم پر انہیں چھیڑتے جاتے ( ) کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے۔ اب ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھ کر فرمائیے کہ رومی سپاہی، جو مجرم، بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سولی کے لیے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لیے ہوتے تھے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے۔ ایسے موقع پر کیا کرتے؟ خود تو اپنے اوپر وہ سولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انہوں نے وہی کیا جو ان کی جگہ پر کوئی بھی ان جیسا انسان کرتا۔ انہوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز

یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اُس پر لاد دی۔ انگریز گارڈ ایسے موقع پر یعنی کسی ہندوستانی مجرم کو حراست میں لیے جاتا ہوتا تو کیا کرتا! یہی کرتا کہ بھیڑ میں کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا۔ اور اُس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و قرینہ نہیں۔ انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے۔ "انہیں شمعون نام ایک کرینی آدمی ملا۔ اُسے بیگار پکڑا کہ اُس کی صلیب اٹھائے۔" (متی ۲۷: ۳۲) اور "شمعون نام ایک کرینی آدمی اسکندر، روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انہوں نے اُسے بیگار میں پکڑا کہ اُس کی صلیب اٹھائے۔" (مرقس ۱۵: ۲۱) "اور جب اُس کو لیے جاتے تھے تو انہوں نے ایک شمعون نام کرینی کو پکڑا جو دیہات سے آتا تھا پکڑ کر صلیب اُس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے۔" (لوقا ۲۳: ۲۶) جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں، بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا۔) اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو دھکا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اُس سے تمسخر کرتا ہوا، سُولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا تو رومی پولیس گارڈ جو ساتھ تھا اب اُس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے۔ وہ بیچارے حسب دستور مجرم اسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لادی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لیے سب یہودی اجنبی ہی تھے اور اس لیے باہم دگر ہم شکل اور یکساں۔ انہیں ایک اسرائیل (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انہیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نظر آسکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا۔ لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ ادھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سُولی پر لٹکانے کی جلدی، اسی افراتفری کے عالم میں اسی شمعون کو پکڑ کر سُولی پر چڑھا دیا گیا اور وہ چیختا چلاتا رہا۔ حضرت مسیح قدرتاً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہوگئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ہاتھ ملتے رہ گئے (ولکن شبہ لہم) یہ عقیدہ نرا ایجاد نہیں خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسیدیہ کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سال وفات ۱۲۵ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا اور کھلم کھلا کہتا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ

قرآن نے حضرت مسیح کے مصلوب ہونے اور مقتول ہونے کی جس زور سے تردید کی ہے، وہ

کچھ لوگوں کے لیے حیران کن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

دنیا کی دو کثیر التعداد قومیں یہود و نصاریٰ تواتر قومی کے طور پر اس پر متفق ہیں کہ حضرت مسیح مصلوب ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح کی مصلوبیت کا مسئلہ متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہے۔ یہ غلط ہے کہ اس مسئلہ کی پشت پر تواتر کی طاقت ہے اور یہ بھی بدیہی طور پر واقعہ کے خلاف ہے کہ یہ مسئلہ نصاریٰ میں اتفاقی ہے۔

دراصل یہ بات کہ حضرت مسیح کی مصلوبیت تواتر سے ثابت ہے صرف وہی لوگ کہتے ہیں جن کو تواتر کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ بے سروپا خبروں اور افواہوں کا نام تواتر نہیں ہے۔ بلاشبہ جو کام جو بات بہر حالت تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچے وہ یقینی ہے اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ تواتر کا مفید یقین ہونا مسلمات میں سے ہے لیکن یہ بات کہ تواتر کسے کہتے ہیں ذرا سمجھنے کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

خبر کے متواتر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں چار شرطیں ہوں، اول یہ کہ بیان کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہو کہ عادۃً جن کا جھوٹ پر ایکا محال ہو۔ دوم یہ کہ از ابتدا تا انتہا سلسلہ روایت میں ہم آہنگی اور یکسانی ہو۔ سوم یہ کہ آخر میں علمی سہارا کوئی علم و فکر اور منظریہ نہ ہو بلکہ محسوس و مرئی اور مشاہدہ ہو، چہارم یہ کہ سننے والوں کو یہ خبر علمی قاطعے رہی ہو۔

اور علامہ سخاوی فتح المغیث میں رقمطراز ہیں:

یہ سب باتیں اس وقت قابل پذیرائی ہیں جب خبر کا آخری مرکز محسوس ہو۔ اگر مشاہدہ سے متعلق ہے تو مشاہدہ ہو اور اگر سماع سے متعلق ہے تو سماع ہو۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تواتر کے لیے ضروری ہے کہ بیان کرنے والوں کی اتنی تعداد ہو کہ جن کا جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو۔ اور پھر جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا اپنے حواس سے ادراک کر رہے ہوں اور ان میں باہم کہیں اختلاف نہ ہو۔ اب آپ ہی خدا لگتی فرمائیے کہ صلب مسیح کے موضوع پر اس قسم کا تواتر کہاں موجود ہے۔ اس موضوع پر ہماری تاریخی معلومات کا سب سے بڑا سہارا اناجیل ہیں یا پھر کچھ رسائل ہیں۔ نہ اناجیل کے مولفین میں عدد تواتر ہے اور اناجیل کی روایتیں کسی مشاہدہ کرنے والے کا کوئی بیان ہے۔ واقعہ صلب کی روایت کا اناجیل میں مرکز چند عورتیں ہیں۔ راویوں میں عدد تواتر مفقود ہے اور جو بھی بیان کرنے والے ہیں ان میں واقعہ کا چشم دید

گواہ کوئی نہیں ہے جو تواتر رکھتے ہیں یا افواہ ہے اس کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں۔

باقی یہ رہا یہ مسئلہ کہ یہ نصاریٰ میں متفق علیہ ہے۔ یہ بھی تحقیق کی روشنی میں غلط ہے چنانچہ جارج سیل صاحب قرآن عزیز کے ترجمہ انگریزی میں بذیل آیت ومکروا ومکر اللہ لکھتے ہیں:

یہود کے خلاف اللہ کا مکر یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور آپ کی شباہت ایک اور شخص پر ڈال دی جو آپ کی جگہ گرفتار ہو کر سولی دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا متواتر مسئلہ ہے۔ بعض عیسائی یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ قصہ القاء شباہت کا معاذ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اختراع ہے مگر وہ لوگ یقیناً غلطی پر ہیں کیونکہ پیغمبر کے زمانے سے بہت مدت پہلے عیسائیوں کے بہت سے فرقوں کا یہی اعتقاد تھا۔ چنانچہ فرقہ بے سی لی ڈین جو عیسائیت کے نہایت شروع میں تھا۔ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے سے انکار کرتا تھا اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ سائیمن آپ کی جگہ سولی پر لٹکایا گیا، ایسے ہی فرقہ سرنتس جو ان سے بھی پیشتر تھا اور کارپوکرتین جو مسیح علیہ السلام کو صرف انسان ہی مانتے ہیں، ان کا بھی یہی اعتقاد تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوتے بلکہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص کو جو آپ کا ہم شکل تھا صلیب دیا گیا۔ مصنف فوتین کہتا ہے کہ میں نے ایک کتاب بنام رسولوں کے سفرنامے، پڑھی جس میں پطرس، یوحنا، اندریاس، طاس اور پولوس کے اعمال مندرج تھے اور من جملہ دیگر امور کے ایک امر یہ بھی تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوتے بلکہ آپ کی جگہ کوئی اور شخص صلیب دیا گیا تھا۔

ایک اور خلش

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ممکن ہے کچھ عیسائی فرقے حضرت عیسیٰ کے مصلوب نہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوں لیکن اناجیل اور عہد جدید کے رسائل کی تصریحات تو مسئلہ صلب مسیح کی موید اور مثبت ہیں جب ان کتابوں میں مسئلہ کی تصریح اور پھر ان میں غلطی نہ ہونا دونوں کا مسلم ہے تو پھر صلب مسیح کے عقیدے کو ماننا ضروری ہے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً ان کتابوں کے غلطی سے محفوظ ہونے اور ان کے مصنفین کی عصمت کی کوئی دلیل

نہیں ہے۔ ثانیاً یہ کتاب جن مصنفین کی طرف منسوب ہیں ان کی طرف ان کی نسبت بھی تواتر سے ثابت نہیں ہے۔ ثالثاً ان اناجیل کی تصریحات دوسری اناجیل سے معارض ہیں جیسے انجیل برناباس اور وجہ ترجیح کوئی موجود نہیں ہے۔ رابعاً یہ اناجیل خود اس مسئلہ میں باہم متعارض ہیں۔ خامساً ان اناجیل کی تصریحات قرآن سے معارض ہیں اور قرآن کی تاریخی حیثیت تواتر سے ثابت ہے۔

بلاشبہ حضرت مسیح کو سُولی دینے کا قصہ موجودہ چاروں انجیلوں میں موجود ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انسانی معلومات کی ترقی کے ساتھ قرآن حکیم کی صداقت خود بخود واضح ہوتی جا رہی ہے۔ چند سو سال پہلے انجیل برناباس کا نسخہ دریافت ہوا تھا۔ اس میں نہایت صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سُولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ یہوداہ اسکریوتی مصلوب ہوا تھا۔ لیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے:

۲۱۴۔ گھر سے نکل کر یسوع نماز پڑھنے باغ میں گیا اپنے نماز پڑھنے کے معمول کے موافق، سو بار گھٹنے جھکاتے اور سجدے میں گرا۔ چنانچہ یہوداہ وہ مقام جہاں یسوع اپنے شاگردوں کے ساتھ تھا۔ جانتا تھا۔ سو وہ سردار کاہن کے پاس گیا اور بولا اگر تم مجھے وہ جس کا وعدہ تھا تو آج رات میں یسوع کو، جس کی تلاش میں تم ہو تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا کیونکہ وہ گیارہ ساتھیوں کے ساتھ اکیلا ہے۔ سردار کاہن نے کہا کہ تو کیا مانگتا ہے۔ یہوداہ نے کہا تیس سکے سونے کے تب سردار نے فی الفور اسے رقم گن دی۔ اور ایک فریسی حاکم کے پاس اور ہیرودیس کے پاس سپاہی لانے بھیجا اور انہوں نے ایک دستہ ساتھ کر دیا۔ کیونکہ وہ لوگوں سے ڈرتے تھے، سو انہوں نے اپنے ہتھیار لیے اور ڈنڈوں پر مشعلیں اور قندیلیں لیے یروشلم سے نکلے۔

۲۱۵۔ جب یہوداہ کے ساتھ سپاہی اس مقام کے قریب پہنچے جہاں یسوع تھا تو یسوع نے بہت سے لوگوں کی آمد سنی سو وہ خوف سے گھر کے اندر جا رہا اور وہ گیارہ سو رہے تھے تب خدا نے اپنے خادم کا خطرہ دیکھ کر اپنے کارگزاروں جبرائیل، میکائیل، رفائیل اور اوریئل کو حکم دیا کہ یسوع کو دنیا سے نکال لاتے۔ مقدس فرشتے آئے اور اس کھڑکی میں سے جو دکھن کی طرف کھلتی ہے یسوع کو نکال لے گئے۔ انہوں نے اسے تیسرے آسمان پر لا بٹھایا۔ ان فرشتوں کی صحبت میں جو ابد تک خدا کی حمد بیان کرتے ہیں۔

۲۱۶۔ یہوداہ جھٹ کر سب سے پہلے اس حجرے میں داخل ہوا جہاں سے یسوع اٹھا لیا گیا تھا۔ اور شاگرد سو رہے تھے اس پر حیرت انگیز خدا نے حیرت انگیز کام کیا۔ وہ یہ کہ یہوداہ بدل کر بول چال اور چہرے میں ایسا یسوع کی مانند ہو گیا کہ ہم اسے یسوع ہی سمجھے اور وہ ہمیں جگا کر دریافت کرنے لگا کہ استاد کہاں ہے اس پر ہم نے تعجب کیا اور جواب دیا کہ آقا تو ہی تو ہمارا استاد ہے کیا تو اب ہمیں بھول گیا اور وہ مسکرا کر بولا، بھلا تم احمق ہو کہ مجھے یہوداہ اسکریوتی نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ سپاہ داخل ہوئی اور یہوداہ پر ہاتھ ڈال دیا کیونکہ وہ ہر طرح سے یسوع جیسا تھا۔ ہم یہوداہ کی باتیں سن کر اور سپاہیوں کا انبوہ دیکھ کر گویا دیوانے ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اور یوحنا جو ایک مہین چادر لپیٹے ہوئے تھا جاگ کر بھاگا۔ اور جب ایک سپاہی نے اسے چادر سے پکڑا تو وہ چادر چھوڑ کر ننگا بھاگ کھڑا ہوا۔ کیونکہ خدا نے یسوع کی دعا سن لی اور گیارہوں کو آفت سے بچا لیا۔

یہ انجیل برنباس کا اقتباس ہے۔ اس انجیل کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر تو ہم آئندہ بحث کریں گے لیکن حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو پطرس حواری کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح کو سولی دینے سے کچھ پہلے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ انجیل پطرس کا یہ جملہ میں اشر تیرہ نے اپنی مشہور کتاب اناجیل اربعہ میں نقل کیا ہے۔

قرآن میں صلب مسیح کی اہمیت

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن عزیز نے صلب مسیح کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ عیسائی دنیا نے اسے اپنے دین کی اساس اور عقائد میں اصل کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان کے خیال میں اس کو مان کر آدمی نجات پا سکتا ہے اور اس کا انکار کر کے ہلاک ہو جاتا ہے۔

اس عقیدے کے لیے افسانہ یہ بنایا گیا ہے کہ حضرت مسیح کو یہودیوں نے پیلاطس حاکم کے دربار میں پیش کر کے عرض کیا، عالی جاہ، یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے بلکہ حکومت کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے اگر فوراً اس کا استیصال نہ کیا گیا تو ہمارا دین ہی صحیح حالت میں نہ رہ سکے گا بلکہ اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے اس شخص نے بڑے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں ہے کہ عوامی طاقت سے قیصر اور آپ کو

شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دینی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بد دین بنانے میں لگا ہے لہٰذا اس فتنہ کی سرکوبی ضروری ہے۔ غرض کافی گفت و شنید کے بعد پیلاطس نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کرلیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں۔ بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کرکے بے حد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقعہ کا انتظار کریں اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقعہ پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔

انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق کہا گیا ہے کہ

> پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کرکے کہا ہم کرتے کیا ہیں! یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے۔ اگر ہم اسے یوں ہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کرلیں گے اور ان میں سے کائفا نام ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا۔ ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امت کے واسطے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔
>
> (انجیل یوحنا باب ۱۱ آیت ۴۷ تا ۵۱)

یہ اس مشورے کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے پہلے آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہ وقت قیصر کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومت یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔

حضرت عیسیٰ اور ان کی دعوت کے بارے میں جو حالات قرآن نے پیش کیے ہیں ان میں اور انجیل میں بیان کردہ دعوتی حالات میں اصولاً کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے بعد کے پورے حالات کے بیان میں قرآن اور انجیل دونوں کی راہیں متضاد سمتوں میں اور الگ الگ ہیں اور اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی مناسبت ممکن نہیں ہے۔ ہاں یہود و نصاریٰ میں یہ نقطہ اشتراکی ہے کہ حضرت مسیح کو سولی دی گئی۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہود اس کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں اور عیسائی اس کو یہود کا ایک قابل نفرین عمل سمجھتے ہیں۔ یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کیا ہے نصاریٰ نے یہود کے اس دعوےٰ کو مان لیا ہے۔ دونوں کا بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع

ملی کہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں - یہ بہترین موقعہ ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے - فوراً ہی یہ لوگ موقعہ پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر لیا - یسوع علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ ان کو سولی پر لٹکا دے۔ اگرچہ پیلاطس نے عیسیٰ علیہ السلام کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا، اور اس کس مپرسی کی حالت میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی۔ ایلی ایلی لما سبقتنی ؟

انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> سردار کاہن نے اس سے کہا میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے یسوع نے اس سے کہا۔ تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے۔ اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی۔ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ وہ قتل کے لائق ہے اس پر انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا ... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے سپرد کیا ... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے ... وہ بولے برابا کو پیلاطس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں؟ سب نے کہا کہ اس کو صلیب دی جائے اس نے کہا کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا الٹا بلوہ

ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا کہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے دہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب اور اس پر تھوکا۔ اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغہ کو اس پر سے اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے۔ ایک دہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اتر آ۔ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کر ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے۔ اس نے اوروں کو بچایا لیکن اپنے تئیں بچا نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما سبقتنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا کہ یہ ایلیاہ کو پکارتا ہے۔ یسوع نے پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دے دی۔ (انجیل متی باب ۲۷)

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کے مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص یہ سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت انتہائی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقے سے ہوئی۔ واقعہ کا یہی انداز اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے کی دلیل ہے۔ اور پھر واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدا تعالیٰ سے یہ درخواست کی اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ موت کا پیالہ مجھ سے ٹل جائے اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہیں ہوئی تو پھر یہ کہنا پڑا اگر یہ میرے پیئے بغیر ٹل نہیں سکتا تو تیری مرضی

پوری ہو۔

حیرت اس بات پر ہے کہ جب عقیدہ کفارہ کے مطابق حضرت مسیح کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنے۔ اور اگر لوازم بشریت کی بنا پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود از راہ فخر و غرور اس پر شاداں تھے اور کہتے تھے کہ مسیح ناصری اگر مسیح موعود ہوتا تو خدا تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو بچائے چاہتے ہیں: دیکھا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اس کو بچائے مگر خدا نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔

واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے پاس اس الزام کا کوئی جواب نہیں ہے اور واقعہ کی تفصیلات کو مان لینے کے بعد عقیدہ کفارہ کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی ہے اس لیے عیسائیوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد یہ اضافہ اور کیا۔ یوحنا کی انجیل میں ہے:

> لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہ نکلا۔ ...... ان باتوں کے بعد ارمتیہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لے جائے۔ پیلاطس نے اجازت دے دی۔ پس وہ آکر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا۔ پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا۔ پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند

کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا ۔ ۔ ۔ لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی ۔ اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کر اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائنتی بیٹھے دیکھا ۔ جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی ۔ انہوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے ؟ اس نے ان سے کہا اس لیے کہ میرے خداوند کو اٹھا کر لے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑی اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے ۔ یسوع نے اس سے کہا ۔ مجھے نہ چھو کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس ان سے جا کر کہہ کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں ۔ مریم مگدلینی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں ۔ (انجیل یوحنا)

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصۂ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے اگر چہ یہ ہے کہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے کس اور بے بس اور مایوس خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصۂ بیان ایسی ہستی کا چہرہ پیش کرتا ہے جو خدائی صفات سے موصوف، ذات باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن اور خوش ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کو اپنے ادائے فرض کا اہم جز سمجھتی ہے ۔

بہر حال چونکہ حقیقت دوسری تھی اور ایک عرصہ دراز کے بعد عقیدۂ کفارہ کی بدعت نے عیسائیوں کو حقیقت کے خلاف اس افسانہ کے گھڑنے پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن حکیم نے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشے سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقت حال کے رخ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہب عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوت تجدید و اصلاح کہا جاتا ہے ۔

حضرت مسیح کے بارے میں اختلاف

۲۳۴ اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں ۔ ظن و گمان کے سوا ان کے پاس علم و بصیرت نہیں ہے ۔ اختلاف کرنے والے کون ہیں یہودی

اور عیسائی یا صرف عیسائی۔ یہ تو آیت قرآنی میں فیہ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ اختلاف کا موضوع حضرت عیسیٰ کی ذات گرامی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں جس اختلاف کا ذکر ہے اس کا تعلق حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری سے ہے یا روانگی سے ہے۔ اگر اختلاف کا تعلق حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری سے ہے تو بلاشبہ اس موضوع پر یہودیوں اور عیسائیوں کا اختلاف ایک واضح اور کھلی بات ہے۔ آپ کی پیدائش کا معاملہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بالکل متضاد سمتوں کا انتہائی گوشہ بن گیا تھا۔ یہودی ان کی پیدائش کو ناجائز تعلق کا نتیجہ قرار دیتے تھے برخلاف اس کے عیسائی نہ صرف جائز بلکہ ایک ربانی معجزہ تصور کرتے تھے۔ قرآن نے ثالث کی حیثیت سے دونوں میں فیصلہ کر دیا اس نے حضرت مریم کی پاکی کا اعلان کیا۔ یہودیوں کے الزام کو بہتان عظیم قرار دیا اور پیدائش مسیح کی سرگزشت ٹھیک اسی طرح بیان کر دی جس طرح انجیل میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اختلاف سے یہ اختلاف مراد نہیں ہے یہ اختلاف یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین ہے اور اگر اختلاف کا تعلق حضرت مسیح کی روانگی سے ہے تو اس میں یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی اختلاف ہے اور خود عیسائیوں میں بھی اس موضوع پر شدید اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں یہاں اختلاف کرنے والوں سے عیسائی مراد ہیں ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی متفق علیہ ایک قول نہیں ہے بلکہ اس موضوع پر بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مشتبہ رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پہ جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی تھی بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ آپ حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا، مگر الوہیت کی روح جو اس میں تھی وہ اٹھا لی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

بہرحال عیسائیوں میں نفس واقعہ صلیب سے متعلق بھی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے بڑا اختلاف ہے اور اس پر جو افسانہ انہوں نے تصنیف کیا ہے اس میں بڑے اختلافات ہیں۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی دلیل

۲۳۵۔ اور یقیناً انہوں نے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا ؕ اور اللہ سب پر غالب اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول کی تکذیب کرتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا۔ اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہود کو جواب دینا مقصود ہے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا۔ اس کے جواب میں اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ یہود نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں قتلوہ کی ضمیر منصوب کا مرجع عیسیٰ السلام ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام سے یہاں صرف ان کی روح مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ قتل اور سولی پر چڑھانا وہ افعال ہیں جن کا مورد صرف جسم ہی ہو سکتا ہے روح کا قتل کرنا اور روح کا سولی پر چڑھانا قطعاً محال ہے۔ لہٰذا بل رفعہ اللہ کی ضمیر بھی اسی جسم کی طرف راجع ہے جس جسم کی طرف ما قتلوہ کی ضمیر راجع ہے۔ یہود روح عیسیٰ السلام کے قتل کے مدعی نہ تھے بلکہ جسم عیسیٰ کے قتل کے دعویدار تھے اس لیے ان کی تردید میں بل رفعہ اللہ فرمایا گیا ہے۔

عربی زبان میں لفظ بل اضراب اور اعراض کے لیے آتا ہے لہٰذا ما قبل اور ما بعد میں منافات ہونی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ رفع جسمانی ہی قتل کے منافی ہے۔ رفع روحانی اور رفعت شان قتل کے منافی نہیں اس لیے بل رفعہ اللہ میں رفع جسمانی مراد ہے ورنہ یہاں کلمہ بل کا لانا بالکل بے موقع اور بے محل ہو جائے گا۔

رفع سے عزت کی موت مراد نہیں

کچھ گمراہ لوگوں نے یہاں رفع سے مراد عزت کی موت بتائی ہے جیسا کہ مرزا قادیانی نے ازالہ اوہام میں لکھا ہے، ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ لغت کی کسی کتاب میں رفع کے معنے عزت کی موت نہیں لکھے ہیں۔ یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینا کہ رفع کا صلہ جب الی آئے تو اس کے معنے اعزاز و اکرام کے ہوتے ہیں جیسے رفعتہ الی الحاکم، لغت اور زبان میں دھاندلی کے مترادف ہے کیونکہ

اوّلاً رفعتہ الی الحاکم کے معنے عزت کی موت کسی نے نہیں بتائے ہیں۔ اگر اس کے یہ معنے نہیں

قرآن دلیل کے طور پر پیش کرنا عبث ہے۔

ثانیاً رفعتہ الی الحاکم جہاں اہل لغت نے لکھا ہے وہاں معنے یہ بتاتے ہیں۔ نزدیک گردانیدن کسے را بجھے صلتہ بالی ومن ذالک قولہم رفعتہ الی السلطان یہاں نزدیک گردانیدن کسے را بجھے موجود ہے اس کا مدلول مرتبہ کی بلندی نہیں بلکہ جسمانی قرب ہے اس لیے رفعتہ الی السلطان کے معنے یہ نہیں کہ اس شخص کو گھر بیٹھے بغیر جسمانی حرکت عزت دلادی بلکہ معنے یہ ہیں کہ میں اس کو بادشاہ کے حضور میں لے گیا وہاں جاکر اگر وہ منظور نظر ہے تو معزز ہے اور اگر کوئی مجرم ہے تو ذلیل و رسوا ہے کیونکہ بادشاہ اور حاکم کی حضوری میں عزت و ذلت اپنے مقام اور حیثیت سے ہوتی ہے نہ کہ قرب مکان کی وجہ سے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں محاورہ رفعہ الی الحاکم کے معنے احضرہ للشکوی یعنی شکایت کے لیے حاکم کے حضور میں جانا لکھے ہیں۔

بہرحال رفع کا صلہ اگر الیٰ آئے تو اس کے معنے عزت کی موت دینا نہیں۔ ایک سے زیادہ مثالیں لغت اور حدیث میں موجود ہیں۔

پہلی مثال لغت کی مشہور کتاب المصباح المنیر میں علامہ فیومی رقمطراز ہیں رفعت الزرع الی البیدر اور اس کے معنے صاحب صراح نے فارسی میں اس طرح کیے: برداشتم غلہ درودہ و بخرمن گاہ آوردم۔ یعنی میں کھیت کو کاٹ کر اور غلہ اٹھا کر خرمن گاہ میں لے آیا۔ صاحب قاموس رفعوا الزرع کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ کسان کھیت کاٹ کر خرمن گاہ میں اٹھا کر لے آئے۔ علامہ زمخشری نے اساس البلاغہ میں بھی یہی معنے بتائے کیا کوئی عقل مند آدمی یہاں یہ معنے کر سکتا ہے کہ غلہ کو عزت دی اور اس کا اکرام کیا۔

دوسری مثال صحیح بخاری میں ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ ابوہریرہ مال زکوٰۃ کی نگرانی پر مقرر تھے، چور نے چوری کی، ابوہریرہ نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ لارفعنک الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حافظ عسقلانی نے اس کے معنے بتائے ہیں لاذھبن بک اشکوک یعنی میں تجھے حضور کے پاس لے جاکر تیری شکایت کروں گا۔ حافظ لکھتے ہیں کہ رفعہ الی الحاکم کے معنے حاکم کے حضور میں شکایت کرنے کے ہیں۔ کیا معاذ اللہ حضرت ابوہریرہ چور کو دربار نبوت میں لے جاکر معزز بنانا چاہتے تھے۔

تیسری مثال مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر قرآن حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اثنائے تلاوت میں آپ نے سر اٹھایا چنانچہ الفاظ یہ ہیں فرفع راسہ الی السماء

آپ نے سر آسمان کی طرف اٹھایا، دونوں جگہ رفع کے ساتھ الیٰ آیا ہے اور دونوں جگہ رفع جسمانی مراد ہے اعزاز و اکرام کے معنے نہیں ہیں۔

چوتھی مثال زمانہ نبوت میں ایک بچے کا انتقال ہوگیا اور وہ بچہ آپ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ فرفع الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وہ بچہ آپ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔ ظاہر ہے کہ بچہ اسی جسد عنصری کے ساتھ اٹھا کر لایا گیا تھا کسی کے نزدیک یہاں عزت کی موت مراد نہیں ہے۔

پانچویں مثال لغت حدیث کی مشہور کتاب مجمع البحار میں ہے فرفعه الی یدہ لیراہ الناس یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ اپنے دست مبارک کی لمبائی کی مقدار میں اوپر اٹھایا تاکہ لوگ دیکھ لیں۔ یہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ پیالہ کا رفع روحانی تھا۔

چھٹی مثال حدیث میں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم شب کو بیدار ہوتے، اٹھ کر بیٹھ جاتے اور اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر تین بار فرماتے سبحان الملک القدوس الفاظ یہ ہیں فرفع راسه الی السماء یہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ سر کا رفع روحانی تھا۔

ساتویں مثال۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں عبداللہ ابن عباس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو سلام پھیرنے کے بعد سر مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے۔ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی فلنولینک قبلة ترضاها۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ رفع کا صلہ جب الیٰ آتا ہے تو اس کے معنے اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ اس میں اعزاز و اکرام کے معنے قطعاً نہیں ہوتے خلاصہ یہ ہے کہ لغت میں رفع کے حقیقی اور وضعی معنے اوپر کو اٹھانا ہیں اور اس کی ضد وضع اور حقیقی ہے کہ ان کے معنے نیچے رکھنا ہیں۔ لہٰذا رفع کا مفعول جب کوئی جسمانی چیز ہوگی وہاں اس سے مراد جسم کو نیچے سے اوپر اٹھانا ہوگا۔ علامہ فیومی المصباح المنیر میں رقمطراز ہیں:

الرفع فی الاجسام حقیقة فی الحرکة والانتقال و فی المعانی علی ما یقتضیه المقام۔

رفع اجسام میں معنے حقیقی کے لحاظ سے حرکت اور انتقال کا نام ہے۔ اور معانی میں موقع و مقام کی مناسبت سے برتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بجسدہ العنصری آسمان پر اٹھائے گئے کیونکہ رفعہ اللہ الیہ میں ضمیر منصوب کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور عیسیٰ نام ہے جسم مع الروح کا نہ کہ صرف روح کا۔

اگر مان بھی لیا جائے کہ رفع کے معنے اعزاز اور اکرام کے ہیں تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ یہ معنے کنائی ہیں اور دوسرے یہ کہ مجازی ہیں۔

کنائی اور مجازی معنے میں فرق

دونوں میں باریک فرق ہے کنائی معنے حقیقی معنے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں لیکن حقیقی اور مجازی معنے کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ کنایہ اور مجاز میں بھی فرق ہے جیسا کہ علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ

> کنایہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے اس کے لازمی معنی مراد ہوتے ہیں اور لازمی معنے کے ساتھ اس لفظ کے اصل معنی کا مراد لینا بھی جائز ہے مثلاً لفظ طویل النجاد کہ اس کے کنائی معنے دراز قامت ہیں اور اس کے حقیقی معنے شریف النسب ہیں۔ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ کنایہ اور مجاز میں یہی فرق ہے کہ کنایہ میں حقیقی اور کنائی معنے دونوں جمع ہو سکتے ہیں برخلاف مجاز کے کہ اس کے ساتھ حقیقی معنے جمع نہیں ہو سکتے۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں رفعہ اللہ الیہ کے حقیقی معنی یعنی جسمانی رفع اور کنائی فرضی معنے یعنی رفع منزلت دونوں جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ جسمانی رفع حضرت عیسیٰ کی بزرگی کی وجہ سے خود اعزاز و اکرام کو لازم ہے جیسا کہ آیت ورفع ابویہ علی العرش میں دونوں جمع ہیں۔ بہرحال رفع کا مفعول جب کوئی جسمانی چیز ہوگی تو اس وقت جسمانی رفع مراد ہوگا۔ اسی لیے قرآن حکیم میں جہاں کہیں رفع سے روحانی رفع عزت ہوتا ہے وہاں بلاشبہ کوئی قرینہ موجود ہوتا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ رفع جسمانی مراد نہیں ہے مثلاً ان آیات قرآنیہ کو بغور پڑھیے ورفع بعضھم درجات، نرفع درجات من نشاء، ورفع بعضکم فوق بعض درجات اور ورفعنا لک ذکرک۔ ان آیات میں ذکر اور درجہ کی قید بتا رہی ہے کہ ان میں رفع جسمانی مراد نہیں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ رفعہ اللہ الیہ کے ذریعے اللہ نے معاملہ کی اصل حقیقت بتا دی ہے اس میں جزم اور صراحت کے ساتھ جو کچھ بتایا گیا ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ یہ سوال کہ اس اٹھا لینے

کی کیفیت کیا تھی اترنے واقعاتی دنیا میں سمجھنے کے لیے یہ باتیں ذہن میں رکھیے کہ

اولاً عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ان اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ حضرت مسیح کی الوہیت کا قائل ہوا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہٖ رفع کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اس واقعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن عزیز کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی غلطی کی تردید کرنا چاہتا ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کی تائید و تقویت کا سامان ہو۔

ثانیاً یہ کہ اگر حضرت مسیح کا اٹھایا جانا ویسا ہی اٹھایا جانا تھا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اٹھایا جاتا ہے یا اگر اس رفع سے مراد محض درجات و مراتب کی بلندی ہوتی تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے اور زیادہ مناسب الفاظ یہ ہوتے کہ یقیناً انہوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو زندہ بچالیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے ان کو ذلیل کرنا چاہا، اللہ نے ان کو بلند درجہ عطا کیا۔

ثالثاً یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورے میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اللہ نے اسے اٹھالیا تو یہ ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا وکان اللہ عزیزاً حکیماً اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے بلکہ یہاں موزوں فقرہ وکان اللہ غفوراً رحیماً ہوتا۔ یہ عزت و حکمت کا حوالہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں ہو سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

ہمیں افسوس ہے کہ معالم القرآن کے صفحات اس سے زیادہ تفصیل کے متحمل نہیں ہیں۔ اگر آپ اس موضوع کے تفصیلی مباحث دیکھنا چاہتے ہیں تو حضرت الشیخ السید انور شاہ کشمیری کی عقیدۃ الاسلام، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی کلمۃ اللہ فی حیات عیسیٰ روح اللہ اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کی شہادۃ القرآن پڑھیے۔ عقیدۃ الاسلام علماء کے لیے ایک عجیب علمی سوغات۔۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام کی دوسری دلیل

۲۳۶۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر شہادت دینے والا ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ موجود ہیں آسمان پر۔ جب دجال پیدا ہوگا تب اس جہان میں تشریف لاکر اسے قتل کریں گے اور یہود و نصاریٰ ان پر ایمان

لائیں گے کہ بے شک عیسٰی زندہ ہیں مرے نہ تھے اور قیامت کے دن حضرت عیسٰی علیہ السلام ان کے حالات اور اعمال کو ظاہر کریں گے کہ یہود نے میری تکذیب اور مخالفت کی اور نصاریٰ نے مجھے خدا کا بیٹا بنایا۔[1]

دراصل اس فقرے کے دو معنے بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا احتمال ہے۔ ایک معنے وہ جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہ لے آتے۔ اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں پہلے معنے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیح کی طبعی موت جب واقع ہوگی۔ اس وقت جتنے اہل کتاب ہوں گے وہ سب ان پر ایمان لا چکے ہوں گے۔ دوسرے معنے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے پہلے رسالت مسیح کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیح پر ایمان لے آتے ہیں مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنے متعدد صحابہ، تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ کے علم میں ہے۔[2]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس آیت کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ العزیز اس طرح فرماتے ہیں:

> نباشد ہیچ کس از اہل کتاب الا البتہ ایمان آرد بعیسٰی پیش از مردن عیسٰی، وروز قیامت باشد عیسٰی گواہ برایشاں۔

> نہیں رہے گا کوئی شخص بھی اہل کتاب میں سے مگر ضرور ایمان لائے گا عیسٰی علیہ السلام پر عیسٰی علیہ السلام کی موت سے پہلے اور حضرت عیسٰی قیامت کے روز ان پر گواہ ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے ترجمہ سے صاف ظاہر ہے کہ آیت قرآنی میں بہ اور موتہ کی دونوں ضمیریں حضرت مسیح کی طرف راجع ہیں۔ قرآن حکیم کا ظاہر سیاق بھی یہی چاہتا ہے کہ ضمیروں کا مرجع حضرت عیسٰی ہوں کیونکہ جیسے ما قتلوہ، ما صلبوہ اور ما قتلوہ یقیناً اور بل رفعہ اللہ کی تمام ضمیریں حضرت عیسٰی کی طرف راجع ہیں۔ اور پھر آئندہ آیت و یوم القیامۃ یکون علیہم شہیداً میں بھی یکون کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسٰی ہیں ایسے ہی ضروری ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیروں کا مرجع بھی حضرت عیسٰی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ترجمان القرآن　حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی باسناد صحیح یہی منقول ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں :

اسی پر عبداللہ بن عباس نے جزم و یقین کیا۔ جیسا کہ ابن جریر نے باسناد صحیح بحوالہ سعید بن جبیر بیان کیا ہے اور ابی رجاء کے حوالہ سے امام الحسن البصری سے اس آیت کی تفسیر قبل موت عیسیٰ منقول ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں واللہ حضرت عیسیٰ اس وقت بھی زندہ ہیں، جب تشریف لاویں گے اس وقت ان پر سب ایمان لاویں گے اور یہی اکثر اہل علم سے منقول ہے اور اسی کو ابن جریر وغیرہ نے راجح قرار دیا ہے۔　(فتح الباری ص ۳۵۵ ج ۶)

یہی بات علامہ قسطلانی نے ارشاد الساری میں اس طرح پیش فرمائی ہے :

اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا مگر حضرت عیسیٰ پر حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا ــــ اسی پر ابن عباس نے یقین کیا ہے جیسا کہ ابن جریر نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے بتایا ہے۔　(ارشاد الساری علی صحیح البخاری)

اور حضرت قتادہ اور ابو مالک سے بھی یہی منقول ہے کہ قبل موتہ کی ضمیر حضرت مسیح کی طرف راجع ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ :

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ بے شک عنقریب تم میں عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے فیصلہ کرنے اور انصاف کرنے والے ہوں گے صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے، لڑائی کو ختم کر دیں گے، اور مال کی اتنی بہتات کر دیں گے کہ کوئی لینے والا نہ ہوگا۔ اور ایک سجدہ دنیا ومافیہا سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ پھر ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت پڑھو وان من اھل الکتاب الا لیومنن بہ قبل موتہ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں :

حضرت ابو ہریرہ کا آیت قرآنی کو اس طرح پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ بہ اور موتہٖ کی ضمیریں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ یعنی ہر شخص زمانہ آئندہ میں حضرت عیسٰی کی موت سے پہلے حضرت عیسٰی پر ایمان ضرور لائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ آیت قرآنی میں لیؤمنن لام تاکید اور نون تاکید یہ چاہتا ہے کہ مراد الٰہی یہ ہو کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں سب اہل کتاب ایمان لے آئیں گے۔ اور آپ ان پر قیامت کے دن شاہد ہوں گے۔ اس آیت کے صحیح معنے یہی ہیں چونکہ ابھی تک تمام اہل کتاب کا حضرت مسیح پر ایمان متحقق نہیں ہوا، اس لیے آپ ابھی تک بقید حیات ہیں۔

ایک خلش کا ازالہ

شاید کچھ لوگ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ اس حدیث میں اقرؤا ان شئتم حضور انور کا ارشاد نہیں ہے بلکہ خود حضرت ابو ہریرہ کا استنباط ہے جو حجت نہیں مطلب یہ کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ صحابی کا اثر ہے۔

جواب یہ ہے کہ حدیث کتاب اللہ کی شرح ہے۔ قرآن عزیز میں جو بات بالاجمال بتائی گئی ہے۔ حدیث اس کی تفصیل ہے۔ اسی بنا پر فقہاء صحابہ اس تتبع اور تلاش میں رہتے تھے کہ ارشادات نبوت اور کلمات طیبہ کا ماخذ کتاب اللہ سے معلوم کریں۔ چنانچہ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں۔

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس کے بہت حریص تھے کہ ارشادات کو قرآن سے مستنبط کریں۔

کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ میں تطبیق اور توفیق دینا اور حدیث کی تصدیق اور مزید توثیق کے لیے کتاب اللہ کی کسی آیت سے استشہاد کرنا یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ اور استنباط کی نعمت اور دولت سے سرفراز فرمایا ہے وہی کر سکتا ہے۔ ابن القیم فرماتے ہیں:

> یہ علم کے مراتب میں سے بزرگ ترین مرتبہ ہے جس کو مل جائے وہ خدا کا شکر کرے اور جسے نہ ملے وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔

خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات کوئی مسئلہ بیان فرما کر اس کے مطابق قرآن کی آیت

تلاوت فرماتے۔ اسی طرح صحابہ کرام کی بھی عادت تھی کہ ارشادِ نبوت کو آیتِ قرآنی کے حوالہ سے بیان کرتے مستشہداً
ابو ہریرہ کی بھی یہی عادت تھی کہ اکثر حدیث کی روایت کر کے استشہاداً کوئی آیتِ قرآنی تلاوت فرماتے۔
اور وہ اکثر اپنی رائے نہ ہوتی بلکہ حضورِ اقدس ہی سے منقول ہوتی۔ کبھی تصریح فرما دیتے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اختصاراً صرف آیت کی تلاوت پر ہی اکتفا فرما دیتے لیکن تتبع اور استقراء
کیا جاتا ہے تو دوسری سند سے اس کے مرفوع ہونے کی تصریح مل جاتی ہے۔ یہ آیت بھی اسی قبیل
سے ہے۔ احادیث میں ایک سے زیادہ اس کی نظیریں موجود ہیں۔ چنانچہ اس حدیث کے متعلق بھی
بعض راویوں کو اس کے مرفوع ہونے کا گمان ہے جیسا کہ مسند امام احمد ص ۲۹۰ ج ۲ میں اس روایت
سے معلوم ہوتا ہے۔

حدثنا عبد اللہ قال حدثنی ابی انا یزید انا سفیان عن الزھری
عن حنظلة عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ینزل عیسی ابن مریم فیقتل الخنزیر ویکسر الصلیب (الی ان قال)
ثم تلا ابو ھریرة وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ
ویوم القیامة یکون علیھم شھیداً۔ فزعم حنظلة ان
ابا ھریرة قال یؤمن بہ قبل موتہ عیسی فلا ادری ھذا کلہ
حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم او شیء قالہ ابو ھریرة۔

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے دیکھو ابن کثیر ص ۳۳۵ ج ۳
اور حافظ ابو جعفر طحاوی نے شرح معانی الآثار میں حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ
حضرت ابو ہریرہ کی سب روایتیں مرفوع ہیں۔ گو بظاہر موقوف ہوں۔ (شرح معانی الآثار ص ۱۱
ج ۱) اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تفسیر درمنثور ص ۲۴۲ ج ۲ میں اس روایت کو مرفوعاً بھی
نقل کیا ہے۔

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ ابو ہریرہ کا قول ہے پھر بھی حجت ہے کیونکہ ایک صحابی کا
مجمع صحابہ میں کسی بات کو علی الاعلان کہنا اور صحابہ کا اس پر سکوت فرمانا اجماع سکوتی کہلاتا ہے۔
بالخصوص ایسی بات جو بار بار اور مجمع صحابہ میں کہی گئی ہو اور صحابہ میں سے اس پر کسی نے کوئی
گرفت نہ کی ہو اس کی قطعی دلیل ہے کہ یہ امر صحابہ کے نزدیک بالکل مسلم ہے۔ اگر قابلِ انکار ہوتا
تو صحابہ کرام اس پر ضرور نکیر فرماتے۔ صحابہ کرام سے یہ ناممکن ہے کہ ان کے سامنے کوئی بات قابل

گرفت کہی جائے یا کوئی کلام قابلِ اعتراض کیا جاتے اور وہ خاموش رہیں۔ حضرت ابی ہریرہ کا قبل موتہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسٰی کو قرار دینا اور صحابہ کے مختلف مجامع میں اس کو بار بار بیان فرمانا اور کسی صحابی کا اس پر انکار نہ کرنا اس امر کی قطعی اور صریح دلیل ہے کہ یہ امر تمام صحابہ کے نزدیک مسلم تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں:

بہ اور موتہ دونوں ضمیروں کا مرجع حضرت عیسٰی ہونا۔ حافظ ابن جریر کا مختار ہے اور سلف کی ایک جماعت نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ اور قرآن کا ظاہر سیاق اسی کا مقتضی ہے کیونکہ گزشتہ کلام میں حضرت عیسٰی ہی کا ذکر ہے۔ اور تابعین تبع تابعین کثرت سے اسی طرف ہیں کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ عیسٰی علیہ السلام کی موت سے پہلے ہر کتابی حضرت عیسٰی پر ضرور ایمان لائے گا جیسا کہ ابن عباس سے مروی ہے۔

ہاں کچھ مفسرین کی رائے یہ ضرور ہے کہ موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسٰی کے رسول برحق ہونے اور اللہ کا بندہ ہونے پر ایمان لے آتا ہے مگر یہ رائے کمزور ہے کیونکہ ـــــ اولاً اس صورت میں ایمان سے وہ ایمان مراد ہوگا جو یہودی غرغرہ کی حالت میں لاتا ہے ایسی صورت میں بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ تعبیر قبل موتہ کی جگہ عند موتہ یا حین موتہ ہو۔

ثانیاً اگر موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف ـــ ـع ہو گی تو مضارع مؤکد بنون تاکید خالص استقبال کے لیے نہ رہے گا۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسٰی پر ضرور ایمان لے آتا ہے اور یہ بات زمانہ مستقبل کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اہل کتاب اس آیت کے نازل ہونے کے وقت بھی اور اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بھی مرتے تھے لہٰذا اہل کتاب کا اپنے مرنے کے وقت ایمان لانا زمانہ مستقبل کے ساتھ خاص نہ رہا۔ حالانکہ تمام ائمہ نحو کے یہاں یہ مسلم ہے کہ مضارع مؤکد بنون تاکید خالص استقبالی معنے کے لیے آتا ہے چنانچہ امام ابن ہشام نحوی مغنی میں رقمطراز ہیں:

اگر مضارع حال کے معنے میں ہو تو نون ثقیلہ اور خفیفہ سے اس کی تاکید ممنوع ہے اور اگر مضارع مستقبل کے معنے میں ہو تو اس کی تاکید نون ثقیلہ و خفیفہ سے واجب

ہے جیسے تاللہ لاکیدن اصنامکم۔ (مغنی جلد ثانی ص ۳۲)

ایسے ہی علامہ رضی شرح کافیہ میں لکھتے ہیں:

اس مستقبل میں جو محض خبری معنے دے رہا ہو نون تاکید نہیں آتا، ہاں جب شروع میں تاکیدی علامت موجود ہو جیسے لام قسم تو پھر نون تاکید لانا ضروری ہے۔

ثانیاً یہ کہ اس صورت میں بہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ کو اور قبل موتہ کی ضمیر کا مرجع کتابی کو قرار دیا جاتے۔ یہ انتشار ضمائر ہے، بلیغ کلام میں اس طرح کا انتشار نہیں ہوتا۔

بہر حال اس آیت سے پہلے آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ سُولی پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا۔ یہ یہود و نصاریٰ دونوں کے اس نظریہ کی تردید ہے جو انھوں نے اپنے زعم باطل سے قائم کر لیا تھا۔ ان سے یہی کہا جا رہا ہے کہ حضرت مسیح کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ علمی طور پر سرتا سر غلط اور بیہودہ ہے اس کے بعد اس آیت میں ان کو اسی بات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ آج اس غلط اور علم و حقیقت سے دور عقیدہ پر فخر کر رہے ہیں تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام خدائے برتر کی حکمت و مصلحت پورا کرنے کے لیے کائناتِ ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہدے کے وقت یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا۔ اور پھر جب وہ اپنی مدت حیات ختم کرنے کے بعد موت سے دوچار ہوں گے تو روزِ قیامت اپنی اُمت پر اسی طرح گواہ ہوں گے جیسے سارے انبیا اپنی اُمتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعہ صلیب پر متفق ہیں لیکن اس سلسلے میں دونوں کے زاویہ نظر مختلف ہیں۔ یہود حضرت مسیح علیہ السلام کو مفتری اور کاذب کہتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو سُولی پر چڑھا دیا اور اس حالت میں مار ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ دُنیا کا پہلا انسان آدم علیہ السلام گنہگار تھا اور ساری دُنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفت رحمت نے ارادہ کیا کہ دُنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اس کی صفت رحمت نے بیٹا ہونے یعنی ابنیت کی صورت اختیار کی اور اس کو دُنیا میں روانہ کیا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سُولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائنات ماضی و مستقبل کے گناہوں کا کفارہ بن کر دُنیا کی نجات کا باعث بنے۔ یہاں ان

آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف بتا دیا کہ حضرت مسیح کے قتل کے دعویٰ کی بنیاد کسی بھی عقیدے پر مبنی ہو گمراہی اور علم و حقیقت کے خلاف اندازے کا تیر ہے اور اس سلسلے میں صحیح اور مبنی بر حقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد علم و یقین اور وحی الٰہی پر قائم ہے۔ للہذا آج جب کہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلے کے لیے جو شک و گمان کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا، علم و یقین کی روشنی آچکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنون کاسدہ اور اوہام فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو۔ اور حضرت مسیح سے متعلق باطل عقیدے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو تو قرآن کا دوسرا فیصلہ اور وحی الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلان برحق کے مطابق حضرت مسیح عالم اعلیٰ سے کائنات ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہدہ ہو گی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو باول ناخواستہ یا بادل خواستہ اس ذات گرامی پر ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں، برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے بقید حیات ہمارے آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اہل زیغ کے لیے تازیانہ

یہاں یہ بات خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ سورۃ آل عمران کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ توفی نہیں بولا بلکہ بصراحت لفظ موت استعمال کیا گیا۔ سوچیں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ صرف اس لیے کہ آل عمران میں جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اس کے لیے توفی ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران کے تشریحی نوٹوں میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس جگہ براہ راست موت ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح بھی کل نفس ذائقۃ الموت، کا مصداق بننے والے ہیں اس لیے یہاں موت کو بصراحت لانا ہی مقام کا تقاضا ہے۔ اور یہ مزید تائید ہے اس بات کی کہ آل عمران میں لفظ موت کی جگہ توفی کا استعمال ایک خاص مقصد کی خاطر ہوا ہے ورنہ جیسے آل عمران میں ”لفظ توفی“ استعمال ہوا تھا اسی طرح یہاں بھی کہا جاتا یا جیسے یہاں لفظ موت لایا گیا ہے آل عمران میں بھی لفظ موت ہی استعمال ہوتا۔ لیکن قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیب بیان کو پالینا حق کے طالبوں ہی کا حصہ ہے نہ اصحاب زیغ اور ارباب ضلالت کا جو اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کرتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلے کی تمام آیات قرآنی کو اسی سانچے میں ڈھال کر اس کا نام تفسیر قرآن رکھتے ہیں۔

بہرحال جمہور کے نزدیک آیت زیرِ تشریح کی تفسیر یہی ہے جو سپردِ قلم کی جا چکی ہے۔ مشہور محدث جلیل القدر مفسر اور اسلامی مورخ حافظ عماد الدین ابن کثیر اس تفسیر کو عبداللہ ابن عباس اور حسن بصری سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قتادہ، عبدالرحمن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی حق ہے جیسا کہ ہم عنقریب دلیل قاطع سے بیان کریں گے۔

اور جیسا کہ پہلے بتا آیا ہوں کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اسی کو سراہا ہے۔

ہاں اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں۔ مگر وہ دونوں بلحاظ سند ضعیف اور ناقابلِ اعتماد اور اور بلحاظِ سیاق و سباق غلط اور ناقابلِ التفات ہیں۔

ایک یہ ہے کہ موتہ میں ضمیر کا مرجع کتابی کو قرار دیا جائے اور ترجمہ یوں کیا جائے اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے حضرت عیسٰی پر ایمان نہ لاتا ہو۔

دوسرا یہ ہے کہ بہٖ کی ضمیر کا مرجع بجائے حضرت عیسٰی کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور ترجمہ یوں کیا جائے کہ اہل کتاب کا ہر فرد اپنی موت سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے لحاظ سے ناقابلِ اعتبار اور غیر صحیح اور سیاق و سباق قرآنی کے خلاف ہیں۔ عقلی نقطۂ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر اس آیت کے یہ معنے ہیں تو پھر یہ آیت معاذ اللہ اپنے مقصدِ بیان کے خلاف بے معنے اور بے نتیجہ ہے کیونکہ قرآن کا یہ صاف اعلان ہے کہ انسان جب عالمِ دُنیا سے کٹ کر عالمِ غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے لا نزع کی کیفیات اس پر طاری ہو جاتی ہیں تو اس وقت اس کے اعمال کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اس وقت تبدیلِ عقائد اور اعتراف حق کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند۔ تو ایسی صورت میں حضرت عیسٰی یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کا تذکرہ کیا معنے رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت میں ہوتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور دینِ حق کی بتائی ہوئی غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ اس وقت کے ایمان کا اعتبار ہی نہیں ہے۔ اور جب اس قسم کا ایمان قابل قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اس انداز سے ہونا چاہیے تھا جو انداز غرقِ فرعون کے وقت

فرعون کے ایمانی اعتراف کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کے ایمان کا بے قیمت ہونا ظاہر کیا گیا، ذکر لیے اسلوب اور انداز میں کر گویا مستقبل میں ہونے والے کسی عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے۔ جو قرآن کے مخاطبوں یہود و نصاریٰ کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش ہونے والا ہے۔ ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آجانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے یا نہ لائے۔ اس کی اس وقت کی تصدیق کا تعلق انسان کے علم و ادراک سے الگ صرف اس کے خدا کے درمیان ہے۔ اس کا کوئی قانونی مقام نہیں ہے۔ ایسے موقع پر ایسی بات کا تذکرہ قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو ایک خاص معاملہ پر ملزم اور مجرم کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے اور فیصلہ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائنات ارضی میں پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ اس آیت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اور اس پر غور فرمائیے کہ غرغرے کی حالت میں حضور انور اور حضورؐ کی رسالت پر ایمان ہر اس کتابی سے تعلق رکھتا ہے جو اس آیت کے نزول سے پہلے گزر چکا ہے۔ اگر اس آیت میں یہی بات بتانی پیش نظر ہوتی تو اس کے لیے مؤکد مستقبل کی یہ تعبیر لیؤمنن به بلاغت کلام کے بالکل مناسب نہیں ہے اس کے لیے تو ایسی تعبیر ہونی چاہیے جو ماضی، حال اور استقبال تینوں پر یکساں حاوی ہو تاکہ بات اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہو۔ اور آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان والی بات تو اس لیے بھی قطعی غلط ہے کہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے اور آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہے "ویوم القیامة یکون علیهم شهیدا" اور یہ بالکل واضح ہے کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ اور علیہم کی ضمیر سے ان کی امت مراد ہے تو پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع حضور انور کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدہ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشار ضمائر کا موجب ہے۔

غرض بے غل و غش صحیح معنے وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال بھی کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ
لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ
الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ
وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ
فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ
سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

بس یہودیوں کی ظلم کاری کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں
جو ان پر حلال تھیں حرام کر دیں [۲۳۷] اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں
کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے [۲۳۸] - اور اس وجہ سے کہ وہ باوجود
منع کیے جانے کے سود لیتے تھے [۲۳۹] - اور اس وجہ سے بھی کہ وہ

لوگوں کے اموال ناجائز طور پر کھاتے تھے[۲۴۰] - اور ان میں کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[۲۴۱]۔ مگر ہاں جو لوگ ان میں سے علم میں پکے ہیں اور جو ایمان والے اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوتی ہے اور ان پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں ، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کو مانتے ہیں ان کو ہم ضرور اجر عظیم دیں گے[۲۴۲]۔

فضائل و رذائل کا تقابلی مطالعہ

ان آیات میں رذائل کا فضائل سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ پہلے رذائل پیش کیے گئے ہیں ، بعد ازیں ان کے مقابلے پر فضائل بتائے گئے ہیں اور دونوں کے نتائج الگ الگ عذاب الیم اور اجر عظیم بول کر بتائے گئے ہیں یعنی رذائل کا نتیجہ عذاب الیم اور فضائل کا اجر عظیم قرار دیا گیا ہے۔ ظلم کاری راہ خدا یعنی نیکی کے کاموں میں رکاوٹیں کھڑی کرنا ، سود ستانی اور لوگوں کا مال غلط طور پر کھانے کو رذائل میں شمار کیا گیا ہے۔ گویا یہ ام الرذائل ہیں۔ باقی دوسرے رذائل کا بلاواسطہ اور بالواسطہ شجرہ نسب ان ہی سے ملتا ہے۔

یہودیوں کے تذکرے میں ان رذائل کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کہ یہودیوں کی جن اجتماعی برائیوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ان کے ساتھ یہ برائیاں بھی ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں - ان برائیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں اور اسی بنا پر وہ پہلے انبیا کے گستاخ اور بے ادب اور قاتل بنے رہے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ برائیوں سے برائیاں جنم لیتی ہیں اور نیکیوں کی قدریں گر جاتی ہیں۔ اہلِ ایمان کو اشاروں اشاروں میں بتایا جا رہا ہے کہ تم ان برائیوں سے بچ کر رہنا ورنہ تمہارا انجام بھی یہی ہوگا جو یہودیوں کا تمہارے سامنے ہے۔

رذائل کے مقابلہ پر رسوخ علمی، ایمان، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ کو بطور فضائل پیش کیا ہے اور اشارہ کیا ہے کہ یہ اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر ان پر قابو پا لیا جائے تو باقی خوبیوں پر قابو پا لینا بہت آسان ہے۔ اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے کیونکہ اس کا منشا انسان کو صرف اخلاق کا علم بخشنا نہیں بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا حامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے اس لیے وہ یہ بحث نہیں کرتا کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں بلکہ اس سے بحث کرتا ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا جائے اور کس طرح بُرے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اس نے اپنی تعلیم میں فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا۔

قرآن اخلاق کو دو ہی قسموں میں تقسیم کرتا ہے وہ اخلاق جن کو اللہ سبحانہٗ پسند کرتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو اللہ ناپسند کرتا ہے یہ رذائل کہلاتے ہیں۔ اس آیت میں قرآن نے دونوں کا اجمالی اور بنیادی نقشہ پیش کیا ہے۔

۱۶۰۔ پس ہم نے یہودیوں کی ظلم کاری کی وجہ سے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں حرام کر دیں۔

یہاں سمجھنے کی یہ باتیں ہیں۔ اوّلاً یہ کہ یہاں جسے ظلم کہا گیا ہے سورۃ انعام کی آیت ۱۴۶ میں اسے بغی فرمایا ہے ذالك جزيناهم ببغيهم یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی۔ بغی کے معنے زیادتی اور دست درازی کے آتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ ظلم کے مرادف ہے۔ دونوں میں ایک جوہری فرق ہے۔ ظلم کے معنے بے موقع، بے محل اور بے جا استعمال کے ہیں اور یہ اپنی ذات کی حد تک بھی ہو سکتا ہے برخلاف بغی کے کہ یہ اپنی ذات کی حد تک زیادتی کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے حقوق کو ہڑپ کرنا، دوسروں پر دست درازی کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودی دونوں قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، انفرادی اور ذاتی بھی اور اجتماعی اور قومی بھی۔ انفرادی حیثیت میں وہ جھوٹے تھے، زبان کے پھوٹ تھے اور جماعتی حیثیت میں وہ بد عہد اور بے ایمان تھے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں قسم کے گناہوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف قومی اور اجتماعی قسم کے گناہوں کی نشاندہی کی ہے۔ یعنی آیت میں رذائل کو تین لفظوں میں پیش کیا ہے۔ ایک لوگوں کو اللہ کے راستہ

سے روکنا۔ دوسرے سود لینا تیسرے لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ۔ ان قومی رذائل کی جڑ کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے برا کہا ہے۔ اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت خدا کے ناپسندیدہ کام ہیں، اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ ہیں۔ اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو شہریوں کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو محفوظ نہ رہے۔

ان تینوں کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جا سکتی ہے ایک ان میں سے کسی برائی کا اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے۔ آیت میں ترتیب کے ساتھ اجتماعی، معاشی رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے صدعن سبیل اللہ پھر اخذ ربا پھر اکل اموال الناس بالباطل، صدعن سبیل اللہ میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ہمہ گیر ہے، ایمان، اعمال اور اخلاق کی ساری خوبیوں اور اچھائیوں کے خلاف قدغن قائم کرنا اس سے جماعت کی پوری دینی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ سود ستانی سے انسانی معاشرت تباہی اور بربادی کے دہانے پر کھڑی جاتی ہے، اور اکل اموال الناس کی برائی وہ برائی ہے کہ جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ تو ایک نظریہ کے مطابق ان رذائل کی ترتیب ہے، دوسرے نظریہ کی رو سے پہلے وہ ذمیم کردار ہے جس سے خدا کی رضا چھن جاتی ہے۔ پھر وہ برائی ہے جس سے خدا کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہے جس سے خدا کی رحمت سے خالی ہو جاتا ہے۔

ثانیاً یہ مضمون قرآن عزیز میں تین جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے کل الطعام کان حلاً لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ۔ "کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، البتہ جو چیزیں ایسی تھیں جن کو تورات نازل ہونے سے پہلے حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ پھر اس آیت میں فرمایا کہ فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں بنی اسرائیل کے ظلم کی وجہ سے ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔ اس کے بعد آٹھویں پارے میں اس اجمال کی تفصیل آ رہی ہے جس میں بتایا ہے کہ ان سرکشیوں کی وجہ سے ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے، بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھہرا دی۔ ان تین آیتوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حلت و حرمت کے معاملے میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجوہ پر مبنی ہے۔

ایک یہ کہ نزول تورات سے صدیوں پہلے حضرت یعقوب نے کچھ چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی ان چیزوں کو چھوڑے رکھا تھا تاآنکہ یہودی علماء نے ان پر قانونی حرمت قائم کر دی۔ اور ان کی حرمت تورات میں لکھ لی۔ ان اشیاء میں اونٹ، خرگوش اور سافان شامل ہیں۔ آج انجیل میں تورات کے جو اجزاء موجود ہیں، ان میں ان تینوں چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے چنانچہ احبار کے باب ۱۱ میں ہے،

مگر ان میں سے جو جگالی کرتے ہیں یا کھوان کے چرے ہوئے ہوتے ہیں ان کو نہ کھاؤ جیسے اونٹ وہ جگالی تو کرتا ہے پر کھر اس کا چرا ہوا نہیں ہوتا، سو وہ تمہارے لیے ناپاک ہے۔ اور صافن کہ وہ جگالی کرتا ہے اور کھر اس کا چرا ہوا نہیں تو وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ اور خرگوش کہ وہ جگالی تو کرتا ہے پر اس کا کھر چرا ہوا نہیں ہے وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے اور سؤر کہ کھر اس کا دو حصہ ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرا ہے، پر وہ جگالی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ تم ان کے گوشت میں سے کچھ نہ کھائیو، اور ان کی لاشوں کو نہ چھوئیو کہ یہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ (۴-۵-۶-۷)

اور استثنا کے باب ۱۴ میں ہے،

لیکن ان میں سے کہ جگالی کرتے ہیں یا ان کے کھر چرے ہوتے ہیں۔ تم ان کو نہ کھاؤ جیسے اونٹ، خرگوش اور ریربوع اس لیے کہ یہ جگالی کرتے ہیں، لیکن ان کے کھر چرے ہوتے نہیں ہیں سو یہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ اور سؤر کہ اس کے کھر چرے ہوتے ہیں پر جگالی نہیں کرتا وہ تمہارے لیے ناپاک ہے تم ان کا گوشت نہ کھائیو اور نہ ان کی لاش کو ہاتھ لگائیو۔ (۶-۷-۸)

لیکن آل عمران میں یہودیوں کو جو یہ چیلنج دیا گیا تھا کہ

فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین

اور دکھاؤ تورات اور پڑھو اس کو تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تورات میں ان احکام کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے کیونکہ اگر اس وقت تورات میں یہ احکام ہوتے تو یہودی فوراً لاکر پیش کر دیتے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور خود ہی شارع بن بیٹھے

تو انہوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی موشگافیوں سے خود حرام کر لیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر اسے قائم رہنے دیا۔ ان اشیاء میں ایک تو ناخن والے جانور شامل ہیں جیسے شتر مرغ، قاز، بطخ، وغیرہ دوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ بائیبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکام تورات میں نقل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ تورات میں کتاب احبار کے گیارہویں باب میں ہے۔

اور پرندوں سے جن سے تم گھن کرو اور جن کو نہ کھاؤ اس لیے کہ وہ مکروہ ہیں۔ سو یہ ہیں۔ نسر عقاب اور گدھ، اور چیل اور شاہین اور سب اس کی قسمیں اور کوے اور اس کی اقسام، اور شتر مرغ اور اُلو اور کوکل اور باز اور سب اس کی قسمیں اور بوم اور ہڑگیلا اور رخم اور لق لق اور بگلا اور سب اس کی قسمیں اور ہُد ہُد اور چمگادڑ اور سب پرندے جو چار پاؤں پر چلتے ہیں وہ تمہارے لیے مکروہ ہیں (۱۳ سے ۲۰ تک)۔

اور تورات کے کتاب احبار کے باب ہفتم میں ہے:

پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم کر کہ بیل اور بھیڑ اور بکری کی چربی نہ کھائیو۔ اور اس حیوان کی چربی بھی جو خود بخود مر گیا یا جس کو درندوں نے پھاڑا ہو تو اسے اور کاموں میں لا سکتے ہو پھر اس کو ہرگز نہ کھائیو۔

لیکن قرآن کی اس آیت کا اشارہ بتایا ہے کہ یہ چیزیں تورات میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسیٰ کے بعد حرام ہوئی ہیں۔ اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی مدوین دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی مگر یہ نکتے کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے اصل یہی ہے اور یہی عام مفسرین کی رائے ہے کہ نزول انبیاء بنی اسرائیل کے زمانے میں یہ سب چیزیں یہودیوں پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بطور سزا حرام ہوئی ہیں۔ یہ صورت اپنی جگہ معنویت بھی رکھتی ہے اور اس کے لیے تاویل کے کسی کمزور سہارے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

پہلی صورت میں یعنی یہ کہ یہ چیزیں حضرت عیسیٰ کے بعد خود یہودی علماء نے اپنے لیے حرام کی تھیں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو قرآن نے یہاں حرمنا طیبات احلت لہم کی تعبیر کیوں اختیار کی ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ خدائی تحریم کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پیغمبر یا کتاب کے ذریعے سے کسی چیز کو حرام کرے بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بناوٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں کو مسلط کر دے اور

وہ ان پر طیبات کو حرام کر دیں ، ایک بے معنے تاویل ہے ، اصل یہی ہے کہ یہ تحریم نبوت ہی کے ذریعے اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہوئی ہے اور بطورِ سزا ہوئی ۔ مولانا آزاد کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ

جب کسی جماعت میں راست بازی اور پرہیزگاری باقی نہیں رہتی تو مباح اور جائز باتوں کا بھی استعمال اس طرح کرنے لگتی ہے کہ طرح طرح کی برائیوں کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور اس وقت مصلح کے لیے ضروری ہو جاتا ہے سداً للذریعہ ان جائز باتوں کو بھی عارضی طور پر روک دے ۔ چنانچہ یہودیوں کی بے لگام طبیعت کا یہی حال تھا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کتنی ہی حلال چیزیں جن کے لیے پہلے کوئی روک ٹوک نہ تھی معلوم روک دی گئیں ۔ یہاں اسی معاملہ کی طرف اشارہ ہے ۔

اللہ کی راہ سے رُکنا اور روکنا

۲۳۸ ۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے ۔ صد کے عربی میں رکنے اور روکنے کے معنے آتے ہیں یعنی لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی ۔ عام شارحینِ قرآن نے یہاں متعدی معنے لیے ہیں ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ وہ غلط قیادت کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں یا یہ کہ لوگوں کو منکرات کا حکم دیتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں بلکہ اس قدر بے باک ہو چکے ہیں کہ مجرمین کی قیادت کر کے اکابر مجرمین کا منصب اختیار کر لیتے ہیں اور دنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو بھی آوازہ بلند ہوتا ہے اس کی قیادت بھی یہودی کرتے ہیں ، اور اللہ کی طرف بلانے کے لیے جو آواز اٹھتی ہے اس کے مقابلہ میں سب سے بڑی روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ اللہ کی کتاب ، اللہ کے رسولوں کو ماننے والے ہیں ۔ دنیا میں تمام بری تحریکوں کا شجرۂ نسب بالواسطہ اور بلاواسطہ یہود سے ملتا ہے ۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے انکار اور اس کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہوا ، اس کا سہرا ان ہی کے سر پر ہے چاہے وہ فرائڈ کا نظریہ جنسیت ہو یا کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت ، مذہب کے لباس میں نہیں بلکہ فلسفہ کے لباس میں نمودار ہو کر پوری انسانیت کو اللہ کے راستے سے روک رہا ہے ۔ اس کی اسلام کے خلاف جارحانہ کارروائیاں مذاہب باطلہ کی جارحانہ کارروائیوں سے بالکل مختلف ہیں ۔ مذاہب باطلہ براہِ راست اور بلاواسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتے تھے یہ باطل فلسفہ یعنی اشتراکیت اور جنسیت براہِ راست اسلام کے مقابلہ پر نہیں آتا بلکہ علم اور عقل کے نام سے مقابلہ کرتا ہے ۔ وہ

جب اسلام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو اسلام کا نام نہیں لیتا بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے کہ گویا اسے معلوم ہی نہیں کہ اسلام بھی اس کے حریف کی حیثیت سے دنیا میں موجود ہے بلکہ وہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح کرتا ہے، خدا، رسول، کتاب اور آخرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات ہی کا ایک نظریہ ہے۔ وہ عقیدہ اور سند کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کو علم اور عقل کے معیار پر پرکھتا ہے اور صرف اور اس کے ناقابلِ تغیر و تردید قوانین کے نام لا مذہبیت اور دہریت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اسلامی غیرت کا زوال

یہی یہودی جب مذہب کے نام پر اسلام کی راہ روکتا تھا تو ہماری اسلامی حمیت جوش میں آجاتی تھی اور ہمارے دل میں اس کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت اور محافظت کا جذبہ ابھرتا تھا۔ ہمیں ذرہ بھر شبہ نہ ہوتا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے اور اس کا اثبات اسلام کی نفی ہے لیکن یہی یہودی جب سے اشتراکیت اور جنسیت کے نظریات کے نام پر اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن کر آیا ہے تو ہماری اسلامی غیرت کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی مدافعت اور حمایت کا جذبہ کمزور ہو گیا۔ جب اس کے دام ہمرنگ زمین میں پھنستے ہیں تو بے علمی اور جہالت قبول کرتے ہیں اور اسے علم کا نام دیتے ہیں اور بے عقلی و نادانی اختیار کرتے ہیں اور اسے عقل اور زیرکی سمجھتے ہیں۔ ہم اشتراکیت اور جنسیت کے نام پر ان کے نظریات کو مانتے ہیں اور ہمارے دل میں یہ بات کھٹکتی نہیں ہے کہ ان کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ صد عن سبیل اللہ ہے۔ ہم ان کو حریف نہیں حلیف سمجھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بربادی کی جو کوششوں میں یہودی مصروف ہیں وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے زیادہ موثر اور زیادہ کامیاب ہو رہی ہیں۔

یہودی رکاوٹ دام ہمرنگ زمین ہے

غلط مذہب کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو خیرباد کہتا تھا تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جا کر شدھی یا بپتسمہ کی ایک خاص رسمی کارروائی میں سے گزرے اس کے بعد وہ مسلمانوں کی

جماعت سے الگ ہو جاتا تھا اور ان سے ہر قسم کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کر لیتا تھا۔ اس کی عبادات کی رسمیں اور بود و باش کے طریقے بدل جاتے تھے اور وہ شادی بیاہ اور دوستی اور رشتہ داری اور میل ملاقات کے لیے ایک دوسری قوم سے راہ و ربط پیدا کرتا تھا۔ اس طرح اس کا کفر کھل کر سامنے آجاتا۔ اسلام سے اس کی دشمنی اور نفرت آشکارا ہو جاتی تھی اور مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار ہو جاتے لیکن یہودی باطل فلسفہ کے اثر سے اب جب کوئی مسلمان اشتراکیت کو اختیار کرتا ہے تو وہ مجبور نہیں ہوتا کہ قسمہ یا شدھی کی طرح کی کسی رسمی کارروائی میں سے گزرے یا مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے یا ان سے اپنے سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کرے یا اپنی بود و باش کے طریقوں کو بدلے کیونکہ یہودیت کے صد عن سبیل اللہ کے اس نئے روپ نے اپنے پیرواؤں کو اجازت دے رکھی ہے کہ تم مذہب سے بیزار ہو کر اور خدا اور رسول کے دشمن بن کر بیٹھتے ہوئے اسلام کے دائرے میں اگر رہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ اس دشمن دین و ایمان سے آج مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر یا وحی و رسالت کے یا حیات بعد الموت کے یا جزا و سزا کے اور یا ان سب کے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اسلامی نظام اس زمانے میں ناقابل عمل ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ مذہب ایک ڈھکوسلا ہے۔ جو یا تو اقتصادی حالت کا نتیجہ ہوتا ہے یا دبی ہوئی جنسی خواہشات کا رد عمل۔ پھر ان میں سے کوئی اسلام کے معاشی نظام کو فرسودہ اور بیکار سمجھتا ہے۔ کوئی اسلامی حکومت کی تجویز کا مذاق اڑاتا ہے کوئی جنسی تعلقات پر اسلام کی لگائی ہوئی پابندیوں کو ایک فطری عمل کی ناجائز مضر صحت اور بے وقت رکاوٹ سمجھ کر ان کا استخفاف کرتا ہے کوئی اسلام کے عبادت کے طریقوں کو بے معنی سمجھتا ہے۔ کوئی زکوٰۃ کو موقوف کرنا چاہتا ہے کوئی حج کو، کوئی نماز کو اور کوئی روزے کو۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کی بنیادی باتوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کے اساسی اصولوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے غیر اسلامی تصورات پر اسلام کا لیبل لگاتے ہیں۔ ان ساری کارگزاریوں کے باوجود یہ لوگ مسلمان بنے رہتے ہیں اور مسلمانوں سے شادی بیاہ، دوستی اور رشتہ داری، میل ملاقات اور کھانے پینے کے تعلقات رکھے ہوتے ہیں۔ واللہ فالی اللہ المشتکی۔

ہمارے شارحین قرآن نے اس آیت میں اللہ کے راستے سے روکنے سے مراد یہ بتا کر یہودی لوگوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ آیت کی معنویت میں بہت بڑی الجھن پیدا کر دی۔ کیونکہ اگر آیت سے مراد یہ ہے تو یہودیوں کا لوگوں کو نبوت محمدیہ کے ماننے سے روکنا طیبات کے حرام ہونے کی کیسے علت بن سکتا ہے، حالانکہ گفتگو یہود کی قومی زندگی کے

شناعت پر ہو رہی ہے۔

آیت میں کثیراً کے اضافے سے فقرے میں بہت بڑی معنوی وسعت آگئی ہے۔ کثیراً کے ایک معنے تو یہی ہیں کہ وہ بہت لوگوں کو راہِ حق سے روکتے تھے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان میں لوگوں کو راہِ حق سے ہٹانے اور روکنے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ تیسرے معنے یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ نہ صرف کثیراً وہ عرصہ دراز تک یہ کام کرتے رہے ہیں۔ بہرحال کثرت کا کمیت اور کیفیت اور زمانہ تینوں سے تعلق ہو سکتا ہے۔

یہود کو سُود کی ممانعت

۱۳۵۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ باوجود منع کیے جانے کے وہ سُود لیتے تھے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن بتا رہا ہے کہ یہودیوں کے لیے بلا قید سُود حرام تھا لیکن یہود کے احبار اور فقہاء نے اس میں بھی قیدیں لگا رکھی تھیں۔ چنانچہ توراۃ کی کتاب خروج کے باب ۲۲ میں ہے:

اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سُود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سورج کے ڈوبنے اس کو واپس کر دینا۔ کیونکہ فقط وہی ایک اس کا اوڑھنا ہے اس کے جسم کا وہی لباس ہے۔ پھر کیا وہ اوڑھ کر سوئے گا۔ پس جب وہ اوڑے گا تو میں اس کو سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں۔

(آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷)

اور توراۃ کتاب احبار کے باب ۲۵ میں ہے:

اور اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تہی دست ہو جائے تو تم اس کی دستگیری کرو خواہ وہ اجنبی ہو خواہ مسافر تاکہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اس سے سُود اور نفع مت لے، پھر اپنے خدا سے ڈر و تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اسے سُود پر روپیہ قرض دے نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں جو تم کو زمین مصر نکال لایا تاکہ تمہیں کنعان کی زمین دوں اور تمہارا خدا ہوں۔ (۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸)

اور توراۃ کی کتاب تثنیہ الاشتراع میں ہے:

تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا نہ نقد کے سود پر نہ غلہ جات کے سود پر، نہ کسی چیز کے جس کی عادت پر سود پر کی جاتی۔ تو اجنبی کو سود ی قرض دے سکتا ہے پر اپنے بھائی کو سودی قرض نہ دینا تاکہ خداوند تیرا اس سرزمین میں جس کا تو وارث ہونے جاتا ہے۔

ان سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ لگائے تجھے برکت دے۔ (۲۰،۱۹)

بلا ریب یہ اجنبی اور بھائی، یگانے اور بیگانے کی سود کے موضوع پر تفریق اُس تورات کی ہرگز آواز نہیں ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی ہے۔ یہ یہودی احبار کا تحریفی کارنامہ ہے یا پھر اصل تورات کی گمشدگی کے بعد روایت بالمعنیٰ ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل کی تصریحات بتا رہی ہیں کہ سود یہودیوں پر بلا قید حرام تھا اس میں یگانے اور بیگانے کی کوئی تقسیم نہ تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ۱۵ زبور میں فرماتے ہیں،

اے خداوند تیرے خیمے میں کون رہے گا۔ تیرے کوہ مقدس پر کون سکونت کرے گا۔ وہ جو سیدھی چال چلتا ہے اور صداقت کے کام کرتا ہے اور اپنے دل سے سچ بولتا ہے وہ جو اپنی زبان سے چغلی نہیں کھاتا اور اپنے ہمسایہ سے بدی نہیں کرتا اور اپنے پڑوسی پر عیب نہیں لگاتا ہے۔ وہ جس کی نظر میں نکما آدمی خوار ہے پر وہ انہیں جو خداوند سے ڈرتے ہیں عزت دیتا ہے۔ وہ جو اپنے ضرر پر قسمیں کھاتا ہے اور بدلتا نہیں۔ وہ جو سود کے لیے قرض نہیں دیتا، اور بے گناہوں کو ستانے کے لیے رشوت نہیں لیتا وہ جو یہ کرتا ہے کبھی نہ ٹلے گا۔

حضرت سلیمان نے جہاں امثال میں بُرے لوگوں کا چہرہ پیش فرمایا ہے وہاں یہ ایک نشانی بتائی ہے۔

جو سود خواری اور ظلم سے اپنی دولت بڑھاتا ہے وہ اس کے لیے جو مسکینوں پر رحم کرے بٹورتا ہے۔ (۸،۹)

حضرت حزقی ایل اپنی ربانی وحی میں اچھوں اور بروں کے اعمال کی عکاسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اور کسی پر ستم نہیں کیا، اور قرض دار کا گرو پھیر دیا۔ اور ظلم سے کچھ چھین نہیں لیا ہے۔ بھوکوں کو اپنی روٹی کھلائی ہے اور ننگے کو کپڑے پہناتے ہیں۔ سود پر نہیں دیا لیا اور بدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ (۷،۸)

ظاہر ہے کہ ان انبیاء کی شریعت و قانون کا نام تورات ہے اس لیے اصل تورات میں سود

علی الاطلاق حرام تھا لیکن بعد میں یہودی فقہاء اور ان کے احبار کی ہاتھ کی صفائی نے اس میں تبدیلی لگادی۔ اور سود ہی پر کیا موقوف ہے لین دین میں دیانتداری کے جس قدر بھی دینی احکام ہیں یہود میں وہ صرف اس لیے ہیں کہ اپنے آدمیوں کے ساتھ بد معاملگی نہ کی جائے لیکن اگر آدمی دوسرے مذہب اور گروہ کا ہوگا تو اس کے ساتھ سچائی اور دیانت داری سے پیش آنا کچھ ضروری نہیں۔ جس طرح بھی غیروں کا مال کھا لیا جائے جائز ہے۔ گویا انہوں نے دین و صداقت کو اپنی نسل اور گروہ کا حق سمجھ لیا تھا۔ یہ قرآن نے اگر بتایا کہ دیانت تو ہر حال میں دیانت ہے اور خیانت ہر حال میں خیانت ہے۔

لوگوں کے اموال کو ناجائز طور پر کھانا

۲۴۰- اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طور کھاتے تھے۔ اس فقرے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدے اٹھاتے تھے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کی امانتوں میں خیانت کر کے لوگوں کا مال کھاتے۔ الفاظ میں اس قدر عموم ہے کہ اس کی آغوش میں سارے وسائل آجاتے ہیں۔ اس فقرے میں قرآن نے یہود کے جرائم کی فہرست میں بتایا ہے کہ وہ ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے تھے۔ اس فقرے میں ان تمام طریقوں کی جو لین دین میں ایمانداری کے خلاف ہیں داستان بیان کر دی ہے اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے، یعنی وہ کسی کی چیز دھوکا اور فریب سے لیتے یا زور و ظلم سے لیتے، غصب کرتے، چوری کرتے اس میں خیانت کرتے، رشوت لیتے غرض ہر ناجائز طریقہ سے دوسرے کا مال لیتے۔

اُخروی سزا

۲۴۱ اور ان میں سے کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ دنیوی سزا بیان کرنے کے بعد اس فقرے میں ان کی آخرت والی سزا بیان ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے یہود کی اگلی پچھلی سخت سے سخت شرارتیں ذکر فرما کر جس سے ان کی سرکشی اور ان کا گناہوں پر دلیر ہونا ظاہر ہوگیا اب فرماتے ہیں کہ اسی واسطے ہم نے ان پر شریعت بھی سخت رکھی کہ ان کی سرکشی ٹوٹے تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ تحریم طیبات تو ان پر تورات میں کی گئی تھی، اور حضرت عیسیٰ کی مخالفت کرنا اور حضرت مریم پر تہمت لگانا نزول توریت کے بعد میں ہوا تو سزا جرم سے کیسے مقدم ہوگی۔ اس تمام رکوع کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ سے اہل کتاب برابر ایک نہ ایک شرارت، نافرمانی اور

عہد شکنی اور حضرات انبیاء کو ایذا رسانی کرتے چلے آتے ہیں۔ اب اگر اے محمد رسول اللہ تم سے خلاف تورات جیسی کتاب دفعۃً واحدۃً طلب کریں اور قرآن جو سب کتابوں سے افضل ہے۔ اس پر کفایت نہ کریں تو ان متعصب نالائقوں سے کیا بعید ہے ان کی اس قسم کی ناشائستہ حرکات پر تعجب نہ کرو اور متحیر نہ ہو ان کی تمام حرکات چھوٹی بڑی اگلی پچھلی ہم کو خوب معلوم ہیں۔ ہم نے بھی سخت شریعت ان کے لیے دنیا میں رکھی اور آخرت میں عذاب عظیم ان کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ [1]

مقصد یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے میں جو چیزیں ان کے لیے مانع ہیں وہ دراصل ان کے یہ جرائم ہیں۔ یہ ہمیشہ سے گردن کش اور نافرمان ہیں۔ انہوں نے اپنی سرکشی سے اپنے اوپر حلال چیزیں حرام کرائی ہیں اور اپنی سرکشی ہی کے سبب سے حق کی راہ میں روڑے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہی چیز ہے جس نے ان کے حرام خوری کے سارے دروازے کھول دیئے جن کا کردار یہ ہو ان سے کس طرح توقع کرتے ہو کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر قرآن پر ایمان لائیں گے فرمایا ان میں سے جتنے بھی کفر پر جم گئے ہیں ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ [2]

مقصد یہ ہے کہ اس قوم کے جو لوگ ایمان و طاعت سے محروم ہو چکے ہیں اور بغاوت و سرکشی کی روش پر قائم ہیں ان کے لیے خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو عبرتناک سزا ان کو مل رہی ہے وہ کبھی کسی دوسری قوم کو نہیں ملی ہے دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزت کا ٹھکانا میسر نہیں۔ دنیا میں تتر بتر کر دیئے گئے ہیں۔ اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں ذلت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہیں۔ اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو اور پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مٹتی ہیں مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی۔ اس کو دنیا میں لا یموت فیھا ولا یحیٰی کی سزا دی گئی ہے تاکہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگزشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلے میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے رہی آخرت تو انشاءاللہ وہاں کا عذاب اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا۔ [3]

اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سزائیں عموماً اجتماعی ہوتی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] تفہیم القرآن

چنانچہ فلاں شمرتوں سے ساری قوم محروم کر دی گئی لیکن آخرت میں سزائیں تمامتر انفرادی اور شخصی حیثیت سے ملتی ہیں۔ ہر ہر فرد اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتے گا۔ جہنم کا عذاب الیم صرف ان ہی افراد کو ہونا جو مجرم ہوں گے۔ ۱؎

اہل کتاب کے علماء حقانی

۱۶۲ - مگر ہاں ان میں جو لوگ علم میں پکے ہیں۔ اور جو ایمان والے اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی ہے اور اس پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔ ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کو مانتے ہیں۔ ان کو ہم ضرور اجر عظیم دیں گے۔ یعنی بنی اسرائیل میں جن کا علم مضبوط ہے جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور جو لوگ صاحب ایمان ہیں، وہ مانتے ہیں قرآن، توریت اور انجیل سب کو اور نماز کو قائم کرنے والوں کا تو کیا کہنا ہے اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان رکھنے والے اللہ پر اور قیامت پر اور ایسے لوگوں کو ہم اجر عظیم بخلاف اوّل فریق کے کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ ۲؎

راسخین فی العلم سے مراد وہ علماء ہیں جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے تھے۔ علم میں طول و عرض اور عمق تینوں ہوتے ہیں، علم کا عمق ہی رسوخ کہلاتا ہے۔ صحیح علم طول و عرض کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے رسوخ اور عمق کا نام ہے۔ اکتسابی اور رسمی فنون چونکہ محض انسانی دماغ کی تخلیقات ہیں اس لیے قطعی نہیں بلکہ ظنی ہیں اور ظنیات ہیں چونکہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لیے تحصیل یقین کی سعی میں دلائل اور تحقیقات کا طول خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن وحی کا علم قطعی ہے وہ جتنا منقول ہے سب مغز ہی مغز ہے۔ اس میں طول و عرض نہیں ہوتا۔ اس کی گہرائی بے اندازہ ہوتی ہے اس سے پہلے یہودیوں کے بارے میں یہ انکشاف کیا تھا مالهم به من علم الا اتباع الظن اب یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان یہودیوں میں کچھ ایسے ہیں جن کا علم ظنیات کا نہیں بلکہ علم میں رسوخ حاصل ہے۔ یعنی ان کو علم سطحی نہیں بلکہ عمیق علم حاصل ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی چیز کو ان الفاظ میں پیش فرمایا اولئک ابرهم قلوبا و اعمقهم علما یہ لوگ دل کے بے حد نیک اور علم میں بڑے گہرے ہیں۔ علامہ شاطبی غرناطی نے الموافقات

۱؎ تفسیر ماجدی ۲؎ افادات شیخ الاسلام

نے شرح میں تیرہ مقدمات لکھے ہیں ان میں ہر مقدمہ اہم اور ضروری ہے لیکن بارہواں مقدمہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ فرماتے ہیں کہ علم ہمیشہ محقق اور راسخ فی العلم سے حاصل کرنا چاہیے۔ راسخ فی العلم کی نشانی یہ ہے کہ اس کے علم کا نسب نامہ صحیح ہو یعنی اس نے علم شیوخ کی زیر نگرانی حاصل کیا ہو۔ صحبت اور ملازمت شیخ کو رسوخ علم میں بڑا دخل ہے۔ صحابہ کا علم اسی طریق پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں ایک قل ھو اللہ احد پڑھنے والا مسئلہ توحید کو جس خوبی اور پختگی کے ساتھ سمجھا ہوا تھا۔ آج ہمارا تیس پاروں کا حافظ عالم بھی اس کا عشر عشیر نہیں سمجھتا ہے۔ یہود میں علماء کم نہ تھے بے شمار تھے لیکن شریعت ان کے لیے ایک نمائشی جامے کی حیثیت رکھتی تھی جس کو وہ پہن کر بازاروں اور عوام میں نکلا کرتے تھے۔ ان کے فکر و نظر اور قلب و روح سے علم کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں البتہ ان میں جو نفوس قدسی دین کی حقیقت سے آشنا تھے ان کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔ یہاں ان ہی نفوس قدسی کو جو عام علماء یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علماء سے نہیں بلکہ راسخون فی العلم سے پیش کیا ہے یعنی یہ آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقف حق پر جمنے والے ہیں۔

آیت میں المؤمنون سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جو اگرچہ راسخین فی العلم کا درجہ تو نہیں رکھتے لیکن اپنی فطرت کی سلامتی، دل کی صلاحیت اور کردار کی پاکیزگی کے اعتبار سے تمام سوسائٹی میں ممتاز تھے اور یہود کے عام بگاڑ کے باوجود وہ خدا کی ہدایت و شریعت پر قائم تھے اور جب اسلام کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے بھی آگے بڑھے۔ گویا ان کا علم راسخ اور ایمان ہی ان کی قیادت کر رہا تھا کہ دین کامل کو مانا جائے۔

تمام نبیوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں۔ توحید کامل اور رسالت محمدی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل اور لاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا اور بس۔ اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔ ان یہودیوں کے رسوخ علمی اور ایمان نے ان کو اس ہدایت امر کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے۔

اگرچہ شارحین قرآن نے ایسے یہودی علماء کے دور نبوت میں نام بھی بتائے ہیں لیکن الفاظ قرآنی عام ہیں اور قیامت تک کے لیے ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ کی فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے اسی لیے فرمایا یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک یہ مبتدا کی خبر ہے۔ یعنی یہ راسخین

فی العلم اور سلیم الفطرت لوگ اس قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس سے پہلی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب کا یہی گروہ ہے جس کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ:

اب جو ایمان لاتے اور جو یہودی ہوتے اور نصرانی اور صابی، جو بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا۔

ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ایمان کامل ہے اور اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ قرآن نے ایمان کامل کا چہرہ یہ پیش کیا ہے:

قل آمنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسماعیل واسحاق و
یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم، لا
نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔

قرآن نے اس آیت میں ایمان کامل یہ بتایا ہے کہ خدا اور اس کے تمام رسولوں کو مانا جائے کسی ایک کی تصدیق کرنی باقی سب کا انکار کر دینا یا سب کی تصدیق کرنی اور کسی ایک کا انکار کر دینا ایمان کامل نہیں ہے۔ اس کے بعد ان اہل ایمان اور راسخین فی العلم کی عملی زندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ اور اعمال میں اولیت نماز کو دی ہے اور نماز کی اہمیت کی وجہ سے عام انداز بیان چھوڑ کر اختصاصی اور مدحی انداز اختیار کیا ہے چنانچہ فرمایا والمقیمین الصلوٰۃ اور نماز قائم کرنے والے۔ عام تعبیر تو والمقیمون الصلوٰۃ ہونا چاہیے کیونکہ اس کا عطف والمؤمنون پر ہے لیکن نماز کی اہمیت اور زندگی میں اس کے اختصاصی مقام کو اجاگر کرنے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کی خصوصیت اور ستائش جتانی مقصود ہوتی ہے تو اسے منصوب کر کے لاتے ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ تعبیر کی اس تبدیلی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عام انداز کو چھوڑ کر یہ خاص انداز سننے والے کے لیے ایک طرف دلکش ہوتا ہے اور دوسری طرف بغیر کسی اضافے کے محض تبدیلی سے اس میں اختصاص کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گویا ان کی جن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں غیر معمولی تعریف ہو گئی۔ خاص شارحین قرآن نے اپنے ترجمہ میں بھی اس کی رعایت کی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ مدح می کنم برپا دارندگان نماز را۔ اور شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں اور آفرین نماز قائم کرنے والوں کو۔ نماز اور زکوٰۃ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے ان کی عملی زندگی کے تذکرے میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا۔ آخر میں والمؤمنون باللہ والیوم الآخر کا مقام وہی ہے جو سورۃ البقرہ کے شروع میں

وبالآخرۃ ھم یوقنون کا ہے۔ جس طرح وہاں یؤمنون بالغیب اور دوسری صفات کے ذکر کے بعد یقین آخرت کو بیان کیا۔ کیونکہ آخرت پر یقین اس زندگی میں تمام خیر اور تقویٰ کا اصل محرک ہے اسی طرح یہاں بھی آخرت کی تذکیر کے لیے اس کا اعادہ فرمادیا۔ کیونکہ تمام دینی زندگی کی اصل بنیاد ایمان بالآخرت ہے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ
بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَ
يَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَ
هَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ۝ وَرُسُلًا
قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ
عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۝ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَ
مُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ
ٱلرُّسُلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ لَّٰكِنِ ٱللَّهُ يَشْهَدُ
بِمَآ أَنزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنزَلَهُۥ بِعِلْمِهِۦ ۖ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ
وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا ۝

---

[۲۴۳] اے پیغمبر ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے، جس طرح
نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کو روانہ کی تھی اور ہم نے ہی

ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب
یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی روانہ کی تھی، اور ہم نے ہی
داؤد کو زبور دی[۲۲۴]۔ اور خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم قرآن میں
پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا اور
اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے[۲۲۵]۔ یہ
تمام رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے
تاکہ ان کو روانہ کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں
کوئی حجت نہ رہے اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا
ہے[۲۲۶]۔ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں، مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ
اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر
فرشتے بھی گواہ ہیں، اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے[۲۲۷]۔

انبیاء میں حضور انور کا مقام

یہودیوں کے اس گروہ نے اعتراض کیا کہ آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب نہیں اتری پہلے انزال

جواب دیا تھا اب اس آیت میں اس کا تحقیقی جواب دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ سوال طرز جاہلانہ ہے کیونکہ نبی انہیں کہتے ہیں جن پر اللہ کی وحی آتی ہے انہیں نہیں کہتے جو آسمان سے کتاب لے کر آتے۔ یہ بے شمار نبی جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی ایسی کتاب نازل نہیں ہوئی، کیونکہ ایسا ہونا سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ جس طرح خدا نے ہمیشہ نبیوں کو اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کر کے باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام آیات قرآنیہ میں سے اس آیت کا انتخاب یہی سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ نبی وہ گرامی قدر شخصیت ہوتی ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آتی ہے اور صرف اتنی بات نہیں بلکہ آیت کے انتخاب سے، یہی جتانا چاہتے ہیں کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں۔ انبیاء مرسلین اور انبیاء مجددین۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق قسم اول سے ہے۔ اور اس آیت کے ذریعے یہ بھی سمجھایا ہے کہ اللہ کا دین ہمیشہ اپنے اصول اور اپنی بنیادی تعلیمات میں ایک ہی رہا ہے۔ اس دین کے جو مختلف ایڈیشن الگ الگ شریعتوں کی شکل میں بعثت کے آغاز سے لے کر نزول قرآن تک آتے رہے ہیں۔ ان کی ظاہری صورتوں اور ان کی تفصیلات میں تو جغرافیائی، تمدنی، نسلی اور قومی حالات اور زمانے کے تقاضوں کے اختلاف کی بنا پر فرق ضرور ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کی روح اور ان کے اصول و مبادی میں کسی فرق کا سوال خارج از بحث ہے۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشبہ اور انبیاء کو مشبہ بہ قرار دے کر یہ بھی سمجھایا ہے کہ جو کمالات فرداً فرداً سب میں تھے ان کا مجموعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں ان سب کے وہ کمالات جو ان انبیاء میں انفرادی طور پر موجود تھے آنحضور کے جامع ہیں۔ اس میں ایک طرف انبیاء مرسلین میں حضرت نوح اور ابراہیم کا تو دوسری طرف انبیاء مجددین میں حضرت اسماعیل، اسحاق، یعقوب، حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت ہارون، حضرت سلیمان، حضرت داؤد اور حضرت موسیٰ کا ذکر کر کے بتا دیا ہے کہ وہ کمالات روحانی، مادی جو ان میں الگ موجود تھے وہ سب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں موجود تھے۔

۱۶۳۔ اے پیغمبر ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی روانہ کی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین مکہ جملہ کفار قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت میں طرح طرح سے بیہودہ شبہ پیدا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی کہہ دیا کہ جیسے توریت سب کی سب ایک دفعہ اتری تھی ایسے ہی تم بھی ایک کتاب آسمان سے لاؤ تو ہم تم کو سچا جانیں۔ بقول شخصے خوئے بد را بہانہ بسیار، سو حق تعالیٰ نے اس جگہ چند آیتیں نازل فرما کر اس کی حقیقت واضح کر دی۔ اور وحی کی عظمت اور کفار کے سب خیالات اور شبہات

بیہودہ کو رد کر دیا اور وحی الٰہی کی متابعت کو عامۃً اور قرآن مجید کی اطاعت کو خصوصاً بیان فرما کر بتلا دیا کہ علم الٰہی کا ماننا سب پر فرض ہے۔ کسی کا کوئی عذر اس میں نہیں چل سکتا جو اس کو تسلیم کرنے میں تردد یا تامل کرے یا انکار کرے وہ گمراہ اور بے دین ہے۔ اب یہاں سے تحقیقی جواب دیا جا رہا ہے۔

وحی اور اس کی عظمت

ایسا بیان فرما کر یہ بتانا مقصود ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی اور عجیب چیز لے کر نہیں آئے جو پہلے کبھی نہ آئی ہو۔ آپ کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں اکیلا پیغمبر بن کر آیا ہوں، بلکہ دراصل وہ بھی اسی منبع علم سے فیض یاب ہوتے ہیں جس سے آپ سے پہلے انبیاء فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور وہ اللہ کی وحی ہے۔ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دل منشاء کو لبوں کو جنبش دیے بغیر خفاء اور آہستگی سے دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دل منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں۔ یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین مادی قسمیں وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے یقینی ہیں۔ اسی طرح روحانی ذرائع کے یہ تین درجے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں۔ اور جس طرح علم کے مادی ذرائع میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔ ہم نے علم کے ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور کشف۔ یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الٰہی ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ وحی (اشارہ) بات کرنا یعنی دل میں کسی معنے کا بغیر آواز اور الفاظ کے آ جانا۔

۲۔ خدا کا پردے کے پیچھے سے بات کرنا۔

۳۔ خدا کا فرشتے کے ذریعہ سے بات کرنا۔ یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ نبی پر وحی کرتا ہے جس کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک

۱؎ افادات شیخ الاسلام

کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دو اور دوسرے طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔ مکالمہ الٰہی کے یہ تینوں طریقے وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ مقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

وحی کی آواز

حدیث عائشہ میں ہے کہ کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ وحی آتی ہے تو مجھے ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے اور یہ قسم مجھ پر شدید ہوتی ہے۔ اور حضرت عمر فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ کے رخ انور کے پاس ایک ایسی آواز محسوس ہوتی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کے بھن بھنانے کی ہوتی ہے۔ ان دونوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اصل غرض سب جگہ ایک ہی ہے۔ مکھیوں کے بھن بھنانے کی آواز بھی گھنٹی کی آواز کی طرح ایک گونج رکھتی ہے۔ اس میں بھی سننے والے کو کسی خاص جہت کا ادراک نہیں ہوتا اور یہاں بھی انسانی کلام کے برخلاف مبدا اور مقطع یعنی آغاز و انجام الگ الگ نمایاں محسوس نہیں ہوتے بلکہ ایک بسیط اور مسلسل آواز محسوس ہوتی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آواز کو تشبیہ دی تو گھنٹے کی آواز سے تشبیہ دی اور جب حضرت عمر نے اس کو تشبیہ دی تو شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ سے دی۔ علماء نے لکھا ہے کہ گھنٹی کی آواز اگرچہ ایک ناخوشگوار آواز ہے مگر وحی کو اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بھی ایک بسیط آواز ہے اور بے جہت سنی جاتی ہے۔ مکھیوں کی لگاتار بھن بھناہٹ سے بھی اسی قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں تشبیہوں پر غور فرمائیے، آپ کو معلوم ہو گا کہ دونوں ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ صاحب وحی کو وہ آواز کچھ تیز محسوس ہوتی ہے اور سامعین میں سے جس کو اس غیبی آواز کے سننے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ ان کو خفیف اور ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی حقیقت خواب و خیال سے بالکل بالاتر ہے خواب کا سارا تماشہ صرف سونے والے تک محدود ہوتا ہے اور یہاں آثار وحی سننے والوں پر بھی درجہ بدرجہ نمودار ہوتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات وحی کی بے کیف آواز کا ادراک بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی متاثر نہ ہوتے تھے بلکہ وحی کی آمد کے وقت اگر آپ کا جسم اقدس کسی دوسرے کے جسم کے ساتھ ذرا متصل ہو جاتا تو وہ بھی وحی کی عظمت سے پس پس جاتا تھا۔ بخاری میں ہے:

سہل بن سعد ساعدی کہتے ہیں کہ میں نے مروان کو مسجد میں بیٹھا دیکھا تو میں ان

کی طرف متوجہ ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ زید بن ثابت نے ان سے بیان کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آیت قرآنی لا یستوی القاعدون من المومنین والمجاھدون فی سبیل اللہ مجھے املا کرائی تھی کہ عبداللہ ابن ام مکتوم آگئے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ بخدا اگر میں جہاد کر سکتا تو ضرور جہاد کرتا۔ عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا تھے ان کی اس معذرت پیش کرنے پر اللہ نے آیت کا یہ حصہ اپنے رسول پر نازل فرمایا، غیر اولی الضرر۔ اس وقت آپ کی ران میری ران سے لگی ہوئی تھی۔ میری ران پر اتنا وزن پڑا کہ یوں محسوس ہوا کہ اب چورا ہوگی۔

ذرا سوچئے کہ جب وحی میں آتے ہوئے ایک کلمہ کا وزن زید بن ثابت کو اتنا محسوس ہو رہا تھا تو جن پر یہ کلمہ نازل ہوا تھا ان کو اس کا وزن کتنا محسوس ہوتا ہوگا اور پھر اندازہ کرنا چاہیے کہ جن پر پورا قرآن نازل ہوا ہے ان کو عام انسانوں سے کتنا امتیاز ہوگا۔

علمی ذرائع میں وحی کا مقام

وحی علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو اللہ کی جانب سے انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے یہ غیر تخلیقی ہے اور نہ کسبی۔ عام انسانوں میں حواس اور مشاعر علم کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن انبیاء میں حواس اور مشاعر سے بالا وحی علم کا ذریعہ ہوتا ہے۔

یوں سمجھو کہ مخلوقات میں جیسے علمی ذرائع کا ایک ارتقائی سلسلہ قائم ہے۔ جمادات بے حس ہیں لیکن نباتات میں قوت احساس موجود ہے۔ حیوانات میں احساسات کے ساتھ کچھ مشاعر بھی کارفرما ہیں۔ انسان احساس اور شعور کے کمالات کا نمونہ ہے، ایسے ہی انسانوں میں انبیاء کو حواس و مشاعر سے بالا ایک ایسی قوت دی جاتی ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملتی۔ حواس صرف مادیات کی دریافت کا ذریعہ ہیں۔ مشاعر مادیات سے آگے ذہنیات اور عقلیات کا ادراک کرتے ہیں اور وحی ذہنیات و عقلیات سے بالا حقائق غیبیہ معلوم کرنے کا راستہ ہے۔

اس ذریعہ میں غور و بحث، منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جیسے وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات۔

چونکہ اللہ سبحانہ انبیاء کو ایک نئے ذریعہ سے علم عطا کرتا ہے اس لیے اس کا نام بھی عام ذرائع سے الگ وحی رکھا ہے۔ عربی میں وحی کے معنے ایماء اور اشارے کے ہیں گویا اللہ سبحانہ کا وہ اشارہ ہے

جو نبوت پر حقائق غیبیہ کے ادراک کی راہ کھول دیتا ہے۔ اسی کو امام رازی کی زبان میں ملکہ نبوت مجدد الف ثانی کی زبان میں نور نبوت اور علامہ اقبال کی اصطلاح میں شعورِ نبوت کہتے ہیں۔

مجدد الف ثانی فرماتے ہیں،

> جیسے عقل کا مقام حواس سے بالا ہے کہ جن چیزوں تک ہم حواس کے ذریعے رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ عقل کے ذریعے کر سکتے ہیں ایسے ہی نبوت کا مقام عقل سے بالا ہے، جہاں عقل کی رسائی نہیں ہے نور نبوت کے ذریعے اس کا ادراک ہو جاتا ہے۔

اور ساتھ ہی مجدد صاحبؒ نے یہ لطیف انکشاف بھی فرمایا ہے کہ جو شخص عقل و حواس ہی کو علمی ذریعہ مانتا ہے اور اس کے سوا کسی علمی ذریعہ کو نہیں مانتا درحقیقت وہ نورِ نبوت کا منکر ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے جسے ہم نے شعورِ نبوت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا، نہ ان کے سامنے یہ سوال ہو گا کہ ان کی پسند کیا ہو اور ناپسند کیا ہو۔ ان کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہ ہو گی کہ وہ اپنے لیے کیا راہِ عمل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی طے شدہ ہوں گی، یہ نہیں کہ ان کو اس بات میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے۔ کیونکہ وحی فی الواقع حقیقت سے بالا ایک ایسے ذریعہ کا نام ہے جس میں وجدان نہیں سرتاسر عرفان ہوتا ہے خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ، آواز کے ساتھ ہو یا بغیر آواز کے حصولِ علم کی حد تک نبوت کے عرفان کی دنیا ایسی ہی حقیقی اور واقعی ہوتی ہے جیسے ہمارے مشاہدات کی۔ اسے صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی ابتداء ادراک یا حس سے نہیں ہوتی۔ یہ کوئی غیر شعوری قسم کا وجدان نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی عرفان کا نام ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں آدمی کے اطوار میں جیسے عقل معقولات کے ادراک کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسے ہی نبوت بھی ایک طور ہے جس کے نور سے صاحبِ نبوت حقائق غیبیہ اور عقل سے بالا امور کا ادراک کر لیتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی ژرف نگاہی اس قسم کے مواقع پر بہت بڑی رہنمائی کرتی ہے وہ فرماتے ہیں۔ انسان کا مزاج اعتدال صورت نوعیہ کے لحاظ سے معارف الٰہیہ کے بغیر پایہ کمال کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے حکمتِ الٰہی نے کچھ شخصیتوں کی تخلیق کر دیا صاف پاکیزہ اور بلند تر بنایا ہے کہ جن میں حقائق غیبیہ کے ادراک کی پوری پوری قابلیت رکھی ہے۔ یہ عظیم المرتبت شخصیت بارگاہِ الٰہی سے علوم کا فیضان لے کرتی ہے اور انسانوں تک پہنچاتی ہے۔ اور انسانی زندگی اس کی بے چون و چرا اطاعت کرتی ہے۔ اس کی حیثیت انسانوں میں ٹھیک وہی ہے جو شہد کی

کمیوں میں میسر ب کی ہوتی ہے اگر سلسلۂ وحی نہ ہوتا تو نوعِ انسانی اس درجۂ کمال کو نہ پا سکتی جو تقدیرِ الٰہی نے اس کے لیے مقرر کیا ہے گویا انسانوں میں وحی و نبوت نوعِ انسانی کے ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔

یہی بات مولانا آزاد نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں اس طرح سمجھائی ہے جہاں تک انسانوں کی عملی زندگی کا تعلق ہے عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے اور نہ ہر حال میں مؤثر، نفسِ انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں میں کچھ اس طرح منغوب ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں کام نقصان رساں اور تباہ کن ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔ وجدان کے ساتھ اگر حواس کی ہدایت ضروری ہے اور اگر حواس کے ساتھ عقل کی ہدایت ناگزیر تھی۔ کیونکہ اس کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دے کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور اعمال کی درستگی و انضباط کے لیے کافی نہیں ہے مگر اس نے وجدان کے ساتھ حواس دیئے تاکہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کا کام کریں۔ اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی تاکہ حواس کی غلطیوں میں بیچ اور قاضی و حاکم کا کام کرے تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دیتا تاکہ عقل کی درماندگیوں میں رہنما اور فیصلہ کن ہو۔ قرآن بتاتا ہے کہ ضرور تھا اور اسی لیے اللہ نے انسان کے لیے ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا بھی سامان کر دیا۔ اسی مرتبہ ہدایت کا نام وحی ہے۔

الغرض وحی و نبوت کا مقام عقل و فکر سے بالا ہے اور جیسے وحی کا مقام عقل سے بالا ہے ایسے ہی نبوت کا مقام ولایت سے بالا ہے۔ ولایت میں صرف وجدان ہوتا ہے اور اس میں غلطی کا احتمال ہے۔ اسی لیے ولی کے الہام میں دلیل و حجت بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس نبوت مقامِ عرفان پر گامزن ہوتی ہے جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔

وحی اور فکرِ جدید

وحی سے متعلق فکرِ جدید نے مادیت اور فلسفے کے دباؤ سے پہلے پہلے انکار کی راہ اختیار کی اور اس پر کبھی قدامت کی خرافات اور کبھی عصبی بیماری کی پھبتی کسی، لیکن یورپ کے محققین جیسا کہ فرید وجدی نے دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں بتایا ہے۔ وحی کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وحی خود روحِ انسانی کی تجلیات میں سے ایک تجلی ہے جو انسان پر ظاہر ہو کر انسان کو معلومات فراہم کرتی ہے۔

ان کا موقف یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی قید مکان سے منزہ ہے اور ملائکہ میں اللہ سے ہمکلامی اور اس سے کچھ سننے کے لیے اللہ کے لیے قید مکان کا اقرار ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ وہ یا تو عقل و بینش سے کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے یا پھر فرزانگی اور عقلیت کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالا ہوئی۔ اس نے فوراً جھٹلا دی گویا حقیقت کے اثبات و وجود کا سارا دار و مدار صرف اس پر ہے کہ ایک شخص کی سمجھ اس کا ادراک کر سکتی ہے یا نہیں۔ دونوں علم و بصیرت کے خلاف اور دونوں کا نتیجہ عقل و بینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا فقدان ہے۔ اگر فرشتوں پر وحی آنے کی اور خود حضور پر وحی آنے کی وہ تمثیل سامنے ہوتی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے تو ان پر اللہ سبحانہٗ کی تنزیہہ منکشف ہو جاتی۔

فی الواقع وحی کا معاملہ ان حقائق غیبیہ سے تعلق رکھتا ہے جس کے لیے ہماری تعبیرات کام نہیں دے سکتی ہیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کرے گی جو عام طور پر ہمیں پیش آتی رہتی ہیں۔ وحی ہمارے محسوسات و معلومات کے دائرے سے باہر ہے اور انسان کی ساری درماندگی یہی ہے کہ وہ حقائق غیبیہ کو اپنے معیار خیال سے تولنا چاہتا ہے، اور اس کے لیے مقدمات بناتا رہتا ہے حالانکہ حقائق غیبیہ اس کے ترتیب دیے ہوئے سارے مقدمات میں اس کے لیے ٹھوکروں پر ٹھوکریں ہیں کیونکہ وہ جتنے مقدمات بناتا ہے اپنے احساس و ادراک کے اندر رہ کر بناتا ہے اور غیبی حقائق اس دائرے کی رسائی سے بالا ہیں۔ نبوت کی دعوت حقائق غیبیہ کو ماننے کی ہے جاننے کی نہیں۔

وحی کی آمد کی کیفیت

اسی بنا پر حضرت امام بخاری اپنی صحیح کے آغاز میں وحی کی آمد کی کیفیت سے متعلق یہ حدیث عائشہ لائے ہیں۔

> حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کیسے آتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گاہ گاہ وحی آتی ہے مجھ پر گھنٹے کی جھنکار کی طرح اور یہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ پھر جب یہ پوری ہو جاتی ہے تو مجھے وہ سب محفوظ ہوتا ہے جو اس نے کہا ہوتا ہے اور کبھی کبھار فرشتہ آدمی کی صورت میں آتا ہے اور مجھ

ہمکلام ہوتا ہے۔ میں اس کی ساری بات کو یاد کرتا ہوں۔

امام بخاری نے اس حدیث کے ذریعے اپنے مخاطبوں کو یہ بات بتائی ہے کہ وحی ایک غیبی معلوماتی ذریعہ ہے اور یہ معلوماتی ذریعہ ہمارے ادراک کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم جو کچھ جان سکتے ہیں وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمد کی کیفیت ہے اور وہ بھی صرف تمثیل کے درجے میں۔ اصل یہ ہے کہ جس حالت و کیفیت سے انسان دوچار نہیں ہوتا، اس کی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کر سکتا۔ وحی بھی ان حالات میں سے ایک حالت ہے جو صرف خاصۂ نبوت ہے۔ اس کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو اس سے دوچار ہوا اس لیے وحی کو عملی طور پر سمجھنے کے لیے صرف تمثیل کے دائرے میں گفتگو ہو سکتی ہے اور معلوم ہے کہ تشبیہ و تمثیل سے کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔

یہاں وحی کو بتانے کے لیے صلصلۃ الجرس گھنٹی کی جھنکار کی تعبیر آئی ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ صلصلۃ الجرس کی تعبیر اس حالت کو مثالاً ظاہر کرنے کے لیے ہے جو وحی کی آمد کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتی تھی یعنی وحی چونکہ عالم غیب سے تعلق رکھنے والا ذریعہ علم کا نام ہے۔ اس عالم سے جس قوت کا تعلق پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس قوت کو دنیا کی تمام چیزوں سے بے تعلق کر دیا جاتا ہے۔ وحی چونکہ عالم غیب سے آتی ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت سامعہ کو ایک خاص جھنکار کے ذریعے تمام دنیوی علائق سے بیگانہ کر کے حفظ وحی کے لیے تیار کر دیا جاتا ہے اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے علوم الٰہیہ کا نزول ہوتا تھا۔

وحی کی شدت اور گرانی

وحی کی اس قسم کا جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھنٹی کی آواز سے تشبیہ دی ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح تعارف کرایا ہے یعنی وحی کی یہ قسم مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ گرانی اور سنگینی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معانی کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ عالم غیب کی جو چیز بھی عالم شہادت میں واسطوں کے ساتھ آتی ہے۔ اس میں خفت اور آسانی ہوتی ہے اور عالم غیب کی جو چیز براہ راست یا واسطوں کی کمی کے ساتھ آتی ہے اس میں زیادہ شدت اور گرانی ہوتی ہے سورج کی گرمی بہت سے پردوں اور بہت بڑی مسافت کے بعد اس قابل ہوتی ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں الغرض عالم غیب کی ہر چیز عالم شہادت میں واسطوں کے ساتھ پہنچتی ہے لیکن صلصلۃ الجرس کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آتی ہے اس میں چونکہ حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس لیے اس میں زیادہ سنگینی ہوتی ہے۔ علامہ ابن خلدونؒ نے اس صورت کے ثقیل ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس میں نبی کی بشریت مغلوب اور فرشتہ کی ملکیت غالب ہو جاتی ہے یعنی وحی کے اس صورت میں شدید ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کی جسمانیت ایک بشری جسمانیت ہے اور جبرائیل کی جسمانیت ایک ملکی جسمانیت ہے۔ نبی کی بشری جسمانیت پر فرشتہ کی ملکی جسمانیت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

دراصل اللہ سبحانہٗ کی وحی ایک عظیم الشان ذمہ داری اور انسانی کمال کا آخری درجہ ہے۔ اس کا بوجھ برداشت کرنا بے حد دشوار ہے۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی دی ہوئی قوت برداشت اور اس کی بخشی ہوئی توفیق ہی ہے جس کے صدقے وحی کی امانت نبوت کے سینے میں محفوظ ہوتی ہے۔

حضور انور کی شان جامعیت

۴۴۲۔ جس طرح نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف وحی کی اور جیسے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھائی کی تھی اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو انبیاء پر بھیجا جاتا ہے۔ اور انبیاء سابقین پر جیسے اللہ کی وحی نازل ہوئی ویسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی۔ لہٰذا جس نے اس کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہیے اور جس نے اس کا انکار کیا گویا ان سب کا منکر ہو گیا۔ حضرت نوح اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی شاید یہ وجہ ہو کہ حضرت آدم کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہو گئی گویا اول حالت تعلیمی حالت تھی۔ حضرت نوح کے زمانے میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہو گئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے۔ چنانچہ انبیاء اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے پر بھی اول عذاب حضرت نوح کے وقت سے شروع ہوا۔ خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب الٰہی نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ان کو ڈھیل دی جاتی تھی اور سمجھانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا تو اب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا۔ اول حضرت نوح کے زمانے میں طوفان آیا۔ اس کے بعد حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیب وغیرہ کے زمانے میں کافروں پر

قسم قسم کے عذاب آئے تو آپ کی وحی کو حضرت نوح اور ان سے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری طرح تنبیہ کر دی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہو گا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم نے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل وغیرہ کو وحی کی نعمت سے سرفراز کر کے نبوت عطا کی ایسے ہی آپ کو بھی وحی سے مشرف فرما کر نبی بنایا۔ نبی ہونے میں آپ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وحی ان کے پاس بھی آتی تھی آپ کے پاس بھی آتی ہے۔ نبی اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔ کسی ہوئی کتاب کا ملنا نبوت کے لیے کوئی شرط نہیں۔ یہ جتنے انبیا ہیں ان میں سے ہر ایک پر وحی آتی ہے اور یہ یہودیوں کے نزدیک نبی ہیں۔ ان پر اگر یکبارگی کتاب کا نازل نہ ہونا ان کی نبوت پر حرف نہیں لاتا تو پھر آپ پر یکبارگی کتاب کا نہ اترنا آپ کی نبوت میں کیسے خلل انداز ہو سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ انبیاء ہیں جن کے نام اور کام تورات کے صحیفوں میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان کو اللہ نے اپنی وحی سے نوازا ہے۔ جب نبیوں کا یہ سلسلہ موجود ہے اور ان پر جن شکلوں میں اور جن باتوں کی وحی آئی اس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں تو ان یہودیوں کی طرف سے آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے ایسے بے سروپا مطالبات کے کیا معنے جو ان تمام رسولوں اور نبیوں کو مانتے ہیں جن کا ذکر ہوا ہے اور یہ بھی مانتے ہیں کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔

اس آیت میں قرآن نے انبیا کے حوالہ سے ان تمام قوموں کی تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے جن کا قرآن تذکرہ کرتا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت نوح کے بعد انبیاء اور حضرت ابراہیم اور ان کے بعد آنے والے پیغمبر۔

اس میں وہ تمام پیغمبر آ گئے جن کی تاریخ سے قرآن استشہاد کرتا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت نوح کے بعد حضرت ہود اور حضرت صالح یہ دونوں پیغمبر قوم عاد اور قوم ثمود میں آئے۔ حضرت ہود کے تذکرے میں قرآن نے بتایا ہے واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح ۔ عرب میں قوم نوح کے بعد قوم عاد کو عروج ہوا۔ ان کی آبادیاں عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ قوم ثمود عرب کے اس حصے میں آباد تھی جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک چلا گیا ہے۔ ایسے ہی حضرت ابراہیم کے ساتھ حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت یونس، حضرت ہارون، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد۔ اس میں اشارہ کردیا کہ نبوت کے دو عظیم سلسلے ہیں۔ ایک نوحی دوسرے ابراہیمی، اور اللہ نے ان دو پیغمبروں اور ان کے خاندانوں کو نبوت و وحی کے لیے چن لیا ہے وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتاب۔ حضرت یعقوب کے ساتھ اسباط کا اضافہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ اولاد یعقوب میں انبیاء پر وحی آئی ہے مگر وہ صاحب کتاب نہیں ہیں جیسے حضرت یوسف، اسباط جمع سبط کی ہے جیسے عرب میں قبیلہ کا اطلاق خاندان پر ہوتا ہے ایسے ہی بنی اسرائیل میں لفظ اسباط استعمال ہوتا ہے۔ اسباط بنی اسرائیل بارہ خاندانوں پر مشتمل ہے اور یہ بارہ خاندان خود حضرت یعقوب کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف کے دو بیٹوں سے مل کر بنتے ہیں۔ حضرت یعقوب کے دس بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ روبین، ۲۔ شمعون، ۳۔ یہودا، ۴۔ یساکر، ۵۔ زبولون، ۶۔ بنیامین، ۷۔ دان، ۸۔ نفتالی، ۹۔ جاد، ۱۰۔ آشیر، حضرت یوسف کے دو بیٹوں کے نام ۱۔ افرائیم، ۲۔ منسی۔

آخر میں خاص طور پر زبور کا تذکرہ کیا ہے لیکن یاد رہے کہ موجودہ بائیبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبور داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤد کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلام حق کی روشنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح بائیبل میں امثال سلیمان کے نام سے جو کتاب ہے اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوب کے نام سے بھی بائیبل میں درج ہے لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اس میں رکھنے کے باوجود پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایوب کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب میں حضرت ایوب کے جس صبر عظیم کی تعریف کی گئی اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوب اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ کے خلاف سراپا شکایت بنے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے ہم نشین ان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے مگر وہ کسی طرح مان کر نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائیبل میں انبیاء بنی اسرائیل کے ۱۷ صحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے خصوصاً یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، عاموس، اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنہیں پڑھ کر آدمی کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان

صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیم ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں زور استدلال۔ اور ان کی بنی اسرائیل کے اخلاقی زوال پر سخت تنقید پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیح کی تقریریں اور قرآن مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے ہیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء ہوئے ان سب کا بالاجمال ذکر فرما کر جو ان میں اولوالعزم پیغمبر ہیں، اور جو مشہور اور جلیل القدر ہیں ان کو تخصیص اور تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا جس سے خوب معلوم ہو گیا کہ آپ کے اوپر جو وحی آتی اس کا حق ہونا اور اس کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا تمام اولوالعزم اور مشاہیر پیغمبروں کی وحی کو۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء پر جو وحی آتی ہے کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے۔ کبھی لکھی ہوئی کتاب مل جاتی ہے۔ کبھی بغیر پیغام اور بدون واسطہ کے خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بات کرتا ہے ان سب صورتوں میں چونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے کسی دوسرے کا حکم نہیں تو بندوں پر اس کی اطاعت یکساں فرض ہے۔ بندوں تک پہنچنے کا طریقہ تحریر ہو یا تقریر اور خواہ پیغام ہو تو اب یہود کا یہ کہنا کہ توریت کی طرح پوری کتاب ایک دفعہ ہی آسمان سے لاؤ گے تو ہم تم کو سچا جانیں گے ورنہ نہیں کتنی بے ایمانی اور حماقت ہے۔ جب وحی الٰہی حکم الٰہی ہے اور اس کے نازل ہونے کی صورتیں البتہ متعدد ہیں تو پھر کسی صورت میں اس کے ماننے میں تردد یا انکار کرنا یا یہ کہنا کہ فلاں خاص طریقہ سے تو مانیں گا ورنہ نہیں صریح کفر ہے اور کھلی حماقت ہے۔[2]

دراصل اس آیت میں تین باتوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

ایک یہ کہ اللہ کا دین ایک ہے اور جس طرح آپ سے پہلے بے شمار پیغمبروں پر خدا کی سچائی نازل ہوتی ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہودیوں کے اس گمراہانہ اعتراض کا جواب دے دیا کہ آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب کیوں نہیں آتراتی۔ فرمایا کہ یہ بے شمار پیغمبر جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں ان میں سے کسی پر ایسی کتاب حضرت موسیٰ کے سوا نازل نہیں ہوئی۔ جس طرح خدا نے ہمیشہ نبیوں کو اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وحی الٰہی سے مشرف ہوتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشبہ اور جملہ انبیاء کو مشبہ بہ قرار دے کر اشارہ کر دیا کہ

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں۔ حضرت نوح کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام سرکش و ظالم حکمرانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام مترفین اور مفسدین کی پیشوائی کے خلاف اعلان کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی زندگی بت شکنیوں کا مسلسل پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی حیات صرف خاکساری، تواضع، عفو و درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔ حضرت سلیمان کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ حضرت ایوب کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے۔ حضرت یونس کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے۔ حضرت یوسف کی زندگی قید و بند میں بھی جوشِ تبلیغ اور دعوت کا سبق ہے۔ حضرت داؤد کی سیرت گریہ و بکا، محمود ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے۔ حضرت یعقوب کی زندگی امیدِ خدا پہ توکل اور اعتماد کی مثال ہے۔ حضرت اسماعیل کی زندگی جذب و شوق اور قربانی کا نمونہ ہے۔ حضرت اسحاق کی زندگی پارسائی اور زہد و تقویٰ کا نمونہ ہے۔ اور حضرت موسیٰ کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ، سلیمان اور داؤد، ایوب اور یونس، یوسف اور یعقوب سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔

محدث خطیب بغدادی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت ندا آئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملکوں ملکوں پھراؤ۔ اور سمندروں کی تہ میں لے جاؤ۔ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے، جن و انس، چرند و پرند بلکہ ہر جاندار کے سامنے ان کو لے جاؤ۔ ان کو آدم کا اخلاق، شیث کی معرفت، نوح کی شجاعت، ابراہیم کی دوستی، اسماعیل کی زبان، اسحاق کی رضا، صالح کی فصاحت، ہود کی حکمت، موسیٰ کی سختی، ایوب کا صبر، یونس کی طاعت، یوشع کا جہاد، داؤد کی آواز، دانیال کی محبت، یوسف کا حسن، الیاس کا وقار، یحییٰ کی پاکدامنی اور عیسیٰ کا زہد عطا کرو اور تمام انبیاء کے اوصاف و اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔

جن علماء نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے ان کا منشا در حقیقت یہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفتِ جامعیت کو نمایاں کریں جس کی نشاندہی قرآن حکیم کی یہ آیت گرامی کر رہی ہے کہ جو کچھ اور انبیاء کو متفرق طور پر عطا ہوا تھا وہ سب مجموعی طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دیکھو۔ یہ جامعیت کی صفت کامل طور پر نمایاں ہو جائے گی۔ مکہ کے پیغمبر کو جب مکہ سے یثرب جاتے دیکھو تو کیا

تم کو وہ پیغمبر یاد آئے گا جو مصر سے مدین جاتا نظر آتا ہے۔ کوہ حرا کے غار نشین اور کوہ سینا کے تماشائی ایک حیثیت سے کیسی یکسانی نظر آتی ہے مگر جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی آنکھیں کمال تجلی اور حضور از کی بندہ حضرت موسیٰ باہر دیکھ رہے تھے اور حضور اندر اندر۔ کوہ زیتون پر وعظ کہنے والا مسیحا حضرت عیسیٰ اور صفا پر چڑھ کر یا معشر قریش! کہہ کر پکارنے والے پیغمبر میں کس قدر مشابہت ہے۔ بدر و حنین اور احزاب و تبوک کے سپہ سالار اور حواریوں اور عمالیقیوں اور اموریوں سے نبرد آزما نبی موسیٰ میں کس قدر مماثلت ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سات سرداروں کے حق میں بددعا کی تو آپ کی زندگی حضرت موسیٰ کے مثل تھی جب انہوں نے ان فرعونیوں پر بددعا کی۔ جو معجزات پر معجزات دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لاتے۔ اور جب آپ نے احد میں اپنے قاتلوں کے حق میں دعائے خیر کی تو اس وقت گویا آپ حضرت عیسیٰ کے قالب میں تھے جنہوں نے کبھی اپنے دشمنوں کا بھی برا نہیں چاہا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم مسجد نبوی کی عدالت گاہ اور جہاد گاہوں اور غزوات میں دیکھو تو حضرت موسیٰ کی سیرت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے لیکن جب آپ کو مکان کے حجروں میں، پہاڑوں کے غاروں میں، رات کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں دیکھو تو حضرت عیسیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ شب و روز کے ۲۴ گھنٹوں میں آپ کی زبان مبارک کی دعاؤں اور مناجاتوں کو سنو تو زبور والے داؤد کا دھوکا ہوگا۔ فتح مکہ کے خدم و حشم اور بیرق و علم کے سائے میں آپ کو دیکھو تو تزک و احتشام اور فوجوں والے سلیمان کا مغالطہ ہوگا۔ اگر شعب ابی طالب میں آپ کو تین برس اس طرح محصور دیکھو کہ کھانے کا سامان کم نہیں ہے تو مصری قید خانے کے پیغمبر یوسف کا جلوہ دکھائی دے گا۔ غرض

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

حضرت موسیٰ سیاست اور قانون لے کر آئے تھے، حضرت داؤد دعا و مناجات لے کر آئے، عیسیٰ زہد و اخلاق لے کر آئے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون و سیاست بھی لاتے اور دعا و مناجات بھی اور زہد و اخلاق بھی۔ ان سب کا مجموعہ الفاظ و معانی محمد رسول اللہ ہیں؛

قرآن میں سب نبیوں کا ذکر نہیں ہے

۲۲۵ ۔ اور خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم قرآن میں پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے نہیں سنایا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی کلام ہوتا ہے۔ اس میں یہودیوں کو تنبیہ ہے کہ

وہ اس وجہ کر میں نہ رہیں کہ نبوت ان کی خاندانی میراث ہے اور یہ فرہ نہ کریں کہ اللہ نے بنی اسرائیل ہی میں سے انبیاء بنائے ہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر کوئی قوم اور امت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی خدا کی جانب سے آگاہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ قرآن کی مختلف سورتوں میں کچھ نبیوں کا ذکر کیا ہے مثلاً سورہ انعام، سورہ ہود، سورہ الشعراء میں ان کا تذکرہ ہے۔ لیکن کچھ ایسے ہی بھی ہیں جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ اس آیت میں انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اصناف انسانی میں سے ایک خاص طبقہ کا قرآن نے اجمالی تذکرہ کر کے بتایا ہے کہ جن کے نام لیے گئے ہیں یہ سب نہیں بلکہ سب میں سے کچھ ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔ اللہ ذکر نہ کرنے کی وجہ اس [illegible] کچھ نہیں کہ وہ انبیاء اور قومیں قرآن کے مخاطبوں کے لیے جانے پہچانے نہیں۔ ان کی تاریخ، ان کے حالات سے قرآن کے مخاطب واقف نہیں، اور نہ معلوم قوموں اور پیغمبروں کے حالات میں ان لوگوں کے لیے کوئی سامان عبرت نہیں ہے اور واقعات و احوال کے بیان کرنے کا بنیادی قاعدہ عبرت پذیری ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ چین و جاپان اور ہندوستان میں یا امریکہ اور یورپ کے شمالی ممالک میں ہدایت کی روشنی نہیں پہنچی ہے، یقیناً پہنچی ہے لیکن چونکہ قرآن کے مخاطب ان سے واقف نہیں ہیں اس لیے قرآن ان کا تذکرہ نہیں کرتا، یہودیوں کی یہ ذہنیت کہ نبوت پر پوری دنیا میں ان کی اجارہ داری ہے قطعاً غلط ہے یہ مقتضائے حکمت ہے اور نہ اللہ کی وسعت رحمت کے شایان شان ہے۔ قرآن نے اس علمی حقیقت کا انکشاف کیا ہے ورنہ قرآن سے پہلے اہل کتاب اس سے قطعاً بے خبر تھے۔

یہ بات کہ کس قدر انبیاء ہوئے ہیں اس کا شمار اور یہ بات فلاں مقام پر کون نبی ہوا ہے۔ ہماری قدرت اور علمی دسترس سے باہر ہے جب تک خود قرآن اور زبان نبوت اس کا انکشاف نہ کرے۔ اس موضوع پر قرآن نے اجمالی ایمان کی ہدایت کی ہے۔ آغاز قرآن ہی میں ما انزل من قبلک فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔

آخر میں خصوصیت سے حضرت موسیٰ کے بارے میں فرمایا ہے کہ وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً، ویسے تو ہر وحی کلام الٰہی ہے اور ہر کلام الٰہی اللہ کی وحی ہے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب او یرسل
رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم۔

کسی انسان میں اللہ سے بات کرنے کا یارا نہیں ہے ہاں یہ کہ اللہ وحی کرے یا پردے کے پیچھے سے بات کرے یا پیغام رساں روانہ کرے اور وہ وحی کرے اللہ کے حکم

ہے جو اسے چاہے اللہ کی ذات برتر ہے اور حکمت والی ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کو پس پردہ کلام الٰہی کا خاص امتیازی شرف حاصل ہوا۔ اگر امتیاز نہ ہوتا تو انداز بیان یہاں سب سے الگ نہ ہوتا۔ بعض شارحین قرآن کی رائے میں تکلیما کا زور بتا رہا ہے کہ تمام نبیوں پر فرشتہ کے ذریعے وحی آئی مگر حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا کی کہ ان سے پس پردہ کلام کیا اور فرشتہ کا درمیانی واسطہ نہ تھا۔ یہ حضرت موسیٰ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں یہ خصوصیت نہ ہو وہ وحی نہیں ہے اور صاحب وحی نبی نہیں ہے۔ ایسے ہی یہ بھی ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خاص خصوصیت تھی نبوت کی شرط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ ہر نبی کو کسی خاص فضیلت اور کسی خاص معجزے سے سرفراز فرماتے ہیں۔ کسی میں کوئی فضیلت رکھی اور کسی میں کوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام سنایا مگر دیدار سے محروم رکھا۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں اپنے کلام اور دیدار دونوں سے مشرف فرمایا۔

بتانا یہ ہے کہ نبی ہونے کے لیے صاحب وحی ہونا ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی خاص نوع ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ لکھی ہوئی کتاب اس کے پاس ہو۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ نبوت کا مشن کیا ہے!

نبوت کا مشن

۱۶۶۔ یہ تمام رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر روانہ کیے گئے ہیں تاکہ ان کو روانہ کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔ اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو برابر بھیجا کہ مومنوں کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر مرضی معلوم نہ تھی۔ معلوم ہوتی تو ہم ضرور اس پر چلتے سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزے دے کر روانہ کیا اور پیغمبروں نے راہ حق بتادی تو اب دین حق کے قبول نہ کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جا سکتا۔ وحی الٰہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے رو برو کوئی حجت چل نہیں سکتی بلکہ سب حجتیں قطع ہو جاتی ہیں اور یا اللہ کی حکمت و تدبیر اور زبردستی کرے تو کون روک سکتا ہے مگر اس کو پسند نہیں ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی ان سب کا ایک کام تھا اور وہ یہ کہ لوگوں کو اعمالِ نیک کے نتائج کی خوشخبری سنائیں اور اعمالِ بد کے نتائج سے آگاہ کریں۔ گویا سارے انبیاء کا مشترک مشن لوگوں کو بشارت دینا اور خطرے سے آگاہ کرنا ہے۔ بشارت اس بات کی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی بسر کریں گے۔ ان کے لیے ابدی زندگی کی خوشیاں اور کامرانیاں ہیں۔ آگاہی اس بات کی کہ جو لوگ کفر اور بدعملی کی راہ اختیار کریں گے ان کے لیے دائمی عذابِ نار ہے۔ ان کی پیروی و طاعت انسان کی روحانی بیماریوں کا علاج اور اخلاقی کمزوریوں کا درمان ہے۔ یہ وہ مقدس گروہ ہے جو خدا کی بھاتی ہوئی تمام آبادیوں میں پھیلا اور مختلف زمانوں میں اپنی تعلیم و ہدایت کا چراغ روشن کرتا رہا۔ انسان کے سرمایہ میں فلاح و سعادت، اخلاق، نیک اعمال اور بہترین زندگیوں پر جو کچھ اثرات ہیں وہ ان ہی انبیاء کرام کے بشیری اور نذیری فیوض و برکات ہیں جو ہر جگہ تبشیر و انذار کے نشانات چھوڑ گئے ہیں۔

نوح کا جوشِ تبلیغ، ابراہیم کا ولولۂ توحید، اسحاق کی وراثتِ پدری، اسماعیل کا ایثار، موسیٰ کی سعی و کوشش، ہارون کی رفاقتِ حق، یعقوب کی تسلیم، داؤد کا غربتِ حق پہ ماتم۔ سلیمان کا سرودِ حکمت، زکریا کی عبادات، یحییٰ کی عفت، عیسیٰ کا زہد، یونس کا اعترافِ تقصیر، لوط کی جانفشانی، ایوب کا صبر، یہی تبشیر و انذار کے وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے انسانیت کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا ایوان آراستہ ہے اور جہاں کہیں صفاتِ عالیہ کا وجود ہے وہ نبوت کی بشیری شان ہے اور جس جگہ برائیوں اور رذائل سے اجتناب ہے وہ نبوت کی نذیری شان ہے۔

انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ مسرت کی تکمیل اور کائنات کے اندر اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں یقیناً تمام کارکن طبقاتِ انسانی کا ہاتھ ہے۔ ہیئت دانوں نے ستاروں کی چالیں بتائیں۔ حکماء نے چیزوں کے خواص بتائے، اطباء نے بیماریوں کے نسخے ترتیب دیے۔ مہندسوں نے عمارتوں کا فن نکالا۔ صناعوں نے ہنر اور فن پیدا کیے' ان سب کی کوششوں سے مل کر یہ دنیا تکمیل کو پہنچی۔ ہم ان سب کے ممنون ہیں مگر سب سے زیادہ ہم ان بزرگوں کے ممنون ہیں جن کی بشیری اور انذاری شان نے ہماری اندرونی دنیا کو آباد کیا جنہوں نے ہماری حرص و ہوس کی اندرونی چالیں درست کیں۔ انسانی بیماریوں کے نسخے ترتیب دیے۔ جذبات، احساسات اور ارادوں کے نقشے بنائے۔ نفوس و قلوب کے عروج و تنزل کا فن ترتیب دیا جس سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی۔ اخلاق و سیرت انسانیت کا جوہر قرار پایا۔ نیکی اور بھلائی ایوانِ عمل کے نقش و نگار بنے۔ خدا اور بندہ کا باہم رشتہ استوار کیا۔ اگر انبیاء بشیر اور

نذیر نہ ہوتے تو کیا یہ دُنیا کبھی تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

نبوت کی غرض وغایت

نبوت کا مشن بتانے کے بعد نبوت کی ضرورت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے "تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے" یعنی انبیاء کے آجانے کے بعد کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں کہ ہماری عقل مسائل وحقائق کے سمجھنے سے قاصر رہی۔ متکلمین نے یہیں سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ بندوں پر حجتِ الٰہی انبیاء کے روانہ کرنے کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرد عقل کی وجہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام پیغمبروں کو روانہ کرنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اس غرض کے لیے خدا نے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی، اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں آگاہ نہیں کیا۔[1] بالفاظِ دیگر بتایا گیا ہے کہ انبیاء دنیا میں اس لیے تشریف لاتے ہیں کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ ان کے پاس خطرے سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ ورنہ وہ ہرگز کفر و بدعملی کی راہ اختیار نہ کرتے۔ اگرچہ اللہ کی ذات عزیز ہے اس پر انبیاء کا روانہ کرنا واجب نہیں ہے اور اگر وہ مخلوق اور مملوک کو انبیاء کو روانہ کیے بغیر ہی سزا دے تو اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے لیکن وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کو سزا دے تو اتمامِ حجت کے بعد ہی دے۔ رسولوں کی تشریف آوری ہی اللہ کی یہ حجت ہے۔

انبیاء کی آمد کی غرض وغایت کے بارے میں شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ قرآن کی بتائی ہوئی غرض کی نشاندہی کی جائے۔ یہاں قرآن صرف یہی بتاتا ہے کہ نبوت

[1] تفہیم القرآن

کی غرض یہ ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت رہے اکہ کل یہ کہ آدم کے فرزند یہ عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا اور ہمیں باطل کی تاریکی سے نکال کر حق کی روشنی میں لانے والا نہیں آیا۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں۔ ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کی جگہ نور عطا کرتے ہیں۔

دراصل اس دنیا کی سلامتی صرف اعتدال میں ہے۔ افراط و تفریط پیدا ہوگی، تو کسی نہ کسی نہج پر زمین پر فساد رونما ہوگا۔ انسانی زندگی میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونوں پلڑے برابر نہ ہوں گے۔ عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات ان میں اسی توازن کا نام حق و عدل ہے۔ آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے۔ یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرے ذرے اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازے اور تقدیر سے قائم ہے۔ یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعے آئی ہوئی میزان شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں میں ہونا چاہیے۔ بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور با ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے۔ یہی اللہ کی حجت ہے جو انبیاء لے کر آئے ہیں۔ انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی اللہ کی حجت کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

قرآنی وحی خاص علوم میں ممتاز ہے

۱۶۶۔ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔ یعنی وحی ہر پیغمبر کو آتی رہی ہے۔ یہ کچھ نئی بات نہیں، سب کو معلوم ہے لیکن اس قرآن میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا اور اللہ اس حق کو ظاہر کرے گا۔ چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو علوم اور حقائق قرآن مجید سے حاصل ہوئے ہیں اور برابر حاصل ہوتے رہیں گے وہ کسی کتاب سے نہیں ہوتے اور جس قدر ہدایت لوگوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اور کسی سے نہیں ہوئی۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں لکن استعمال ہوا ہے اور عربی زبان میں لکن استدراک کے لیے آتا ہے۔ استدراک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلی بات میں پیدا شدہ شبہ کو دور کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کیا شبہ پیدا ہوا تھا جس کو قرآن کہتے ہیں کہ شبہ یہ پیدا ہوا کہ جب ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ آپ بھی ویسے ہی اللہ کے رسول ہیں جیسے دوسرے انبیاء تو پھر ان یہودیوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیوں ہو رہا ہے کہ کتاب آسمانی لے کر آؤ۔ اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ ان کا یہ معاملہ آپ سے الگ نہیں دوسرے انبیاء کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ رہا ہے جن کو وہ ہی مانتے تھے۔ معاملہ کے واضح اور صاف ہونے کے باوجود اگر یہود آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے ہیں اور آپ پر اتری ہوئی وحی کی شہادت نہیں دیتے ہیں تو نہ دیں ان کی شہادت پر آپ کا رسول ہونا موقوف نہیں بلکہ اللہ کی شہادت پر آپ کا رسول ہونا موقوف ہے۔ آپ کی رسالت پر اللہ اور اس کے فرشتوں کی شہادت ہے۔ آپ پر جو وحی اللہ نے نازل کی ہے اس کا سر رشتہ علم الٰہی سے ملا ہوا ہے۔ یہ آپ کا وجدان نہیں بلکہ وہ عرفان ہے جس کی صداقت پر کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس طرح آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہو گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا
ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ
لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ
فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ
جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ ۚ وَإِنْ
تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ
عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧٠﴾

بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی اور اللہ کی راہ سے انہوں نے
لوگوں کو روکا تو بلاشبہ وہ دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں[۲۲۳]۔ بلاشبہ
جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کیا تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں ہے
اور نہ اللہ انہیں کوئی راستہ دوزخ کے راستہ کے علاوہ دکھائے گا
وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بالکل معمولی

بات ہے[۲۴۹]۔ اے انسانو رسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق لے کر آچکا ہے لہٰذا ایمان لے آؤ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا، اور اگر راہِ کفر اختیار کرو گے تو یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے[۲۵۰]۔

ہدایت کا معیار

اس سے پہلی آیات میں دلائل کی پوری قوت سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپ ہی کی ذات گرامی معیارِ حق ہے۔ آپ کی صداقت یہودیوں کے ماننے نہ ماننے پر موقوف نہیں ہے۔ آپ کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے اور اللہ کی گواہی یہ ہے کہ اس نے علوم الٰہیہ، ادبیہ، سیاسی، دیوانی، فوجداری، اجتماعی اور اخلاقی علوم پر مشتمل، اعجازی کتاب کو آپ کی نبوت کے لیے دلیل بنایا ہے اور فرشتوں کی گواہی یہ ہے کہ فرشتوں کے جھرمٹ میں روح الامین کتاب الٰہی لے کر نازل ہوتے۔ اب اس کے باوجود اگر کوئی آپ کی وحی کو نہ مانے گا اس کو ہدایت نہ ملے گی۔ آپ عالم میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے شاہد ہیں۔ نیکوکاروں کو فلاح و سعادت کی بشارت سنانے والے بشیر ہیں۔ ان کو جو ابھی تک بے خبر ہیں ہوشیار اور بیدار کرنے والے نذیر ہیں بھٹکنے والے مسافروں کو بلانے والے داعی ہیں اور خود بہ تن نور اور چراغ ہیں۔ یعنی آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہے۔ یوں تو ہر پیغمبر خدا کا شاہد، داعی، بشیر اور نذیر وغیرہ بن کر اس دنیا میں آیا ہے مگر یہ ساری صفتیں عملاً نمایاں ہو کر ظاہر نہیں ہوتیں۔ بہت سے انبیاء تھے جو خصوصیت کے ساتھ شاہد ہوتے جیسے حضرت یعقوب، حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل وغیرہ

بہت سے تھے جو نمایاں طور پر مبشر تھے جیسے حضرت ابراہیم حضرت عیسیٰ ، بہت سے تھے جن کا خاص وصف نذیر تھا جیسے حضرت نوح ، حضرت موسیٰ ، حضرت ہود ، حضرت شعیب بہت سے تھے جو امتیازی حیثیت سے داعیِ حق تھے جیسے حضرت یوسف ، حضرت یونس لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ بیک وقت تھے اور آپ کے مرقعِ حیات میں یہ سارے نقش و نگار نمایاں تھے اور یہ اس لیے کہ آپ سب کے جامع تھے آپ ایسی وحی لے کر آئے جو کامل ہے ۔ آپ کی تعلیم دائمی ہے اس لیے آپ کی ذات مجموعۂ کمالات ہے ۔

آپ کا انکار اور آپ سے سرکشی ضلال بعید ہے اور آپ سے کافرانہ تعلقات کا نتیجہ دوزخ کی ہولناکی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ اس سے بچنے کا راستہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پوری انسانیت آپ کو اللہ کا رسول مانے ۔ قرآن نے اس آیت میں بلا تمیز سب کو مخاطب کیا ہے ۔

۲۴۸ - بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی اور اللہ کی راہ سے انہوں نے لوگوں کو روکا تو بلاشبہ وہ دُور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں ۔ یعنی حق کے واضح ہونے کے باوجود جو لوگ آپ کی وحی کو نہیں مانتے اور آپ کے رسول ہونے کا انکار کر رہے ہیں ۔ اور خود ہی نہیں مانتے بلکہ اوروں کے لیے رکاوٹ بنے ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنی غلط رہنمائی اور قسم قسم کے شبہات میں ڈال کر راہِ حق سے روک رہے ہیں ۔ وہ راہِ حق سے بہت دُور ہو چکے ہیں اور اتنی دُور ہو چکے ہیں کہ ان کا پلٹ کر آنا ممکن نہیں ہے ۔ اس آیت میں قرآن نے ایک اصولی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب کفر کے ساتھ کفر کی پیشوائی اور قیادت کسی طبقہ کے پاس ہو تو حق کی پذیرائی کی اس طبقہ میں حق کی پوری وضاحت کے باوجود کوئی صلاحیت نہیں ہوتی ۔ بالخصوص جب حق سے روگردانی کا پس منظر منافع ہوتے ہیں تو انسان منفعت کوشی میں اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر قدم حق کشی میں صرف ہونے لگتا ہے مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اور نبوت کا انکار کرنے کے بعد ان کا ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہونا ناممکن ہے ۔ اس کا صاف اور کھلا تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات حضور اقدس کے لائے ہوئے اسلام پر موقوف ہے کیونکہ جب آپ کی نبوت کا انکار ضلال بعید ہے تو اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ اسلام ہی شرطِ نجات ہے ۔ یہ صرف اس آیت کا مدلول ہی نہیں بلکہ دوسرے موقعہ پر صراحۃً بھی قرآن نے یہ بات کہی ہے ۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ،

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمت میں سے جس کسی بھی شخص تک خواہ یہودی یا نصرانی تک میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہو گا۔ (مسلم)

اس حدیث میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کے لیے گئے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں، ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے جیسا کہ زیرِ تشریح آیت میں ان الذین کفروا بالکل عام ہے اور ایک کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دُنیا کا کوئی گروہ کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں ہے جس پر اس کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو آیت سے کھینچ تان کر نکالی جا رہی ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس آیت کے لفظ کفروا کا صریح مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ پر وحی آنے کو دلائل سے ثابت کرنے کے بعد کفر کا بطلان صاف طور پر بتا رہا ہے کہ آپ کی نبوت کا انکار کھلے طور پر گمراہی ہے اور اگر یہ گمراہی ہے تو آپ کی نبوت کو مان لینا یقیناً ہدایت ہے۔ اسی لیے یہود و نصاریٰ کو خاص طور پر آپ کی نبوت قبول کر لینے پر قرآن نے ہدایت ملنے کی بشارت دی ہے۔ فان اسلموا فقد اهتدوا۔

قانونِ مجازات اور مکافاتِ عمل

۱۶۹- بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور ظلم کیا تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں ہے اور نہ اللہ ان کو دوزخ کے راستہ کے علاوہ کوئی راستہ دکھائے گا، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، ایسا کرنا اللہ کے لیے معمولی بات ہے۔ قرآن مجید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور توثیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ آپ کے منکر ہوتے اور توریت میں جو آپ کے اوصاف موجود تھے ان کو چھپایا اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کرکے ان کو بھی دینِ حق سے باز رکھا سوا ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہو نہ ہدایت جس سے خوب واضح ہو گیا کہ ہدایت آپ کی متابعت میں منحصر ہے اور گمراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے جس سے یہودی کو پوری سرزنش ہو گئی اور ان کے خیالات کی تغلیط واضح ہو گئی ہے[1] اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قانونِ مجازات اور مکافاتِ عمل کیا ہے۔ کفر و ظلم کے نتائج ایمان و عدل کے نتائج سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اعمال اور ان کے نتائج میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اچھے اعمال کے اچھے نتائج اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بُرے اعمال کے بُرے نتائج کا ہونا ناگزیر ہے۔ کفر و ظلم کے نتائج یقیناً خوشگوار نہ ہوں گے۔ کفر سے مراد خدا کی وحی کا انکار، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار اور ظلم سے مراد تورات میں بتائی ہوئی ان آیتوں کا چھپالینا جو حضور انور کی نبوت سے تعلق رکھتی ہیں، یا پھر غلط قیادت کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دینا ہے۔ گویا انہوں نے اپنے کفر اور اپنے ظلم سے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا ہے کہ خدا ان کی مغفرت فرمائے یا جہنم کے راستے کے سوا ان کو کوئی راستہ دکھائے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی شان اور اللہ کا قانون یہ نہیں ہے کہ اس کفر کو معاف کر دیا جائے اور یوم حساب میں اس ظلم سے درگزر کیا جائے کیونکہ کفر و ظلم دونوں نفس انسانی پر اثر انداز ہو کر تاریکی اور فطری فساد کی ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو کبھی انسان سے جُدا نہیں ہو سکتے اور ہمیشہ انسان کے افکار و اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے کفر و ظلم کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی اللہ کا قانون نہیں ہے کہ ظلم و کفر کے لیے فلاح و نجات کی کوئی راہ نکالے بلکہ ظلم و کفر بالذات ایسی برائیاں ہیں کہ ان کو اپنانے والا جہنم کی طرف جانے والے راستے ہی پر گامزن ہوتا ہے۔ پوری عمر کفر و ظلم میں کھپا کر جہنم کی اُمید اللہ کے قانونِ عدل کو برباد کرتے اور پورے نظامِ عدل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

اس آیت پر غور کرو کہ کفر و ظلم مقدم ہے اور لم یکن اللہ لیغفر لھم الخ مؤخر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی جانب سے مغفرت نہ ہونا اور جہنم کا راستہ ملنا علت اور انسانوں کا کفر و ظلم معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسانوں کا کفر و ظلم پہلے ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں عدم مغفرت بعد میں ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی نادانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یہ عادت نہیں ہے کہ بندہ کے کفر و ظلم میں ملوث ہونے کے باوجود بندے کے لیے مغفرت اور جنت کی راہ کھول دے۔ آیت کا جبر سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

عالمگیر اور دائمی نبوت

۱۵۰۔ اے انسانو! الرسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق لے کر آپکا ہے لہٰذا ایمان لے آؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا اور اگر راہ کفر اختیار کرو گے تو یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

آپ کی اور آپ کی کتاب کی تصدیق اور آپ کے مخالفین یعنی اہل کتاب کی تغلیط اور تضلیل بیان

فرماکر اب عام سب لوگوں کو منادی کی جاتی ہے کہ اے لوگو ہمارا رسول بھی کتاب اور سچا دین لے کر تمہارے پاس پہنچ چکا ہے۔ اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ اس کی بات مانو اور اگر نہ مانوگے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور تمہارے تمام احوال اور افعال سے خبردار ہے۔ تمہارے اعمال کا پورا حساب کتاب ہو کر اس کا بدلہ ملے گا۔ اس ارشاد سے بھی صاف معلوم ہو گیا کہ وحی جو پیغمبروں پر نازل ہو اس کا ماننا فرض اور اس کا انکار کفر ہے۔[1]

اس آیت میں یہودیوں کے مخاطبہ اور عیسائیوں کے مخاطبہ کے درمیان میں تمام انسانوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے۔ لفظ رسول پر الف لام تعریف لگا کر فرمایا ہے کہ وہ رسول تمہارے پاس آچکا ہے۔ اس سلسلے میں سمجھنے کی یہ بات ہے کہ عیسائی اور یہودی دونوں اہل کتاب ہیں۔ ان کے تذکرے میں پوری انسانیت کو مخاطب بنانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اہل کتاب ہو کر ان پر ایمان لانا واجب ہے تو جو اہل کتاب نہیں ان کو تو بدرجہ اولیٰ ایمان لانا ضروری ہے اور آنے　　اور وہ رسول کی تعبیر اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی اپنی کتابوں کی تصریحات کی بنا پر رسول کے آنے کے منتظر تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جس کا تمہیں انتظار تھا وہ رسول آچکا ہے۔

توراۃ میں ایک بشارت ہے:

> خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔　　(استثنا ۳۳-۲)

اس بشارت کا ایک ٹکڑا حضرت حبقوق نبی کے صحیفہ میں پھر دہرایا گیا ہے۔

> خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے۔ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی۔　　۳-۳

حضرت یحییٰ جب ظاہر ہوتے ہیں تو لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ تم آنے والے پیغمبروں میں تم کون ہو؟

> یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے؟ اور اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا کہ تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے اس نے کہا میں نہیں ہوں،

---

[1] ملفوظات شیخ الاسلام

بس آیا تو وہ نبی ہے، اس نے جواب دیا نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تورات کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام الیاس اور مسیح تھے لیکن تیسرے کا نام صرف وہ نبی لیا گیا ہے۔ یہ تیسرا نبی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون ہے۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات ہے جو نبی اور رسول کے مطلق نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ مسلمان آپ کو آنحضرت کہتے ہیں اور مسیحیوں میں آپ کا نام وہی پرافٹ مشہور ہو گیا ہے۔ عرب روم اور یہودی و نصاریٰ سب کو تورات اور انجیل کی بشارتوں کے مطابق ایک آنے والے کا انتظار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو سفیان کی زبانی مروی ہے کہ جب قاصد نبوی دعوت نامہ اسلام لے کر قیصر کے دربار میں پہنچا۔ اور قیصر نے ابو سفیان کو بلا کر جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند استفسارات کیے اور ابو سفیان نے ان کے جو جوابات دیے ہیں۔ ان کو سن کر اس نے بھرے دربار میں کہا کہ جو کچھ کہا اگر وہ سچ ہے تو ایک دن یہ میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اس کے قبضہ میں ہو گی مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہو گا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں خود جا کر اس کی زیارت کرتا اور اگر وہاں ہوتا تو خود اس کے پاؤں میں دھوتا۔

قیصر کے علوم راز اور شام کے بشپ ابن ناطور کا بیان ہے کہ قیصر کا خیال تھا کہ ختنہ والے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اور رومیہ کے ایک مسیحی عارف نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی۔ مقوقس شاہ مصر کے دربار میں جو قاصد حضور انور کا خط لے کر گیا تھا وہ بھی یہ جواب لے کر آیا کہ ہاں ہم کو بھی یقین ہے کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہو گا۔ حبش کے عیسائی بادشاہ نے لکھا تھا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ سچے پیغمبر ہیں۔ یمن کے شہر نجران سے ایک عیسائی وفد آیا اور فیصلہ حق کے لیے یہ طے پایا تھا کہ دونوں فریق مباہلہ کریں جس کی تفصیل آپ جلد سوم میں پڑھ چکے ہیں۔ لیکن وفد کے سمجھدار عیسائیوں نے وفد کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مباہلہ سے منع کیا اور کہا کہ خدا کی قسم اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔

اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو بھی پیغمبر کا انتظار تھا۔ ورقہ بن نوفل کا واقعہ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے۔ بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیجہ آپ کو ورقہ کے پاس لے کر گئیں تو ورقہ نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور آرزو ظاہر کی کہ کاش میں آپ کی ہجرت تک زندہ رہتا تو آپ کی مدد کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا

اس وقت انتظار تھا۔

قرآن اسی پس منظر میں ہمیں مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ گویا وہ رسول جس کی بشارت موسیٰ نے تورات میں دی اور جس کی آمد کی خبر حضرت عیسیٰ نے انجیل میں دی ہے آچکا ہے اور اب ہمیشہ رہنے والی سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے لے کر آچکا ہے۔

اور اگر آیت کو اس منظر سے الگ کیا جائے تو الرسول میں الف لام تعریف یہ بتانے کے لیے ہے کہ رسولوں میں وہ رسول کامل آچکا ہے جس کی رسالت میں عموم بھی ہے اور جو نبوت و رسالت کا خاتم ہے یعنی جس پر نبوت و رسالت کے سارے کمالات ختم ہو گئے ہیں کیونکہ قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعے سے اللہ کا دین اپنے تمام اصول و فروع کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا ہے بلکہ گزشتہ انبیا میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔

میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (استثنا - ۱۸)

اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا:

لیکن وہ فارقلیط پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ خدا میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا

(یوحنا ۱۴: ۲۶)

اور لکھا ہے کہ

لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی۔

حضرت عیسیٰ نے بھی ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔ بالآخر وہ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کی مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی سچائی کی وہ روح ہوں جو مسیح کی اصلی سچائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو مکمل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اسی لیے حضور انور نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کیونکہ تکمیل کے بعد کسی نئے آنے والے کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما انزل من قبلک۔ پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا اشارہ تک نہیں

کیا۔ دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھیے اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ اس حیثیت کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں یہی ہے کہ دنیا کی ہدایت اور آخرت کی نجات آپ کی نبوت پر ایمان لانے پر موقوف ہے۔ آپ پر ایمان ہی دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی خیر کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی نہیں مانتا تو اللہ کو کسی کی پرواہ نہیں ہے وہ کافروں کو کفر کی سزا ضرور دے گا۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا
الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ
كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ
وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ
سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۟ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ
اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ
يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ
جَمِيْعًا ۟ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا
يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۟

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو[۲۵۱]، اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو[۲۵۲]۔ مریم کا بیٹا عیسیٰ ابن مریم مسیح بس اللہ کا رسول ہے[۲۵۳]۔ اور اس کا کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم پر القا کیا تھا[۲۵۴]۔ اور ایک روح ہے جو اللہ کی جانب سے تھی[۲۵۵]۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین ہیں[۲۵۶]، اس سے باز آجاؤ اس میں تمہارے لیے خیر ہے[۲۵۷]۔ واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی ذات یگانہ معبود ہے[۲۵۸]۔ اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور کارساز ہونے کے لیے اللہ کافی ہے[۲۵۹]۔ مسیح کو ہرگز اس بات سے عار نہیں کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جائے اور نہ خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ و عار ہے[۲۶۰]۔ جو کوئی خدا کی بندگی میں ننگ و عار سمجھے اور گھمنڈ کرے اللہ ضرور سب کو اپنے حضور جمع کرے گا۔ پھر وہ لوگ جو

ایمان اور عمل صالح کی متاع رکھتے ہوں گے ان کو پوری پوری اجرتیں دے گا اور اپنے فضل سے مزید دے گا، اور وہ لوگ جو خدا کی بندگی کو ننگ و عار سمجھتے ہیں اور گھمنڈ میں ہیں ان کو دردناک عذاب دے گا اور اس روز ان کو خدا کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ ملے گا۔

اہل کتاب یعنی عیسائیوں کا غلو

اہل کتاب کی ایک بہت بڑی گمراہی دین میں غلو ہے یعنی حقیقت و اعتدال سے ہٹ کر بہت دور تک چلے جانا، مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے اس سے قرآن کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ حضرت مسیح کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں میں تحلیل معرکۃ الآرا بنانے کے لیے کی گئی جس سے حضرت مسیح کی وہی ایک ہے کی تعلیم ان کے مذہب سے مٹ گئی۔ ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی۔ اور ہر بڑے پادری سے دعا مانگی جاتی تھی۔ ملک شام میں جو بڑے بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے۔ مسیح و مریم، روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے کرتے تھے کہ اس کی نظیر زمانہ مابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔

سیل صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

گرجا کے پادریوں نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے رہتے تھے۔ اسی ایک زمانہ میں اکثر وہ ترہات جو رومن چرچ کے لیے باعث ننگ ہیں مذہبی صورت میں قائم کیے گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی

سے ہونے لگی۔

مسٹر مارس اپنی کتاب تاریخ ہندوستان میں ضمناً ایک موقعہ پر تحریر کرتے ہیں:

اس نازک موقعہ پر یعنی ظہور اسلام کے وقت ان سب ناکارہ بدعات کے درمیان جو عیسائیت کو ناپاک کر رہی تھیں اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلے کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے، اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت مدھم۔

الغرض حضرت عیسٰی علیہ السلام دنیا کو امن و سلام کا پیام سنا کر رخصت ہوئے ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہو گئیں۔ اور بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح غلبہ پایا کہ اس کی بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئی اور باپ بیٹے روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہو گیا، اور تورات جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسٰی بھی مٹا نہیں سکتے تھے وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی پال کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی۔[1]

۲۵۱ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اہل کتاب اپنے انبیاء کی تعریف میں غلو سے کام لیتے تھے اور حد سے نکل جاتے تھے۔ خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کی بات میں مبالغہ نہ کرو۔ اور جس سے اعتقاد ہو اس کی تعریف میں حد سے نہ بڑھنا چاہیے، جتنی بات تحقیق ہو اس سے زیادہ نہ کہے اور حق تعالیٰ کی شان مقدس میں بھی وہی بات کہو جو سچی اور محقق ہو اپنی طرف سے کچھ مت کہو۔ تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عیسٰی کو جو اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں ان کی وحی کے خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تین خدا کے معتقد ہو گئے، ایک خدا، دوسرے حضرت عیسٰی، تیسرے حضرت مریم، ان باتوں سے باز آجاؤ۔ اللہ تعالیٰ واحد یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہو سکتا، اس کی ذات پاک اس سے منزہ ہے۔ یہ تمام خرابی اس کی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت اور پابندی نہ کی۔ وحی کی متابعت کرتے تو خدا کے لیے بیٹا نہ مانتے اور تین خدا کے قائل ہو کر صریح مشرک نہ ہوتے اور محمد رسول اللہ سید الرسل اور قرآن مجید افضل الکتب کی تکذیب کر کے آج ڈبل کافر نہ ہوتے۔ اہل کتاب کے ایک فریق نے تو حضرت عیسٰی کو رسول بھی نہ مانا اور قتل کرنا پسند کیا جن کا ذکر پہلے گزرا۔ اور دوسرے فریق نے ان کو خدا کا بیٹا کہا، دونوں کافر ہو گئے۔ دونوں فریق کی گمراہی کا سبب یہی ہوا کہ وحی کے خلاف کیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ نجات وحی کی متابعت میں ہے۔[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پچھلی آیات میں حضرت عیسٰیؑ کے بارے میں یہودیوں کی تفریط کا ذکر تھا۔ اب اس کے مقابلے پر حضرت عیسٰیؑ ہی کے بارے میں عیسائیوں کے افراط کا تذکرہ ہے یا بقول حضرت تھانویؒ اسی بات کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا غلو احکام ظاہری میں تعمق اور مسائل باطنی کی طرف روگردانی کی صورت میں تھا اور عیسائیوں کا غلو مسائل باطنی میں تعمق اور احکام ظاہر سے بے اعتنائی کی صورت میں تھا۔ حالانکہ اعتدال ظاہر و باطن کی ہم آہنگی میں ہے۔

لا تغلوا غلو سے بنا ہے۔ غلو کے معنے بڑھنے، زیادہ ہونے، حد سے بڑھ جانے کے ہیں۔ ہانڈی کو اُبال آجاتے تو بولتے ہیں غلت القدر، یہاں فی دینکم کے اضافہ سے بتا دیا کہ دین میں غلو ممنوع ہے دین میں غلو یہ ہے کہ اللہ کے دین میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے پیغمبر نے جس کام، جس فکر، جس حالت کا جو درجہ اور مرتبہ بتایا ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ مثلاً جو حکم صرف استحباب کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض اور واجب کا درجہ دے دیا جائے، جس عمل کی جو صورت بتائی ہے اسے بگاڑ دیا جائے۔ جو شخص ایک فقیہ، مجتہد یا صحابی ہے اس کو معصوم بنا دیا جائے۔ جس کو اللہ نے نبی و رسول بنایا ہے اس کو خدا کا شریک یا خدا بنا ڈالا جائے۔ جس کی صرف تعظیم و تکریم مطلوب ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ یہ اور اسی قبیل کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں۔ اور جس طرح دین میں تفریط بہت بڑا جرم ہے اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے اللہ کے دین کا وہ مزاج جو سراسر اعتدال ہے درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یوں تو اس غلو میں سب ہی مبتلا ہوئے ہیں۔ یہودیوں کا جرم اگر یہ تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کے انکار و مخالفت میں حد سے بڑھ گئے تو عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ وہ حضرت مسیحؑ کی عقیدت و محبت میں حد سے بڑھ گئے بلکہ انہوں نے اپنے غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ دیا۔ حضرت عیسٰیؑ خدا کے بندے اور رسول تھے۔ ان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر ان کو خدائی کے عرش پر بٹھا دیا۔ حضرت مریمؑ حضرت عیسٰیؑ کی والدہ تھیں۔ ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا۔ حضرت جبریلؑ خدا کے بندے اور فرشتے تھے۔ ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر تثلیث کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ حضرت مسیحؑ نے دُنیا اور اس کے زخارف سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی تو انہوں نے رہبانیت کا ایک پورا انتظام کھڑا کر دیا۔ غرض اس غلو کے چکر میں کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہی افکار، اعمال، اخلاق اور احوال سب کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا۔ الغرض اہلِ کتاب کی بہت بڑی گمراہی دین میں غلو ہے۔ یعنی حقیقت و اعتدال سے متجاوز ہو کر بہت دُور تک چلے جانا۔ اگر کسی کی محبت و تعظیم کی تو اتنی تعظیم کی کہ اسے خدا کے درجہ تک پہنچا دیا۔ مخالفت پر آئے تو اتنی مخالفت کی کہ اس کی صداقت ہی سے انکار کر دیا۔ اگر زہد و عبادت کی راہ اختیار کی تو اتنی

وہ ترک چلے گئے کہ رہبانیت تک پہنچ گئے۔ اگر دنیا کے پیچھے پڑے تو اتنے چھوٹ اور بے لگام ہوئے کہ نیک وبد کی تمیز ہی اٹھا دی۔ یہود ونصاریٰ اسی گمراہی کا شکار ہوئے۔ یہاں خطاب عیسائیوں سے ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں اس قدر غلو کیا کہ انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا۔ اور ایک خدا کی جگہ تین خدا یعنی باپ بیٹا اور روح القدس کا اعتقاد پیدا کر لیا۔

اللہ کے دین میں فساد کا دروازہ

۲۵۲- اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو۔ یعنی دین کے موضوعات پر کوئی عقیدہ، کوئی عمل، عمل کی کوئی صورت میں اپنی رائے نہ گھسیڑو اور توحید میں شرک کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے دو۔ دراصل دین میں غلو کا فتنہ جس راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی تائید وتقویت کا سامان جہاں سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ اس کا سد باب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اللہ کی طرف وہی بات منسوب کی جائے جو اس نے فرمائی ہے تو اس سے کسی فتنہ کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ فتنہ کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب اس کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو اس نے نہیں فرمائی ہے۔ یہی چیز بدعت ہے اور یہیں سے شیطان کو دین میں گھسنے کا اور اس میں فساد برپا کرنے کی راہ کھلتی ہے نصاریٰ جہاں سے ہلاک ہوئے وہ یہی دروازہ ہے انہوں نے گمراہ قوموں سے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفر یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراط مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداء ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ حضرت مسیح کے ابتدائی پیروکار جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم حضرت مسیح نے ان کو دی تھی مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف حضرت عیسیٰ کی عقیدت اور تعلیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفیوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیرات شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کی مسیح کی تعلیمات سے کوئی نسبت نہ تھی۔

اس موضوع پر خود ایک مسیحی عالم ریورینڈ چارج ولیم کا بیان قابل ملاحظہ ہے۔

عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائیبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفہ کی صورتوں میں۔ باپ، بیٹا، روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور پال نے بھی جو اس کو استعمال

کیا۔ اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا پس اس عقیدے کا مواد یہودی ہے۔ اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔ یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم باپ بیٹا، روح القدس کے درمیان تعلق کی حیثیت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جواب جو دیا ہے وہ اس عقیدے میں ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔

ایک اور مسیحی عالم کا بیان انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں یسوع مسیح کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔

عید پنتکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے۔ انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا اور سوتا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافت حال کا محتاج تھا۔ اس نے دکھ اٹھایا۔ اس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہوگا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعویٰ کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی نہ قرار دے دیا جائے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوتے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شعور کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادر مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں بہت کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ "یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعے سے نہیں مل سکتی۔" اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔

بہرحال حضرت مسیح کی ابنیت، ان میں خدا کے حلول کا عقیدہ، تثلیث کا فکری سانچہ اور حضرت مسیح کے بارے میں دانائے غیب، قادر مطلق، مختار کل، اور حاضر و ناظر ہونے کے تصورات کی حیثیت قول علی اللہ بغیر الحق کے سوا کچھ نہیں ہے اور قرآن کے نزدیک یہ سنگین جرم ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

دین میں غلو خواہ عقائد میں ہو یا اعمال میں اور چاہے اخلاق میں ہو یا احوال میں فی الواقع اللہ پر خلاف واقعہ بات تھوپنے کے مترادف ہے۔ یعنی اگر ایک کام ایک بات، ایک حال دین کے بتانے ہوتے علم و عمل میں نہیں ہے اور آپ کہتے ہیں کہ یہ دین ہے تو آپ یہ کہہ کر کہ یہ اللہ کا حکم ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا، بغیر حکم خداوندی کسی چیز کو دین کہنا اور موجب ثواب و عتاب بتانا اللہ پر جھوٹ بولنے کے مترادف ہے۔ قرآن میں ہے

ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولے۔

ایسے ہی حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ تصورات رکھنا اور ان کی اشاعت خدا پر جھوٹ بولنا ہے۔

مریم کے بیٹے اور خدا کے رسول ہیں

۲۵۳۔ مریم کا بیٹا عیسیٰ بس اللہ کا رسول ہے۔ یعنی وہ معبود و الٰہ نہیں، خدا نہیں اور بمنظرِ خدا نہیں بلکہ وہ صرف اللہ کے رسول ہیں۔ رسول، رسالت سے بنا ہے۔ رسالت کے لفظی معنے سفارت کے ہیں قرآن کی اصطلاح میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے قانونی احکام پہنچانے اور انہیں اپنی مرضی کی راہ بتانے کے لیے قائم کیا ہے اس کا دوسرا نام نبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے احکام پہنچانے کے لیے ہمیشہ انسانوں کو ذریعہ بنایا ہے یعنی اللہ کے یہ رسول نہ فرشتوں میں سے ہوتے تھے نہ جنوں میں سے نہ کسی اور مخلوق میں سے اور نہ ایسا ہے کہ اپنے احکام بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ خود ہی کسی انسانی یا غیر انسانی شکل میں یہاں اتار رہا ہو۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ جب بھی رسول بھیجا گیا نوعِ انسانی ہی میں سے بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیہم

ہم نے تم سے پہلے مردوں ہی کو پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے ہیں۔

اس لیے یہ بدیہی بات ہے کہ رسالت کے لیے ہمیشہ انسانوں ہی کا تقرر ہوا ہے ٹھیک ویسے ہی انسانوں کو جیسے کہ ہم اور آپ ہیں۔ ہماری ہی طرح وہ بھی جسم و جان رکھتے تھے، قوتیں اور خواہشیں رکھتے، بیوی بچے رکھتے۔ قوانینِ طبعی کے تحت پیدا ہوتے، نشوونما پاتے، کھاتے اور پیتے اور سوتے اور جاگتے، خوشی اور غم کا احساس کرتے، ہنستے اور روتے، تندرست رہتے، بیمار پڑتے اور وفات پاتے۔ غرض وہ ہر پہلو سے انسان ہوتے اور انسانیت کی ایک ایک چیز ان کے اندر موجود ہوتی۔ قرآن نے متعدد آیات میں حقیقتِ حال کی یہ تفصیل بتائی ہے مثلاً۔

انهم ليأكلون الطعام ويمشون في الأسواق

بلاشبہ اللہ کے رسول کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے تھے۔

اور

وجعلنا لهم ازواجاً وذرية

ہم نے ان کے بیوی بچے بنائے تھے۔

جس مصلحت کی بنا پر رسالت کے لیے انسانوں ہی کا تقرر ہوا اس کی بھی قرآن حکیم نے نشاندہی کر دی ہے۔ جب لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف یہ دلیل دی کہ اگر اللہ کو ہمارے پاس اپنا کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی فرشتے کو بھیجتا، نہ کہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قل لو كان في الارض ملائكة يمشون مطمئنين لنزلنا عليهم من السماء ملكاً رسولاً۔

اے رسول ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر روانہ کرتے۔

یہ آیت رسالت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ بتا رہی ہے کہ رسول کو اسی جنس اور اسی مخلوق میں سے ہونا چاہیے جس کے پاس جا کر اسے رسالت کا فرض انجام دینا ہے۔ بظاہر اگرچہ صرف ایک بات ہے لیکن فی الواقع یہ ایک ایسا کلمہ حکمت ہے جو عقل سلیم کو پوری بات سمجھا دیتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت آپ سے آپ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انسانوں تک اللہ کے احکام پہنچانے والے رسولوں کا انسان ہی ہونا ضروری تھا۔ ورنہ رسالت کا منشا پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن نے اس آیت میں ابن مریم کہہ کر یہی بات سمجھائی ہے کہ انسان ہیں اور انسان ہو کر اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی اعجازی ولادت

۲۵۲۔ اور حضرت مسیح اللہ کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے مریم پر القا کیا تھا۔ یعنی حضرت عیسیٰ مریم کے بیٹے ہیں اور حضرت مریم سے ان کی ولادت عام تخلیقی ضابطے سے نہیں بلکہ اللہ کے کلمہ کن سے ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ صرف کلمہ کن سے بلا توسط اسباب پیدا ہوئے۔ اگرچہ تمام لوگوں کی پیدائش اللہ ہی کے کلمہ سے ہوتی ہے مگر چونکہ بظاہر اور لوگوں میں کچھ اسباب ظاہری کا بھی لگاؤ ہوتا ہے۔ حضرت مسیح کی

ولادت میں یہ بھی نہ تھا اس لیے ان پر کلمۃ اللہ کا اطلاق ہوا۔ یہاں مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ مریم کے رحم پر اللہ نے یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد سے تعلق کے بغیر حمل کا استقرار قبول کرے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انہوں نے یونانی فلسفے سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو کلام کا ہم معنے سمجھ لیا۔ پھر اس کلام سے اللہ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس صفت ذاتی نے مریم کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کر لی جو مسیح کی شکل میں رونما ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے خدا ہونے کا غلط عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے صفت کلام کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ اس طرح عیسائیوں نے لفظ کلمہ کو بمعنے ذات خدا یا اقنوم علم سمجھ لیا ہے اور اپنے ان اختراعی معنی کو لے کر یہی ان کو قرآن کی اس آیت کے سمجھنے میں یہ شبہ ہو گیا کہ قرآن نے حضرت مسیح کو خدا کا کلمہ کہہ کر حضرت مسیح کی الوہیت کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ان کا ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ سمجھنے والوں نے تو عیسائیوں کے اس رکیک شبہ پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن حضرت مولانا کیرانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے ازالۃ الشکوک میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بے نظیر اور عجیب ہے۔ ہم معالم القرآن کے پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے یہاں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

لفظ کلمہ لغت عرب میں کہیں بمعنے ذات خدا یا اقنوم علم استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی کلمہ یا اس کی جمع کلمات خدا کی طرف مضاف ہو کر آیا ہے جیسے کلمۃ اللہ، کلمۃ ربک، کلمات ربہا، کلمتنا، اور کلماتہ۔ وہاں بمعنے کلام خدا یا حکم خدا آتا ہے مثلاً سورۂ توبہ میں وکلمۃ اللہ ھی العلیا، اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے۔ اور سورۂ انعام میں ہے وتمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا یعنی صداقت اور عدالت کی رو سے تیرے رب کی بات پوری ہو گئی۔ اور سورہ صافات میں ہے ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین ہمارا حکم اپنے بندوں کے حق میں جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے۔ بہرحال قرآن میں ہر جگہ لفظ کلمہ یا کلمات خدا کی بات اور خدا کے حکم کے معنے میں آیا ہے اور کہیں بھی بمعنے ذات یا اقنوم علم نہیں آیا ہے۔

حضرت مسیح کلمۃ اللہ ہیں

حضرت مسیح چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوتے یعنی عادت الٰہی کے خلاف ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے امر یعنی کن سے ہوئی اور اس طرح ان کو ولادت میں ایک قسم کا اختصاص ملا ہے اور یہودی ان کی

اس اختصاصی شان کو نہیں مانتے تھے اس لیے قرآن میں اللہ سبحانہ نے حضرت مسیح کو کلمۃ اللہ فرمایا۔ ورنہ ساری کی ساری مخلوق ہی اللہ کے حکم سے پیدا ہوتی۔ اور اختصاصی شان کو ظاہر کرنے کیلئے کلمہ کا اطلاق عربی زبان میں عام طور پر ہوتا تھا۔ مخلوق پر بخصوص مقدور پر لفظ قدرت مجبر پر لفظ جبر اور مشتہی پر شہوت بولا جاتا ہے اسی طرح کلمہ کن کے ذریعے جس کی ولادت ہوتی ہے اس کو کلمہ کہہ دینا لغت اور محاورے کے مطابق ہے۔

خود عہد جدید اور قدیم کی کتابوں میں یہ لفظ بمعنے کلام خدا اور حکم خدا آتا ہے۔ مثلاً زبور عربی میں ہے

بکلمۃ الرب ثبتت السماوات وبروح فیہ جمیع جنودھا۔

اس کا فارسی ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

آسمانہا بکلام خدا و تمامی عساکر آنہا بنفس دہانش ساختہ اند۔

اور ۱۹۳۳ء کے ہندی ترجمہ میں ہے:

خداوند کے کلام سے آسمان بنے اور ان کے سارے لشکر اس کے منہ کے دم سے۔

اور اخبار الایام کی پہلی کتاب کے سترہویں باب میں ہے۔

اور اسی رات ایسا ہوا کہ خدا کا کلام ناتان نبی کو پہنچا۔

اور انجیل لوقا کے تیسرے باب میں ہے:

خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یحیٰی کو پہنچا

اور اعمال کے چوتھے باب میں ہے:

خدا کی بات دلیری سے کہنے لگے

اور اعمال کے چھٹے باب میں ہے:

تب ان بارہ رسولوں نے سب مریدوں کو بلا کے کہا کہ مناسب نہیں کہ ہم خدا کی بات کو چھوڑ کے میزوں کی خدمت کریں اور خدا کی بات پھیل گئی۔

اور اعمال کے بارہویں باب میں ہے:

لیکن خدا کا کلام پھیل کر بڑھ گیا۔

اور اعمال کے تیرہویں باب میں ہے:

اور سلامی شہر میں پہنچ کے یہودیوں کی عبادت گاہوں میں خدا کے کلام کا وعظ کرنے لگے۔ چاہا کہ خدا کا کلام سنے، ۴۴۔ دوسرے سبت کے دن کو قریب سارے شہر کی ابادی آئی تاکہ خدا کی بات سنیں۔ ۴۶۔ تب پولس اور برنباہ نے دلیری کرکے

کہا صرور تھا کہ خدا کا کلام پہلے تم سے کیا۔

نامہ اوّل یوحنا کے باب دوم میں ہے:

اے جوانو! میں نے تمہیں لکھا ہے کہ تم دلیر ہو اور خدا کی بات تم میں رہتی ہے۔

ان سب مقامات میں لفظ کلمہ حکم اور بات کے معنوں میں آیا ہے [1]

بہرحال حضرت عیسٰی کے بارے میں کلمۃ اللہ ان کی تشریف و خصوصیت بتانے کے لیے آیا ہے ذکر ان کی الوہیت۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی خارق عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کی ولادت اسی طرح کلمہ کن سے ہوئی ہے جس طرح آدم کی ولادت کلمہ کن سے ہوئی ہے۔ اسباب تو ظاہر کا پردہ ہیں وجود اور زندگی تو جسے بھی ملتی ہے خدا ہی کے حکم سے ملتی ہے اور بس۔

حضرت عیسٰی رُوح من اللہ ہیں

۲۵۵ - اور ایک رُوح ہے جو اللہ کی جانب سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے زندہ کیے ہوتے اور اللہ کی بنائی ہوئی رُوح ہیں جو بلا اسباب عادی ظاہری مریم کے بطن میں مجسم ہو گئے۔ یعنی حضرت عیسٰی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک پاکیزہ رُوح ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے محض نفخہ جبریل سے پیدا کیا جیسے جبریل امین کو رُوح القدس کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ پاک رُوح ہیں۔ گویا حضرت عیسٰی کو اللہ نے وہ پاکیزہ رُوح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی، سراسر حقانیت اور راست بازی تھی اور از سر تا پا فضیلت اخلاق تھی۔ حضرت عیسٰی کی یہ تعریف عیسائیوں کو بھی بتائی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں غلو کیا۔ رُوح من اللہ کو عین رُوح اللہ قرار دے لیا اور مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی رُوح تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اور تو اور کچھ دلیے عیسائیوں نے قرآن کی اس تعبیر کا بھی منہ بگاڑ کر رکھ دیا اور برملا کہہ دیا۔ اس آیت کے موافق حضرت عیسٰی رُوح اللہ ہیں تو البتہ الوہیت کے مرتبہ میں ہیں۔ اس لیے کہ خدا کی رُوح کچھ خدا سے کم نہیں ہے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس شبہ کا ازالۃ الشکوک میں جو جواب دیا ہے وہ صرف لطیف نہیں بلکہ محققانہ ہے۔ اور بتایا ہے کہ قرآن میں حضرت عیسٰی کو روح منہ کیوں کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس آیت میں رُوح کی نسبت خدا کی طرف اگر حضرت مسیح کے حق میں ہے تو دوسری آیات میں اوروں کے حق میں بھی ہے مثلاً

---

[1] ازالۃ الشکوک۔

حضرت آدم کے بارے میں ہے فسویٰہ و نفخ فیہ من روحہ کہیں فرمایا و نفخت فیہ من روحی ان آیات میں حضرت آدم کے نفس ناطقہ کو اللہ نے اپنی رُوح فرمایا ہے اور روحہ و روحی اس پر بولا ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر قرآن میں حضرت جبریل کو اپنی رُوح فرمایا فارسلنا الیہا روحنا لہٰذا اس آیت میں روح منہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰی کا نفس ناطقہ اور جان اللہ کی جانب سے ہے۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر صرف اتنی سی بات ہے تو اس میں حضرت عیسٰی کی خصوصیت کیا ہے جان تو سب کی اللہ کی دی ہوئی ہے۔ حضرت عیسٰی کے بارے میں خاص طور پر یہ بات کیوں فرمائی گئی ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی دس وجوہ بتائی ہیں لیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے۔

اولاً یہ کہ اللہ سبحانہٗ اپنی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو اپنی طرف اس لیے نسبت اور اضافت کرتے ہیں تاکہ لوگوں میں اس کی عظمت کی نمائش ہو جائے۔ یہ اضافت تشریفی ہوتی ہے۔ قرآن میں اس قسم کی اضافتیں متعدد ہیں۔ بیتی میرا گھر، جنتی میری جنت، اس قسم کی اضافت صرف قرآن ہی میں نہیں ہے بلکہ عہد عتیق اور جدید کی کتابوں میں بکثرت موجود ہے مثلاً،

انجیل متی میں حضرت عیسٰی کا ارشاد ہے کہ

میرا گھر بیت المقدس عبادت کا پہلا گھر کہلائے گا۔

کتاب پیدائش کے باب ۲۸ میں ہے

اور یہ پتھر جو میں نے کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا

سموئیل کی کتاب دوم باب ششم میں ہے:

اور داؤد اپنے سارے لوگوں کو لے کر بعل یہوداہ سے چلا تاکہ خدا کی صندوق کو کہ جس کے پاس لشکروں کو یہواہ کا نام لیا جاتا ہے جو دو کروبوں کے بیچ میں دھرا تھا وہاں سے چڑھا لاوے ۳۔ سو انہوں نے خدا کی صندوق کو نئی گاڑی میں رکھا۔

ان میں خدا کا گھر، خدا کا صندوق میں اضافت تشریف کے لیے ہے۔

ثانیاً یہ کہ کچھ چیزوں کی تخلیق عام عادت الٰہیہ کے خلاف اور عجیب طور پر ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہٗ کو جب اس تخلیق اعجاز کو بتانا مقصود ہوتا ہے تو اس کی اضافت اپنی طرف کرتے ہیں جیسے اونٹنی کو ناقۃ اللہ فرمایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی تخلیق خلاف عادت الٰہیہ اللہ کی قدرت سے ہوئی ہے پتھر سے نکلی تھی باقاعدہ کوئی ولادت نہ ہوئی تھی۔

ثالثاً یہ کہ روح کے معنے پھونک کے آتے ہیں چونکہ حضرت عیسٰی مریم کے بطن میں حضرت جبریل کی

پھونک سے حمل میں آئے تھے اور جبریل کی پھونک محض اللہ کے حکم سے تھی اس لیے حضرت عیسٰی کو روح اللہ کہہ دیا گیا۔

رابعاً یہ کہ روح کے معنے نعمت کے بھی آتے ہیں۔ حضرت عیسٰی کی ذات گرامی بھی چونکہ اللہ کی رحمت تھی اس لیے ان کو روح اللہ کہہ دیا گیا۔

خامساً عربی زبان میں روح پاکیزہ چیز کو بھی بولتے ہیں اور چونکہ حضرت عیسٰی کی ولادت بغیر باپ کے نطفہ کے ہوئی تھی اس لیے ان پر عرب محاورے کے مطابق لفظ روح بولا گیا ہے۔

سادساً یہ کہ ہر ایسی چیز کو جو دینی امور میں مخلوق خدا کی بھلائی کا ذریعہ ہو عربی میں روح کہا جاتا ہے اسی اعتبار سے قرآن کو روح کہا گیا ہے ارشاد ہے،

وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا

السیوطی نے روح کی تفسیر قرآن سے کی ہے اور بیضاوی نے اسی کو قول مختار کہا ہے۔ حضرت عیسٰی بھی چونکہ ہدایت و تزکیہ میں مخلوق کی بھلائی کا سبب ہیں اس لیے ان کو روح اللہ کہا گیا ہے۔

سابعاً یہ کہ اناجیل کی زبان میں ہر سچے کو روح اللہ اور روح الحق کہا گیا ہے۔ فی الواقع حضرت عیسٰی ایک سچے واعظ تھے اسی اعتبار سے قرآن نے ان کو روح کہا ہے۔ یوحنا کے پہلے نامہ کے چوتھے باب میں ہے،

> اے پیارو تم ہر واعظ روح پر اعتقاد نہ رکھو بلکہ روحوں (واعظوں) کو آزماؤ کہ وے خدا کی طرف سے ہیں کہ نہیں۔ کون روح (واعظ) خدا سے ہے تم اسی سے جانو ہر ایک روح (واعظ) جو اقرار کرتا ہے کہ یسوع مسیح جسم میں ظاہر ہوا خدا سے ہے۔ ہم خدا کے ہیں جو خدا کو پہچانتا ہے۔ ہماری سنتا ہے اور جو خدا کا نہیں ہماری نہیں سنتا ہے ہم اسی سے روح الحق سچے واعظ اور روح الضلال گمراہی کے واعظ کو پہچانتے ہیں۔

اس میں روح اللہ روح الحق سچے واعظ پر بولا گیا ہے۔

ثامناً یہ کہ انجیل اور عہد عتیق میں روح اللہ بمعنے قدرت خداوندی مستعمل ہے۔ چنانچہ انجیل متی کے باب ۱۲ میں ہے:

> لیکن اگر میں خدا کی روح سے دیووں کو دور کرتا ہوں تو خدا کی بادشاہت تم تک پہنچتی ہے۔

اور لوقا کی انجیل میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے کہ

> اگر میں خدا کی قدرت سے دیووں کو نکالتا ہوں تو البتہ خدا کی بادشاہت تم

کلمہ کن۔

مٹی نے خدا کی روح سے بولا اور لڑکا نے خدا کی قدرت سے اسی کی تفسیر کر دی۔ حضرت مسیح بھی چونکہ بغیر باپ کے خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان پر روح اللہ اور روح من اللہ کا اطلاق صحیح ہے تاسعاً یہ کہ کتب عہد قدیم میں روح اللہ میں نفس ناطقہ کو بھی کہا گیا ہے جسے ادراک کامل ہو اور مصدر حسنات ہو۔ چنانچہ کتاب پیدائش کے باب ۴۱ میں بادشاہ مصر کا حضرت یوسف کے بارے میں قول آیا ہے۔

اور فرعون نے اپنے نوکروں کو کہا کہ تم ایسا جیسا یہ مرد ہے جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں۔

اور کتاب دانیال کے باب چہارم میں ہے کہ روح خدایان مقدس درست اور اس کے مقابلہ میں روح زنا وغیرہ آتی ہے۔ یوشع کی کتاب کے باب چہارم میں ہے حرامکاری کی روح نے انہیں گمراہ کیا ہے۔ چونکہ حضرت مسیح کا نفس ناطقہ ادراک کامل سے مالا مال، حسنات اور عجائب و غرائب کا مصدر تھا، اس لیے ان کو روح اللہ کہا گیا ہے۔ اس صورت میں اور پہلی اور دوسری میں روح منہ کا مضاف محذوف ہوگا اصل عبارت یوں ہے ذو روح منہ السیوطی نے جلالین اور قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

عاشراً یہ کہ چونکہ مطلق روح کو تجرد اور اصل خلقت کے اعتبار سے اللہ کی ذات کے ساتھ ایک طرح کی مناسبت ہے۔ اس لحاظ سے مطلق روح کی اضافت بھی خدا کی طرف صحیح ہے۔ چنانچہ حزقی ایل کی کتاب میں اللہ سبحانہ نے ان سب لوگوں کو مخاطب کر کے جن کو حضرت حزقیل کے معجزہ سے زندہ کیا تھا فرمایا۔ اور جب میں اپنی روح تم میں رکھوں گا۔ عربی میں تعبیر یوں ہے فاعطی فیکم روحی۔ اس میں اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کی جان کو اپنی روح فرمایا ہے۔[1]

بہرحال ان وجوہ کی بنا پر قرآن کی اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضرت مسیح کو روح فرمایا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کلمۃ اللہ، روح اللہ قسم کے اطلاقات سے حضرت مسیح کی الوہیت کو ثابت کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ ہاں اس سے دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں ایک طرح کی فضیلت ضرور ثابت ہوتی ہے۔

۲۵۶۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ ذکھو کر تین ہیں۔ یعنی ان صحیح حقائق

---

[1] ازالۃ الشکوک ملخصاً

سمجھ لینے کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد و خیالات کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسولوں کی ہدایات پر ایمان لاؤ۔ اللہ کو الٰہ واحد مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو جن میں سے ایک رسول مسیح بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم تھی اور یہی امر حق ہے جسے ایک سچے حضرت مسیح کے پیرو کو ماننا چاہیے۔ اور یہ کہہ کر تین ہیں۔ یعنی تین خداؤں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ وہ تین اقنوم ہوں یا تین مستقل بالذات ہستیاں ہوں۔ پہلے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جب خدا کے تمام رسولوں کی تعلیم تورات و انجیل میں موجود ہے اور اس تعلیم میں مسیح سے لے کر آدم تک کہیں سراغ نہیں ملتا تو آخر یہ عقیدہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا ہے۔ پس صحیح راستہ یہ ہے کہ الگ پگڈنڈی بنانے کے بجائے تم بھی اس صراط مستقیم پر چلو جس پر تمام نبی اور رسول چلے، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسیح کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف ہو۔

عیسائی مذہب میں خدا کا تصور

جہاں تک خدا کے وجود کا تعلق ہے عیسائی مذہب اس معاملہ میں دوسرے مذاہب سے مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی خدا کو تقریباً انہی صفات کے ساتھ تسلیم کرتا ہے جو دوسرے مذاہب میں اس کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ مارس، لمعن لکھتا ہے:

> عیسائیت کا خدا کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ ایک زندہ جاوید وجود ہے جو تمام امکانی صفات کمال کے ساتھ متصف ہے۔ اسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن پوری طرح سمجھا جا نہیں سکتا، اس لیے اس کی حقیقت کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ ہمارے ذہن کی قوت سے ماوراء ہے وہ فی نفسہٖ کیا ہے! ہمیں معلوم نہیں صرف اتنی بات معلوم ہے جو خود اس نے بنی نوع انسان کو وحی کے ذریعے بتلائی ہے۔

عقیدہ تثلیث

یہاں تک تو بات واضح اور صاف ہے لیکن آگے چل کر اس مذہب نے خدا کے تصور کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بڑی الجھی ہوئی ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ یہ بات تو ہر کس و ناکس کو معلوم ہے کہ عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم سے مرکب ہے۔ باپ، بیٹا، روح القدس۔ اسی کو عقیدۂ تثلیث کہتے ہیں لیکن بجائے خود اس عقیدے کی تشریح و تعبیر میں عیسائی علماء کے بیانات اس

قدر مختلف ہیں کہ یقینی طور پر کوئی ایک بات کہنا بہت مشکل ہے۔ وہ تین اقانیم کون ہیں؟ جن کا مجموعہ ان کے نزدیک خدا ہے۔ خود ان کی تعیین میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا باپ بیٹے اور روح القدس کے مجموعہ کا نام ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ باپ بیٹا اور کنواری وہ تین اقنوم ہیں جن کا مجموعہ خدا ہے۔ پھر ان تین اقانیم میں سے ہر ایک کی انفرادی حیثیت کیا ہے اور خدا کے مجموعے سے جسے تثلیث کہتے ہیں اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس سوال کے جواب میں بھی ایک زبردست اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان تین میں سے ہر ایک بذاتِ خود بھی ویسا ہی خدا ہے جیسا مجموعہ خدا، ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک الگ خدا تو ہیں مگر مجموعہ خدا سے کم ہیں اور ان پر لفظ خدا کا اطلاق ذرا وسیع معنے میں کر دیا گیا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ تین خدا ہی نہیں خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے۔

خواب پریشاں

غرض اس قسم کے بے شمار اختلافات ہیں جن کی وجہ سے تثلیث کا عقیدہ ایک خواب پریشاں بن کر رہ گیا ہے۔ ہم اس جگہ عقیدے کی وہ تشریح پیش کرتے ہیں جو عیسائیوں کے یہاں سب سے زیادہ مقبول عام معلوم ہوتی ہے یہ تعبیر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں مندرجہ ذیل ہے:

> تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ باپ خدا ہے، بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں اس لیے کہ عیسائی نظریے کے مطابق ہم جس طرح تینوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں۔

اسی بات کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تیسری صدی عیسوی کے مشہور عیسائی عالم اور فلسفی سینٹ آگسٹائن اپنی مشہور کتاب علی الثالوث میں لکھتے ہیں:

> عہد قدیم اور جدید کے وہ تمام کیتھولک علماء جنہیں پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور جنہوں نے مجھ سے پہلے تثلیث کے موضوع پر لکھا ہے وہ مقدس صحیفوں کی روشنی میں اس نظریے کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدائی وحدت تیار کرتے ہیں جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک اور ناقابل تقسیم ہے۔

> اس وجہ سے وہ تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک خدا ہے اگرچہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا۔ لہٰذا جو باپ ہے وہ بیٹا نہیں ہے۔ اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے جو بیٹا ہے وہ باپ نہیں ہے اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا بلکہ باپ اور بیٹے کی روح ہے، جو دونوں کے ساتھ مساوی اور تثلیثی وحدت میں ان کی حصہ دار ہے لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ تثلیثی وحدت ہی کنواری مریم کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے، اسے پینطس پیلاطس نے پھانسی دی اسے دفن کیا گیا اور پھر یہ تیسرے روز زندہ ہو کر جنت میں چلی گئی، کیونکہ یہ واقعات تثلیثی وحدت کے ساتھ نہیں، صرف بیٹے کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ یہی تثلیثی وحدت یسوع مسیح پر کبوتر کی شکل میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب اسے بپتسمہ دیا جا رہا تھا بلکہ یہ واقعہ صرف روح القدس کا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ جب یسوع مسیح کو بپتسمہ دیا جا رہا تھا یا جب وہ اپنے تین شاگردوں کے ساتھ پہاڑ پر کھڑا تھا۔ اس وقت تثلیثی وحدت نے اس سے پکار کر کہا تھا کہ تو میرا بیٹا ہے ... بلکہ یہ الفاظ صرف باپ کے تھے جو بیٹے کے لیے بولے گئے تھے۔ اگرچہ جس طرح باپ بیٹے اور روح القدس ناقابل تقسیم ہیں۔ اسی طرح ناقابل تقسیم طریقے پر وہ کام بھی کرتے ہیں، یہی میرا عقیدہ ہے اس لیے کہ یہ کیتھولک عقیدہ ہے۔

تین کو ایک اور ایک کو تین قرار دینے کی عیسائیوں کے پاس وجہ جواز کیا ہے۔ اس سوال کا جواب سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ عیسائی مذہب میں باپ بیٹے اور روح القدس سے کیا مراد ہے۔

عیسائیوں کے نزدیک باپ سے مراد خدا کی تنہا ذات ہے جس میں اس کی صفت کلام اور صفت حیات سے قطع نظر کر لی گئی ہے۔ یہ ذات بیٹے کے وجود کے لیے اصل کا درجہ رکھتی ہے۔ مشہور عیسائی فلاسفر سینٹ تھامس ایکوئیناس کی تشریح کے مطابق باپ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے کسی کو جنا ہے اور کوئی ایسا وقت گزرا ہے جس میں باپ تھا اور بیٹا نہیں تھا بلکہ یہ ایک خدائی اصطلاح ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ باپ بیٹے کے لیے اصل ہے جس طرح ذات صفت کے لیے اصل ہوتی ہے ورنہ جب سے باپ موجود ہے اسی وقت سے بیٹا موجود ہے اور ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی زمانی اولیت حاصل نہیں ہے۔

خدا کی ذات کو باپ کیوں کہا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے الفریڈ ای گاروے نے لکھا ہے کہ

اس سے کئی حقائق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام مخلوقات اپنے وجود میں خدا کی محتاج ہیں۔ جس طرح بیٹا باپ کا محتاج ہوتا ہے، دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر اس طرح شفیق اور مہربان ہے جس طرح باپ اپنے بیٹے پر مہربان ہوتا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج ۳ ص ۸۵)

بیٹے سے مراد عیسائیوں کے نزدیک خدا کی صفت کلام ہے۔ لیکن یہ انسانوں کی صفت کلام کی طرح نہیں ہے۔ انسانوں کی صفت کلام اور خدا کی صفت کلام کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے اکیوناس لکھتا ہے۔

انسانی فطرت میں صفت کلام کوئی جوہری وجود نہیں ہے اسی وجہ سے اس کو انسان کا بیٹا یا مولود نہیں کہہ سکتے لیکن خدا کی صفت کلام ایک جوہری ہے جو خدا کی ماہیت میں اپنا ایک وجود رکھتا ہے اسی لیے اس کو حقیقۃً نہ مجازاً بیٹا کہا جاتا ہے اور اس کی اصل کا نام باپ ہے۔

عیسائی عقیدے کے مطابق خدا کو جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اسی صفت کے ذریعے ہوتی ہیں۔ اور اسی صفت کے ذریعے تمام اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صفت باپ کی طرح قدیم اور جاودانی ہے۔ خدا کی یہی صفت یسوع مسیح بن مریم کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی جس کی وجہ سے یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ حلول کا یہ عقیدہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

رُوح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور محبت ہے یعنی اس صفت کے ذریعے خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت علم (بیٹے) سے محبت کرتی ہے اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے۔ یہ صفت بھی صفت کلام کی طرح ایک جوہری وجود رکھتی ہے اور باپ بیٹے کی طرح قدیم اور جاودانی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ایک مستقل اقنوم کی حیثیت حاصل ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب حضرت مسیح کو بپتسمہ دیا جا رہا تھا تو یہی صفت ایک کبوتر کے جسم میں حلول کر کے حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب حضرت مسیح کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا تو عید پینتی کوسٹ کے روز بھی رُوح القدس آتشیں زبانوں کی شکل میں حضرت مسیح کے حواریوں پر نازل ہوا۔

اب عقیدہ توحید فی التثلیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ خدا تین اقانیم یا شخصوں پر مشتمل ہے۔ خدا کی ذات جسے باپ کہتے ہیں خدا کی صفت کلام جسے بیٹا کہتے ہیں اور خدا کی صفت حیات جسے روح القدس کہا جاتا ہے۔ ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے۔ لیکن یہ تینوں مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ

ایک ہی خدا ہیں[1]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں مسیحی تثلیث کا عقیدہ خود مسیحیوں کے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ "باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح قدس غیر محدود۔ باپ ازلی بیٹا ازلی اور روح قدس ازلی تاہم تین ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود، یونہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح قدس قادر مطلق۔ تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا باپ خدا بیٹا خدا روح القدس خدا بس یہی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا تین میں ایک اور ایک میں تین کے اسی گورکھ دھندے کو عیسائیوں کے لیے ایک ناقابل حل چیستان بنا دیا۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے پر سر کھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں، اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہو گئے۔ اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی اور نہ حضرت مسیح نے، اور نہ اس چیستان کا کوئی حل ممکن ہے۔ یہ از تین خود ان کے غلو کی تخلیق ہے۔ اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں اور تین کہنا چھوڑ دیں، اور بس۔

حلول و تجسم کے عقیدہ کا بطلان

۲۵۷۔ اس سے باز آجاؤ اس میں تمہارے لیے خیر ہے۔ یعنی تین خدا کہنے سے اور تین میں ایک اور ایک میں تین کے چکر سے باز آجاؤ۔ یہ بات دھمکی کے انداز میں ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کہنے سے باز آجاؤ کہ خدا کی صفت کلام انسانوں کی فلاح کے لیے حضرت مسیح کے انسانی وجود میں حلول کر گئی۔ حضرت مولانا اشرف علی نے یہ بات بر موقعہ فرمائی ہے کہ یہ آیت کریمہ حلول و اتحاد کے بطلان صریح پر دال ہے۔ حضرت مسیح کے بارے میں حلول و تجسم کا عقیدہ سب سے پہلے انجیل یوحنا میں ملتا ہے اس انجیل کا مصنف حضرت مسیح کی سوانح کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے۔

ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا یہی ابتداء میں

---

[1] عیسائیت کیا ہے از مولانا محمد تقی عثمانی

خدا کے ساتھ تھا۔ (یوحنا ۱ : ۱-۲)

اور آگے چل کر لکھتا ہے :

اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔ (یوحنا ۱ : ۱۴)

چونکہ عیسائی مذہب میں کلام خدا کے اقنوم ابن سے عبارت ہے جو خود مستقل خدا ہے اس لیے یوحنا کی عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفت کلام یعنی بیٹے کا اقنوم مجسم ہو کر حضرت مسیح علیہ السلام کے روپ میں آگیا تھا۔ مارس ریلیش اس عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

کیتھولک عقیدے کا یہ کہنا ہے کہ وہ ذات جو خدا تھی خدائی کی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی یعنی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کر لیں جو زمان و مکان کی قید میں مقید ہے اور ایک عرصہ تک ہمارے درمیان مقیم رہی۔

بیٹے کے اقنوم کو یسوع مسیح علیہ السلام کے انسانی وجود کے ساتھ متحد کرنے والی طاقت عیسائیوں کے نزدیک رُوح القدس تھی۔ روح القدس سے مراد عیسائیوں میں خدا کی صفت محبت ہے۔ اس لیے اس عقیدے کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ خدا کو اپنی بندوں سے محبت تھی اس لیے اس نے اپنی صفت محبت کے ذریعے اقنوم ابن کو دنیا میں بھیج دیا تاکہ وہ لوگوں کے اصلی گناہ کا کفارہ بن سکے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عیسائیوں کے نزدیک بیٹے کے حضرت مسیح میں حلول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹا خدائی چھوڑ کر انسان بن گیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے صرف خدا تھا اب انسان بھی ہو گیا لہٰذا اس عقیدے کے مطابق حضرت مسیح بیک وقت خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ الفریڈ ای گاروے اسی بات کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :

وہ حضرت مسیح حقیقتہً خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ ان کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوتے۔ اتہناسیس نے آریوس کے مقابلہ میں اس نظریہ کی پرزور حمایت کی تھی لہٰذا منظور شدہ فارمولا یہ ہے کہ حضرت مسیح کی ایک شخصیت میں دو ماہیتیں جمع ہو گئی تھیں۔

انسانی حیثیت سے حضرت مسیح خدا سے کمتر تھے اسی لیے انہوں نے یہ کہا تھا کہ

" باپ مجھ سے بڑا ہے "۔

اور اسی حیثیت سے ان میں تمام انسانی کیفیات پائی جاتی تھیں لیکن خدائی حیثیت سے وہ باپ کے ہم مرتبہ ہیں اس لیے انجیل یوحنا میں آپ کا یہ قول مذکور ہے۔

میں اور باپ ایک ہیں۔

اگسٹائن لکھتے ہیں،

علیٰ ہذا القیاس خدائی حیثیت سے انہوں نے انسان کو پیدا کیا اور انسانی حیثیت سے وہ خود پیدا کیے گئے۔

بلکہ اگسٹائن تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ،

چونکہ خدا نے بندے کا روپ اس طرح نہیں اپنایا تھا کہ وہ اپنی اس خدائی حیثیت کو ختم کر دے جس میں وہ باپ کے برابر ہے لہٰذا ہر شخص اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ یسوع مسیح اپنی خدائی شکل میں خود اپنے آپ سے افضل ہے، اور اسی طرح اپنی انسانی حیثیت میں خود اپنے آپ سے کمتر بھی ہے۔[1]

بہرحال کچھ ہو قرآن کا مطالبہ ہے کہ ان سب خیالی معتقدات سے باز آجاؤ اور آخر میں فرمایا ہے کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ یعنی اگر تم توحید کو مانو گے تو یہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا اس دنیا میں بھی بہتر ہے اور آخرت میں بھی بہتر ہے۔ دنیا کی بہتری یہ ہے کہ نوع انسانی جس مقصد کی خاطر دنیا میں آئی ہے اور اللہ سبحانہ نے جو کمالات اس کے لیے مقدر فرمائے ان کمالات تک پہنچنا ممکن ہو جائے گا اور آخرت کی بہتری یہ ہے کہ عالم غیب میں ان کمالات کے جو نتائج اللہ سبحانہ نے متعین فرمائے ان سے بہرہ ور ہوگا ابدی زندگی، راحت و انعام والی پائے گا۔ اور اگر توحید کی جگہ تثلیث کو اپنایا تو بد ترین زندگی ہوگی اور شرک اس دنیا میں انسان کو اپنے نوعی کمال تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور آخرت میں مشرک کے لیے سرتاسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔

توحید الوہیت کا اعلان

۲۵۸۔ امر واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی ذات ہی یگانہ معبود ہے، وہ ہر اعتبار سے اور ہر معنے میں واحد ہے۔ تثلیث اور حلول و اتحاد کی وہاں گنجائش نہیں۔ کسی بھی پیغمبر نے از مسیح تا

---

[1] عیسائیت۔

اُدم تثلیث کی تعلیم نہیں دی ہے سب توحید کے منادی ہوکر آئے ہیں۔ عہدِ قدیم اور عہدِ جدید میں سب نبیوں نے اس کی دعوت دی ہے یہی سارے نبیوں کا اشتراکی سرمایہ ہے۔ قرآن کے بیان توحید کی تائید صحف عہد عتیق اور جدید کی کتابیں بھی کرتی ہیں مثلاً

تورات سفر استثناء باب ۴ آیت ۳۵، ۳۶

یہ سب تجھ کو دکھایا گیا تاکہ تو جانے کہ خداوند وہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں۔

تورات سفر استثنا باب ۶ آیت ۴

سُن لے اے اسرائیل خداوند ہمارا اکیلا خدا ہے۔

تورات سفر استثنا باب ۳۲ آیت ۳۹

اب دیکھو کوئی معبود میرے ساتھ نہیں اور میں ہی مارتا ہوں اور میں جلاتا ہوں اور میں ہی زخمی کرتا ہوں اور میں ہی چنگا کرتا ہوں، اور ایسا کوئی نہیں جو میرے ہاتھ سے چھڑا دے۔

زبور مقدس باب ۸۶ آیت ۹

تو بزرگ اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

زبور باب ۷۷ آیت ۱۳۔

اے خدا تیری راہ مقدس ہے، کون معبود خدا کے مانند بڑا ہے۔

اول کتاب السلاطین باب ۸ آیت ۶۰۔

تاکہ زمین کے سارے گروہ معلوم کریں کہ خداوند وہی خدا ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

کتاب اشعیا باب ۴۳ آیت ۱۱

اور میرے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

کتاب اشعیا باب ۴۵ آیت ۱۴

اور تیرے آگے سجدہ کریں گے اور تیرے آگے منت کریں گے اور کہیں گے کہ یقیناً خدا تجھ میں ہے اور کوئی دوسرا نہیں اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں یقیناً تو ہی ایک خدا ہے۔

کتاب اشعیا باب ۴۶ آیت ۹

میں خدا ہوں اور کوئی دوسرا نہیں، میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں ہے۔

کتاب خروج باب ۱۵ آیت ۱۱

معبودوں میں خداوند تجھ سا کون ہے، پاکیزگی میں کون ہے تیرا سا جلال والا۔

کتاب دوم سموئیل باب ۷، آیت ۲۲
اے خداوند کوئی تیری مانند نہیں اور تیرے سوا جہاں تک ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہے کوئی خدا نہیں ہے۔

اول کتاب السلاطین باب ۸ آیت ۲۳
اور سلیمان نے اسرائیل کی ساری جماعت کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے اور کہا اے خداوند اسرائیل کے خدا تجھ سا کوئی خدا نہ اوپر آسمان میں ہے دیکھیے۔

کتاب اشعیا باب ۴۰ آیت ۲۸۔
کیا تو نے نہیں جانا کیا تو نے نہیں سنا خداوند ابدی خدا ہے۔ زمین کے کناروں کا پیدا کرنے والا وہ تھک نہیں جاتا اور ماندہ نہیں ہوتا اس کے فہم کی تہہ نہیں ہے۔

کتاب یرمیاہ باب ۱۰ آیت ۱۰ تا ۱۵
لیکن خداوند سچا خدا ہے وہ زندہ خدا اور ابدی بادشاہ ہے۔ زمین اس کے قہر سے تھرتھراتی ہے اور قومیں اس کے جھلاہٹ کی برداشت نہیں کر سکتی ہیں تم ان سے اس طرح کہو کہ جن معبودوں نے آسمان و زمین کو نہیں بنایا زمین پر سے اور آسمان کے نیچے سے نیست ہوں گے۔ اسی نے اپنی قدرت سے دنیا کو بنایا ہے۔ اسی نے اپنی حکمت سے جہان کو قائم کیا ہے۔ عہد عتیق کی طرح عہد جدید کی کتابوں میں بھی جگہ جگہ توحید کی تعلیم موجود ہے۔ مثلاً

یسوع نے کہا کہ میں اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں۔

یوحنا باب ۲۰ آیت ۱۷
ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جس کو تو نے بھیجا ہے جانیں۔ (یوحنا باب ۱۷ آیت ۳)

اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے ۲۹۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے ۳۰ اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔

مرقس باب ۱۲ آیت ۲۸
اے استاد کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے

مرقس ۱۳ - ۳۲

تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے۔

متی ۱۹ - ۱۷

یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما سبقتنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔

متی ۲۷ - ۴۶۔

جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ (یوحنا ۱۴ - ۲۴

زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ رکھو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے۔

متی ۹ - ۲۳۔

یسوع نے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک دعا مانگوں۔ متی ۲۶ - ۳۶۔

یسوع نے کہا لکھا ہے کہ تو اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔

لوقا ۴ آیت ۷، ۸

ان تصریحات کے باوجود عیسائی تثلیث کے گورکھ دھندے سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے اس گورکھ دھندے سے پریشان ہو کر صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح کو خدا ماننا ہی غلط ہے وہ صرف انسان تھے۔ مسٹر جیمس میک کنن نے اپنی فاضلانہ کتاب میں ان منکرین کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اس نظریہ کے ابتدائی لیڈر پال آف سموسٹا جن کا نام حافظ ابن حزم نے الملل والنحل بولس الشمشاطی بتایا ہے اور لوسین ہے۔ مسٹر میک کنن لکھتے ہیں۔

دونوں کا نظریہ یہ تھا کہ یسوع مسیح ایک مخلوق تھے البتہ دونوں کے نظریات میں یہ فرق ہے کہ پال کے نزدیک وہ محض ایک انسان تھے جن میں خدا کی غیر شخصی عقل نے اپنا مظاہرہ کیا تھا۔ اور لوسین اور اس کے مکتب فکر کے نزدیک وہ ایک آسمانی وجود تھے جس کو خدا عدم سے وجود میں لایا تھا اور جن میں خدائی عقل اپنی شخصی کیفیت میں آگئی تھی۔ لہٰذا وہ حلول کے وقت ایک انسانی جسم کا مظاہرہ کرتے تھے مگر ان کی روح انسانی نہیں تھی۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ باپ کا پیغام پہنچائیں لیکن نہ تو وہ علی الاطلاق خدا تھے اور نہ قدیم وجاودانی۔

گویا پال نے تو سرے سے حلول کے عقیدے ہی کا انکار کر دیا اور یہ کہا کہ حضرت مسیح کے وجود میں خدا کے حلول کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے ایک خاص عقل عطا ہوئی تھی

اور لوسین نے حلول کے عقیدے کا تو انکار نہیں کیا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ خدا کی صفت علم ان میں حلول کر گئی تھی لیکن یہ حلول ایسا نہ تھا کہ حضرت مسیح کو خدا، خالق، قدیم اور جاودانی بنا دے بلکہ اس حلول کے باوجود خدا بدستور خالق رہا اور حضرت مسیح بدستور مخلوق۔

پال اور لوسین ہی کے نظریات سے متاثر ہو کر چوتھی صدی عیسوی میں مشہور متفکر آریوس نے اپنے وقت کے کلیسا کے خلاف بڑی زبردست جنگ لڑی اور پوری عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس کے نظریات کا خلاصہ میک گفن کے الفاظ میں یہ تھا۔

> آریوس میں اس بات پر زور دیتا تھا کہ صرف خدا ہی قدیم اور جاودانی ہے اور اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ اسی نے بیٹے کو پیدا کیا جب کہ وہ پہلے معدوم تھا۔ لہٰذا نہ بیٹا جاودانی ہے اور نہ خدا ہمیشہ سے باپ ہے کیونکہ ایک ایسا وقت تھا جس میں بیٹا موجود نہیں تھا۔ بیٹا باپ سے بالکل الگ ایک حقیقت رکھتا ہے اور اس پر تغیرات واقع ہو سکتے ہیں۔ وہ صحیح معنے میں خدا نہیں ہے۔ البتہ اس میں مکمل ہونے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ ایک مکمل مخلوق ہے۔ ایک عقل مجسم جو ایک حقیقی انسانی جسم میں پائی جاتی ہے اس طرح اس کے نزدیک مسیح ایک ثانوی خدائی کا حامل ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ نیم دیوتا جو خدائی اور انسانیت دونوں کی صفات سے کسی قدر حصہ رکھتا ہے لیکن بلند ترین معنے میں خدا نہیں ہے۔
>
> گویا اس کی نظر میں حضرت مسیح کی حیثیت
> بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
>
> کی تھی۔ اور بس۔

عقیدۂ ابنیت پر ضرب کاری

۲۵۹۔ اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور کارساز ہونے کے لیے اللہ کافی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق اور اس کی مملوک اور اس کے بندے ہیں، پھر کیسے کوئی اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اور اللہ سب کام بنانے والا اور سب کی کارسازی کے لیے وہی کافی ہے، کسی دوسرے کی حاجت نہیں پھر بتلاتے اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہو

ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ نہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور نہ اس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش اور نہ اس کو اس کی حاجت، جس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص حق تعالیٰ کے لیے بیٹا یا کسی کو اس کا شریک مانتا ہے وہ حقیقت میں جملہ موجودات کو مخلوق باری اور باری تعالیٰ کو خالق جملہ موجودات نہیں مانتا اور نیز اللہ تعالیٰ کو سب کی حاجت برآری اور کارسازی کے لیے کافی نہیں جانتا۔ گویا خدا کو خدائی سے نکال کر مخلوقات اور ممکنات میں داخل کر دیا، تو اب ارشاد سبحانہ ان یکون لہ ولد میں جس ناپاکی کی طرف اشارہ خفی تھا اس کا پتہ چل گیا۔ اور فرزند حقیقی اور فرزند مجازی اور ظاہری دونوں میں وہ ناپاکی چونکہ برابر موجود ہے تو خوب سمجھ میں آگیا کہ اس کی ذات مقدس جیسے اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہو اس سے بھی پاک اور برتر ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنائے لہ

یہ عیسائیوں کے چوتھے غلو کی تردید ہے۔ ولدیت کا عقیدہ غلط ہی نہیں بلکہ اصلاً مہمل اور تنزیہ الوہیت کے لیے باعث توہین اور شان الوہیت کے بالکل منافی ہے۔ خالق کا صحیح رشتہ مخلوق کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے۔ مالک و مملوک میں مباینت لازمی ہے برخلاف والد و مولود کے کہ ان میں ہم جنسی اور ہم قومی شرط ہے۔ جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی مخلوق اللہ کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ بائبل کے عہد جدید کی روایات مثلاً،

> آسمان سے یہ آواز کہ یہ یعنی حضرت مسیح میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں
>
> (متی باب ۳ آیت ۱۷)

تو ان سے زیادہ سے زیادہ بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلقات سے تشبیہ دی ہے اور باپ کا لفظ وہ خدا کے لیے محض مجازاً اور استعارے کے طور پر استعمال کرتے تھے، یہ تنہا مسیح کی خصوصیت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ بولتے چلے آرہے تھے اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل کے پرانے عہد نامے میں موجود ہیں۔ حضرت مسیح نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا ہے وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے لیکن عیسائیوں

لہ افادات شیخ الاسلام

نے غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی رُوح کا جسدی ظہور ہے۔ اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے اور خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو زمین پر اس لیے بھیجا ہے کہ انسانوں کے گناہوں کو اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود حضرت مسیح کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس غلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارے کی تردید نہیں کی ہے کیونکہ عیسائیوں کے یہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے۔ اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جاتے اور اس غلط فہمی کو دُور کر دیا جاتے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے[1]

اللہ کا بندہ ہونا شرف ہے

۱۷۲۔ مسیح کو ہرگز اس بات سے عار نہیں ہے کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جاتے اور نہ خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ و عار ہے۔ یعنی اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجا لانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر اور ضرورت پوچھیے ان کو اس سے کیسے ننگ و عار ہو سکتا ہے۔ البتہ ذلت اور عیرت تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مان کر ان کی اور بتوں کی عبادت کرنے لگے سو ان کے لیے ہمیشہ کو عذاب اور ذلت ہے۔[2]

نجران کے عیسائیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے خداوند یسوع کا رتبہ کم کرتے ہیں کہ آپ ان کو خدا کا بندہ کہتے ہیں، اس میں ان کی توہین ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خود اللہ کا بندہ بننے سے عار نہیں ہے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی۔ دراصل یہ بھی غلو کی ایک صورت ہے کہ جب کسی شخص کو مانتے ہیں تو یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس سے عقیدت

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

رکھتے ہیں اس کو بڑھا کر دکھائیں۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو مانا تو صرف اس پر قانع نہ ہے کہ ان کو اللہ کا بندہ اور رسول کہیں بلکہ ان کو حاضر و ناظر، مختار کل، واقف غیب ابن اللہ تین میں سے تیسرا بنا دیا یہاں قرآن نے عیسائیوں کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ تم عبداللہ کہتے ہوتے جھجکتے ہو اور اسے مسیح کی شان میں گستاخی اور بے ادبی سمجھتے ہو لیکن خود حضرت مسیح تو عبداللہ ہونے کو ہرگز عار نہیں سمجھتے، مسیح تو کیا عار سمجھیں گے وہ بھی عار نہیں سمجھتے جو نوری مخلوق ہیں اور جنہیں اللہ سے قرب ہے، خدا کا بندہ ہونا تو اتنا بڑا شرف ہے کہ اس سے اوپر کسی شرف کا تصور بھی نہیں ہے۔

یہاں شارحین قرآن نے تفضیل ملائکہ علی الانبیاء اور تفضیل انبیاء علی الملائکہ کی بحث چھیڑ دی ہے۔ معتزلہ کا مذہب چونکہ ملائکہ کی افضلیت کا ہے اس لیے اس آیت میں ملائکہ کے مسیح پر عطف کو دیکھ کر علامہ زمخشری نے اپنے مسلک کی ترجمانی کا فرض ادا کرنا ضروری سمجھا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل تعبیری نوع سے حل نہیں ہوتے۔ یہاں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہوتے ہیں، صرف عطف کی تعبیر کے سہارے استدلال کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ عطف میں معطوف ضرور اعلیٰ ہو۔ بہرحال اس موضوع کی تفصیل مباحث کا یہ محل نہیں ہے۔

خدا کی بندگی سے ننگ و عار

۲۶۱ - اور جو کوئی اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور گھمنڈی بنے گا اللہ ضرور سب کو اپنے حضور جمع کرے گا۔ پھر وہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح کی متاع رکھتے ہوں ان کو پوری پوری اجرتیں دے گا اور اپنے فضل سے مزید دے گا اور وہ لوگ جو خدا کی بندگی کو ننگ و عار سمجھتے ہوں اور گھمنڈی ہیں ان کو دردناک عذاب دے گا اور اس روز ان کا خدا کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ ہوگا یعنی جو شخص اللہ کی بندگی سے ناک چڑھانے گا اور سرکشی کرے گا تو وہ یونہی نہ چھوڑ دیا جائے گا بلکہ ایک روز سب کو اللہ کے سامنے جمع ہونا اور حساب دینا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے یعنی اللہ کی بندگی پوری بجا لائے ان کو ان کے کاموں کا پورا پورا ثواب ملے گا بلکہ اللہ کے فضل سے بڑی بڑی نعمتیں ان کو ثواب سے زیادہ بھی ان کو عنایت ہوں گی اور جنہوں نے اللہ کی بندگی سے ناک چڑھائی اور سرکشی کی وہ عذاب عظیم میں گرفتار ہوں گے اور کوئی ان کا خیر خواہ و مددگار نہ ہوگا۔

جن کو اللہ کی بندگی میں شریک کیا ہے عدالت کے کٹہرے میں وہ بھی کام نہ آئیں گے۔ اب نصاریٰ کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ان دونوں صورتوں میں سے ان کے مناسب حال کیا ہے اور حضرت مسیح کے موافق شان کیا ہے؟[1]

استنکاف کے معنے ہیں کسی چیز سے غیرت، حمیت اور خودداری کی بنا پر روگردانی کرنا اور استکبار کہتے ہیں حقیر سمجھ کر سامنے تن جانا اور اکڑنا یعنی خود جو کچھ ہے اس سے زیادہ اپنے کو سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا، حضرت مسیح سے استنکاف کی نفی کے بعد اس آیت میں یہ عام قانون بیان کر دیا ہے کہ جو بھی اللہ کی بندگی میں عار اور اپنے کو بڑا بنا کر رکھے اس کی اللہ کی بارگاہ میں پیشی ضرور ہو گی۔ اس قانون کا اطلاقی دائرہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جن بزرگوں کو آپ مانتے ہیں ان کو خدا کا بندہ کہتے ہوئے یہ سوچ کر آپ ہچکچائیں کہ اس میں ان کی توہین ہے بلکہ اس کی پہنائیاں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ غیر مسلموں کے درمیان اگر آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ غیر اسلامی نظاموں کے مقابلے میں اگر آپ اسلامی نظام کا ذکر کرتے ہوتے یا اسلامی نظام سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں تو یہ استنکاف ہے۔ خدا کی بندگی اسلام سے وابستگی شرمانے کی نہیں بلکہ فخر کرنے کی چیز ہے۔ نیشنلزم کے مقابلہ میں اسلامیت سوشلزم کے مقابلے میں اسلامی نظام کو اگر آپ اس لیے نہیں لاتے کہ آپ اسلام کو ان کے مقابلے میں حقیر سمجھتے ہیں اور اسلام سے اپنے انتساب کو اپنی بے عزتی تصور کرتے ہیں تو بلاشبہ یہ استنکاف بھی ہے اور استکبار بھی۔ قرآن نے اللہ کی عبادت سے استنکاف سے اس آیت میں سختی سے روکا ہے۔ عبادتِ خداوندی سے استنکاف کے ممنوع ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے سوا اوروں کی عبادت سے استنکاف ہونا چاہیے اور دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کے سوائے نظام جو اب تک آتے تھے، وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ کے نزدیک عابدانہ نظام صرف اسلام ہے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے، کیونکہ اللہ کی عبادت کا یہ نظام ساری دنیا کا نظام ہے اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوعِ انسانی کا پیغمبر ہے۔

اسی لیے آئندہ دو آیتوں میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے کہ خواہ کوئی کتنی بڑی روحانی طاقت رکھتا ہو اور کیسی مادی طاقتوں سے سرشار ہو، قانون اور ضابطہ سب کے لیے ایک ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس میں نبی غیر نبی، ولی غیر ولی، بادشاہ اور عام شہری سب یکساں ہیں سب سے مطالبہ ہے کہ جو ترت کے لاتے ہوتے خدا کی عبادت کے نظام کو جو اپنائے گا اور ایمان و عمل کی دولت سے مالا مال ہوگا وہ کامیاب ہوگا۔ اللہ کے یہاں اس کو ایمان و عمل کی مزدوری ضرور ملے گی یعنی جتنا اجر مقرر ہے وہ تو ملے ہی گا اس کے علاوہ اللہ ان کو اپنے فضل سے بھی ضرور نوازے گا اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے عابدانہ تعلقات میں عار محسوس کی اور اگر کبر کا مظاہرہ کیا تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا اور ان کا کوئی کارساز و مددگار نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ
نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ
فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس بُرہان یعنی دلیل و حجت آچکی ہے[۳۶۲]، اور ہم نے تمہاری طرف ایک نُورِ مبین اتار دیا ہے[۳۶۳]، لہٰذا جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑا تو وہ انہیں ضرور اپنی رحمت کے سایے میں داخل کرے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔[۳۶۴]

حضورِ انور کی جامعیت اور کاملیت

سابقہ آیات میں عیسائیوں پر حجت تمام کردی۔ اس سے پہلے یہودیوں کے تمام شبہات کا قلع قمع

کر دیا تھا۔ یہ دونوں طبقے نبوت اور قانون الہی سے واقف تھے اور یہی اہل کتاب ہیں۔ اس سے پہلے اسی سورت میں منافقین کو مخاطب کر کے ان کی حالت تلاش کی اور ساتھ ہی مشرکین کے خیالات و افکار کا بودا پن بھی عیاں کیا۔ اس کے نتیجہ میں جب حضور انور کی نبوت ہر پہلو سے بے نقاب ہو کر سامنے آگئی۔ یہود و نصاریٰ منافقین اور مشرکین کے سارے شبہات جب تار تار ہو گئے تو اللہ سبحانہ نے پوری انسانیت کو اس آیت میں للکارا ہے اور بتایا ہے کہ برہان اور نور مبین دو چیزیں ہیں جن سے وابستگی پر انسانی زندگی کی فلاح اور نجات موقوف ہے۔ نور مبین سے مقصود قرآن حکیم ہے اور برہان جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی۔ برہان آپ کو اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ کی ذات گرامی مختلف طبقات انسانی کے لیے عملی نمونے اور مثالیں رکھتی ہے۔ یعنی انسانوں کے ہر طبقہ اور صنف کے لیے آپ کی ذات میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے برہان ہے یعنی سراسر دلیل و حجت ہے۔ اس دنیا کی بنیاد ہی اختلاف عمل پر ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے سے یہ دنیا چل رہی ہے۔ اس میں بادشاہ یا رئیس جمہوریہ اور حکام بھی ضروری ہیں۔ اور محکوم و مطیع اور فرمانبردار رعایا بھی۔ امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور فوجوں کے سپہ سالاروں اور افسروں کا بھی، غریب بھی ہیں اور دولتمند بھی، شب بیدار، عابد و زاہد بھی اور دن کے سپاہی اور مجاہد بھی۔ اہل و عیال بھی ہیں اور دوست و احباب بھی، تاجر اور سوداگر بھی ہیں اور امام و پیشوا بھی، غرض اس دنیا کا نظم و نسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی مجسمہ اور نمونہ کی ضرورت ہے۔ قرآن تمام انسانوں کے لیے حضور انور کی ذات گرامی کو برہان بنا کر پیش کرتا ہے، اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ آپ کی ذات گرامی سب کے لیے حجت و دلیل ہے۔ ایک حاکم کے لیے محکوم کی زندگی۔ ایک محکوم کے لیے حاکم کی زندگی۔ ایک دولت مند کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے دولت مند کی زندگی۔ حجت اور دلیل نہیں بن سکتی۔ ان تمام مختلف طبقات کے لیے ضرورت تھی کہ ایسی کامل و جامع زندگی ہو جو اپنی زندگی میں ہر نوع، ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنف انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیریں رکھتی ہو۔ وہ ہی اس لائق ہے جو اس اصناف و انواع سے بھری ہوئی دنیا کی عالمگیر اور دائمی رہنمائی کے لیے برہان کا کام انجام دے اور بس۔

۲۶۲ - لے لوگو: تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس برہان یعنی دلیل و حجت آچکی ہے یعنی تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری تربیت اور تزکیہ نفس کی خاطر ایک عظیم برہان یا ایک کھلی اور واضح دلیل آچکی ہے۔ یہ تمہارے سامنے ایمان صحیح کی حقیقت کھول کر بیان کرتی ہے اور وہ تمام

باتیں تمہیں بتاتی ہے جن کی تمہیں زندگی کے مختلف گوشوں میں ضرورت ہے۔ یہ برہان خود حضور نور کی ذات گرامی ہے۔ یعنی آپ اپنی نبوت کی خود دلیل ہیں۔ کیونکہ ایک ایسی ہستی جس نے علمی طلبگاری میں زندگی کا ایک لمحہ بھی صرف نہیں کیا اور جس نے کسی کے سامنے کبھی زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ اس میں یکایک علم کی تکوین ہوتی ہے اور وہ امیوں، علم کے طلب گاروں کو علوم الٰہیہ اور صفات ربوبیت کا معلم بن جاتا ہے اور اپنے تعلیم کا دائرہ صرف عالم غیب سے متعلق افکار تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اللہ سبحانہ کے حاکمانہ حقوق، نفس انسانی کے تزکیہ اور حیاۃ اجتماعی کی صلاح و فلاح کے اصول و ضوابط تک پھیلا دیتا ہے۔

آپ کی ذات "قانون کی عملی تشریح کے لیے برہان ہے ایسے ہی آپ کی عملی سیرت بھی پوری انسانی زندگی کے لیے برہان ہے۔ یہ محض شاعرانہ انشاپردازی نہیں بلکہ "تاریخی واقعات ہیں۔ آپ غیظ و غضب اور رحم و کرم، جود و سخا، اور فقر و فاقہ، شجاعت و بہادری اور رحمدلی و رقیق القلبی۔ خانہ داری اور خدا دانی دنیا و دین دونوں کے لیے زندگی کے نمونوں سے مالامال تھے۔ آپ دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی اور آسمان کی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بشارت دیتے تھے اور دونوں بادشاہیوں کے قوانین و قواعد اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں اپنے برت کر دکھایا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف عفو و درگزر، معافی و نرمی انسانیت کی تکمیل کے سب سے بڑے ذریعے ہیں بلکہ فقط یہی ذریعے ہیں اس لیے جس ہستی میں صرف یہی ایک پہلو ہو وہی انسانیت کی سب سے بڑی برہان ہے لیکن بتایا جائے کہ انسان کے اخلاق میں کیا صرف یہی قوتیں ہیں یا اس کے مقابل کی قوتیں بھی ہیں۔ ایک انسان میں دیکھو تو غصہ و کرم، محبت و عداوت، خواہش و قناعت انتقام اور ہر قسم کے فطری جذبات موجود ہیں اس لیے برہان کامل وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کے ان تمام قویٰ اور جذبات میں اعتدال پیدا کر کے ان کے صحیح مصرف کو مقرر کر دے۔ جن لوگوں کو یہ دعویٰ ہے کہ ان کے پیغمبروں کی سیرتیں صرف رحم و کرم اور عفو و درگزر پر مبنی ہیں وہ براہ کرم بتائیں کہ اپنی اجتماعی زندگی میں وہ کتنے روز ان کی سیرتوں کے مطابق کر سکے ہیں۔ قسطنطین پہلے عیسائی بادشاہ سے لے کر آج تک عیسائی مذہب میں کتنے صاحب تاج و تخت گزرے اور کتنی بادشاہیاں قائم ہوئیں مگر ان میں سے کسی نے اپنی سلطنت کا قانون اپنے پیغمبر کی سیرت کو قرار دیا۔ پھر ایسی سیرت جو عملی زندگی میں ہر حیثیت سے اپنے پیروؤں کے لیے نمونہ نہ ہو وہ کیوں کر برہان کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ شارحین قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے برہان ہونے پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ تو صرف یہی ہے جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے کہ اللہ نے آپ کو حجت قاطعہ بنایا ہے۔ اور آپ کو رسول بنا کر اپنی حجت تمام کر دی ہے یا اللہ نے آپ کو برہان اس لیے کہا ہے کہ آپ معجزات

سے کراُتے ہیں جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے اور یہ ایسا پیغمبر ہے جس کی شان اعجاز مخالفتوں اور منکروں کو حیران کر دیتی ہے جیسا کہ الفسفی رقمطراز ہیں یا آپ کی تشریف آوری ہے چونکہ حجت دنیا والوں پر پوری ہو گئی اس لیے آپکو برہان کہا ہے جیسا کہ القاسمی نے تصریح کی ہے لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ آئیے آپ کے برہان ہونے کا یہ پہلو بھی دیکھ لیجئے۔ بُرہان میں تنوین تعظیم کے لیے ہے یعنی آپ کی ذات ایسی عظیم بُرہان ہے جس کی آغوش میں تمہاری ضرورتوں کی کفالت، ساری بیماریوں کا علاج، ساری پریشانیوں کا مداوا اور سارے سوالوں کا جواب ہے۔ دُنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں ایک وہ جہاں صرف ایک فن سکھایا جاتا ہے جیسے کوئی میڈیکل کالج ہے کوئی انجینئرنگ کالج۔ ایک آرٹ سکول ہے، ایک تجارت کا مدرسہ ہے ایک زرعی کالج ہے، ایک قانون کا مدرسہ ہے، ایک فوجی تعلیم کا مدرسہ حربیہ ہے۔ ان میں سے ہر مدرسہ صرف ایک ہی قسم کے طلبہ کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے۔ میڈیکل کالج سے صرف ڈاکٹر نکلیں گے۔ زراعت کے کالج سے صرف زراعت کے ماہر پیدا ہوں گے، قانون کے مدرسہ سے صرف قانون دان تیار ہوں گے، تجارت کی تعلیم گاہ سے صرف تجارت کے واقف کار پیدا ہوں گے ملٹری کالج سے صرف سپاہی پیدا ہوں گے۔ آؤ اب ذرا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بُرہان دیکھو اور پتہ لگاؤ کیا مدرسہ نبوت کی حیثیت اس سکول اور کالج کی ہے جہاں ایک ہی فن کی تعلیم ہوتی ہو یا اس کی حیثیت ایک جامع اور عمومی درسگاہ اور عظیم الشان یونیورسٹی کی ہے۔ جہاں ذوق مناسبت طبع اور استعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں کو اور ہر قوم کے افراد کو الگ الگ تعلیم ملتی ہے۔ ہر فن کی کتابیں الگ ہوتی ہیں۔ ہر فن کے اساتذہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ آؤ دیکھو یہاں کتاب بھی ایک ہے استاذ بھی ایک ہے اور درسگاہ بھی ایک ہے۔ اس کے باوجود ایک کتاب اور ایک استاذ سے پڑھ کر نکلنے والے طالب علموں کا حال یہ ہے کہ

ایک طرف عقلائے روزگار اسرار فطرت کے محرم دُنیا کے جہانبان اور ملکوں کے فرمانروا اس درسگاہ سے تعلیم پاکر نکلے ہیں۔ ابوبکر صدیق ہیں، عمر فاروق ہیں، عثمان غنی ہیں، علی مرتضیٰ، معاویہ ابن ابی سفیان ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک، افریقہ سے ہندوستان تک فرمانروائی کی جو دُنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہ اور حکمرانوں کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ان کے عدل و انصاف کے فیصلے ایرانی دستور اور رومی قانون کو بے اثر کر دیتے ہیں اور دُنیا کی سیاسی و انتظامی تاریخ میں وہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں جن کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

دوسری طرف خالد بن الولید، سعد بن ابی وقاص اللیثی، ابو عبیدہ بن جراح، عمرو بن العاص

پیدا ہوتے ہیں جو مشرق و مغرب میں وہ عالم گیر کار اور انسانیت کے لیے لعنت سلطنتوں کا چند سال میں مرتبہ الٹ دیتے ہیں اور دنیا کے وہ فاتح اعظم اور سپہ سالار اکبر ثابت ہوتے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی دنیا میں بیٹھی ہوئی ہے۔ سعد بن ابی وقاص نے ایران کا تاج شہنشاہی اتار کر اسلام کے قدموں میں لا ڈالا۔ خالد اور ابو عبیدہ نے رومیوں کو شام سے نکال کر ابراہیم کی موعود زمین کی امانت مسلمانوں کے سپرد کر دی۔ عمرو بن العاص نے فرعون کی سرزمین وادی نیل رومن شہنشاہی کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لی۔ عبداللہ بن الزبیر اور ابن ابی سرح نے افریقہ کا میدان دشمنوں سے جیت لیا۔ یہ وہ مشہور فاتح اور سپہ سالار ہیں جن کی قابلیتوں کو زمانے نے تسلیم کیا ہے اور تاریخ نے ان کی بزرگی کی شہادت دی ہے۔

تیسری طرف باذان بن ساسان، یمن میں خالد بن سعید صنعا میں مہاجر بن امیہ کندہ، زیاد بن لبید حضرموت میں عمرو بن حزم نجران میں، یزید بن ابی سفیان تیما میں علاء، ابن حضرمی بحرین میں وغیرہ بیسیوں وہ صحابہ ہیں جنہوں نے صوبوں اور شہروں کی کامیاب حکومت کی اور خلق خدا کو آرام پہنچایا۔

چوتھی طرف علماء و فقہاء کی صف ہے۔ عمر بن الخطاب، علی ابن ابی طالب، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، عبداللہ ابن زبیر وغیرہ ہیں جنہوں نے اسلام کے قانون فقہ کی بنیاد ڈالی، اور دنیا کے مقننین میں انہوں نے خاص درجہ پایا۔

پانچویں صف عام ارباب روایت و تاریخ کی ہے مثلاً ابو ہریرہ، ابو موسیٰ اشعری، انس بن مالک، ابو سعید خدری، عبادہ ابن الصامت، جابر بن عبداللہ، براء بن عازب وغیرہ سینکڑوں صحابہ ہیں جو احکام و وقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔

چھٹی جماعت ان ستر صحابہ اہل صفہ کی ہے جن کے پاس سر چھپانے کے لیے مسجد نبوی کے چبوترے کے علاوہ کوئی جگہ نہ تھی، بدن پر کپڑوں کے سوا دنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ تھی، وہ دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور ان کو بیچ کر خود کھاتے، کچھ خدا کی راہ میں دیتے اور رات کو عبادت میں گزارتے۔

ساتویں کلاس زہاد کی ہے جن میں ابوذر غفاری ہیں جن کے مانند آسمان کے نیچے ان سے زیادہ حق گو پیدا نہیں ہوا۔ ان کے نزدیک آج کا کھانا کل کے لیے اٹھا رکھنا بھی شان توکل کے خلاف تھا ان کو دربار نبوت نے مسیح الاسلام کا خطاب عنایت کیا تھا۔ سلمان فارسی ہیں جو زہد و تقویٰ کی تصویر ہیں۔ عبداللہ بن عمرو ہیں جنہوں نے پورے تیس سال عبادت میں گزارے مصعب بن عمیر ہیں

جو اسلام سے پہلے ریشم کے کپڑے پہنتے تھے اور ناز و نعمت میں پلے تھے اور جب اسلام لائے تو ٹاٹ اوڑھتے اور پیوند لگے کپڑے پہنتے۔ عثمان بن مظعون ہیں، محمد بن سلمہ ہیں اور ابو الدرداء ہیں جن کی راتیں نماز میں اور دن روزوں میں گزرتے تھے۔

آٹھویں طرف بہادر کار پردازوں اور عرب کے مدبرین کی جماعت ہے، اس میں طلحہ ہیں، زبیر ہیں، مغیرہ ہیں، مقداد ہیں، سعد بن معاذ ہیں، سعد بن عبادہ ہیں، اسید بن حضیر ہیں، اسعد بن زرارہ، عبدالرحمان بن عوف ہیں۔

نویں طرف تاجر، بیوپاری اور کاشت کاروں کی جماعت ہے ان میں عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن زبیر جیسے سرمایہ دار اور دولت مند بھی ہیں۔

دسویں طرف حق کے شہیدوں کی جماعت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی عزیز جانیں قربان کر دیں۔ یہ ان گنت ہیں۔ ان کی داستانوں سے سیرت و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ دنیا کے ایک مشہور مذہب کو صرف ایک سولی پر ناز ہے لیکن یہاں کتنی سولیاں ہیں کتنے مذبح ہیں اور کتنے مقتل ہیں؟

غور کا مقام ہے۔ یہ وہی وحشی عرب، وہی بت پرست عرب، وہی بداخلاق عرب ہیں۔ یہ کیا انقلاب ہو گیا تھا۔ ایک اُمی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل، روشن دل، روشن دماغ اور متقی کیوں کر بنا گئی۔ ایک نہتے پیغمبر کا ولولۂ تبلیغ کس مپرس عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بنا کر نئے زور اور قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا۔ جو خدا کے نام سے بھی ناآشنا تھے وہ ایسے شب زندہ دار عابد و متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہو گئے۔ آپ نے درسگاہ محمدی یا مدینہ یونیورسٹی کی پوری سیر کر لی۔ ہر رنگ اور ہر مذاق کے طالب علم دیکھے، عالم بھی دیکھے، متقی بھی دیکھے، فوجی بھی دیکھے، جج اور مجسٹریٹ بھی دیکھے۔ حکام اور والی بھی دیکھے، غریب و مسکین بھی دیکھے، شاہ و امیر بھی دیکھے، غلام بھی دیکھے آقا بھی دیکھے، لڑنے والے بھی دیکھے مرنے والے بھی دیکھے، راہِ حق کے شہیدوں اور جاں نثاروں کو بھی دیکھا۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟! اس کے سوا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی ذات میں اپنے کمالات اور اپنی صفات کے لیے اپنے پروردگار کی جانب سے برہان تھے اور یہ سب آپ کے برہان ہونے کی جلوہ آرائیاں ہیں جو کبھی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہو کر چمکتی تھیں، کبھی ذی النورین اور مرتضیٰ ہو کر نمایاں ہوتی تھی۔ کبھی خالد بن الولید اور ابو عبیدہ اور کبھی سعد و جعفر طیار ہو کر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر اور ابو ذر اور سلمان اور ابو درداء ہو کر مسجد

محراب میں نظر آتی تھیں۔ کبھی ابن عباس اور ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود کی صورت میں علم و فن کی درسگاہ، اور عقل و حکمت کا دبستان بن جاتی تھیں۔ گویا محمد رسول اللہ کی برہان آفتاب عالم تاب تھی جس سے اونچے پہاڑ ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کر رہے تھے، یا یہ برہان ایک ابر باراں تھا جو پہاڑ، جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا اور قسم قسم کے درخت اور رنگارنگ کے پھول اور پتے جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے سید رشید رضا نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ

وھو برھان بسیرتہ العلیۃ کما انہ برھان فی سیرتہ العلیۃ

قرآن نور مبین ہے

۲۶۳۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایک نور مبین اتارا ہے۔ نور مبین سے مراد قرآن حکیم ہے جس میں بڑے چھوٹے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل موجود ہے۔ قرآن کو نور مبین اس لیے کہا ہے کہ اس سے احکام و قوانین نمایاں ہو جاتے ہیں، جیسے روشنی سے چیزیں نظر آتی ہیں۔ سید رشید فرماتے ہیں کہ اس کی بلاغت اور اس کے اندازِ بیان سے حقائق اس طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں کہ کسی غور و فکر والے شخص کے لیے کوئی اشتباہ نہیں رہتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال توحید ہے۔ پہلے مذاہب میں جو حقیقت میں توحید ہی کا پیام لے کر آئے تھے تین اسباب سے غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہوئیں۔ ایک جسمانی تشبیہہ و تمثیل دوسرے صفات کو ذات سے الگ اور مستقل ماننا اور تیسرے افعال کی نیرنگی سے دھوکہ کھانا۔ قرآن نے ان گرہوں کو کھولا، ان غلط فہمیوں کو دور کیا اور ان حقیقتوں کو واضح کیا۔

ذات میں توحید

خدا کو، خدا کی صفتوں کو اور خدا اور بندہ کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں اور تمثیلیں دوسرے مذاہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل خدا گم ہو گیا اور اس کی جگہ تشبیہیں اور تمثیلیں خدا بن گئیں۔ ان ہی تشبیہوں اور تمثیلوں نے مجسم ہو کر بتوں کی شکل اختیار کرلی اور بت پرستی شروع ہو گئی۔ قرآن کی کھلی روشنی نے ان تمام تشبیہی اور تمثیلی صورتوں طریقوں اور محاوروں کو یک قلم موقوف کر دیا اور ان کا استعمال شرک قرار دیا۔

صفات میں توحید

قدیم مذاہب کے عقیدہ توحید میں غلط فہمیوں کا دوسرا سبب صفات کا مسئلہ ہے یعنی صفات کو ذاتِ الٰہی سے الگ مستقل وجود کے طور پر تسلیم کرنا، ہندوؤں کے عام مذہب میں جو لاتعداد خداؤں کا لشکر نظر آتا ہے وہ فی الواقع اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک صفت کو انہوں نے ایک علیحدہ اور مستقل وجود مان لیا اور اس طرح ایک خدا کے ۳۳ کروڑ خدا بن گئے۔ ہندو مذہب پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی مسئلہ صفات کے تجسم اور مستقل وجود کے تخیل سے مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کی تین بڑی صفتیں ہیں خالقیت، قیومیت اور ممیتیت ہندو فرقوں نے ان تین صفتوں کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کرلیا۔ اور برہما، وشنو، اور شیو یعنی خالق، قیوم اور ممیت تین مستقل ہستیاں بن گئیں۔ عیسائیوں نے خدا کی تین بڑی صفتوں یعنی حیات، علم اور ارادے کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کرلیا۔ حیات باپ ہے علم روح القدس ہے اور ارادہ بیٹا ہے۔ اسی قسم کی چیزیں رومی، یونانی اور مصری تخیل میں بھی ملتی ہیں لیکن قرآن عزیز کی واضح روشنی نے اس غلطی کا پردہ چاک کیا اور صفات کی نیرنگی سے دھوکا کھا کر ایک کو چند سمجھنا انسان کی جہالت اور نادانی قرار دیا اور بتایا کہ تینوں ایک کی صفات ہیں۔ صفات کے تعدد اور اختلاف سے موصوف میں تعدد اور اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ بات صرف قرآن کی روشنی میں نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے، ورنہ اوروں نے تو ذات سے صفات کو الگ کرکے ایک خدا کے متعدد خدا بنا ڈالے سبحان اللہ عما یشرکون۔

افعال میں توحید

لوگوں نے افعال الٰہی کی نیرنگی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ ان مختلف افعال کی کرنے والی مختلف ہستیاں ہیں کوئی مارتی ہے، کوئی جلاتی ہے، کوئی لڑواتی ہے، کوئی صلح کراتی ہے، کسی کا کام محبت ہے، کسی کا کام عداوت ہے، کوئی علم کا دیوتا ہے، کوئی دولت کی دیوی ہے، غرض ہر کام کے لیے الگ الگ سینکڑوں خدا ہیں۔ قرآن نے ان نادانوں کو بتایا ہے کہ یہ سب ایک ہی خدا کے کام ہیں۔ خدا نے یہ کائنات بنائی ہے، آسمان و زمین بنائے، مادے کو خلق کیا، اشیاء میں خاصیتیں رکھی ہیں اور ان کو مختلف قوتیں بخشیں، پھر انسان کو بنایا، اس کو دل و دماغ بخشا، عقل و حکمت دی۔ اب دیکھو ایک انسان اس کائنات میں اشیاء کی ترتیب اور ان کی خاصیتوں کو دیکھ کر ایک خالق و قادر کی

صنعت کاری اور صورت گری پر تعجب کرتا ہوا فتبارک اللہ احسن الخالقین پڑھ کر حضرت ابراہیم کی طرح یہ پکار اٹھتا ہے ۔

انی وجہت وجھی للذی فطر السماوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین

اور دوسری طرف اسی مادہ اور اس کی قوتوں کی ظاہر داریوں میں پھنس کر انسان کے دل و دماغ کی عقل و حکمت خدا کا انکار کر بیٹھتی ہے اور مادے ہی کو اصل کائنات اور علۃ العلل سمجھنے لگتی ہے اور یہ کہتی ہے ۔

ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدھر

کائنات ایک ہے ، پیغام ایک ہے ، البتہ دل دو ہیں اور یہ دونوں دل اور دونوں دماغ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں دو خالق نہیں ہیں ۔ نتیجہ کیا نکلا ، یہی نا کہ افعال کی دوئی فاعل کی دوئی کی دلیل نہیں ہے ۔ یہ تمام نیرنگیاں ایک ہی قدرت کے تماشے ہیں ۔

اللہ کی عبادت

اللہ سبحانہ کی عبادت ہر مذہب میں حق اور ہے لیکن ایک عام غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ عبادت کا مقصود جسم کو تکلیف دینا ہے یا دوسرے لفظوں میں کہو کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس قدر اس ظاہری جسم کو تکلیف دی جائے گی ، اسی قدر روحانی ترقی ہو گی اور دل کی اندرونی صفائی اور پاکی بڑھے گی ۔ اسی کے نتیجہ میں ہندوؤں میں عام طور پر جوگ اور عیسائیوں میں رہبانیت پیدا ہوئی اور بڑی بڑی ریاضتوں کا وجود ہوا اور ان کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھا گیا ۔ کوئی عمر بھر نہانے سے پرہیز کر لیتا ۔ کوئی عمر بھی ٹاٹ یا کمل اوڑھے رہتا ۔ کوئی ہر موسم میں یہاں تک شدید جاڑوں میں بھی ننگا رہتا ، کوئی عمر بھر کھڑا رہتا ، کوئی پوری عمر غار میں گزار دیتا ، کوئی ساری عمر دھوپ میں کھڑا رہتا ، کوئی عمر بھر کے لیے کسی چٹان پر بیٹھ جاتا ۔ کوئی عہد کر لیتا تھا کہ پوری زندگی صرف درختوں کی پتیاں کھا کر گزارہ کرے گا ، کوئی عمر بھر تجرد میں گزارتا تھا اور قطع نسل کو عبادت سمجھتا تھا ، کوئی ایک ہاتھ ہوا میں رکھ کر سکھا دیتا ، کوئی حبس دم یعنی سانس روکنے کو عبادت سمجھتا ، کوئی درخت پر الٹا لٹک جاتا ، یہ تھا قرآن کے آنے سے پہلے خدا پرستی کا اعلیٰ درجہ اور روحانیت کی سب سے بڑی ترقی یافتہ شکل ۔ قرآن نے آ کر انسانوں کو ان مصیبتوں سے نجات دلا دی اور بتایا کہ یہ وحشت نہیں جسمانی تماشے ہیں ۔ ہمارے خدا کو جسم کی شکل نہیں بلکہ دل کا رنگ مطلوب ہے طاقت سے زیادہ تکلیف اس کی شریعت میں نہیں ۔

بہرحال آیت گرامی میں کہ اللہ سبحانہ نے انسانیت کو دو چیزیں مرحمت فرمائیں۔ ایک برہان دوسرے نور مبین۔ برہان سے حضور انور کی ذات گرامی مراد ہے اور نور مبین سے قرآن حکیم سلے دوسرے لفظوں میں آپ عمل اور علم بھی کہہ سکتے ہیں۔ برہان کو یہاں مقدم کرکے اس کی مقصودیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی علم سے مقصود عمل ہے اور من ربکم کے اضافہ سے یہ بات جتا دی ہے جیسا کہ علامہ ابو السعود نے لکھی ہے کہ اس سے مقصود انسانوں کی تربیت اور ان کا تزکیہ ہے۔

علم وعمل کی شاہراہ

۲۶۴۔ لہٰذا جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑا تو وہ انہیں ضرور داخل کرے گا اپنی رحمت کے سائے میں اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔ پہلے سے وحی الٰہی اور بالخصوص قرآن حکیم کی عظمت اور اس کی حقانیت کا بیان اور اس کی متابعت اور اتباع کی تاکیدات کا ذکر تھا۔ اسی کے ذیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ان کے ابن اللہ ہونے کا ذکر کیا تھا جس کے قائل نصاریٰ تھے۔ اس کی تردید و ابطال کے بعد اب آخر میں پھر اسی اصل اور ضروری بات کی سب کو تاکید فرمائی جاتی ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس رب العالمین کی جانب سے حجت کامل اور نور روشن پہنچ چکا ہے جو ہدایت کے لیے کافی و وافی ہے، یعنی قرآن مجید اب کسی تامل اور تردد کی گنجائش نہیں سو جو کوئی اللہ پر ایمان لائے گا اور اس مقدس کتاب کو مضبوط پکڑے گا وہ اللہ کی رحمت اور فضل میں داخل ہوگا اور براہ راست اس تک پہنچے گا اور جو اس کے خلاف کرے گا اس کی گمراہی اور خرابی اسی سے سمجھ لیجیے سلے

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی جانب آئی ہوئی برہان اور خدا کی نازل کردہ کتاب کی روشنی میں اللہ سے بندگی کا تعلق رکھیں گے اور اس تعلق کے ساتھ اللہ سے اعتصام پیدا کریں گے یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی برہان اور اللہ کی نازل کردہ کتاب کو اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں تھام کر رکھیں گے اور زندگی کے اطوار، اقدار اور احوال میں ان دونوں سے ہو کر رہیں گے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ سے ربط اور قرآن و سنت سے وابستگی کا نام اعتصام ہے۔ قرآن نے اس سورت میں اعتصام کا تیسری بار ذکر کیا ہے سب سے پہلے آیت نمبر ۱۰۳ میں پھر آیت نمبر ۱۴۶ میں، دونوں پر تفصیل تبصرہ جلد چہارم اور پنجم میں ہو

سلے ہفوات شیخ الاسلام

چکا ہے۔ اب یہاں اسی اعتصام کا تیسری بار ذکر ہو رہا ہے۔ اعتصام یہ ہے کہ فکر و عمل میں اللہ کے رسول ﷺ کے علم و عمل سے وابستہ ہو جائیں۔ اعتصام ہی اس دنیا میں اولاً اہل ایمان کی انفرادی صلاح اور اجتماعی فلاح کا ضامن ہے اور یہی صراط مستقیم کا رہنما ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے ترجمان اور خدا کی نازل کردہ کتاب کے علاوہ ہر اعتصام خواہ یہودیت کا ہو یا عیسائیت اور چاہے وطنیت کا ہو یا قومیت کا، مادیت کا ہو یا معاشی کا، صراط مستقیم کا رہنما نہیں بلکہ سُبل متفرقہ کا رہنما ہے۔ آیت ۱۰۳ میں بتایا جا چکا ہے کہ صرف انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ تمہیں قانونی، اخلاقی، سیاسی اور عائلی زندگی کے تمام گوشوں میں اجتماعی طور پر اعتصام والا بن کر رہنا چاہیے۔ اور اس سے زندگی کا کوئی کوئی گوشہ بھی آزاد نہ ہونا چاہیے۔ مختلف کڑیاں ترتیب میں اسی نظام اسی مرکز، اسی سلسلہ، اسی وجود اسی طاقت میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ یک جا ہونی چاہئیں۔ اور تمام اعمال اور قوتوں پر ایک ایسی اجتماعی کیفیت طاری ہو، ہر قوت کھنچی ہوئی، ہر عمل باہم ملا ہوا، ہر شخص زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو۔ کوئی چیز، کوئی گوشہ کوئی عمل اس سے علیحدہ نہ ہو۔ اسی کا نتیجہ صراط مستقیم ہے۔ یہاں ایمان کے ساتھ اعتصام کا ذکر کر کے اور پانچویں پارے میں اخلاص کے ساتھ اعتصام کا ذکر کر کے اور چوتھے پارے میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد اعتصام کا ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ ایمان، اخلاص اور تقویٰ کی حقیقی کسوٹی اعتصام بکتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار یہی ہے کہ مسلمان نظامہائے باطل کے مقابلے میں نبوت کے واسطے ہوئے علم و عمل کا بول بالا کریں اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس سے وابستہ ہوں کسی حال میں اس سے جدائی گوارا نہ کریں۔

اس آیت میں اس ایمان کے جس میں اعتصام موجود ہو دو ناگزیر نتیجے بتائے ہیں اور یہیں تاکید کا لگا کر بتائے ہیں فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ یعنی اللہ سبحانہٗ ان لوگوں کو جن کے ایمان میں نبوت کے واسطے ہوئے علم و عمل سے اعتصام ہوگا اپنی خاص رحمت میں اور اپنے خاص فضل میں ضرور داخل کرے گا۔ رحمت سے مراد عام شارحین قرآن نے جنت اور فضل سے مراد اہل جنت کو مزید اکرام و عنایت بتایا ہے لیکن ہماری رائے میں یہاں رحمت سے مراد انفرادی صلاح اور فضل سے مراد دوسروں کی اصلاح کی ہے۔ اسی لیے متعدیت کو فضل قرار دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ قرآن و سنت سے وابستگی کے نتیجہ میں تمہیں انفرادی طور پر اچھا بنائے گا اور دوسروں کو اچھا بنانے کا مقام عطا کرے گا، تمہارا وجود انسانیت کے لیے رحمت ہوگا۔ پوری انسانیت تمہارے افکار، تمہارے علوم، تمہارے فضائل سے استفادہ کرے گی اور اس انفرادی صلاح اور اجتماعی فلاح کے بعد اللہ ایسی

شاہراہ تمہارے لیے کھول دے گا جس پر چل کر تم منزلِ مقصود کو پہنچ جاؤ گے۔ دُنیا میں سیادت، قیادت اور امامت کا مقام دے گا اور آخرت میں جنت اور رضوان عطا کرے گا۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر قائم رہنے کی ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں اللہ کی جناب میں درخواست کرتا ہے۔

آیت کا زبردست احتجاج

قرآن کی یہ آیت مسلمانانِ عالم کے رہنماؤں اور ان کے حکمرانوں کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ موجودہ عالمِ اسلام اللہ کی نگرانی اور اس کے نازل کردہ نورِ مبین کے اعتصام سے ہٹ کر یورپ کے لائے ہوئے مختلف نظاموں سے جس طرح اعتصام کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان رہنماؤں، لیڈروں اور حکمرانوں نے یورپ کے فکری فلسفہ کو اپنے ساری اقتصادی سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز ان کی مادہ پرستانہ قومیت کو اپنانے کا عزم کر لیا ہے وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اس کے علمی، اجتماعی ڈھانچہ کے ساتھ مستقل صف بہ صف پیکار اور معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل، نظامِ تعلیم و تربیت اور اعلانات کے ذریعے قوم کی اس قوت ایمانی اور جذبہ دینی کو غیر شعوری طور پر داؤ پر لگا رہے ہیں اور یورپ کی طاعت کو ترقی کا ذریعہ سمجھ کر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ بے شک یہ رہنما وقتاً فوقتاً اسلام سے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا ایمان کی حد تک اظہار کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے اور عوام کے درمیان اسلام سب سے بڑا اور طاقتور رابطہ ہے اور اس کا نام لیے بغیر وہ لاکھوں عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ لیکن اعتصام سے وہ تہی دامن ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں اسلام ایمان و اعتصام کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اسلام اس ایمان کا ہے جس میں اعتصام نبوت کے علم و عمل سے نہیں بلکہ مغربی فکر، مغربی تمدن کے ساتھ ہو، صرف عقائد و اخلاقیات میں محدود رہ کر ساری زندگی میں بے قید ہونے کو ہی وہ اسلام سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر سالم کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ

> اس مقصد کی خاطر قومیت نے اسلام سے پوری ہم آہنگی کی ہے لیکن جس اسلام کو قومیت نے اپنایا ہے وہ قدیم اسلام نہیں بلکہ تبدیل شدہ جدید اسلام ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا نام تو لیتے ہیں لیکن صرف اس لیے کہ ہر اس چیز کے لیے سندِ جواز مل جائے جسے قوم پرور اختیار کرنا چاہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں اسلام ایمان واعتصام کا نہیں بلکہ چند عقائد اور چند رسوم کا نام ہے اور رسوم کے لیے بھی حقیقی ہونا شرط نہیں بلکہ وہ تمام رواجی رسمیں جو مسلمانوں میں رائج ہوں اسلام ہیں۔

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوٓا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٧٦﴾

اے پیغمبر لوگ آپ سے کلالہ کے بارے میں فتویٰ دریافت کرتے ہیں فرما دیجئے کہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے[۲۶۵] کہ اگر کوئی ایسا شخص مرا ہو جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن موجود ہو تو جو کچھ مرنے والا چھوڑ جاتے اس کا آدھا بہن کا ہے[۲۶۶]۔ اور بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا[۲۶۷]، پھر اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں ترکے میں سے دو تہائی ملے گا[۲۶۸]، اور اگر بھائی بہن ہوں کچھ مرد اور عورتیں تو پھر مرد کے لیے دو عورتوں

کے برابر حصہ ۔ اللہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے۔"[269][270]

میراث کا ایک ذیلی مسئلہ

سورت کے آغاز میں قرابت داروں کے حقوق و احکام بیان ہوئے تھے درمیان میں بھی ان مسائل کا تذکرہ ہوا اور اب سورت کا اختتام بھی اسی پر ہوا ہے۔ یہ آیت کریمہ پوری سورت نساء کے نازل ہونے کے بہت عرصہ بعد نازل ہوئی بلکہ بعض روایات سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت ہے۔ بہرحال یہ آیت میراث کے مسائل میں ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے جو ابتدائے سورت کے بیان کردہ احکام وراثت کے ایک خاص مسئلہ کی وضاحت کے لیے بعد میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ سورت کا آغاز بھی مالیاتی مسائل سے ہوا تھا، خاتمہ بھی مالیاتی مسائل کی ایک خاص دفعہ پر مشکلات کے لیے کیا گیا۔ اور شاید کلالہ کا مسئلہ آخر میں ذکر فرما کر اس طرف اشارہ ہو کہ جس طرح کلالہ کا وارث اس کے بھائی ہوتے ہیں اسی طرح بنی اسرائیل کے وارث اب بنی اسماعیل ہیں۔ بنی اسرائیل حضرت مسیح کے بعد ایک کلالہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ حضرت مسیح اسرائیلی سلسلہ نبوت کے آخری فرزند ہیں اس لیے اب نبوت بنی اسماعیل میں منتقل ہوتی ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔ اور دونوں خاندانوں کو بابرکت کرنے کا وعدہ بھی حضرت ابراہیم سے تھا۔ حضرت شیخ الاسلام اپنے افادات میں یہاں ایک خاص نوٹ تحریر فرماگئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اس جگہ کلالہ کے حکم کو بیان فرمانے سے چند باتیں معلوم ہوگئیں۔

اولاً یہ کہ جیسا پہلے وان تکفروا فان للہ ما فی السماوات وما فی الارض فرما کر اس کے بعد بطریق تمثیل اہل کتاب کا ذکر فرمایا تھا ایسے ہی آیت فاما الذین آمنوا باللہ واعتصموا کے بعد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ بھی بطور تمثیل ذکر کر دیا ہے تاکہ وحی سے انحراف کرنے والوں کی گمراہی اور برائی اور وحی کا اتباع کرنے والوں کی حقانیت خوب سمجھ میں آجائے۔

ثانیاً اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اہل کتاب کا حال تو یہ کہ انہوں نے ذات قدس سبحانہ کے لیے

شریک اور اولاد جیسے قبیح کلام کو اپنا ایمان بنالیا اور وحی الٰہی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا حال یہ ہے کہ اصول ایمان اور رسوم عبادات تو درکنار معاملات جزئیہ اور معمولی مسائل متعلقہ میراث نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے متلاشی اور اس کی انتظار میں بیٹھتے اور زندگی کے ہر معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس کو دیکھتے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے اپنی عقل اور خواہش کو قطعاً حاکم نہ سمجھتے۔ اگر ایک بار تسلی نہ ہوتی تو مکرر حاضرِ خدمت ہو کر دریافت کرتے۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔

ثالثاً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے۔ اگر کسی معاملہ میں حکم وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزول وحی کا انتظار فرماتے، جب نزول وحی ہوتا تو حکم فرماتے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اللہ سبحانہ کے سوا حاکم کوئی نہیں چنانچہ آیات متعددہ میں ان الحکم الا للہ وغیرہ صاف مذکور ہے۔ باقی جو ہیں سب واسطہ ہیں۔ ان کے ذریعے سے اوروں کو حکم الٰہی پہنچایا جاتا ہے خواہ واسطہ قریب ہو یا بعید جیسا حکم سلطانی پہنچانے کے لیے وزیر اعظم اور دیگر مقربین شاہی اور حکام اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ بدرجہ واسطہ ہوتے ہیں پھر اس سے زیادہ گمراہی کیا ہو گی کہ کسی معاملہ میں وحی الٰہی کے مقابلے میں کوئی گمراہ کسی کی بات سنے اور عمل کرے۔

وانکہ ز روے تو بجائے نگر آنند
کوتہ نظر آنند چہ کوتہ نظر آنند

رابعاً اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں وہ خوبی نہیں ہے جو حسب ضرورت اور حسب موقع متفرق نازل ہونے میں ہے کیونکہ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق سوال کر سکتا ہے اور بذریعہ وحی اس کو جواب مل سکتا ہے جیسا کہ یہاں اور قرآن کے دوسرے مواقع میں موجود ہے۔ اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ خرافت ذکر خداوندی و عزت خطاب حق عزوجل ایسے فخر عظیم پر مشتمل ہے جو کسی امت کو نصیب نہیں ہے جس صحابی کی بھلائی میں یا اس کے سوال میں کوئی آیت نازل ہوتی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے اور اختلاف کے موقع میں جس رائے یا جس کے قول کے موافق وحی الٰہی اتری تا قیامت ان کے نام کا بول بالا ہوا۔ لہٰذا کلالہ کے متعلق سوال و جواب کا ذکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اشارہ کر دیا، اور غالباً اسی اشارے کی خاطر سوال کو مطلق رکھا۔ مسئول عنہ کا سوال کے ساتھ ذکر نہیں کیا بلکہ جواب میں اس کی تصریح فرمائی جس کی قرآن میں کہیں مثال نہیں ہے۔ اور پھر جواب کی اللہ سبحانہ کی طرف نسبت فرمائی۔ الحاصل جملہ احکام کے لیے

وحی الٰہی منشا اور اصل ہے۔ اور ہدایت اسی کی متابعت پر موقوف ہے اور کفر و ضلالت اسی کی مخالفت میں منحصر ہے اور چونکہ زمانہ ہجرت میں یہود و نصاریٰ اور جملہ مشرکین اور تمام اہل ضلالت کی گمراہی کی جڑ یہی مخالفت تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں بہت جگہ وحی کی متابعت کی خوبی اور اس کی مخالفت کی خرابی پر تنبیہ فرمایا۔ بالخصوص اس جگہ تو دورکوع کا موضوع ہی یہ مہتم بالشان مضمون ہے۔ شاید حضرت امام بخاری نے اسی وجہ سے اپنی کتاب میں

باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ

منعقد فرما کر آیت انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ کو ترجمۃ الباب میں داخل کیا اور ان دونوں رکوعوں کی طرف اشارہ کر گئے گویا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے مضمون وحی کے ختم تک تلاوت کر لو۔

۲۶۵۔ اے پیغمبر آپ سے کلالہ کے بارے میں فتویٰ دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے۔ شروع سورت میں آیت میراث میں کلالہ کی میراث کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس کے بعد جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے متعلق زیادہ تفصیل پوچھنی چاہی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کلالہ کے معنے کمزور اور ضعیف یہاں وہ شخص مراد ہے جس کے وارثوں میں باپ اور اولاد میں سے کوئی نہ ہو جیسا کہ پہلے بیان ہوا کیونکہ اصلی وارث والد اور ولد ہی ہیں۔ جس کے یہ نہ ہوں تو اس کے حقیقی بھائی بہن کو بیٹا بیٹی کا حکم ہے۔ اور اگر حقیقی نہ ہوں تو یہی حکم سوتیلوں کا ہے جو کہ باپ میں شریک ہوں۔ ایک بہن ہو تو آدھا اور دو بہنیں ہوں تو دو تہائی۔ اور اگر بھائی بہن دونوں ہیں تو مرد کو دوہرا حصہ اور عورت کو اکہرا حصہ ملے گا۔ اور اگر صرف بھائی ہوں بہن کوئی نہ ہو تو وہ بہن کے مال کے وارث ہوں گے یعنی ان کا کوئی حصہ مقرر نہیں بلکہ وہ عصبہ ہیں جیسا کہ آیت میں یہ سب صورتیں مذکور ہیں۔ اب باقی رہ گئے ہیں وہ بھائی بہن جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں تو ان کا حکم آغاز سورت میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا حصہ مقرر ہے۔[1]

کلالہ کی معنوی تحقیق پر ہم چوتھی جلد میں سورہ نساء کی آیت ۱۲ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم محض تقریب سخن کی خاطر اس پر اجمالی تبصرہ کرتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کلالہ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے کلالہ کے لغوی معنے کے متعلق اہل لغت کے سات اقوال نقل کیے ہیں۔ علامہ منظور افریقی نے لسان العرب میں ابن بری کی جانب نسبت کر کے لکھا ہے کہ کلالہ اصل میں مصدر ہے۔ کل یکل کلالۃ بولا جاتا ہے۔ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے نہ بیٹا چھوڑے اور نہ باپ۔ لفظ کلالہ وارث اور مورث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اگر مورث کے معنے ہیں تو مصدر بمعنے اسم مفعول ہے جیسے خلق بمعنے مخلوق اور اگر کلالہ وارث کے معنے میں ہو تو مصدر بمعنے اسم فاعل ہے جیسے عدل بمعنے عادل: رجل عدل یعنی اور ماء غور یعنی بمعنی غائر، لفظ کلالہ مورث کے معنے بصریین کا مختار ہے اور لفظ کلالہ بمعنے وارث کوفیین کا مختار ہے۔ ابن الاثیر فرماتے ہیں کہ باپ اور بیٹا آدمی کی دو طرفین ہیں، اگر دونوں طرفین نہ ہوں تو آدمی کلالہ کہلاتا ہے۔ زمخشری نے اساس البلاغہ میں آدمی کے باپ اور بیٹا نہ ہونے کو بعض وارث کلالہ کو مجاز قرار دیا ہے فرماتے ہیں ومن المجاز کل فلان اذا لم یکن ولدا و لا والدا، اصل لغت میں کلالہ کے معنے کمزور ہونے کے ہیں۔ اسی سے وہ تلوار جو کند ہو گئی ہو کلیل اور اسی طرح وہ زبان جس میں قوت گویائی نہ ہو اور وہ آنکھ جس کی بینائی کمزور ہو جائے کلیل کہلاتی ہے۔ اسی سے قرآن میں اس غلام کو جس کا بوجھ مالک کمزوری کی وجہ سے اس کا آقا اٹھائے کل اور اسی سے حدیث میں خدیجۃ الکبریٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتایا ہے انک لتحمل الکل آپ ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں جو خود کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے۔ اور یہی معنے اس ارشاد گرامی کے

من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک کلا فالی وعلی

جو شخص مال چھوڑ کر مرجائے تو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو بوجھ چھوڑ جائے یعنی بے کس اور بے بس اولاد چھوڑ جائے یا قرض چھوڑ جائے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں

استعمال میں وسعت کے بعد کلالہ سے مراد وہ ہوتے ہیں جو منقطع الطرفین ہوں نہ ان کے والدین ہوں اور نہ اولاد ہو۔ اور جو شخص آباؤ اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو اس کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے

ورثتم قناۃ الملک غیر کلالۃ
عن ابنی مناف عبد شمس وہاشم

یعنی عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے تم کو حکومت کا نیزہ میراث میں تو ملا ہے مگر تم خود ان کی خصوصیات سے بے بہرہ ہو۔ قریب کے رشتہ دار کو چھوڑ کر دور کے رشتہ دار کو بھی کلالہ

کہتے ہیں۔ البصاص کمطراز ہیں کہ احادیث میں مورث اور وارث دونوں کو کہتے ہیں۔ بہرحال اس پر علماء کا اجماع ہے کہ سورہ نساء کی پہلی آیت وان کان رجل یورث کللۃ۔ میں کلالہ سے وہ مورث مراد ہے جس کے والد اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں اخیافی بھائی بہن ہوں یعنی جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ اور سورۃ نساء کی اس آیت میں اخیافی نہیں عینی اور علاتی بھائی بہن مراد ہیں یعنی جو میت کے ساتھ باپ اور ماں یا صرف باپ کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں۔ گویا تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کلالہ کے وارث اخیافی بھائی بہن ہوں، دوسرے یہ کہ کلالہ کے وارث عینی بھائی بہن ہوں تیسرے یہ کہ کلالہ کے وارث علاتی بھائی بہن ہوں۔ اس آیت میں آخری دو صورتوں کا ذکر ہے جبکہ پہلی آیت کلالہ میں پہلی صورت کا ذکر تھا۔

عینی یہ کہ باپ اور ماں ایک ہی ہوں۔ علاتی یہ کہ باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں اور اخیافی یہ کہ ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں۔

پہلی آیت میں چونکہ پہلی صورت بتائی گئی اس لیے سوال پیدا ہوا کہ باقی دو صورتوں کا کیا حکم ہے۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے کلالہ کے موضوع پر دو آیتیں نازل فرمائی، ایک سورہ نساء کے شروع میں اور دوسری سورۃ نساء کے خاتمہ پر، پہلی آیت میں بات اجمالی بتائی گئی تھی، دوسری آیت میں بات کو کھول دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ پہلی آیت میں اس کلالہ کا ذکر تھا جو اپنے وارثوں میں اخیافی بہن بھائی چھوڑ کر مرتا ہے، اس آیت میں اس کلالہ کا ذکر ہے جو اپنے وارثوں میں عینی اور علاتی بھائی بہن چھوڑ کر مرتا ہے۔ یہ بات کہ اس آیت میں اس کلالہ کا ذکر ہے جو اپنے وارثوں میں عینی یا علاتی بھائی بہن چھوڑ کر مرا ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ایک بار خطبہ میں ارشاد فرمایا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کے خلاف نہ کیا اس لیے یہ بات اتفاقی اور اجماعی ہے اور اسی سلسلے میں حضرت جابر کا وہ واقعہ بھی ہے جسے عام شارحین قرآن نے اس آیت کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

> حضرت جابر کہتے ہیں کہ میں بیمار تھا اور بیہوش تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، وضو فرمایا اور وضو کے باقی پانی سے مجھ پر چھینٹا دیا، مجھے ہوش آیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں کلالہ ہوں، میرا کوئی وارث نہیں، میری میراث کا کیا بنے گا، اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ روایت صحیحین میں اور سنن اربعہ میں موجود ہے اور حافظ ابن حجر کا یہ بھی انکشاف ہے کہ

حضرت جابر کے ۹ بہنیں تھیں۔ قرآن کے سیاق اور حضرت جابر کے واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلالہ کے معنے قطعاً بے غبار ہیں۔ قرآن نے موضوع میراث پر سب سے پہلے اولاد کی پھر اولاد کی موجودگی میں اور عدم موجودگی میں اور بھائیوں کی موجودگی اور عدم موجودگی میں والدین کی میراث کا ذکر کیا ہے پھر اولاد کی موجودگی اور عدم موجودگی میں میاں بیوی کی میراث کا ذکر کیا ہے۔ ان کا میت سے بلا واسطہ تعلق ہے اب ظاہر ہے جن کا تعلق میت سے بالواسطہ ہوگا وہ کلالہ ہے اسی لیے اس کے بعد کلالہ کی میراث کا ذکر ہے اور گزشتہ ضابطہ میراث بول رہا ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کا باپ نہ ہو اور بیٹا نہ ہو کیونکہ ان کی میراث بیان ہو چکی ہے۔ اگر لغت سے کلالہ کے معنے معلوم نہ بھی ہوں تو قرآن کا سیاق خود معنے بتانے کے لیے کافی ہے اور شاید اسی بنا پر امام اعظم ابوحنیفہ نے کلالہ کے معنے میں دادی اور پوتی کی نفی کا بھی اضافہ کیا ہے، بہرحال اس آیت نے اور نساء کی پہلی آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ایسا شخص جس کا اصحاب فرض میں سے کوئی وارث نہ ہو اور اپنے پیچھے عینی یا علاتی بھائی بہن چھوڑ کر مرا ہے قرآن کی وراثت کا ضابطہ ہے۔

وارثوں میں اکیلی بہن

۲۶۶ - اگر کوئی ایسا شخص مرا ہو جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن موجود ہو تو جو کچھ مرنے کے بعد اس نے چھوڑا ہے اس میں آدھا اس کی بہن کا ہے۔ یعنی اگر کوئی مرد مر گیا اور اس نے ایک بہن چھوڑی نہ بیٹا چھوڑا نہ باپ تو اس کی میراث میں نصف مال ملے گا۔[1]

اصل ارشاد میں لفظ ھلک آیا ہے اس کے معنے مر جانے کے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس کا استعمال تحقیر کے موضوع پر ہوتا ہے لیکن محققین کی رائے میں یہ عرف حادث ہے ورنہ اصل میں اس کے معنے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس معنے میں یہ لفظ خود قرآن و سنت میں آیا ہے اور تحقیر کا کوئی پہلو وہاں نہیں ہے۔ حضرت یوسف کے بارے میں ہے حتی اذا ھلک اور حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو مدینہ میں ذرہ دفعتان سے ایک ہنگامہ بپا تھا۔ باہر سے آنے والے نے دریافت کیا یہ کیا ہو گیا۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ھلک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور کا وصال ہو گیا ہے لیکن بعد کے عرف میں یہ لفظ حقارت والی موت پر بولا جانے لگا۔ اسی بنا پر علامہ خفاجی نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شرح شفا میں تصریح کی ہے۔

انبیاء کے حق میں اس لفظ کو استعمال ذکرنا چاہیے اور لغت قدیم معنے کا خیال کیا جائے قواعد شرعیہ سے تھوڑا سا لگاؤ رکھنے والا شخص بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں بھی یہ بات نقل کی ہے۔

یہ بات کہ اگر کلالہ وہ ہے جس کے باپ نہ ہو اور بیٹا نہ ہو تو قرآن نے صرف بیٹے کی نفی کیوں کی ہے اور یہ کیوں فرمایا ہے کہ لیس لہ ولد، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے یہاں بیٹے نہ ہونے کی تصریح اس لیے کی ہے کہ

اولاً بیٹا نہ ہونا کلالہ کے لغوی مفہوم میں موجود ہے

ثانیاً عموماً آدمی کی وفات والدین کے وفات کے بعد ہوتی ہے اس کا سرمایہ یا اپنی کمائی سے ہوتا ہے یا وراثت میں ملا ہوتا ہے۔

ثالثاً، بھائیوں اور بہنوں کا والد کے ساتھ وارث نہ ہونا فرائض کی آیات سے پہلے معلوم ہو چکا ہے اس لیے یہاں باپ نہ ہونے کی شرط لگانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ بات خود قرآن سے، میراث کے قواعد سے پہلے ہی معلوم تھی اس لیے اختصاراً اسے حذف کر دیا۔

آیت میں ولد سے کیا مراد ہے؟ ولد سے مراد یہاں بیٹا ہے کیونکہ بیٹے کی موجودگی میں بہن بالاتفاق وارث نہیں ہو سکتی اور بیٹی کی موجودگی میں بہن کو وراثت میں حق ملتا ہے لیکن کچھ علماء کی رائے میں یہاں ولد بیٹا اور بیٹی دونوں کے لیے ہے۔ زید بن ثابت سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا ہے اس نے اپنے پسماندگان میں ایک عینی بہن چھوڑی ہے اور ایک بیوی چھوڑی ہے میراث کا حکم کیا ہے فرمایا کہ بیوی کو آدھی اور بہن کو آدھی جائداد دے دی جائے اور فرمایا کہ میں بارگاہ نبوت میں حاضر تھا، آپ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ حدیث مسند امام احمد میں ہے۔ حافظ ابن جریر نے عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ ابن الزبیر کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو ایک بیٹی اور بہن چھوڑ کر انتقال کر جائے، یہ نقل کیا ہے کہ بہن کو کچھ نہ ملے گا لیکن جمہور نے اس معاملہ میں عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن الزبیر سے اختلاف کیا ہے، ان کی رائے میں بیٹی کو نصف فرض کی بنا پر اور بہن کو نصف عصبہ ہونے کی وجہ سے دیا جائے گا۔ بہن کو عصبہ بنا کر دینا اس واقعہ کی وجہ سے ہے جو صحیح بخاری میں بحوالہ سلیمان از ابراہیم الاسود آیا ہے کہ

حضرت معاذ نے زمانہ نبوت میں ایسے ہی واقعہ لڑکی کے لیے اور بہن کے لیے نصف کا فیصلہ فرمایا تھا۔

اور صحیح بخاری میں ہذیل بن شرحبیل کے حوالے سے ہے کہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ اس نے پسماندگان میں ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف ملے گا یہ بتا کر فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود سے بھی پوچھ لو۔ سائل نے عبداللہ ابن مسعود سے دریافت کیا اور ساتھ ہی ابو موسیٰ کا فتویٰ بھی بتا دیا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا پھر تو میں بے راہ ہو جاؤں گا اور مجھے راہ نہ ملے گی۔ میں تو وہی فیصلہ کروں گا جو حضور نے فیصلہ کیا ہے۔ آدھا بیٹی کو ملے گا اور چھٹا پوتی کو ملے گا اور باقی بہن کو۔ سائل کہتا ہے کہ میں ابو موسیٰ کے پاس آیا اور ان کو عبداللہ بن مسعود کے فتویٰ سے آگاہ کیا، بولے جب تک یہ عالم تم میں موجود ہے مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔

بھائی بہن کے سارے مال کا وارث

۲۶۷ ۔ اور بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا۔ یعنی اور اگر اس کے برعکس ہو یعنی کوئی عورت لاولد مر گئی اور اس نے بھائی عینی یا علاتی چھوڑا تو وہ بہن کے مال کا وارث ہوگا کیونکہ وہ عصبہ ہے اور اگر اس نے لڑکا چھوڑا تو بھائی کو کچھ نہ ملے گا اور اگر لڑکی چھوڑی تو لڑکی سے جو کچھ بچے گا وہ اس بھائی کو ملے گا اور اگر بھائی بہن اخیافی ہوں تو اس کے لیے چھٹا حصہ مقرر ہے جیسا کہ ابتدائے سورۃ میں گزر چکا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ بھائی اس کے سارے مال کا وارث ہوگا اگر اور کوئی صاحب فریضہ نہ ہو۔ اگر کوئی صاحب فریضہ موجود ہو مثلاً شوہر تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔[2]

منشا یہ ہے کہ بھائی بہن کے مال کا وارث ہوگا جب اس کے بیٹا نہ ہو، والد نہ ہو جیسا کہ کلالہ کی معنوی روح کا تقاضا ہے اور جیسا کہ فرائض اور میراث کے قواعد و ضوابط کی روح ہے۔

کلالہ برادر کی اگر دو بہنیں ہوں

۲۶۸ ۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔ یعنی اگر دو سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

زیادہ بہنیں ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا۔[1] مطلب یہ ہے کہ اگر مرنے والا کلالہ اپنے پسماندگان میں دو بہنیں چھوڑ کر مرے تو ان کو بھائی کے ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا اور اگر دو سے بھی زیادہ ہوں جیسا کہ حضرت جابر کی نو بہنیں تھیں تو ان کو بھی دو تہائی ہی ملے گا اور باقی عصبہ کو ملے گا بشرطیکہ اصحاب فرض میں سے کوئی نہ ہو۔ ادائے قرض اور اجرائے وصیت ہر حال میں مقدم ہوگا۔ اس آیت میں کلالہ کی دو بہنوں کا خاص طور پر حکم بتایا اور حکم بھی ایسے بلیغ انداز میں بتایا کہ دو بہنوں کے لیے صرف تثنیہ کی ضمیر پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ اثنتین کا عدد لے کر آئے، صرف اس لیے تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب ایک بہن کا آدھا ہے تو دو بہنوں کا تو لازماً سارا ہوگا فرمایا یہ بات نہیں بلکہ بہنیں دو ہوں گی تو صرف دو تہائی ملے گا پورا نہیں ملے گا اور دو سے زائد کے بارے میں بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ فان کن نساء فوق اثنتین فلهن ثلثا ما ترک۔ اس لیے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا۔

مرد کو عورت سے دگنا

۲۶۹- اگر بہن بھائی ہوں، کچھ مرد کچھ عورتیں تو پھر مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے یعنی اگر میت کلالہ ہو اس کے نہ باپ ہو نہ بیٹا اور اس کے وارثوں میں بھائی اور بہنیں ہوں تو میت کا ترکہ ان بھائی بہنوں میں دو اور ایک کی نسبت سے تقسیم ہوگا، اس کے لیے یہ بلیغ تعبیر اختیار کی للذکر مثل حظ الانثیین یعنی لڑکے کو دو لڑکیوں جیسا ہے، یہ نہیں فرمایا للانثیین مثل حظ الذکر دو لڑکیوں کو ایک لڑکے جیسا ملے گا یا للانثی مثل حظ الذکر کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا ملے گا اس میں اس سماجی ذہن کی تردید ہے جو عورتوں کو وراثت سے محروم کرتا تھا۔

یہ بات کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں ڈبل کیوں دیا گیا ہے؟ یہ سوال بہتوں کے ذہنوں میں ابھرا ہے۔ اور شارحین قرآن نے اس پر مختلف انداز میں داد تحقیق دی ہے۔

آیئے ذرا اس موضوع پر ایک اور پہلو سے غور فرمایئے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی پیدا نہیں کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔

ولهن مثل الذی علیهن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور یہ بھی درست ہے کہ جہاں تک معیشت اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے قرآن نے مرد و عورت دونوں کے استقلال کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن

اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ وراثت میں قرآن نے حقداری کی حد تک مرد و عورت دونوں کی برابری کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان مما قل منہ او کثر

اس کے باوجود ترتیب اور تقسیم حقوق میں عورت کو مرد سے نصف دیا ہے، اور دوں کا پتہ نہیں مگر اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ نہیں ہے کہ عورت کمزور ہے جیسا کہ علامہ آلوسی کی رائے ہے اگر بنیاد یہی ہو تو پھر عورت کو ڈبل ملنا چاہیے اور طاقتور کو سنگل ملنا چاہیے۔ اور اس بات میں کوئی خاص وزن نہیں ہے کہ مرد کو خاندانی زندگی میں قوام بنایا گیا ہے اور یہ بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی ساخت نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت اولاد کے ساتھ اور کوئی کام کرے۔ واقعی وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت کو میراث میں لڑکے کے مقابلہ میں آدھا اس لیے دیا گیا ہے کہ عورت کو مہر کی صورت میں شوہر کی جانب سے جو رقم ملنے والی ہے وہ اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ نیز عورت پر شادی ہو جانے کے بعد اپنی رہائش، خوراک کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے شوہر اس کی ہر قسم کی کفالت کرتا ہے۔ اسے مثال سے یوں سمجھیے کہ رشید کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے دو بالغ بچے حمید اور فریدہ چھوڑے ہیں اور اس کا ترکہ تین ہزار روپیہ ہے۔ ظاہر ہے کہ دو ہزار حمید کو ملیں گے اور ایک ہزار فریدہ کو۔ اب دونوں کی شادی ہوتی ہے، حمید کو اپنی بیوی کو ایک ہزار روپیہ مہر دینا ہے اور فریدہ کو اپنے شوہر سے ایک ہزار روپیہ مہر لینا ہے۔ حمید پر اپنی اور اپنی اہلیہ کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے جب کہ فریدہ اپنے نان و نفقہ سے بے فکر ہے۔ مہر کے بارے میں پڑھ چکے ہو وآتوا النساء صدقاتھن نحلۃ، اور وآتیتم احداھن قنطارا۔

ان حالات میں آپ ہی ذرا انصاف فرمائیے کہ زیادہ کس کو ملا ہے، لڑکی کو یا لڑکے کو۔ لڑکے کے پاس صرف ایک ہزار ہے اور اس میں اس پر خانگی ذمہ داریاں ہیں۔ لڑکے پر مہر کی ذمہ داری ہے اس لیے اس کو ڈبل دیا گیا ہے۔ لڑکی کو مہر لینا ہے اس لیے اس کو میراث میں حصہ سنگل دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شوہر کے مرجانے پر بیوی کو چوتھائی اور آٹھواں دیا ہے اور بیوی کے مر جانے پر شوہر کو

ذیل اور جو تھائی دیا ہے کیونکہ بیوی کے مرجانے پر شوہر کو دوسری شادی کرنی ہے بیوی کو مہر دینا ہے اور شوہر کے مرجانے پر بیوی کو دوسری شادی کرنی ہے اس کو مہر لینا ہے۔

نزولِ قوانین کا مقصد

۲۷۰۔ اللہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے۔ یعنی اللہ رحیم و کریم محض اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اور ان کو گمراہی سے بچانے کے لیے اپنے احکام حقہ صادقہ بیان فرماتا ہے جیسا یہاں میراث کلالہ کو بیان فرما دیا۔ اس کی اس میں کوئی غرض نہیں ہے وہ سب سے غنی اور بے نیاز ہے تو اب جو اس مہربانی کی قدر نہ کرے بلکہ اس کے حکم سے انحراف کرے اس کی شقاوت کا کیا ٹھکانا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ بندہ کو جملہ احکام کی تابعداری لازم ہے اگر معمولی اور جزوی امر میں خلاف کرے گا تو گمراہی ہے پھر جو لوگ اس کی ذات پاک اور اس کی صفات کمال میں اس کے حکم کے خلاف کرتے ہیں اور اپنی عقل اور اپنی خواہش کو اس کے مقابلہ میں اپنا مقتدا بناتے ہیں۔ ان کی ضلالت اور خباثت کو اسی سے سمجھ لیجئے کہ کس درجہ کی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کی ہدایت پسند کرتا ہے آخر میں ارشاد ہے کہ اس کو سب کچھ معلوم ہے۔ تو مطلب یہ نکلا کہ مسائل دینیہ میں جو ضرورت پیش آئے اس کو پوچھ لو۔ یہاں صحابہ نے جو کلالہ کے مسئلہ میں استفسار فرمایا تھا اس کی تحسین کی طرف اور آئندہ ایسے سوالات کی ترغیب کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے یعنی تم نہیں جانتے تم تو یہ بھی نہیں بتلا سکتے کہ کلالہ اور اس کے سوا دیگر صورتوں میں جو حصہ مقرر کیا گیا ہے فی الواقع اس کی وجہ کیا ہے؟ پھر آدمی کی عقل اس قابل کب ہو سکتی ہے کہ اس کے بھروسے حق سبحانہٗ کی ذات و صفات میں وحی کے خلاف پر جرأت کرے جو اپنے تعلقات اور اپنے اقارب کے فرق اور امتیاز سے عاجز ہو وہ بے چون و چگوں اور اس کی صفات کو بدون اس کے بتلائے کیا سمجھ سکتا ہے[1] ان تضلوا اصل میں علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اصل میں لئلا تضلوا ہے یعنی تاکہ تم بے راہ نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی احکام و قوانین کا بنیادی مقصد افراد کی تکمیل ذات اور انسان کی اجتماعی زندگی کی نشو و نما ہے۔ فرد کی تکمیل ذات اور اجتماعی سیرت کی تشکیل و تعمیر ایک ایسا مقصد ہے جس سے سیاسی ترقی اور معاشی فارغ البالی کا مقصد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی شخصیت کا نشوونما زندگی کی ایک ایسی حالت پر موقوف ہے جس میں افراد کی حقیقی اور لابدی ضروریات پوری ہوں۔ چونکہ اسلامی قوانین کا مقصد انسان کی تکمیل ذات اور اس کی اجتماعی خودی کی نشوونما ہے اس لیے وہ مادی زندگی کے مالیاتی شعبہ سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے فرائض میں اہم فرض یہ ہے کہ وہ معاشرے کی مالیاتی، معاشی اور سیاسی تنظیم کرے۔ اسی طرح اسلامی قانون باطنی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کی حیات خارجی ہو یا اس کی باطنی زندگی دونوں کی بیک وقت اصلاح چاہتا ہے کیونکہ خارج و باطن دونوں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ دوسرے کی بھی اصلاح کی جائے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو درست نہیں کیا جا سکتا جب تک خود انسان کا نفس بھلائی کی طرف مائل نہ ہو جائے اور اگر نفس انسانی زندگی کی ہر شاخ میں خواہشوں کا پرستار ہو کر رہ جائے تو تمدن کی تمام اصلاحی کوششیں، معاشرتی زندگی کو درست کرنے کی ترکیبیں اور سیاسی نظام کا تغیر و تبدل بیکار ہے۔ جب تک افراد میں بھلائی کی طرف میلان نہ ہو تمدنی زندگی امن و مسرت سے ناآشنا رہے گی۔ قرآن نے یبین اللہ لکم کا مفعول حذف کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ الجصاص نے بالکل درست لکھا ہے کہ وہ تمام احکام اللہ سبحانہ ہمارے لیے بیان کرتا ہے جن کی ہمیں ضرورت ہے اور دوسرے شارحین قرآن نے اسی کو احکام دین و شرائع سے تعبیر کیا ہے یعنی اللہ تمہارے لیے دین کے قوانین و احکام بیان کرتا ہے۔ سورت کے آغاز سے یہاں تک جو معاشرتی، عائلی، اخلاقی، روحانی، معاشی، قانونی اور سیاسی اور مالیاتی احکام بیان ہوتے ہیں۔ ان سب کی طرف بحیثیت مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معاشرت، اخلاق، سیاست اور مالیات کے وہ قانون ہیں جو اللہ تمہاری خاطر بیان کر رہا ہے اور اس لیے بیان کر رہا ہے تاکہ تم زندگی میں کسی مقام پر بے راہ اور گم کردہ راہ نہ ہو جاؤ۔

اور یہاں لکم پر زور دے کر اشارہ کیا ہے کہ تم دنیا میں اس لیے روانہ کیے گئے ہو کہ اللہ سبحانہ تمہارے لیے اپنے احکام و ہدایات بیان فرماتے۔ نبوت کے بجائے خود امت کو مخاطب اس لیے کیا گیا ہے کہ آخری نبوت کے ذریعے ایک ایسی امت کو وجود میں لانا مقصود ہے جو دنیا میں نبوت کی نیابت کر سکے اور پورے دین کی حامل اور تمام انبیاء کی وارث ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ اللہ سبحانہ نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس بنا پر ایسی کامل شریعت عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو۔ اس بنا پر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر عالمی دعوت کا علمبردار ہو کر آتا ہے وہ علاوہ ان اصُول کے جو دوسرے انبیاء کے ہیں کچھ نئے اصُول اختیار کرتا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے،

وہ ایک قوم کو سلف راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور دُرست کرتا ہے۔ پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دُنیا میں پھیلاتا ہے اور ان کو ذریعہ بنا کر محنت کرتا ہے۔ قرآن کی اس آیت کنتم خیر امۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

دُنیا کی تمام قوموں میں اس پیغمبرانہ کام کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی صرف عرب کی سرزمین بنجر اور زمین کی طرح نشو ونما کے مادے سے لبریز تھی۔ اللہ سبحانہ نے اسی کا انتخاب فرمایا اور یہیں تکمہ تاج ان کے سر پر رکھا اور فلاح و سعادت کی وہ راہ جس پر انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین چل چکے تھے ان پر کھول دی اور بالآخر ان کی اس دُعا کو شرف قبول عطا کیا اھدنا الصراط المستقیم یہاں ان تضلوا میں اسی طرف اشارہ ہے کہ وہ احکام و قوانین اس لیے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر رہا ہے کہ صراط مستقیم سے نہ ہٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہودیوں کی طرح روحانیت کو چھوڑ کر مادیت کے ہو جاؤ اور ایسا نہ ہو کہ تم مادیت کو نظر انداز کر کے روحانیت کے پیچھے پڑ جاؤ۔

سورۃ نساء کی یہ آخری سطریں جو اس خطاکار کے قلم سے آج مورخہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء بروز دوشنبہ بوقت ۱۱ بجے دن بمقام شویخ الکویت فیکٹری مقیم الوطن از جناب الحاج عبدالغنی صاحب حوالۂ قرطاس ہوئی ہیں، اللہ سبحانہ لغزشوں کو معاف فرمائے، اور خاص اپنے فضل و کرم سے معالم القرآن کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرماتے۔ آمین۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

سورت کا نام

یہ قرآن کی پانچویں سورت ہے۔ اس میں ۱۲۰ آیتیں ہیں۔ اس کا نام مائدہ ہے۔ اس میں مائدہ کا واقعہ ہے اور واقعہ اپنے اندر ایک سے زیادہ عجائبات رکھتا ہے کیونکہ اس کے جلو میں ایک سے زیادہ قدرت کی نشانیاں ہونے کے ساتھ اس دور کے اہل ایمان پر عظیم مہربانی اور منکرین کے لیے سنگین دھمکی ہے۔ اس لیے بندہ ہونے کی حیثیت میں یہ واقعہ بندوں کو ان ذمہ داریوں کے اپنانے کا بہت بڑا محرک ہے جو اللہ کی جانب سے اس پر ڈالی گئی ہیں جس کے ذریعے اللہ اور بندوں کے درمیان رابطہ ایمانی استوار ہوتا ہے اس لیے پوری سورت کو مائدہ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول سورۃ مائدہ

یہ سورت مدنی اس معنے میں ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مدینہ بلکہ آخر عمر شریف کا زمانہ ہے۔ ورنہ واقعۃً اس کے بیشتر حصہ کا نزول مکہ مکرمہ میں حجۃ الوداع ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ میں ہوا ہے۔ اور کچھ صلح حدیبیہ سے واپسی کے وقت نازل ہوئی ہے۔ روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ ہجری کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی قعدہ ۶ھ کا واقعہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے مگر کفار مکہ نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپ کو عمرہ نہ کرنے دیا۔ اور بڑی رد و کد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آئندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقعہ پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارت کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتائے جائیں تاکہ آئندہ سال عمرہ کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے اور دوسری طرف انہیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو عمرے سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں۔ اور کچھ فتح مکہ کے سال ۸ھ میں۔

روایتوں میں آیا ہے کہ جس وقت اس سورت کا نزول ہوا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی

پرسوار تھے نزولِ وحی کے ثقل کو جانور تک نے محسوس کیا اور وہ بیٹھ گئی۔

بیان کے انداز سے گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک ہی خطبہ پر مشتمل ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اس سورت میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلہ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورت دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

سورہ مائدہ کا موضوع

سورہ نساء کے نزول سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ اسلام صرف ایک عقیدہ و مسلک نہیں ہے جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو بلکہ وہ روحانی اور اخلاقی نظام کے ساتھ ایک سیاسی نظام بھی ہے جس کی حکمرانی عملاً اپنے حدود میں بسنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک بن چکے تھے کہ جس سیاسی نظام پر وہ ایمان لائے تھے اس کے مطابق ریاست بنا کر زندگی بسر کرسکیں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے سیاسی نظام یا قانون کو اپنے دائرہ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ سے آخری امت کی حیثیت سے اپنی آخری اور کامل شریعت پر پوری پابندی کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو پوری دنیا میں قائم کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے۔
گویا دوسرے لفظوں میں سورت کا موضوع ایفاءِ عہد ہے یعنی احکام الٰہی کی اطاعت کا جو عہد کرچکے ہو اسے سچائی کے ساتھ پورا کرو۔ پورا کرنا یہ ہے کہ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ کرو اور جن سے روکا گیا ہے ان سے رک جاؤ۔ چنانچہ آغاز ہی میں اوفوا بالعقود کے بعد اوامر و نواہی کا بیان شروع ہوگیا ہے۔ سورت کے موضوع کے تقاضے سے اس میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں ان میں چند نمایاں باتیں یہ ہیں۔

اولاً یہ کہ اس میں جو احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں وہ دعوت اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ تکمیل دین اور اتمام نعمت کا مرحلہ سامنے آچکا ہے۔ ظاہر ہے کہ عہد و پیمان لینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں احکام یہی ہوسکتے ہیں۔
ثانیاً یہ کہ ان احکام میں امتحان کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ پچھلی امتوں کو اس طرح کے جو احکام دیئے گئے تھے ان میں انہوں نے ٹھوکریں کھائیں جس کے نتیجے میں وہ معتوب ہوئیں۔ اس امت پر اللہ کا خاص یہ فضل ہوا کہ عہد و پیمان لیتے وقت ایسے احکام خاص طور پر دیئے گئے۔ یہ امت پاؤں پھسلنے

کے مقامات سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ۔
ثالث یہ کہ اس سورت میں تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے نقض عہد کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے اور اس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔
رابعاً یہ کہ اس سورت میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان پوشیدہ گوشوں کو خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے جہاں سے کفر اور اس کے ایجنٹوں کو گھس آنے کا موقع ملتا ہے اور پھر وہ فتنے سر اٹھاتے ہیں جو روکے نہ جائیں تو پورا انتظام شریعت درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے ۔
خامساً یہ کہ اس سورت میں وہ اصول و ضوابط خاص طور پر پوری طرح واضح کر دیئے گئے ہیں جن کا تمام عہد الٰہی پر قائم و استوار رہنے کے لیے ضروری ہے ۔
یہ پانچ باتیں اس وقت کہی گئیں جب کہ اسلامی اصول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق، معاشرت، تمدن ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے ممتاز ہو چکے تھے۔ تمام اسلامی علاقے میں مساجد اور نماز با جماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین سیاسی، فوجداری اور دیوانی بڑی حد تک بن چکے تھے اور ریاست کی تشکیل سیاسی قوانین کی روشنی میں ہو چکی تھی اور عدالتوں کے ذریعے دیوانی اور فوجداری قوانین نافذ کیے جا رہے تھے۔ لین دین خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح طلاق کے قوانین، پردہ شرعی اور استیذان کے احکام اور زنا و قذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نشست و برخاست بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ جن کا اپنا ایک الگ تمدن بن چکا ہے پھر کبھی ان میں آملیں گے ۔
اسی لیے اس سورت کو آخری سورت کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخری مراحل میں نازل ہوئی ہے البحر المحیط میں ابن حیان اندلسی کی یہ بات زیادہ وزنی ہے کہ سورہ مائدہ کے کچھ حصے سفر حدیبیہ میں اور کچھ فتح مکہ کے سفر میں اور کچھ حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوئے ہیں۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں بحوالہ حضرت حمزہ ابن حبیب اور عطیہ ابن قیس یہ ارشاد نبوت نقل کیا ہے کہ سورہ مائدہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری سورت ہے۔ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ اسی قسم کی

ایک روایت حافظ ابن کثیر نے بحوالہ جبیر بن نفیر نقل کی ہے کہ وہ حج کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا جبیر تم سورہ مائدہ پڑھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہاں پڑھتا ہوں، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ یہ قرآن کی آخری سورت ہے جو احکام دیئے ہیں وہ محکم ہیں ان میں نسخ کا احتمال نہیں ہے۔ ان کا خاص اہتمام کرو۔

سُورَةُ الْمَائِدَةِ مَدَنِيَّةٌ (٥) (١١٢)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

المنزل ٢

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ

الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝١

اے مسلمانو! معاہدے پورے کرو، تمہارے لیے مویشی جانور حلال کردیے گئے ہیں[٢]، ہاں مگر وہ جن کا ذکر آگے کیا جائے گا[٣]۔ لیکن جب تم حالت احرام میں ہو تو تمہارے لیے شکار حلال نہیں ہے[٢]۔ بلاشبہ اللہ جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

معاشرتی زندگی اور تمدنی زندگی

سورہ نسا میں اسلامی معاشرت کو کھول کر بیان کیا تھا۔ اس سورت میں اسلامی تمدن کا ذکر ہو رہا ہے۔ دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے سورت کی ابتدا ء اوفوا بالعقود سے کی ہے کیونکہ اگر ایک طرف تمدن کی بنیاد معاہدات پر ہے تو دوسری طرف شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند عقود ہی کو کہتے ہیں اور عیسائیت نے چونکہ نہ صرف شریعت کا استخفاف کرکے اسے بالکل غیر ضروری

قرار دیا حالانکہ اپنی آسمانی کتاب کا نام نیا عہد نامہ ہی رکھا ہے بلکہ اسے معاذ اللہ ایک لعنت قرار دیا ہے۔ اسی لیے عیسائیت کے ذکر کی ابتداء اس حکم سے موزوں تھی ۔ اور دونوں باتوں کو اکٹھا کرکے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جب نظام عالم مادی بغیر قوانین وعہود ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا تو روحانی نظام بدون اتباع قوانین اور بدون ایفائے عہود الٰہی کیوں کر قائم رہ سکتا ہے ۔ اور اس حکم سے ابتداء کرنے کے بعد کھانے پینے اور نکاح کے کچھ احکام بتائے کہ خواہشات حیوانی کی تعدیل کے لیے یہ احکام نہایت ضروری ہیں۔ اس رکوع میں تکمیل دین کا بھی اعلان ہے یہ گویا اشارہ ہے کہ دین کی تکمیل شریعت کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں ہے دوسرے رکوع میں پھر ضرورت شریعت کو بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور صفات ملکوتی کی طرف توجہ دلاتی ہے ۔ اوّل الذکر کے لیے نماز کا ذکر کیا اور اس کی ایک چھوٹی سی فرع طہارت جسمانی کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے سچے تعلق کو بتایا تو دوسری طرف انسانوں کے تعلقات میں اعلیٰ درجے کے اصول انصاف کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں تک کہ نہ صرف غیر قوموں بلکہ دشمنوں سے بھی عدل وانصاف پر قائم رہنے کا حکم دیا ۔ تیسرے رکوع میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنیوں چوتھے رکوع میں بنی اسرائیل کی نافرمانی کا ۔ پانچویں رکوع میں ان اہل کتاب کے جو عہد شکنیوں کی وجہ سے راہ حق سے دُور ہو گئے تھے منصوبوں کا ذکر ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وہ کرتے تھے اور جان و مال کی حفاظت کو واضح کیا ہے جس کے بغیر تمدّن قائم نہیں رہ سکتا ۔ چھٹے میں بتایا ہے کہ اہل کتاب کے باہمی مقدمات انہی کی شریعت کے مطابق فیصلے کرو ۔ اور ساتویں میں دنیوی جھگڑوں کے فیصلے اور دینی جھگڑوں کے فیصلوں کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ دینی اختلافات میں فیصلے قرآن حکیم ہی سے کرنا ہے ۔ آٹھویں رکوع میں یہود ونصاریٰ سے تعلقات کا اور نویں میں ان کی حالت کا ذکر ہے ۔ دسویں میں عیسائیت کے حق میں انحراف اور غلو کو واضح کیا ہے ۔ گیارہویں میں بتایا کہ اس کے باوجود عیسائی مسلمانوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں حق پذیری کی زیادہ صلاحیت موجود ہے ۔ بارہویں رکوع میں عیسائیوں کی غلطی پر مسلمانوں کو متنبہ کیا جنہوں نے ایک طرف تو یہاں تک غلو کیا کہ عبادت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو بھی حرام قرار دیا اور دوسری طرف دُنیا میں اس قدر منہمک ہوئے کہ حرام چیزوں جیسے شراب کو بھی شیر مادر بنا لیا ۔ تیرہویں رکوع میں خانہ کعبہ کی حرمت کا ذکر کیا کیونکہ اگر ایک دفعہ پہلے عیسائیوں نے اس گھر کو ڈھانے کا ارادہ کیا تھا تو علم الٰہی میں وہ دوسرا وقت بھی آنے والا تھا جب اس پاک گھر کے بارے میں عیسائی اقوام کے بد ارادے ہوں گے ۔ چودہویں میں بتایا کہ شریعت کو ضروری ہے مگر افراط وتفریط پسند نہیں ہے ۔ اسی بنا پر چھوٹے چھوٹے غیر ضروری سوالات کرنے سے روک دیا ۔

پندرہویں رکوع میں حواریوں کے مائدہ طلب کرنے کے ذکر میں عیسائیوں کے لذات دنیوی میں انہماک کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ ان کی توجہ روحانی امور سے ہٹ کر کھانے پینے اور خواہشات نفس کی طرف رہ جائے گی اور آخری رکوع میں بتایا کہ حضرت مسیح کی الوہیت اور تثلیث کا مسئلہ خود حضرت مسیح کی تعلیم ہرگز نہیں ہے۔

۱۔ اے مسلمانو! اپنے معاہدے پورے کرو۔ ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے، صحیح معرفت اور تسلیم و انقیاد۔ یعنی خدا اور رسول کے جملہ ارشادات کو صحیح مان کر تسلیم و قبول کے لیے اخلاص سے گردن جھکا دینا۔ اس تسلیمی جزو کے لحاظ سے ایمان فی الواقع تمام قوانین و احکام الٰہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد و اقرار ہے۔ گویا حق تعالیٰ کی ربوبیت کا وہ اقرار جو عہد الست کے سلسلے میں لیا گیا تھا، جس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے، اسی کی تجدید و تشریح ایمان شرعی سے ہوتی ہے۔ پھر ایمان شرعی میں جو کچھ اجمال عہد و پیمان تھا اسی کی تفصیل پورے قرآن و سنت میں دکھلائی گئی ہے۔ اس صورت میں دعویٰ ایمان کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ تمام احکام الٰہیہ میں خواہ ان کا تعلق براہ راست خدا سے ہو یا بندوں کی جسمانی تربیت سے یا روحانی اصلاح سے دنیوی مفاد سے ہو یا اُخروی فلاح سے، شخصی زندگی سے ہو یا حیات اجتماعی سے صلح سے ہو یا جنگ سے، اس کا عہد کرتا ہے کہ ہر منہج سے اپنے مالک کا وفادار بن کر رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو عہد و پیمان اسلام، جہاد، سمع و طاعت یا دوسرے عمدہ خصال اور امور خیر کے متعلق صحابہ کرام سے بشکل بیعت لیتے تھے وہ اسی عہد ایمانی کی ایک محسوس صورت تھی، اور چونکہ ایمان کے ضمن میں بندے کو حق تعالیٰ کے جلال و جبروت کی صحیح معرفت اور اس کی شان انصاف و انتقام اور وعدوں کی سچائی کا پورا یقین ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بدعہدی اور غداری کے مہلک عواقب سے ڈر کر اپنے تمام عہدوں کو جو خدا سے یا بندوں سے یا خود اپنے نفس سے کیے ہوں، اس طرح پورا کرے کہ مالک حقیقی کی وفاداری میں فرق نہ آنے پائے۔ اس تقریر کے موافق عقود کی تفسیر میں جو مختلف تشریحات سلف سے منقول ہیں ان سب میں تطبیق ہو جاتی ہے اور آیت میں ایمان والو کے لفظ سے خطاب فرمانے کا مزید لطف حاصل ہوتا ہے۔[1]

---

[1] اخلاصات شیخ الاسلام

اہل ایمان کو اپنے عہد پورا کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ ایمان دراصل ایک معاہدہ التزام ہے کہ میں دل و جان سے ان احکام کی تعمیل کروں گا۔ یہ عہد التزام ہی ایمان کی حقیقت ہے جس میں تمام احکام داخل ہیں اس طرح گویا ایمان تمام حقوق کی بجا آوری کا عہد و اقرار ہے اس لیے حکم ہوا ہے کہ اے ایمان والو تم نے ایمان لا کر التزام احکام کا اجمالی طور پر جو عہد و پیمان کیا ہے اس کو پورا کرو۔ لہٰذا ایمان درحقیقت التزام طاعت کا ایک اجمالی معاہدہ ہے۔ جسے آج کی زبان میں حلف وفاداری کہتے ہیں۔ یہ اجمالی معاہدہ ایک امر بسیط ہے اور تمام احکام شرعیہ اس معاہدے کی دفعات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان دراصل التزام طاعت خداوندی کے معاہدہ کا نام ہے اور یہ ایک امر بسیط ہے۔ اس میں فی حد ذاتہٖ تجزی اور تبعض نہیں جیسے عقد نکاح کہ حقوق زوجیت کے التزام کا ایک اجمالی معاہدہ ہے اور ایک امر بسیط ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی صرف ایجاب و قبول سے پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن نان و نفقہ اور رہائش وغیرہ یہ تمام امور عقد نکاح کے اجزاء ترکیبی نہیں بلکہ اس کے لوازم ہیں۔ اسی طرح اعمال صالحہ عقد ایمان کے لوازم ہیں جن کی بجا آوری لازم ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

> جب آدمی مسلمان ہوا تو سب حکم اللہ کے قبول کرنے ٹھہرا چکا، اب فرماتے ہیں کہ ان کو قبول کرو۔

مطلب یہ ہے حسب عہد ان احکام کی بجا آوری کرو جن کے التزام کا تم نے عہد کیا ہے، خلاف عہد کوئی کام نہ کرو بے وفائی بہت بری چیز ہے۔

عقود کا مفہومی عموم

عقد کا لفظ عہد و میثاق کے مقابلہ میں عام ہے۔ اس میں قول و قرار اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سے لے کر اس عہد و میثاق تک جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یعنی ہر عہد شرعی کو شامل خواہ اس کا تعلق خالق سے ہو خواہ مخلوق سے جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کی روایت ہے۔ ابو حیان اندلسی نے بھی عام عقود مراد لیے ہیں۔ امام حسن فرماتے ہیں کہ ہر قسم کا عہد عقود میں مراد ہے خواہ کاروباری، لین دین، کرایہ، نکاح، طلاق، مزارعت، مصالحت، تملیک، تخییر اور عتق وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ عبادات کے علاوہ بھی جتنے عہد سیاسیات، تجارت، معاشرت وغیرہ معاملات و اخلاقیات سے متعلق ہو سکتے ہیں سب اس میں آ گئے۔ ابوبکر الجصاص فرماتے

ہیں کہ عقد کیا جاتا ہے یا عہد اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ امام راغب اصفہانی نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس کے حکم میں داخل ہیں اور پھر لکھا ہے کہ عقد کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک معاہدہ وہ ہے جو انسانوں کا اپنے رب سے ہے مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد، دوسرے وہ معاہدہ جو ایک کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے جیسے کسی چیز کی نذر یا حلف۔ تیسرے وہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ۔ اس میں وہ تمام معاہدات داخل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ حکومتوں کے باہمی معاہدات یا بین الاقوامی معاہدات، جماعتوں کے عہد و میثاق اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات اس میں داخل ہیں اور اس آیت کی رو سے ان کا ایفا واجب ہے چنانچہ اس سورت میں میثاق شریعت کی پوری تاریخ بھی اس کے تمام نتائج و عواقب کے ساتھ بیان ہوتی ہے۔ قسم اور شہادت کی ذمہ داریاں بھی واضح کی گئی ہیں۔

چارپایوں کی حلت

۲۔ تمہارے لیے مویشی جانور حلال کر دیے گئے ہیں۔ سورۃ نساء میں گزر چکا ہے کہ یہود کو ظلم و بدعہدی کی پاداش حلال و طیب چیزوں سے محروم کر دیا گیا۔ فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات (نساء رکوع ۲۲) جن کی تفصیل سورۃ انعام میں ہے۔ اس امت مرحومہ کو ایفائے عہد کی ہدایت کے ساتھ ان چیزوں سے بھی منتفع ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری اور اسی جنس کے تمام اہلی اور وحشی (پالتو اور جنگلی) چرپائے مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ تمہارے لیے ہر حال میں حلال کیے گئے بجز ان حیوانات یا حالات کے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی تمہارے جسمانی یا روحانی یا اخلاقی مصلحت کے لیے ممانعت فرما دی ہے[1]
اصل ارشاد میں بھیمۃ الانعام ہے۔ اس میں اضافت تشبیہ کے لیے ہے یعنی مویشیوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے مشتے جلتے ہوتے چرپائے جو نہ درندے ہوں نہ شکاری مراد ہیں۔ ہرن، نیل گائے وغیرہ ایسے چوپائے جو شکاری اور درندے نہ ہونے میں مویشیوں سے مشابہ ہوں۔ اضافت سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ اونٹ، گائے، بکری اور اس قبیل کے سارے ہی چوپائے خواہ گھریلو ہوں یا وحشی تمہارے لیے جائز ٹھہرا دیے گئے۔ احلت بکم حلال کر دیے گئے سے مراد یہ ہے کہ جو پابندیاں تم نے اپنے اوہام سے عائد کی ہیں وہ بھی ختم اور جو پچھلے صحیفوں کی روایات کی بنا پر تھیں وہ بھی کالعدم۔ دراصل انعام (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری پر بولا جاتا ہے اور بھیمہ کا اطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ انعام تمہارے لیے حلال کیے گئے تو اس سے صرف وہی جانور حلال ہوتے جنہیں عربی میں انعام کہتے ہیں لیکن حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ مویشی کی قسم کے چرندے چوپائے تم پر حلال کیے گئے۔ اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندے جانور اس دائرے میں آ جاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں یعنی جو کچلیاں نہ رکھتے ہوں، حیوانی غذا کے بجائے نباتی غذا کھاتے ہوں، اور دوسری حیوانی خصوصیات میں انعام عرب سے مماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے اشارہ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ چوپائے جو مویشیوں کے برعکس کچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے پنجے ہوتے ہیں جو دوسرے جانوروں کو شکار کر کے کھاتے ہیں یا مردار خوار ہوتے ہیں۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل ذى مخلب من الطير۔

حضور نے پنجوں والے پرندوں سے منع فرمایا ہے۔

دوسرے متعدد صحابہ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔ [1]

تحلیل سے ایک استثناء

۲۔ ہاں مگر وہ جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ غالباً اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اسی رکوع کی تیسری آیت میں بیان کی گئی ہیں یعنی حرمت علیکم المیتۃ سے ذالکم فسق تک

---

[1] تفہیم القرآن افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ بجز ان جانوروں کے جن کی حرمت قرآن میں آگے بیان ہو رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اشیأ میں عام قانون تحلیل ہے جیساکہ پڑھ چکے ہو هو الذی خلق لکم ما فی الارض میں قرآن نے اشیأ کی حلت کا اعلان کیا ہے حرام صرف وہ چیزیں ہیں جن کی حرمت کا قرآن وسنت میں ذکر ہے۔ یہاں صرف اشارہ کیا ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔ تفصیل کے موقع پر قرآن نے گیارہ چیزوں کا ذکر کیا ہے اوّل مردار جانور، دوسرے خون، تیسرے سؤر کا گوشت، چوتھے وہ جانور جو بقصدِ تقرب غیراللہ کے لیے نامزد کردیا گیا ہو، پانچویں وہ جانور جو گلا گھٹ کر مرجائے، چھٹے وہ جانور جو چوٹ کھاکر مرجائے، ساتویں وہ جو اوپر سے نیچے گر کر مرا ہو، آٹھویں وہ جانور جو دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مرا ہو۔ نویں وہ جانور جس کو درندے نے پھاڑ کھایا، دسویں وہ جانور جو کسی استھان پر ذبح کیا جائے۔

اس آیت میں لطیف بلیغ نکتہ یہ ہے کہ ایفاءِ عہد کے حکم کے بعد تحلیل عام بیان کی اور پھر تحلیلِ عام کے بعد استثنا کرکے اپنے علم وقدرت اور رموزِ مصلحت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حالتِ احرام میں شکار حرام ہے

۴۔ لیکن جب تم حالتِ احرام میں ہو تو تمہارے لیے شکار حلال نہیں ہے۔ محرم کو صرف خشکی کے جانور کا شکار جائز نہیں دریائی شکار کی اجازت ہے۔ اور جب حالتِ احرام کی رعایت اس قدر ہے کہ اس میں شکار کرنا ممنوع ہے تو خود حرم شریف کی حرمت کا لحاظ اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہیے یعنی حرم کے جانور کا شکار محرم یا غیر محرم سب کے لیے حرام ہوگا جیساکہ لا تحلوا شعائر اللہ کے عموم سے مترشح ہوتا ہے[1]۔ مطلب یہ ہے کہ حالتِ احرام میں حلال جانوروں کا شکار بھی ناجائز ہے۔ شکار سے یہاں صرف ان جانوروں کا شکار مراد ہے جن کا کھانا جائز ہے جیساکہ امام راغب نے تصریح کی ہے۔ باقی سانپ بچھو وغیرہ موذی جانوروں کا اس ممانعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ان کے مارنے پر شکار کا اطلاق ہوتا ہے۔ لفظ صید سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان جانوروں کا شکار مراد ہے جو وحشی ہوتے ہیں اور جن کے پکڑنے میں کسی تدبیر وحیلہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام گھریلو جانور بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ جو عادتاً شکار کرکے نہیں لائے جاتے اور روزانہ محض ذبح کرکے کھائے جاتے ہیں ان کو ذبح کرنے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کی کوئی ممانعت نہیں۔ دانستہ حرام سے صرف حالتِ احرام ہی میں شکار کی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ حرم کے علاقہ میں بھی شکار حرام ہے خواہ شکار کرنے والا احرام میں نہ ہو۔ ممانعت کا اصل مدار شکار کا حدودِ حرم میں ہونا ہے۔

یہ گویا ان حرمتوں میں سب سے پہلی حرمت کا ذکر ہے۔ یعنی تمہارے لیے انعام کے قسم کے تمام چوپائے خواہ پالتو ہوں یا وحشی جائز ہیں اس پابندی کے ساتھ کہ حالتِ احرام میں شکار کو جائز کرنے والے نہ بن جانا۔ اس کے سب سے پہلے ذکر کرنے سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہیے کہ احرام اس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارتِ کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلے پر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں جب تک وہ اپنا معمولی لباس اتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہمد اور ایک چادر ہوتی ہے جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے پہن لینے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو عام حالات میں جائز ہیں مثلاً حجامت، خوشبو کا استعمال۔ ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضائے شہوت وغیرہ ان ہی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کیا جائے نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتہ بتایا جائے[1]۔

دراصل اس سورت میں جو احکام بیان ہوئے وہ تکمیلی اور اتمامی نوعیت کے ہیں۔ اپنے اسی پہلو کے پیشِ نظر وہ اس سورت میں بیان ہوتے ہیں۔ ان پر عہد لینے کے معنے یہ ہیں کہ پوری شریعت کی پابندی اور اس سے وفاداری کا عہد لیا گیا۔ کھانے پینے کے باب میں یہاں جو حرمتیں اور حلتیں بیان ہوئی ہیں وہ بالکل آخری نوعیت کی ہیں۔ اس سے پہلے اس موضوع کے بہت سے احکام سورہ بقرہ میں گزر چکے ہیں اور بقرہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ انعام میں بیان ہوتے ہیں جو ایک مکی سورت ہے صرف کچھ جزئیات باقی رہ گئی تھیں جو یہاں بیان کی گئی ہیں اور ان کے بعد یہ باب بالکل مکمل ہو گیا۔

اللہ حاکم مطلق ہے

۵۔ بلاشبہ اللہ جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے جس خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا پھر

[1] تفہیم القرآن۔

کمال حکمت سے ان میں باہم فرق مراتب رکھا۔ ہر نوع میں اس کی استعداد کے موافق جدا جدا فطری خواص و قویٰ ودیعت کیے۔ زندگی اور موت کی مختلف صورتیں تجویز کیں۔ بلاشبہ اسی خدا کو اپنی مخلوقات میں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اختیار کامل علم محیط اور حکمت بالغہ کے اقتضا سے جس چیز کو جس کسی کے لیے جن حالات میں حلال یا حرام کر دے لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔[1] یعنی ارادہ الٰہی سے بالاتر کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ کسی کو حق نہیں۔ اس کے ماننے میں چون وچرا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت ومصلحت پر مبنی ہیں لیکن بندہ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مصلحت سمجھتا ہے بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کر دی وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ اشیاء کی حلت وحرمت کے لیے مالک کی اجازت وعدم اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی ضرورت نہیں اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا جس چیز کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور ناجائز قرار دے وہ ناجائز ہے۔[2]

اس میں شاید اس حکمت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ انسان کے لیے بعض جانوروں کو کھانے کی اجازت دینا کوئی ظلم نہیں۔ جس مالک نے سب جانیں بنائی ہیں اسی نے پوری بصیرت وحکمت کے ساتھ یہ قانون بھی بنایا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے لیے غذا بنایا ہے زمین کی مٹی درختوں کی غذا ہے اور درخت جانوروں کی غذا اور جانور انسانوں کی غذا۔ انسان سے اعلیٰ کوئی مخلوق نہیں ہے اس لیے انسان کسی کی غذا نہیں بن سکتا۔[3] آئیے اس فقرے پر ابتلاء امتحان کے زاویہ سے نگاہ ڈالیے تو آپ محسوس کریں گے حالت احرام میں شکار کی ممانعت کا معاملہ بالکل اس حکم سے مشابہ ہے جو یہود کو سبت کے دن سے متعلق دیا گیا تھا۔ ان کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی لیکن وہ اس عہد کو نباہ نہ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اللہ یحکم ما یرید کا اضافہ فرما کر اس حکم کے امتحانی پہلو کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ حکم تمہاری وفاداری کی جانچ کے لیے ہے۔ اس میں چون وچرا نہ کرنا اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن [3] معارف القرآن م شفی

اس سے گریز کی راہیں نہ تلاش کرنا۔ خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور اس کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت ہی میں بندوں کے لیے خیر و برکت ہے۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ جو احکام محض تعبدی ہوتے ہیں ان میں بندوں کی مصلحت کا پہلو مخفی ہوتا ہے اس لیے جب تک یہ عقیدہ دل میں مضبوط نہ ہو کہ خدا کو حکم دینے کا اختیار مطلق حاصل ہے اور اس کا ہر حکم بندوں ہی کی مصلحت کے لیے ہوتا ہے اس وقت تک سچی وفاداری کے ساتھ ان کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔[1]

حضرت مولانا اشرف علی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے کہ آیت میں اسرار احکام کی تفتیش کی ممانعت کی طرف اشارہ ہے۔[2]

---

[1] تدبر قرآن [2] تفسیر ماجدی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ

وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ

فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ

إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ 1

اے اہل ایمان اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ ان مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں۔ نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو اور نہ ان جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردن میں نذر خدا کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوتے ہیں۔ اور نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے

فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف

جاتے ہوں۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم

کو شکار کی اجازت ہے۔ اور یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اس گروہ کی

دشمنی جس نے تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ روکا تھا اس بات

پر نہ ابھارے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ تمہارا دستور یہ ہونا

ہونا چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے

کی مدد کرو، گناہ اور ظلم کی بات میں کسی سے تعاون[12] نہ کرو۔

اللہ سے ڈرو، اللہ سنگین سزا دینے والا[13] ہے۔

اسلامی شعائر

جیسے مشاعر ان امکنہ کو کہا جاتا ہے جہاں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، حج کے مشاعر اپنے گوناگوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ صدق توبہ اور ذکر الٰہی کی نورانیت کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں۔ مشاعر کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر بہت گہرا ہوتا ہے وہ مقامات جہاں انبیاء علیہ السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الٰہی کی بارش ہوئی وہ ماحول اور فضا قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد جہاں حضرت ابراہیم کو مناسک حج کی معرفت حاصل ہوئی مشاعر کہلاتے ہیں، ایسے ہی شعائر شعیرہ کی جمع ہے، اس سے دین کی

تمام نشانیاں مراد ہیں۔ شارحین قرآن نے اس سے مراد وہ تمام امور لیے ہیں جو حدود و فرائض اوامر اور نواہی کی صورت میں اللہ کی جانب سے ہیں۔ اسی لیے امام حسن کا کہنا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ کا دین ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرز فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا شعیرہ اور شعار کہلاتی ہے کیونکہ وہ اس کے لیے علامت اور نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے فوج اور پولیس وغیرہ کی یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی، زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں، کیس، کڑا، کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اس نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے بغاوت کا ہم معنے ہے۔

۶ — اے اہل ایمان اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لیے علامات و نشانات خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ ان میں حرم محترم، بیت اللہ شریف، جمرات، صفا و مروہ، ہدی، احرام، مساجد، کتب سماویہ وغیرہ تمام حدود و فرائض اور احکام وغیرہ شامل ہیں آگے ان شعائر میں سے بعض مخصوص چیزوں کا جو مناسک سے متعلق ہیں ذکر فرماتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے آیت میں بھی محرم کے بعض احکام ذکر کیے گئے تھے۔[1]

اصل ارشاد میں شعائر اللہ آیا ہے اللہ کی نشانیاں یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے نشان بندگی قرار دیا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ شعائر شعیرہ کی جمع ہے اور ابن فارس نے اس کا واحد شعار بتایا ہے۔ ہر وہ شے جو کسی کے لیے نشان مقرر ہو یا جو کسی علامت کو بتائے اسے شعیرہ کہتے ہیں اور امام ابوبکر الجصاص رقمطراز ہیں کہ اہل لغت کا بیان ہے کہ شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ شعیرہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لیے وہ مقرر کی گئی ہے اشعار بدن کے معنے یہ ہیں کہ جانور پر ایسی نشانی لگا دی جائے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں شعائر سے اللہ کے دین کے تمام نشانات مراد ہیں یعنی دین کے وہ فرائض جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کے حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے حقوق میں کوتاہی نہ کریں اور ان کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یہ معنے ان تمام معانی کو جامع ہیں جو سلف سے اس کی تشریح میں منقول ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تعظیم شعائر ایک مستقل عنوان قائم کرکے شعائر اللہ کی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ وہ محسوس اور مرئی امور ہیں جن کے ذریعے اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں ان کی تعظیم اللہ کی تعظیم ہے۔ اور ان کی بے حرمتی و بے ادبی جناب الٰہی میں بے ادبی ہے۔ اسلام میں بزرگ تر شعائر چار ہیں۔ قرآن، خانہ کعبہ، ذات پیغمبر اور نماز اس کے بعد ہر ایک کے بارے میں شعیرہ ہونے کی حیثیت بتائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے شعائر کے معنے میں ذرا وسعت کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دین کے عرف میں شعائر، مکانات، اوقات اور علامات عبادت کو کہتے ہیں۔ کعبہ، عرفات، مزدلفہ، رمی جمار، صفا، مروہ، منیٰ اور مساجد، رمضان، حرمت کے مہینے، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، جمعہ، ایام تشریق، اذان، تکبیر، ختنہ، نماز باجماعت، نماز جمعہ و عیدین سب اللہ کے شعائر ہیں۔

بعض بزرگوں نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ احکام شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ احکام وہ ہیں جو امت کے لیے بطور تعبد مقرر کیے گئے ہیں مثلاً نماز بطریق مخصوص، اور نماز میں خانہ کعبہ کی طرف رُخ کرنا، مناسک حج وغیرہ، یہ ایسے احکام ہیں جن کی شرعیت کی مصلحت ہمارے ادراک سے بالا ہے۔ ان میں کمی بیشی کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ان میں کسی کی رائے حجت نہیں ہے ان میں کمی و بیشی کے ذریعے دین میں بدعت کو گھس آنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کو شعائر کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک مسلمان کی اسلامی زندگی کی محسوس نشانیاں ہیں۔

کچھ احکام وہ ہیں جن کی شرعیت انسانی مصالح کی خاطر ہوتی ہے ان کے اسباب وعلل تک ہماری رسائی ممکن ہے مثلاً احکام معاملات، سیاست، معاشرت، عدالت ان کو شعائر نہیں کہتے۔ ان دونوں قسم کے مجموعہ احکام کا نام اسلام ہے۔

دراصل شعائر انسان کے اندر بندگی کا احساس ابھارنے اور اسے مکمل کرنے میں بڑا حصہ لیتا ہے اور یہ مومن کو ایک ذہن عطا کرتے ہیں جو اسلام کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہوتا ہے، ایک ایسا دل عطا کرتے ہیں جو دین کے حکموں پر برابر کان لگائے رکھتا ہے۔ ایک ایسی رُوح عطا کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب سے سرشار ہوتی ہے اور اس طرح وہ اللہ کی

طاعت گزاری کے لیے ایسا مستعد ہو جاتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑے۔ اس کے دل کی زمین جت کر اور کھاد پانی پا کر اس طرح شعائر کے ذریعے تیار ہو جاتی ہے کہ دینی ہدایات کا جو تخم بھی اس میں ڈالا جائے اسے فوراً قبول کر لے۔ اور نشوونما کے لیے اپنا عمل شروع کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو شعائر کہا گیا ہے یعنی دین کے باقی اجزا کے لیے نشان راہ قرار دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک بہترین تعبیر تھی جو قرآن نے اختیار کی ہے۔

حرمت والے مہینوں کی بے حرمتی

ارشاد ہے - اور نہ ان مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں۔ ادب والے مہینے چار ہیں منہا اربعۃ حرم سورۃ توبہ رکوع ۵ جن ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب۔ ان کی تعظیم اور احترام یہ ہے کہ دوسرے مہینوں سے بڑھ کر ان میں نیکی و تقویٰ کو اختیار کرو اور شر و فساد سے بچنے کا اہتمام کرو بالخصوص حجاج کو ستا کر اور دق کر کے حج بیت اللہ سے نہ روکا جائے۔ اگرچہ یہ تمام سال کے بارہ مہینوں میں واجب العمل ہیں۔ لیکن ان محترم مہینوں میں بالخصوص بہت زیادہ موکد قرار دیے گئے باقی دشمنان دین کے مقابلہ میں بجوئی پیش قدمی تو جمہور کا مذہب یہ ہی ہے بلکہ ابن جریر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کی ان مہینوں میں ممانعت نہیں ہے اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ توبہ میں آئے گا۔ عام شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ اس میں مشرکین سے حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت ہے اور البقرہ کی آیت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموهم کو ناسخ بتاتے ہیں مگر محققین کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے کیونکہ اول آیت میں مشرکین کی بابت کوئی حکم نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو بدی اور ان کے مراسم حج میں خلل اندازی سے ممانعت ہے۔ وہ بدستور اب بھی باقی ہے لیکن یہ سوچ درست نہیں ہے کیونکہ آیت میں یہ فقرہ ولا یجرمنکم شنان قوم اس توجیہ کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شعائر اللہ کے عام احترام کا حکم دینے کے بعد اب یہاں چند خاص شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا ہے کیونکہ اس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔

ا ہ افادات شیخ الاسلام

ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں ۔ اور پھر ان کے احترام کا یہ حکم اس زمانے میں دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں اور مشرکین عرب کے درمیان جنگ برپا تھی ۔ مکہ پر مشرکین قابض تھے ۔ عرب کے ہر حصے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبہ کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے ۔ اس وقت یہ حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک سہی ۔ تمہارے اور ان کے درمیان جنگ سہی مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جا رہے ہیں تو حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو ۔ یہ مہینے قابلِ احترام ہیں تمہیں ان کا احترام کرنا چاہیے ۔

کعبہ کی نیاز اور قربانی

۸ ۔ نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو اور نہ ان جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خدا کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں ۔ ہدی قربانی کے جانوروں کو کہتے ہیں جو بطور نذر خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت اللہ لے جاتے جاتے ہیں ۔ قلائد قلادہ کی جمع ہے جس سے مراد وہ ہار یا پٹہ ہے جو ہدی کے جانور کے گلے میں نشان کے طور پر ڈالتے تھے تاکہ قربانی کا جانور سمجھ کر اس سے تعرض نہ کریں اور دیکھنے والوں کو اسی جیسا عمل کرنے کی ترغیب بھی ہو ۔ قرآن عظیم نے ان چیزوں کی تعظیم و حرمت کو باقی رکھا اور ہدی یا اس کی علامات سے تعرض کرنے کو ممنوع قرار دیا[1] ہدی کے بعد قلائد کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کی نوعیت رکھتا ہے ۔ اور مقصود اس سے تعرض کی سنگینی کو واضح کرنا ہے کہ جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ہوں ان پر حملہ خاص خدا کے گلے پر حملہ کرنا ہے ۔ ان جانوروں کی بے حرمتی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ان کو حرم تک پہنچنے سے روکا جائے یا چھین لیا جائے ، دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے قربانی کے علاوہ کوئی دوسرا کام سواری یا دودھ حاصل کرنے کا لیا جائے اس آیت نے ان سب صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے ۔

طالبِ رضائے حق قابلِ احترام ہے

۹ ۔ اور نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں۔ بظاہر یہ شان صرف مسلمانوں کی ہے یعنی جو مخلص مسلمان حج وعمرہ کے لیے جائیں ان کی تعظیم و احترام کرو اور ان کی راہ میں روڑے مت اٹکاؤ۔ اور جو مشرکین حج بیت اللہ کے لیے آتے تھے۔ اگر وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہوں۔ کیونکہ وہ بھی اپنے زعم اور عقیدے کے موافق خدا کے فضل و قرب اور خوشنودی کے طالب ہوتے تھے تو کہنا پڑے گا کہ یہ حکم اس وقت سے پہلے کا ہے جب کہ انما المشرکون نجس فلا تقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا۔ کی منادی کرادی گئی۔ لے

مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا ادب یہ ہے کہ جو اس کی زیارت کو جا رہا ہے اس سے کوئی تعرض نہ کرو، اس لیے کہ جب خانہ کعبہ کے ادب اور احترام میں قربانی کے جانور سے تعرض جائز نہیں تو انسان سے تعرض کرنا کیسے روا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس کام میں اللہ کی تعظیم کریں اس کام میں کافروں کی مزاحمت نہ کرو۔ البتہ بت وغیرہ کی تعظیم میں ان کی مزاحمت اور اہانت کرو۔ مشرکین عرب اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا پیرو کہتے تھے۔ اسی بنا پر وہ حج اور عمرہ کی نیت سے سفر کرتے اور اپنے گمان میں وہ اللہ کی خوشنودی کا قصد کرتے۔ ان کے بارے میں اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ خانہ کعبہ کی نیت سے آتے ہیں ان سے تعرض نہ کرو۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان شعائر اللہ کے احترام پر مامور ہے بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو۔ کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیل کی آلودگی سے انہیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی عبادت اور بندگی کا کوئی جزو رکھتا ہے تو اس جزو کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور ان شعائر کا بھی احترام کریں گے جو اس مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور ان کے درمیان نزاع نہیں ہے بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اس میں نہیں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے؟

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں اور مشرکین عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکہ پر مشرکین قابض تھے۔

لے افادات شیخ الاسلام

احرام کھولنے کے بعد شکار کی اجازت

۱۰۔ اور جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تمہیں شکار کی اجازت ہے یعنی حالتِ احرام میں شکار کی جو ممانعت کی گئی وہ احرام کھولنے کے بعد باقی نہیں رہی۔[1] احرام بھی من جملہ شعائر اللہ ہے اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے اس لیے شعائر اللہ کے سلسلے میں اس کا ذکر کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدے کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔[2]

یاد رہے کہ فاصطادوا میں صیغہ امر وجوب کے معنے میں نہیں بلکہ صرف اجازت کے مفہوم میں ہے۔ الجصاص اور آلوسی نے اس کی تصریح کی ہے۔ نسفی اور ابن کثیر کا بھی اسی طرف میلان ہے۔ مولانا اشرف علی نے یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ محض ایک امر مباح کے لیے صیغہ امر کا لانا یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس مباح کے ترک سے اس کے ممنوع ہونے کا قانون میں شبہ ہونے لگے اس مباح کا کرنا ہی مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں سے ان متشددین کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو مباحات کے چھوڑنے میں احرام ہی کی طرح تشدد اور غلو رکھتے ہیں۔

دشمنی میں بھی انصاف کا دامن نہ چھوڑو

۱۱۔ اور یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی جس نے تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ روکا تھا اس بات پر تمہیں نہ ابھارے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ پچھلی آیت میں جن شعائر کو حق تعالیٰ نے معظم و محترم قرار دیا تھا ۶ھ میں مشرکین مکہ نے ان سب کی اہانت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ ماہ ذیقعدہ محض عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر مشرکین نے اس مذہبی فریضہ کی بجا آوری سے روک دیا۔ نہ حالتِ احرام کا خیال کیا نہ کعبہ کی حرمت کا، محترم مہینہ کا نہ ہدی و قلائد کا۔ مسلمان شعائر اللہ کی اس توہین اور مذہبی فریضہ سے روک دیے جانے پر ایسی وحشی و ظالم قوم کے مقابلہ میں جس قدر بھی غیظ و غضب

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اور بغض و عداوت کا اظہار کرتے وہ حق بجانب تھے اور جوشِ انتقام سے برافروختہ ہو کر جو کارروائی کرتے وہ ممکن تھی لیکن اسلام کی محبت و عداوت دونوں نپی تلی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے جابر و ظالم دشمن کے مقابلہ میں بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا۔ عموماً آدمی زیادہ محبت یا زیادہ عداوت کے جوش میں حد سے گزر جاتا ہے اس لیے فرمایا کہ سخت سے سخت دشمنی تمہارے لیے اس کا باعث نہ ہو کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو[1]

چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیئے گئے تھے اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانہ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے ماریں مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر روک دیا[2]

آیت کا منشا یہ ہے کہ جس قوم نے تم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ اور تم سخت غم و غصہ کے ساتھ ناکام واپس ہو گئے تھے۔ اب جبکہ تم کو قوت اور قدرت حاصل ہے تو ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ گزشتہ واقعہ کے غم و غصہ اور بغض کا انتقام اس طرح لیا جائے کہ تم ان کو بیت اللہ اور مسجد حرام میں داخل ہونے اور حج کرنے سے روکنے لگو۔ کیونکہ یہ ظلم ہے اور اسلام ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔ ظلم کے بدلہ میں انصاف کرنا اور انصاف پر قائم رہنا اسلام کا شاہکار ہے۔ اگر انہوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں اقتدار کے نشہ میں مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے جبراً روک دیا تو یہ ظلم تھا، اس کا جواب ہرگز یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اب مسلمان بھی اپنے زمانہ اقتدار میں اسی ظلم کی کاپی کریں۔

اس آیتِ قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ عدل و انصاف میں دوست دشمن سب یکساں ہیں تمہارا دشمن خواہ کیسا ہی سخت ہو اور اس نے تمہیں کیسی ایذا پہنچائی ہو، اس سے بھی عدل و انصاف کا برتاؤ تمہارا فرض ہے۔

یہ کیسے زریں اصول کی تعلیم ہے کہ بیگانے تو بیگانے ان حق پوش بیگانوں سے بھی انصاف کا معاملہ کرو جن کی دشمنی کھل کر سامنے آ چکی ہو اور تم ان سے اور وہ تم سے میدان جنگ میں آمنے سامنے آ چکے ہوں۔ اس طرح بتا دیا کہ جو دشمن نہ ہوں یا جن سے تعلقات ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کس قدر ضروری ہے۔ پھر دشمن کے لفظ کو عام نہیں رکھا۔ کیونکہ بعض وقت محض اجنبی ہونے کی وجہ سے ایک قوم کو دشمن سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ ان صدوکم عن المسجد الحرام بول کر بتا دیا کہ وہ دشمن جو تمہیں انتہا درجے کے دکھ پہنچا چکے ہوں، تمہیں گھر سے بے گھر کر چکے ہوں اور تمہارے مذہبی فریضہ کی ادائیگی میں حائل ہو چکے ہوں ان سے بھی عدل و انصاف کرو۔

نیکی میں سب کے شریک رہو

۱۲۔ تمہارا دستور یہ ہونا چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو اگناہ اور ظلم کی بات میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اگر کوئی شخص بالفرض جوش انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعت اسلام اس کے ظلم و عدوان کی اعانت نہ کرے بلکہ سب مل کر نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کریں اور اشخاص کی زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو روکیں۔[1]

اس آیت میں جو قاعدہ بتایا گیا ہے وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے سارے کاموں کے لیے ایک عام دستور العمل ہے۔ جو کوئی نیک کام کرے اس کی مدد کرو۔ اگرچہ مسلمان نہ ہو اور اگرچہ مخالف ہو اور جو کوئی برائی کرے اس کی مدد نہ کرو۔ اگرچہ مسلمان ہو، اگرچہ تمہارا ساتھی ہو مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا شیوہ اختیار نہ کرو کہ اپنی قوم ہر سب پر مقدم اور اپنی پارٹی بہرحال اپنی پارٹی۔ اس سے پہلے قاعدہ اور اصول غیروں سے معاملات کے بتائے تھے۔ اب اس آیت میں امت کی حیثیت بتائی جارہی ہے کہ تمہاری حیثیت عام امتوں کی نہیں ہے تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا میں تم برو تقویٰ کے مددگار اور اثم و عدوان کے مخالف بن کر آئے ہو اور یہ ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جو اس امت کے پورے نظام اجتماع کی روح ہے اور جس پر مسلمان کی ہر صلاح و فلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے۔ ہر دانش مند جانتا ہے کہ دنیا کا پورا نظام باہمی تعاون پر قائم ہے۔ قرآن نے اس آیت میں صرف تعاون کی تعلیم نہیں دی بلکہ تعاونوا علی البر والتقویٰ کی ہدایت کی ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان سے منع کیا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف چل رہا ہو تو ناحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دکرو بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو، کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح امداد ہے تاکہ ظلم و جور سے اس کی دُنیا و آخرت تباہ نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انصر اخاک ظالماً او مظلوماً یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو، یہی اس کی مدد ہے۔

دراصل یہ آیت اوپر والی بات ہی کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے یعنی جس گروہ کو اللہ نے دُنیا میں نیکی اور تقویٰ قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتی سے مشتعل ہو کر خود اس طرح کی زیادتیاں کرنے لگے، وہ ایسا کرے تو اس کے معنی ہوتے کہ اس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور شریروں نے برائی کی جو رَو چلائی اس پر اس نے بھی چند روڑے رکھ دیے حالانکہ اس کا کام نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنا تھا۔

اللہ کی نافرمانی سے بچو

۱۳۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سنگین گرفت والا ہے۔ یعنی حق پرستی انصاف پسندی اور تمام عمدہ اخلاق کی جڑ خدا کا خوف ہے۔ اور اگر خدا سے ڈر کر نیکی سے تعاون نہ کیا گیا تو عام عذاب کا اندیشہ ہے[1]

لہٰذا تم کو چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو تاکہ تم کو اللہ کے فضل اور رضوان سے حصّہ ملے اور سخت عذاب سے محفوظ رہو۔ بِر یعنی نیکی سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور تقویٰ سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ جس نے دونوں باتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا اس نے سعادت مکمل کر لی۔ بِر نیکی فعل خیرات کا نام ہے اور تقویٰ و پرہیزگاری ترک منکرات کا نام ہے۔ جس میں یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں اس کی خوش نصیبی کے کیا کہنے،

آئیے ایک بار پوری آیت پر مجموعی نظر ڈال لیجئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اوپر والی آیت میں حالت احرام میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی کہ یہ چیز احرام کے تقدس اور اس کے درویشانہ مزاج کے خلاف نیز شعائر الٰہی میں سے ایک شعیرہ کی توہین ہے۔ اب اسی تعلق سے تمام شعائر الٰہی کے احترام کی پہلے بحیثیت مجموعی تاکید فرمائی۔ پھر چند مخصوص شعائر کا حوالہ دیا۔ پھر شعائر کی ممانعت سے متعلق یہ واضح فرمایا کہ اس کا تعلق صرف حالت احرام سے ہے احرام سے باہر ہو جانے کے بعد یہ ممانعت اٹھ جائے گی۔

پھر اس اشتعال انگیز سبب کا ذکر فرمایا جو اس وقت تازہ بتازہ موجود تھا۔ اندیشہ تھا کہ مسلمان اس سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی بات کر گزریں جو احترام شعائر کے منافی ہو۔ قریش نے ان کو بیت اللہ کی زیارت وطواف سے محروم رکھا تھا۔ یہ معاملہ نہایت صبر آزما تھا اور اب جبکہ مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت موجود تھی اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ اس عہد کے احترام میں ان سے کوئی بے اعتدالی صادر ہو جاتے۔ اسی صورت کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کو خاص طور پر متنبہ کیا جائے کہ دوسروں کی زیادتیاں بھی ان کے لیے کسی زیادتی کا جواز فراہم نہیں کر سکتیں: وہ دُنیا میں شعائر الٰہی کا احترام کرنے اور نیکی و تقویٰ کے علمبردار بن کر اٹھے ہیں۔ اس وجہ سے جب تک اپنے بچاؤ کی ضرورت مجبور نہ کرے ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نیکی اور تقویٰ کے خلاف اٹھائیں۔ اس کے بعد نکتہ کی بات یہ ارشاد فرمائی کہ دوسروں کے غلط رویے سے متاثر ہو کر انہی کی سی روش اختیار کر لینا درحقیقت ان کی برائی کی برائی بدی میں ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے اور یہ چیز اہل ایمان کے شایان شان نہیں ہے۔ اہل ایمان کے شایان شان بات یہ ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے کام میں تعاون کریں۔ دشمن کے ہاتھوں بھی کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں مزاحم ہونے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ آخر میں شدید العقاب کا حوالہ دینے سے مقصود مسلمانوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ عہد الٰہی کی حرمت سخت سے سخت حالات میں بھی قائم رکھنی ہے۔ اور یاد رکھو جس خدا نے تم کو اپنے عہد و میثاق سے دُنیا کی امامت کی سرفرازی بخشی ہے۔ اس کے ہاں نقض میثاق کی پاداش بھی بڑی سخت ہے۔

اس آیت سے حضرت مولانا اشرف علی کی یہ نکتہ آفرینی قابل داد ہے کہ حسن و قبح میں مقدمات کو مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے اور مشائخ اہل تربیت کے یہاں اسی قاعدے پر عمل ہے یہیں سے ان مجلسوں، انجمنوں اور اجتماعی زندگی کے شعبوں میں شرکت کا وجوب بھی مفہوم

رہا ہے جن کا مقصد اشاعت دین اور نصرت دین ہو اور جو انسانی حقوق کی حفاظت کو اپنا نصب العین بنا چکی ہوں اور ان اجتماعی کاموں اور اداروں میں شرکت کی حرمت بھی یہیں سے معلوم ہو رہی ہے جن سے بے دینی، بدعملی اور انسانی حقوق کی پامالی کی تائید ہوتی ہو۔

برو تقویٰ اور اثم وعدوان

جیسے لفظ تقویٰ فرائض کی ادائیگی کے لیے آتا ہے ایسے لفظ بر حقوق کی پاسداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے بر کی ضد اثم اور عقوق آتا ہے۔ برو اور بار اسی سے صفت کے صیغے آتے ہیں۔ برابوالدیہ۔ اس سعادت مند بیٹے کو کہتے ہیں جو اپنے والدین کا فرمانبردار ہو اور ان کے پورے پورے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے معنے میں صرف حقوق ہی داخل ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ یہ لفظ زیادہ حقوق میں استعمال ہوتا ہے اور فرائض میں کم۔ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے بچاؤ کے معنے میں ہو تو اس کی ضد فجور آتی ہے۔

انسان کا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں اور ریکھوں سے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے اور اس کی تباہی سے اس کی حفاظت کی جائے۔ برو تقویٰ کو بنیاد بنا کر تعمیر کی جائے اور اثم وعدوان پر مبنی تخریب سے بچا جائے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو گے جب تک دنیا میں برو تقویٰ کے معاون اور اثم وعدوان کے مخالف بن کر کھڑے نہ ہو گے۔ یہ آیت قرآنی مکارم اخلاق کے لیے رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ اسی لیے ایک ارشاد نبوت میں بر حسن اخلاق کو بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

نواس بن سمعان کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بر صرف اچھے اخلاق کا نام ہے جب کہ اثم وہ ہے جس کی تمہارے دل میں کھٹک ہو اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔

مسند احمد اور مسند دارمی میں حضرت وابصہ کے حوالے سے جو ارشاد نبوت آیا ہے اس میں بر اور اثم کی حقیقت کو اور زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے:

وابصہ کہتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ وابصہ تو بر اور اثم کے بارے میں پوچھنے آیا ہے، عرض کی جی ہاں۔

فرمایا کہ تو اپنے دل سے پوچھ، بر وہ ہے جس پر تیرا جی مطمئن ہو اور تیرا دل لگ جائے اور اثم وہ ہے کہ جس کی کھٹک تیرے جی میں ہے اگرچہ لوگ تجھے کتنے ہی فتوے دیں۔

یہ دونوں ارشاداتِ نبوت واشگاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ بر کا سر تا سر تعلق لوگوں کے حقوق سے ہے، انسانی حقوق جیسے اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ایسے ہی معاملات میں دیانت داماست سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک ارشادِ نبوت میں راست گفتار اور سچے کو بار فرمایا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالے سے یہ واقعہ ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ جنت کا عمل کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا جب بندہ سچ بولتا ہے تو بار یعنی نیکوکار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے حوالے سے یہ ارشادِ نبوت اس کی توضیح کرتا ہے کہ:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! راست گوئی کی عادت اختیار کرو کیونکہ راست گوئی بر نیکوکاری کی رہنما ہے اور نیکوکاری انسان کو جنت میں پہنچاتی ہے۔

ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی حقوق یعنی اخلاق و معاملات میں حسن کاری کا نام بر ہے۔ اگر اخلاق میں ہو تو اس کا متقابل فجور ہے اور معاملات میں ہو تو اس کا متقابل اثم ہے اور اگر اقارب میں ہو تو اس کا متقابل عقوق ہے۔ بہرحال جیسے خداوندی حقوق کی پاسداری کا نام تقویٰ ہے ایسے ہی انسانی حقوق کی ادائیگی کا نام بر ہے۔ اسی بنا پر سفر کی دعا میں دونوں کو مانگا ہے:

اللھم انا نسئلک فی سفرنا ھذا البر والتقوی۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ
اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ
وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ
أَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ
الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ
رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ
غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳﴾

مسلمانو! تم پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں۔ مُردار جانور، خونِ
سُور کا گوشت، وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر پکارا جائے، گلا گھونٹ
کر مرا ہو، وہ جو بلندی سے گر کر مر جائے، وہ جو کسی جانور کے
۱۴ سینگ مارنے سے مر جائے، وہ جسے درندہ پھاڑ کھا جائے۔

مگر ہاں وہ حرام نہیں جسے تم اس کے مرنے سے پہلے ذبح کرلو،[15] وہ جانور جو کسی تھان پر چڑھا کر ذبح کیا جاتا ہے[16]۔ اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تیروں کے پاسوں سے آپس میں تقسیم کرو، یہ گناہ کی بات[17] ہے۔ مسلمانو، جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی وہ آج تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں[18]۔ لہٰذا ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو[19]۔ آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے میں نے دینِ اسلام پسند کر لیا[20]۔ پس دیکھو جو کوئی بھوک سے بے بس ہو جائے یہ نہ ہو کہ دانستہ گناہ کرنا چاہے تو اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے[21]۔

محرمات کی تفصیل

اس آیت میں ان حرمتوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جن کا پہلی آیت میں الا ما یتلی علیکم کے الفاظ میں اجمالاً ذکر ہوا تھا۔ اس میں پہلے ان چیزوں کا ذکر ہوا جن کی حرمت پہلے ہی بیان ہو چکی

ہے۔ مزید تاکید اور تکمیل بحث کے طور پر ان کا یہاں بھی اعادہ کر دیا گیا۔ اس مقام پر یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کی جو قیود شریعت کی طرف سے عائد کی گئی ہیں، ان کی اصل بنیاد ان اشیاء کے طبی فوائد یا نقصانات نہیں بلکہ ان کے اخلاقی فوائد و نقصانات ہیں۔ جہاں تک مادی اور طبعی امور کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی اپنی سعی و جستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادی اشیاء میں کیا چیزیں اس کے جسم کو غذائے صالح بہم پہنچاتی ہیں اور کیا چیزیں تغذیہ کے لیے غیر مفید یا نقصان دہ ہیں۔ شریعت ان امور میں اس کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر یہ کام اس نے اپنے ذمہ لیا ہوتا تو سب سے پہلے سنکھیا کو حرام کیا ہوتا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن و سنت میں اس کا یا ان دوسرے مفردات و مرکبات کا جو انسان کے لیے ہلاک ہیں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ شریعت غذا کے معاملہ میں جس چیز پر روشنی ڈالتی ہے دراصل اس کا یہ پہلو ہے کہ کس غذا کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر ہوتا ہے اور کون سی غذائیں طہارتِ نفس کے لحاظ سے کیسی ہیں اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں سے کون سے طریقے اعتقادی نقطہ نظر کی حیثیت سے صحیح یا غلط ہیں۔ چونکہ اس کی تحقیق کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے اور اسے دریافت کرنے کے ذرائع انسان کو میسر ہی نہیں ہیں اور اسی بنا پر انسان نے اکثر امور میں غلطیاں کی ہیں۔ اس لیے شریعت صرف انہی امور میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جن چیزوں کو اس نے حرام حرام کیا ہے۔ انہیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا برا اثر پڑتا ہے یا وہ طہارت کے خلاف ہیں۔ یا ان کا تعلق کسی فاسد عقیدے سے ہے برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان برائیوں میں سے کوئی برائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے ہم کو ان اشیاء کی حرمت کی وجوہ کیوں نہ سمجھاتے تاکہ ہمیں بصیرت حاصل ہو جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان وجوہ کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے مثلاً یہ کہ خون یا سور کے گوشت یا مردار کے کھانے سے ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رونما ہوتی ہیں کس طرح اور کس قدر ہوتی ہیں۔ اس کی تحقیق ہم کسی طرح نہیں کر سکتے کیونکہ اخلاق کو ناپنے اور تولنے کے ذرائع ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بالفرض ان کے برے اثرات کو بیان بھی کر دیا جائے تو شبہ کرنے والا تقریباً اسی مقام پر ہوتا جس مقام پر وہ اب ہے، کیونکہ وہ اس بیان کو صحت اور عدم صحت کو آخر کس چیز سے ناپتا۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے حلال و حرام کی حدود کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے جو شخص اس باب پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب اللہ کی کتاب ہے اور رسول اللہ کا رسول ہے

اور اللہ علیم و خبیر ہے وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرے گا خواہ ان کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو، اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جن چیزوں کی خرابیاں انسانی علم کے احاطہ میں آگئی ہیں صرف انہی سے پرہیز کرے اور جن کی خرابیوں کا علمی احاطہ نہیں ہوا ہے ان کے نقصانات کا تختۂ مشق بنتا ہے۔

۱۴۔ مسلمانو! تم پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں، مردار جانور، اس آیت سے جن چیزوں کا کھانا حرام ہوا، ان میں اول میتہ مردار جانور ہے۔ جو واجب الذبح جانور ذبح کیے بغیر خود اپنی موت سے مر جاتے، اس کا خون اور حرارت غریزیہ گوشت ہی میں محتقن اور جذب ہو کر رہ جاتی ہے جس کی میت اور گندگی سے کئی قسم کے بدنی اور دینی نقصانات لگ جاتے ہیں (ابن کثیر) شاید اسی تعلیل پر متنبہ فرمانے کے لیے میتہ کے بعد دم خون کی حرمت مذکور ہوئی۔ اس کے بعد حیوانات کی ایک خاص نوع یعنی خنزیر کا ذکر کیا جس کی بے انتہا نجاست خوری اور بے حیائی مشہور عام ہے شاید اسی لیے شریعت حقہ نے دم خون کی طرح اس کو نجس العین قرار دیا۔ ان تین چیزوں کے ذکر کے بعد جن کی ذات ہی مادی گندگی اور خباثت پائی جاتی تھی۔ محرمات کی ایک اور قسم کا ذکر کیا یعنی جو جانور اپنی ذات کے اعتبار سے حلال و طیب ہے مگر مالک حقیقی کے سوا کسی اور کی نیاز کے طور پر نامزد کر دیا گیا ہو۔ اس کا کھانا بھی میت کی خباثت اور عقیدے کی گندگی کی بنا پر حرام ہے کسی اندار کی جان صرف اسی مالک حقیقی و خالق کے حکم اور نام پر لے جا سکتی ہے جس کے حکم اور ارادے سے اس پر موت و حیات طاری ہو سکتی ہے۔ باقی منخنقہ وغیرہ غیر مذبوح جانور سب میتہ کے حکم میں داخل ہیں جیسا کہ ما ذبح علی النصب، ما اھل لغیر اللہ کے ساتھ ملحق ہے جاہلیت میں ان سب چیزوں کے کھانے کی عادت تھی۔ اسی لیے اس قدر تفصیل سے ان کا ذکر کیا۔

میتہ، دم، لحم خنزیر اور ما اھل بہ لغیر اللہ کا ذکر دوسری جلد میں ہو چکا ہے۔ منخنقہ اس جانور کو کہتے ہیں جو گلا گھونٹ کر مر جاتے۔ موقوذہ جو چوٹ سے مر جاتے، مثلاً کسی ٹرک کے نیچے آ کر مر گیا۔ متردیہ جو اوپر سے نیچے گر کر مر جاتے۔ نطیحہ جو کسی جانور کے سینگ سے مر جاتے ما اکل السبع جس کو کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔

مذکورہ بالا پانچوں چیزوں کا ذکر در حقیقت میتہ کی تفصیل کے طور پر ہوا ہے اور اس تفصیل

لمعۂ افادات شیخ الاسلام

سے گویا اس حکم کی تکمیل فرمائی ہے جو تقرواولا اس آگے پہلے انعام میں بیان ہو چکا ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ایک مردار میں جو طبعی موت سے مرا ہو اور اس جانور میں جو کسی چوٹ یا حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا ہو کچھ فرق ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ شبہ اس زمانے میں بھی کچھ کی زبانوں پر آتا ہے بلکہ بہت سے لوگ اسی کو بہانہ بنا کر گردن مروڑی ہوئی مرغی بھی جائز بتاتے ہیں۔ قرآن کی اس تفصیل نے اس شبہ کو صاف کر دیا۔

موقوذہ کے بارے میں یہ بات ضرور پیش نظر رہے کہ موقوذہ وہ جانور ہے جو ضرب شدید کے ذریعے ہلاک ہوا ہو جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کر ڈالے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوذہ میں ہی داخل ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات معراض تیر سے شکار کرتا ہوں اگر شکار اس سے مر جائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور تیر کے عرض کی چوٹ سے مرا ہے تو وہ موقوذہ کے حکم میں داخل ہے اس کو مت کھا اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت الجصاص نے احکام القرآن میں نقل کی ہے اس میں شرط یہ ہے کہ تیر پھینکتے وقت بسم اللہ کہہ کر پھینکا ہو۔

جو شکار بندوق کی گولی سے ہلاک ہو گیا ہو اس کو بھی فقہائے نے موقوذہ میں داخل کیا ہے ابوبکر الجصاص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں المقتولة بالبندقة تلك الموقوذة یعنی بندوق کے ذریعے جو جانور قتل کیا گیا ہو وہی موقوذہ ہے اس لیے حرام ہے امام اعظم امام شافعی اور امام مالک وغیرہ سب اس پر متفق ہیں۔ (قرطبی)

ذبح اور ذکاۃ کی اسلامی اصطلاح

۱۵۔ مگر ہاں وہ حرام نہیں ہے جسے تم اس کے مرنے سے پہلے ذبح کر لو۔ اصل ارشاد میں ذکیتم آیا ہے۔ ذکاۃ سے ہے جو اصل میں آگ کے جلنے پر بولا جاتا ہے۔ ذکیت الشاۃ کے معنے ہیں میں نے بکری کو ذبح کیا۔ گویا حرارت غریزی کے اخراج کا نام تذکیہ ہے یعنی خون کے نکل جانے کا اس لیے شریعت میں جانور کو ذبح کر کے مارنے پر بولا گیا ہے۔ لفظ تذکیہ لا کر بتا دیا کہ اصل ذبح خون نکالنا ہے اس لیے بجائے ذبح کے تذکیہ کا لفظ اختیار کیا کیونکہ خون میں بہت قسم کی زہریں ہوتی ہیں۔ اور تذکیہ اسی جانور کا ہو سکتا ہے جس میں زندگی باقی ہو۔

یعنی کچھ حرارت غریزی موجود ہو اس لیے یہی لفظ زیادہ موزوں تھا۔
مطلب یہ ہے کہ جو جانور مذکورہ بالا حوادث میں سے کسی حادثہ کا شکار ہو جانے کے باوجود مرا نہ ہو بلکہ کچھ آثار زندگی اس میں پائے جاتے ہوں اس کو اگر ذبح کر لیا جائے تو کھایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حلال جانور کا گوشت صرف ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس کو ہلاک کرنے کا صحیح نہیں ہے۔ یہ ذبح اور ذکاۃ اسلام کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ ان سے مراد حلق کا اتنا حصہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے۔ جھٹکا کرنے یا گلا گھونٹنے یا کسی اور تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خون کا بیشتر حصہ جسم کے اندر ہی رک جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، برعکس اس کے ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کے ساتھ جسم کا تعلق دیر تک قائم رہتا ہے جس کی وجہ سے رگ رگ کا خون کھینچ کر باہر آجاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت خون سے صاف ہو جاتا ہے۔ خون کے متعلق ابھی یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ حرام ہے لہٰذا گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خون اس سے جدا ہو جائے۔ ذبح کا یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہے اس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے۔ یہ استثناء منخنقہ اور اس کے مابعد سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا۔ زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔

تھانوں پر بھینٹ

۱۶۔ اور وہ جانور جو کسی تھان پر چڑھا کر ذبح کیا جائے۔ تھوڑا سا پہلے ہدی کے ادب و احترام کا ذکر تھا یعنی وہ جانور جو تقرب الی اللہ کی غرض سے خدائے واحد کی سب سے پہلی عبادت گاہ کی نیاز کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل اس جانور کا بیان فرمایا جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام پر یا خانہ خدا کے سوا کسی دوسرے مکان کی تعظیم کے لیے ذبح کیا جائے۔
(موضح القرآن) اس دوسری صورت میں بھی فی الحقیقت نیت نذر غیر اللہ ہی کی ہوتی ہے گو ذبح کے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہا جائے۔ اس تقریر کے موافق ما اھل بہ

ۓ تفہیم القرآن

لغیر اللہ اور ماذبح علی النصب کا فرق واضح ہو گیا۔ (ابن کثیر)[1]

امام راغب فرماتے ہیں کہ نصب ان پتھروں کو کہتے ہیں جن کو مشرکین عرب غیر اللہ کی عبادت کے لیے نصب کرتے تھے اور جانوروں کو وہاں لے جا کر وہاں ذبح کرتے تھے الی نصب یوفضون قرآن میں آیا ہے۔

نصب اور صنم میں فرق یہ ہے کہ نصب ان پتھروں کو کہتے ہیں جو کسی دیوتا یا دیوی کے نام پر لگایا گیا ہو خواہ تصویر ہو یا نہ ہو اور صنم وہ تصویری پتھر ہے جس پر کسی دیوتا یا دیوی کی تصویر ہو خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ پتھر گاڑے گئے ہوئے تھے جن کو مشرکین اپنے دیوتاؤں کا استھان سمجھ کر ان کے پاس آکر قربانیاں کیا کرتے تھے اور کچھ خون بھی ان پر چھڑک دیتے تھے اور ان پتھروں کو بدلتے ہی رہتے تھے۔ ایک پتھر کے بجائے دوسرا اچھا پتھر رکھ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی نجس اور حرام قرار دیا اور ان قربانیوں کے کھانے کی ممانعت کی جو ان استھانوں پر لے جا کر کی جائیں کیونکہ یہ صورت بھی فی الواقع نذر غیر اللہ کی ایک خاص صورت ہے اگرچہ ذبح کے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ دیا جائے۔ کیونکہ اصل مقصود اس ذبح سے غیر اللہ کی تعظیم اور تقرب ہے جو شرک ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بھی حرام قرار دیا کیونکہ حرمت کا دارومدار مشرکانہ اعتقاد پر ہے جس کا ظہور کبھی گفتار سے ہوتا ہے اور کبھی کردار سے۔ یعنی ایسے مقام پر ذبح کرنے سے جو غیر اللہ کے نام پر بنے ہوئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ذبیحہ کا کھانا حرام قرار دیا۔[2]

دراصل نصب تھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں اور جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اس قسم کے ذبیحے حرام قرار دیئے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ ان کے اندر حرمت محض بارادہ تقرب و خوشنودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے اس سے بحث نہیں کہ ان پر نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا، اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے ان کو حرمت لاحق ہوتی تو ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اوپر ما اھل لغیر اللہ کا ذکر ہو چکا ہے وہ کافی تھا۔ ہمارے نزدیک اسی حکم میں وہ قربانیاں بھی داخل ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحب مزار اور صاحب قبر کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ا

خوشنودی مدِ نظر ہوتی ہے۔ ذبح کے وقت نام چاہے اللہ کا لیا جائے یا صاحب قبر و مزار کا۔ ان کی حرمت میں نام کو نہیں بلکہ مقام کو دخل ہے لہ

نُصب ان تمام جگہوں اور مقامات کو کہتے ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو، خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔ لہ

استقسام بالازلام

۱۷۔ اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تیروں کے پانسوں سے آپس میں تقسیم کرو، یہ گناہ کی بات ہے۔ بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیر مراد لیے جو زمانہ جاہلیت میں لحم ذبیحہ وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک صورت قمار اور جوئے کی تھی جیسے آج کل چٹھی ڈالنے کی رسم ہے لیکن حافظ ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال و تردد کے وقت اپنی مرادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر اَمَرَنِی رَبِّی لکھا تھا (میرے پروردگار نے حکم دیا) کسی پر نَہَانِی رَبِّی تحریر تھا (میرے پروردگار نے منع کر دیا)۔ اس طرح ہر تیر پر یوں ہی اٹکل پچو باتیں لکھ چھوڑی تھیں۔ جب کسی کام میں تذبذب ہوا تو تیر نکال دیکھ لیتے۔ اگر امرنی ربی والا تیر نکل آیا تو کام شروع کر دیا اور اگر اس کے خلاف نکلا تو ترک کر دیتے۔ علیٰ ہذا القیاس گویا بتوں سے یہ ایک قسم کا مشورہ اور استعانت تھی۔ چونکہ اس رسم کا مبنیٰ خالص جہل، شرک اوہام پرستی اور افتراء علی اللہ تھا اس لیے قرآن حکیم نے متعدد مواقع میں نہایت تغلیظ و تشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرما دیا۔ اس تقریر کے موافق ازلام کا ذکر نصب کی مناسبت سے ہوا، اور مردار، خنزیر وغیرہ نہایت خبیث اور گندی چیزوں کی حرمت کے سلسلے میں منسلک کر کے بتلا دیا کہ اس کی معنوی اور اعتقادی نجاست و خباثت ان چیزوں سے کم نہیں ہے جیسا کہ دوسری آیت میں رجس

لہ تدبر قرآن لہ تفہیم القرآن

کے اطلاق سے ظاہر ہوتا ہے۔[1]

اصل میں، استقسام کے معنے حصہ، قسمت یا تقدیر معلوم کرنے کے ہیں۔ ازلام جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ اپنے خیال کے مطابق غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے، اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے تھے۔ علماء نے یہاں پہلی صورت کو ترجیح دی ہے یعنی تیروں کے ذریعے فال وغیرہ نکالتے اور جو حکم نکل آیا اس پر عمل کرتے۔ خود صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ایک روایت اسی مضمون کی آئی ہے کہ:

> استقسام یہ ہے کہ تیروں سے فال گیری کی جاتے۔ اگر ممانعت نکل آتے تو رک جاتے اور اگر حکم ہوتا تو عمل کرتے اور تیروں پر نشانیاں لگا رکھی تھیں ان سے ہی قسمت معلوم کرلیتے۔

صحابہ، تابعین اور اکثر مفسرین سے یہی منقول ہے۔ عبداللہ بن عباس سے حافظ ابن جریر نے نقل کیا کہ مقصد قسمت معلوم کرنے والے تیر ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے امام مجاہد، ابراہیم نخعی، الحسن البصری اور مقاتل بن حیان سے یہی معنے نقل کیے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں:

> تیروں کے ذریعے قسمت معلوم کرنا یہ ہے کہ تیروں کے ذریعے خیر و شر کا فیصلہ کیا جاتے۔ یہی جمہور کا مختار ہے۔

امام مجاہد نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ قرعہ اندازی، فال گیری اور وہم پرستی کی یہ شکل اہل عرب ہی میں رائج نہ تھی بلکہ ایران اور روم کی بڑی مہذب قومیں بھی اس میں مبتلا تھیں۔

دراصل استقسام بالازلام کے ذریعے جس چیز کو حرام قرار دیا گیا اس کی تین بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، اور آیت کا حکم ان تینوں پر حاوی ہے۔

۱۔ مشرکانہ فال گیری جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکین مکہ نے اس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوتے تھے۔ جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کرنے نہ کرنے کا سوال ہو یا گم شدہ چیز کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پتہ پوچھنا ہو یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو اس کے لیے ہبل کے پانسہ دار کے پاس پہنچ جاتے۔ اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملہ کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ دار ان تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ توہم پرستانہ فال گیری، جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی و خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کیا جاتا ہے جن کا وسیلہ علم غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل، نجوم، جفر مختلف قسم کے شگون اور نچھتر اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس قسم میں داخل ہیں۔

۳۔ جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے۔ لہٰذا ہزارہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمّہ کے بہت سے حل صحیح ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا جو صاحبِ معمّہ کے صندوق میں بند ہے۔

ان تینوں قسموں کو حرام قرار دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں برابر کے دو کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار کیا جاسکتا ہے۔ یا مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دو کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جاسکتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار کرتے تھے جبکہ وہ برابر کے حقداروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آتی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔ [1]

---

[1] تفہیم القرآن

آخر میں فرمایا ہے ذالکم فسق یعنی یہ سب اللہ کے مقرر کیے ہوتے دین قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ ذالکم کا اشارہ ممکن ہے استقسام بالازلام تک محدود ہو لیکن زیادہ قابل پذیرائی یہی ہے کہ ان سب چیزوں کی طرف ہے جن کی ممانعت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ رازی اور قرطبی نے اسی کو راجح بتایا ہے۔ اور ذالک اشارہ بعید یہاں ان کاموں کے بعد منزلت کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ یعنی یہ کام برائی میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ فسق کا لفظ یہاں عام قانونی معنے میں نہیں ہے بلکہ قرآنی مفہوم میں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کھلی بدی، نافرمانی، سرکشی، کفر و شرک سب کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ ابلیس کے بارے میں ہے ففسق عن امر ربہ۔ دراصل یہ لفظ یہاں تقویٰ کے مقابلے پر آیا ہے۔ پچھلی آیت کو واتقوا اللہ پر ختم فرمایا تھا اور اس کو ذالکم فسق پر ختم کیا۔ جس طرح حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ نفس کی خواہشوں کی طرف ذوق و رغبت کی آزادیوں پر بھی احکام الٰہی کا پورا پورا کنٹرول ہو ایسے ہی حقیقی فسق یہ ہے کہ احکام الٰہی کی پابندیوں سے الگ ہو کر انسان میں فکری اور اخلاقی آوارگی آ جائے۔ تقویٰ اور فسق کا یہ تصور عام ذہنوں کو بڑا عجیب معلوم ہوگا مگر یہی مجوزہ پن دراصل دین حق کا وہ خاص وصف ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ جانوروں کے حلال و حرام ہونے کے احکام میں فسق کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ اسلام سے پہلے کھانے پینے میں مذہبی اعتقادات درجہ سخت اور تنگ تھے یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے بیجا قیدیں ہٹا دیں اور وہم پرستی کے عنصر سے دین کو پاک کر دیا۔

کفر سے معاشرتی انقطاع

۳ - مسلمانو! جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے وہ آج تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور علوم ہدایت کے ہر باب کے متعلق اصول و قواعد اس طرح ہموار ہو چکے تھے اور فروع و جزئیات کا بیان بھی اتنی کافی تفصیل اور جامعیت سے کیا جا چکا تھا کہ پیروان اسلام کے لیے قیامت تک قانون الٰہی کے سوا کوئی قانون قابل التفات نہیں رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے ہزاروں سے متجاوز خدا پرست، جانباز اور سرفروش ہادیوں اور معلموں کی ایسی عظیم الشان جماعت تیار ہو چکی تھی جس کو قرآنی تعلیم کا مجسم نمونہ کہا جا سکتا تھا، مکہ فتح ہو چکا تھا صحابہ کرام کامل وفاداری کے ساتھ خدا سے عہد و پیمان پورے کر رہے تھے۔ نہایت گندی غذائیں اور

مردار کھانے والی قوم مادی اور روحانی طیبات کے ذائقہ سے لذت اندوز ہو رہی تھی۔ شعائر اللہ کا ادب اور احترام قلوب میں راسخ ہو چکا تھا۔ ظنون واوہام اور انصاب وازلام کا تارپود بکھر چکا تھا شیطان جزیرۃ العرب کی جانب سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا گیا تھا کہ دوبارہ وہاں اس کی پرستش ہو سکے۔ ان حالات میں ارشاد ہوا الیوم یئس الذین کفروا من دینکم یعنی آج کفار اس بات سے مایوس ہو گئے کہ تم کو تمہارے دین سے ہٹا کر پھر انصاب وازلام وغیرہ کی طرف لے جائیں یا دین اسلام کو مغلوب کرنے کی توقعات باندھیں یا احکام دینیہ میں کسی قسم کی تحریف و تبدیلی کی امید قائم کر سکیں۔[1]

کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے یعنی تمہارا دین ایک مستقل نظام بن چکا ہے اور خود اپنی حاکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ و قائم ہے۔ کفار جو اب تک اس کے قیام میں مانع ہے ہیں اب اس طرف سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اسے مٹا سکیں گے اور تمہیں پھر پچھلی جاہلیت کی طرف واپس لے جا سکیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو وہ اس طمع خام میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ دین اسلام کو یا مغلوب کر لیں گے یا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیں گے کہ دونوں کا نباہ ہو سکے لیکن اب ان کی اس طمع خام کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب انہوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا ہے کہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے اس طرح الگ الگ ہو گئی ہیں کہ اب ان کا کسی نقطہ اتصال پر جمع ہونا بالکل ناممکن ہے۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے اشتراک کو معاشرتی ارتباط میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر صورت حال یہ پیدا ہو جائے کہ ایک کے یہاں جو چیزیں حلال و طیب ہوں دوسرے کے یہاں وہ حرام اور خبیث قرار دے دی جائیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں میں مکمل معاشرتی انقطاع کا اعلان ہو گیا۔ اب ان دونوں کے مل بیٹھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ قدرتی طور پر اس چیز نے ان کو اسلام اور مسلمانوں سے آخری درجہ میں مایوس کر دیا۔ آخری مایوسی سے بعض مرتبہ آخری جھلاہٹ بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ مریض کا آخری سنبھالا ہوتی ہے جس کے بعد آخری ہچکی کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔

میرے سوا کسی سے نہ ڈرو

۱۹- لہٰذا ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو۔ یعنی آج تمہیں کامل و مکمل دین مل چکا ہے جس

[1] افادات شیخ الاسلام

میں کسی ترمیم کا آئندہ امکان نہیں ہے۔ خدا کا انعام تم پر پورا ہو چکا ہے جس کے بعد تمہاری جانب سے اس کے ضائع کر دینے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ خدا نے ابدی طور پر اسی دین اسلام کو تمہارے لیے پسند کیا ہے اس لیے اب کسی ناسخ کے آنے کا بھی احتمال نہیں ہے۔ ایسے حالات میں تم کو کفار سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ البتہ اس محسن جلیل اور منعم حقیقی کی ناراضگی سے ہمیشہ ڈرتے رہو جس کے ہاتھ میں تمہاری ساری نجاح و فلاح اور کل سود و زیاں ہے۔ گویا فلا تخشوهم واخشونی میں اس پر تنبیہ فرما دیا کہ آئندہ مسلم قوم کو کفار سے اس وقت تک کوئی اندیشہ نہیں جب تک ان میں خشیت الٰہی اور تقویٰ کی شان موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس دین کے احکام اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں اب کسی کافر طاقت کے غلبہ و قہر اور دراندازی و مزاحمت کا خطرہ تمہارے لیے باقی نہیں رہا ہے۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی ہے۔ اب تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوئی کوتاہی تم نے کی تو تمہارے پاس ایسا کوئی عذر نہ ہوگا جس کی بنا پر تمہارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جائے اب شریعت کی خلاف ورزی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ تم دوسروں کے اثر سے مجبور ہو بلکہ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ تم خدا کی اطاعت کرنا چاہتے ہو نہیں یہ گویا وعدہ الٰہی ہے کہ اب تشویش کی چیز کفار کا غلبہ نہیں بلکہ احکام شریعت سے تجاوز اور ان سے روگردانی ہے۔ یہی چیز اہل ایمان کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور ان کے ملی وجود کے لیے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ خشیت الٰہی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کمی اہل ایمان میں ضعف پیدا کر سکتی ہے نہ کہ اہل کفر کی کوئی خارجی قوت۔

ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دوبارہ غلبہ کا اندیشہ مت کرو۔ ہاں احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور حدود اللہ کے توڑنے سے بچو اور اس سے ڈرو یعنی اگر تم کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس وجہ سے پہنچے گا کہ تم اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے اور اگر تم اپنے عہد پر مضبوط رہو تو کفر کا خوف مت کرو۔ اس میں دین اسلام کے کمال غلبہ اور اسلامی حکومت کے دنیا میں پھیل جانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دنیا میں تمہارا اس قدر غلبہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو برباد نہ کر سکے گی، لیکن اگر تم احکام الٰہی کی پیروی نہ کرو گے تو یہ تمہارا تغافل تمہیں اس مقام رفیع سے گرا دے گا۔

لہ افادات شیخ الاسلام لہ تفہیم القرآن

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کا ڈر جس کا قرآن باربار ذکر کرتا ہے۔ امام راغب نے اس خشیت کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے مراد وہ خوف ہے جس میں تعظیم کی آمیزش ہو یعنی اس کی عزت اور محبت دل میں ہو۔ ظاہر ہے کہ محبوب چیز کا خوف یہ نہیں ہوتا کہ انسان اس سے بھاگتا ہے بلکہ خوف واقعی یہ ہے کہ کوئی بات نہ پیدا ہو جائے کہ انسان اپنے محبوب سے دور ہو جائے یا کوئی امر اس کی ناراضگی کا انسان سے سرزد ہو جائے۔ لہٰذا خشیت اللہ کے معنے یہی ہیں کہ حدود اللہ کو توڑنے کا خوف ہو۔ اسی لیے قرآن میں خشیت اللہ کی نسبت علماء کی طرف کی ہے کیونکہ وہ حدودِ الٰہی کا علم رکھتے ہیں اور صفاتِ الٰہی سے واقف ہوتے ہیں اور حدود اللہ کو توڑنے کی جرأت نہیں کرتے اور اپنے عہد و میثاق پر قائم رہتے ہیں۔

تکمیلِ دین کا اعلان

۲۰ - آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے میں نے دینِ اسلام پسند کر لیا۔ یعنی اس کے اخبار و قصص میں پوری سچائی، بیان میں پوری تاثیر اور قوانین و احکام میں پورا توسط و اعتدال موجود ہے جو حقائق کتبِ سابقہ اور دوسرے ادیانِ سماویہ میں محدود و ناتمام تھیں۔ ان کی تکمیل و تتمیم اس دینِ قیم سے کر دی گئی ہے۔ قرآن و سنّت نے حلت و حرمت وغیرہ سے متعلق تنصیصاً یا تعلیلاً جو احکام دیے ان کا اظہار و ایضاح تو ہمیشہ ہوتا رہے گا لیکن اضافہ و ترمیم کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاء جیسا نبی تم کو مرحمت فرمایا۔ مزید برآں اطاعت و استقامت کی توفیق بخشی۔ روحانی غذاؤں اور دنیوی نعمتوں کا دسترخوان تمہارے لیے بچھا دیا۔ حفاظتِ قرآن، غلبۂ اسلام اور اصلاحِ عالم کے سامان مہیا کر دیے لہٰذا اس کامل عالمگیر اور مکمل دین کے بعد اب کسی اور دین کا انتظار کرنا سفاہت ہے اسلام جو تفویض و تسلیم کا مرادف ہے اس کے سوا مقبولیت اور نجات کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

اس آیت الیوم اکملت لکم دینکم کا نازل فرمانا بھی من جملہ نعماتِ عظیم ایک نعمت ہے۔ اسی لیے بعض یہود نے حضرت عمر سے عرض کیا کہ امیر المومنین اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید منایا کرتے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ جس روز

یہ ہم پر نازل کی گئی مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ آیت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفہ کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی جبکہ میدان عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد اتقیاء و ابرار کا مجمع کثیر تھا۔ اس کے بعد صرف ۸۱ روز حضور اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔

اس آیت میں تکمیل دین کا اعلان ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل کی گئی تھی کہ ان کی نسل میں امت مسلمہ پیدا ہو جائے۔ پھر آیت ۱۵۰ دوسری جلد میں فرمایا تھا کہ خدا چاہتا ہے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کر دے لاتم نعمتی علیکم یہاں فرمایا کہ آج کے دن خدا نے تمہارا دین کامل کر دیا اور خدا نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور امت مسلمہ اپنے تمام مقاصد و خصائص کے ساتھ ظہور میں آگئی اور اللہ نے تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ یہاں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

اول یہ کہ تمہارا دین کامل کر دیا

دوسرے یہ کہ اپنی نعمت تم پر پوری کر دی

تیسرے یہ کہ اسلام کو بطور دین اللہ نے تمہارے لیے پسند کر لیا۔

دین کو کامل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظام فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتا ہے اس کی ہدایت سامنے موجود پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوتے ہے۔ کچھ اسی طرح جس طرح ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوتے ہے۔

ہم یہاں اس نظام کے اہم اجزا کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں تاکہ ایک طرف تو اس دعوے کا مکمل ثبوت بھی سامنے آ جائے، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دین ہے کیا! لیکن قبل اس کے کہ کامل دین کا تعارف کرایا جائے دو تین اصولی باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین

لہ افادات شیخ الاسلام

کرلینا چاہیے۔

اول یہ کہ اس دین کا ہر جزو ایک ہی مرکز سے وابستہ ہے ایک ہی رُوح ہے جو ان سب کے اندر دوڑ رہی ہے یہ مرکز اور یہ رُوح وہی افکار و عقائد ہیں جن کو قرآن ایمانیات کہتا ہے اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا تنہا معبود اصلی حاکم اور حقیقی قانون ساز ہے دراصل یہی بنیادی وہ جڑ ہے جس سے بالکل فطری انداز میں اس دُنیا کا پورا نظام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس دین کی کارفرمائی ایک ایسے معاشرے کے وجود پر موقوف ہے جو مسلم ہو جسے اللہ اور اس کی صفات پر گہرا یقین ہو جو آخرت پر سچا یقین رکھتا ہو اور جو محمد رسول اللہ کو دل سے اللہ کا نبی اور آخری نبی تسلیم کرتا ہو اس لیے اس دین کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ایک ایسے ہی معاشرے کے ساتھ وابستہ کرکے دیکھا جائے۔ لکم سے اسی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس نظام کے مختلف حصے آپس میں مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جس طرح مشین کے مختلف پرزے باہم جڑے ہوتے ہیں اس لیے نظری طور پر سمجھنے کے لیے تو انہیں الگ الگ قانون میں تقسیم کیا جاسکتا ہے مگر عملی طور پر ان کا علیحدہ علیحدہ وجود قریب قریب ناممکن ہے اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ سارے اجزاء دراصل ایک وحدت میں ان میں کوئی جزو اپنا عمل جوہر اسی وقت دکھا سکتا ہے جب یہ پورا دین کمل کا کل حرکت میں ہو جیسا کہ دینکم کی اضافت اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ان اصولی باتوں کو ذہن نشین کرلینے کے بعد آئیے اب کامل دین کا اجمالی مطالعہ کریں، اسلام صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں یعنی یہ اس طرح کا دین نہیں کہ بندے اور خدا کے درمیان کا بس ایک نجی معاملہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات لازماً انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہوتیں۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا۔ نماز روزے کا حکم دیتا۔ چند اخلاقیات کی تلقین کردیتا کچھ معاشرتی ہدایتیں دے دیتا اور پھر خاموش ہو رہتا۔ مگر قرآن و سنت کا صفحہ صفحہ گواہی دے رہا ہے کہ صورتِ واقعہ یہ نہیں ہے اسلام کی مسندِ ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں میں ہی بچھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں، کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں میں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایتیں دیتا۔ کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا امر کرتا نظر آتا ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی

ایسی نہیں جس کو وہ دین نہ کہتا ہو۔ مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو سو کوڑے مارو۔ اس کا یہ حکم صریحاً طور پر ایک ایسا حکم ہے جس کا تعلق پولیس اور عدالت سے ہے۔ اور اس لیے وہ پوری طرح اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے لیکن اس کے باوجود اس کی حیثیت وہ خود دین اللہ کی قرار دیتا ہے۔ ولا تاخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ۔

اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ سال کے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ ان میں جنگ کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن کی یہ ہدایت واضح طور پر جنگی قوانین سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ اجتماعی زندگی کے بالکل آخری مسائل میں سے ہے لیکن قرآن اسے بھی دین قیم قرار دیتا ہے ذالک الدین القیم۔

یہ چند مثالیں اس حقیقت کو کھول دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے۔

دین کے کامل کر دینے کا یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے تمام دینوں کو جو آدم تا عیسیٰ علیہم السلام چلے آ رہے تھے ان کو ناقص کہا جاتے اور یہ سمجھا جائے کہ وہ جن لوگوں کی ہدایت کے لیے آئے تھے ان کی ہدایت کا ان کے اندر پورا سامان نہیں تھا۔ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہوگا اس کے برخلاف حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان ادیان میں سے جو دین بھی آیا وہ اس قوم، اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح کے لیے بالکل کافی تھا جس کے لیے اسے نازل کرنے والے نے نازل کیا تھا۔ لیکن چونکہ ان میں کا ہر دین صرف ایک قوم کے لیے تھا۔ تمام انسانوں کے لیے نہ تھا۔ صرف ایک محدود علاقے کے لیے تھا پوری دنیا کے لیے نہ تھا صرف ایک خاص زمانے اور محدود مدت کے لیے تھا۔ ہمیشہ کے لیے نہ تھا اس لیے قدرتی طور پر اس میں نہ عالمی معاملات و مسائل کے بارے میں ہدایتیں ہوتی تھیں۔ نہ اس کی ساری تعلیمات کا مزاج بین الانسانی ہوتا تھا نہ وہ دور مستقبل کے مسائل کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتا تھا۔ غرض جس طرح اس کی مخاطبت کا دائرہ محدود تھا۔ اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ایسا دین روانہ کیا جائے جو سب کے لیے ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الاقوامی ہو۔ اور اس کی تعلیمات ہر زمانے ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں۔ قرآن حکیم کی یہ گرامی قدر آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

کی جو ہدایت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اترنی شروع ہوئی تھی اور جو نوع انسانی کے ذہنی اور تمدنی ارتقاء کے ساتھ تفصیل اور وسعت کا رنگ اختیار کرتی چلی آرہی تھی۔ وہ آج ہر پہلو سے کمال کے درجے کو پہنچ گئی ہے اور اب ایک مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس میں روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور قانونی نظام کامل اور مکمل ہے۔

اکمالِ دین کے فطری تقاضے

دوسرے دینوں کے مقابلے میں اسلام کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھیے اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ اکمال دین کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ کہ اس امتیاز کے باوجود اس نبوت کا بھی مرتبہ و مقام ہر پہلو سے ٹھیک وہی ہوگا جو دوسری نبوتوں کا ہے اور کیا اسلام کا حق بھی ویسا ہوگا جیسا کہ دوسرے دینوں کا ہے۔ اس سوال کے جواب میں عقل و انصاف اور قرآن و حدیث ہر ایک کا فیصلہ صاف نفی میں ہے۔ ان کے نزدیک اکمالِ دین کے فطری تقاضے لازماً بالکل دوسرے ہوں گے۔

۱۔ اکمال دین کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا تو یہ ہے کہ دوسرے تمام ادیان منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے کیونکہ جب دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔ یہ ایک مسلمہ اصولی حقیقت ہے کہ

مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہ مسلمہ اصولی حقیقت محض بے معنی الفاظ نہ رہ جائے گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی اس اصول کا اسی طرح اطلاق نہ ہو جس طرح کہ دوسرے تمام انبیاء کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کا سارے انسانوں کی طرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اور دین کامل لے کر آنا اس بات کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے کامل دین کو اپنا دین مان کر لازماً اسی کی پیروی

کرے اگر کوئی شخص آپ کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ کے نبی ہی بلکہ اس فرمانروائے کائنات سے کھلی بغاوت ہے جس نے آپ کو پوری دُنیا کا ہادی اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب دوسری کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دُنیا کی مردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ صورتِ حال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔

کمالِ دین کا دوسرا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکمالات کا نمائندہ ہو وہ بھی مجمع الکمالات ہو۔ کمالِ علمی کی حد تک قرآن حکیم ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیے۔ تاکہ نمونہ کو مکمل نمونہ اور عمل کو نقشِ قرآن کہا جا سکے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اگر دین کامل ہے تو جو ذات کامل دین لے کر آئی ہے ضروری ہے کہ وہ ہمہ گوشہ کاملیت کا نمونہ ہو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کاملیت کا جلوہ دیکھنا ہو اور کمالِ جامعیت و ہمہ گیری کی نمائش گاہ آپ مطالعہ کرنا چاہیں تو مختصراً یوں سمجھیے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم خواہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدانِ جہاد میں، نمازِ شبانہ میں مصروف ہوں یا فوجوں کی درستی میں، منبر پر ہوں یا گوشۂ تنہائی میں۔ ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ میری حالت اور کیفیت ہو وہ سب منظرِ عام پر لائی جائے۔ ازواجِ مطہرات آپ کے خلوت خانوں کے حالات سنانے اور بتانے میں مصروف رہیں۔ مسجدِ نبوی میں ایک چبوترہ ان عقیدت مندوں کے لیے تھا جن کے بیٹھنے کو گھر نہ تھے۔ وہ باری باری دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اس سے روزی حاصل کرتے اور سارا وقت آپ کے ارشادات سنتے، آپ کے حالات دیکھتے اور آپ کی معیت میں گزارنے کے لیے صرف کرتے تھے۔ ان کی تعداد ستر کے قریب تھی، ان ہی میں حضرت ابوہریرہ ہیں جن سے زیادہ کسی صحابی کی روایات نہیں ہیں۔ یہ ستر ہستیاں معتقد جاسوسوں کی طرح شب و روز ذوق و شوق کے ساتھ آپ کے حالات دیکھنے اور دوسروں سے ان کے بیان کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دن میں پانچ وقت مدینہ میں بسنے والی تمام آبادی دس برس تک مستقل آپ کی ایک ایک حرکت و سکون ایک ایک جنبش کو دیکھتی رہی۔ غزوات اور لڑائیوں کے موقع پر ہزار ہا صحابہ کو شب و روز آپ کے دیکھنے اور آپ کے

حالات مبارکہ سے واقف ہونے کا موقعہ ملتا تھا۔ غزوہ فتح مکہ میں دس ہزار، تبوک میں تیس ہزار اور حجۃ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ صحابہ کو آپ کی زیارت کا موقعہ ملا تھا۔ اور خلوت وجلوت گھر باہر، صفہ اور مسجد حلقہ تعلیم اور میدان جنگ تک میں جس نے جس حال میں آپ کو دیکھا، اس کی عام اشاعت کی نہ صرف اس کو اجازت بلکہ حکم اور تاکید تھی۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی زندگی کا کون سا پہلو ہوگا جو زیر پردہ رہا ہوگا اور اس پر بھی ایک شخص تک آپ پر خردہ گیری نہ کر سکا۔ آج بھی آپ کے دشمن اور مخالف پوری چھان بین اور تلاش وجستجو کے بعد آپ پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے تو اب ایسی زندگی کو کامل زندگی کہنا زیبا ہے یا ان زندگیوں کو جن کا بڑا حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل اور پوشیدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ السلام کی زندگی کا کوئی پہلو تاریک نہیں رہا ہے اور نہ ناقص، بلکہ آپ کی زندگی ہر پہلو سے اپنے اندر کمال ہی کمال رکھتی ہے۔

باسورتھ سمتھ کی یہ شہادت پیش کرنے کے لائق ہے۔

یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔ شخصیت کی تاریک گہرائیاں درحقیقت اور ہماری پہنچ کے خطہ سے باہر وہ ہمیشہ رہیں گی لیکن ہم محمد کی بیرونی تاریخ کی ہر چیز کو جانتے ہیں۔ ان کی جوانی، ان کا ظہور، ان کے تعلقات، ان کے عادات، ان کا پہلا تخیل اور تدریجی ترقی ان کی عظیم الشان وحی کا ترتیب بہ نوبت آنا، اور ان کی اندرونی تاریخ کے لیے اس کے بعد کہ ان کے مشن کا اعلان کیا جا چکا۔ ہم ایک کتاب قرآن رکھتے ہیں جو اپنی اصلیت میں اپنے محفوظ رہنے میں اپنے مضامین کی بے ترتیبی میں بالکل یکتا ہے لیکن اس کی جوہری صداقت کوئی شخص کبھی سنجیدہ شک نہ کر سکا۔ اگر کوئی کتاب ہم ایسی رکھتے ہیں جو اپنے زمانے کے ماسٹر اسپرٹ کا آئینہ ہو تو یہ کتاب ہے۔ کمی تصنع اور بناوٹ سے پاک غیر مرتب تھکا دینے والی لیکن چند عظیم الشان خیالات سے معمور ایک دماغ جو اس روحانیت سے لبریز جو اس کے اندر بند ہے خدا کے نشہ میں مست وسرشار لیکن انسانی کمزوریوں کے ساتھ جن سے پاک ہونے کا کبھی انہوں نے دعویٰ نہیں کیا۔

اور مشہور مورخ گبن کے الفاظ میں

کسی ابتدائی پیغمبر نے کبھی صداقت کا کوئی ایسا سخت امتحان پاس نہیں

کیا جیسا کہ محمد نے، جب کہ آپ نے پہلے پہل اپنے کو بحیثیت پیغمبر کے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اس کی کمزوریاں سے بحیثیت ایک انسان ہونے کے واقف تھے وہ لوگ جو اس سے سب سے زیادہ واقف تھے ان کی بیوی، ان کا غلام، ان کا چچا زاد بھائی اور ان کا سب سے پرانا دوست جس نے جیسا کہ محمد نے طور کہا ہے کہ اس کے پیروؤں میں وہ ایک ہے۔ جس نے نہ پشت پھیری اور نہ گھبرایا۔ یہی لوگ اس کے سب سے پہلے معتقد ہوئے۔ پیغمبروں کی عام قسمت محمد کے حق میں بالکل الٹ گئی۔

ان شہادتوں کا مطلب یہ ہے کہ جو جس قدر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسی قدر زیادہ ان کا عقیدت مند تھا۔ عام پیغمبروں کا یہ اصول رہا ہے کہ پہلے ان کو واقفوں نے مانا ہے۔ اس کے بعد گھر والوں کی باری آتی ہے مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ آپ کو سب سے پہلے انہوں نے مانا جو آپ کے اخلاق، عادات اور معاملات سے زیادہ واقف تھے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے ایمان و اعتقاد کا شدید خطرناک امتحان دیا ہے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ تین برس تک آپ کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہیں، جس میں بھوک اور فقر و فاقہ سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس وقت جب ہر چہار طرف دشمن تعاقب میں تھے۔ رات کی تاریکی میں آپ کے ساتھ خطرناک رفاقت کا حق ادا کیا۔ حضرت علی نے اس بستر پر قدم رکھا جو صبح کو مقتل بننے والا تھا۔ حضرت زید غلام خاص وہ تھے جو پتہ ملنے پر بھی اپنے باپ کے اصرار کے باوجود آپ سے جدا نہ ہوتے۔

گاڈفری ہیگنس اپالوجی فار محمد میں کہتا ہے:

عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ جب عیسیٰ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیروکار بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے برعکس اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد جمع ہوتے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر اس کو غالب کر دیا۔

یہ جاں نثاری ان میں سے تھی جو آپ کو ہر طرح اور ہر حیثیت سے جانتے تھے کیا ایسے شخص کے ساتھ جس کی زندگی اس کے ساتھیوں اور رفیقوں میں کامل نہ ہو اس لائق ہو سکتی ہے کہ اس پر

وہ جانیں قربان کریں۔

اسی کمال کی بنا پر قرآن نے آپ کی زندگی کو کامل ترین نمونہ بنایا ہے اور اس کی پیروی کو خدا کی محبت کا ذریعہ بتایا ہے۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

آپ کی اتباع یعنی مجمع الکمالات کی زندگی کی نقل کو خدا کی محبت کا معیار قرار دیا۔ قرآن کی نگاہ میں آپ کی حیات ایک مسلمان کے لیے کامل نمونہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس نمونے کے سارے پہلو سب کے سامنے ہونے چاہئیں اور وہ سب کے سامنے ہیں، اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کے سلسلے کی کوئی کڑی گم نہیں ہے کوئی واقعہ زیر پردہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ تاریخ کے صفحات میں آئینہ ہے۔ اور یہی ایک ذریعہ کسی زندگی کے کامل معصوم اور بے گناہ یقین کرنے کا ہے نیز ایسی ہی زندگی جس کے ہر پہلو اس طرح روشن ہوں انسانوں کے لیے نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔

دنیا میں بابل، اسیریا، ہندوستان و چین، مصر و شام اور یونان و روم میں بڑے بڑے تمدن پیدا ہوئے۔ اخلاق کے بڑے بڑے نظریے قائم کیے گئے۔ تہذیب و شائستگی کے بڑے بڑے اصول بنائے گئے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے، شادی بیاہ، مرنے جینے، غم و مسرت، دعوت و ملاقات، مصافحہ و سلام، غسل و طہارت، عبادت و تعزیت، تبریک و تہنیت، دفن و کفن کے رسوم و آداب، شرائط اور ہدایات مرتب ہوتے اور ان سے ان قوموں کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے اصول بنائے گئے۔ یہ اصول صدہا سال میں بنے۔ پھر بھی بگڑ گئے۔ صدیوں میں ان کی تعمیر ہوئی تاہم وہ فنا ہو گئے۔ لیکن اسلام کا یہ تمدن چند برسوں میں بنا اور تعمیر ہوا اور ۱۴ سو برس سے کل روئے زمین کی سینکڑوں مختلف اقوام میں یکسانی کے ساتھ قائم ہے، کیونکہ اس کا ماخذ ایک ہے اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس زندگی کے آئینے میں صحابہ نے اپنی زندگیاں سجائیں اور ان کا عکس تابعین نے اتارا اور اس طرح وہ تمام دنیائے اسلام کا عمل اور رسم بن گئی۔ وہ مقدس زندگی مرکزی نقطہ تھی، صحابہ نے اس کو خط اور بعد کی نسلوں نے اسے دائرہ بنا دیا۔ وہ تمدن اگرچہ آج مکمل نہیں مگر اس کے نقش قدم آج بھی ہیں اور اسی پر کل مسلمان چل رہے ہیں۔ ایک محمد رسول اللہ کی زندگی تھی جو سارے صحابہ کی زندگی بن گئی اور وہی کبھی دنیائے اسلام

کی زندگی تھی۔ افریقہ یا ہندوستان کا کوئی قبیلہ آج جب عیسائی ہوتا ہے تو اس کو مذہب اگرچہ انجیل سے ملتا ہے لیکن تمدن و تہذیب اور عملی زندگی کا سبق یورپ کے ساختہ تمدن سے سکھایا جاتا ہے لیکن وحشی سے وحشی قبیلہ جو مسلمان ہوتا ہے اس کو جہاں سے روحانی نظام ملتا ہے، وہیں سے تمدن و تہذیب اور شائستگی کا سبق بھی ملتا ہے۔ مسلمان ہونے کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی انسانی ضروریات اور حالات کے ساتھ اس کے سامنے آجاتی ہے اور یہ بولتی چالتی، جیتی جاگتی تصویر ہر مسلمان کی زندگی کی ہر حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ گویا سیرتِ محمدی دنیا کا آئینہ خانہ ہے جس میں دیکھ کر ہر شخص اپنے جسم و روح، ظاہر و باطن، قول و عمل، زبان و دل، آداب و رسوم، طور و طریق کی اصلاح کر سکتا ہے اور اسی لیے مسلمان اپنی شائستگی اور ادب و اخلاق کے لیے محمد رسول اللہ سے باہر اور آپ کی سیرت سے الگ کوئی چیز نہیں مانگتی۔ اور نہ اس کو اس کی ضرورت ہے۔ سیرت محمدی دنیا نے اسلام کا عالمگیر آئینہ ہے اسی کے مقابلے حسن و قبح اور نیکی و بدی کا راز اس پر کھلتا ہے۔ اور چونکہ کوئی انسانی کامل زندگی اس استیعاب و استقصاء کے دنیا کے سامنے موجود نہیں ہے اس لیے تمام انسانوں کے لیے بھی ایک کامل نمونہ ہے اور ایسی ہی کامل اور بے پردہ زندگی انسانوں کے لیے قابل نمونہ ہو سکتی ہے۔[1]

بہرحال دین کو مکمل کرنے سے مقصود اس کو ایک مستقل نظام و فکر اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تعلیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

کمالِ دین اور ختمِ نبوت

کمال دین اور ختم نبوت لازم و ملزوم ہیں یعنی جیسے آپ کی نبوت عالمگیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لیے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا اور قیامت تک اب کوئی رسول نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین خاتم مہر کو کہتے ہیں۔ جب کسی لفافے یا دستاویز پر مہر لگا دی جاتی ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی

[1] خطبات مدراس

چیز نہیں ڈال جا سکتی یا کسی اور بات کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس طرح کسی کی بات کا عمل امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارے انبیاء کا خاتم فرمایا جانا اس حقیقت کا نہایت بلیغ انداز میں اعلان ہے کہ اب دین کامل ہو چکا ہے اور یہ آخری رسول قیامت تک کے لیے ہمارا پیغام لے کر آ چکا ہے۔ اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کی اہمیت کو جس علمی انداز میں علامہ اقبال نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب تشکیل جدید الٰہیات میں پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

> اس نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان بطور حد فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے؛ تو جناب کی ذات گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پا لیا جن کی اسے اپنی شاہراہوں کے لیے ضرورت تھی، اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ عہد طفولیت کی حالت میں نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن حکیم غور و فکر اور تجارت و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ و فطرت دونوں کو علم انسانیت کے ذرائع ٹھہراتا ہے یہ سب اسی مقصد کے گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے۔ پھر عقیدہ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات کے متعلق ایک آزادانہ اور ناقدانہ طرز عمل قائم ہوتا ہے اس لیے ختم نبوت کے معنے یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرے۔

اتمام نعمت کیا ہے؟

اتمام نعمت کا جلد دوم آیت ۱۵۰ میں لاتم نعمتی علیکم میں وعدہ کیا گیا تھا، یہاں

اس کو پورا کیا جا رہا ہے۔ اتمام نعمت سے یہاں مراد یہی ہے کہ امت ہر جگہ ہر خوف اور ہر بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح اسلامی تمدن، اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے گی کہ وہ دینی منصب امامت کے تقاضے پورے کر سکے۔ کفر کا غلبہ اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھا جسے قرآن فتنہ کہتا ہے۔ اس فتنہ سے خلاصی پا کر جب ان کو دارالاسلام میسر آ گیا جس میں نبوت کا لایا ہوا علم و عمل بلا کم و کاست نافذ ہو گیا اور اس کے ساتھ ان کو وہ ذرائع بھی مل گئے جن سے وہ اللہ کی زمین پر کفر و فسق کی جگہ ایمان و تقویٰ کو جاری کر سکیں تو یہ ان پر اللہ کی نعمت کا اتمام ہوا۔ اس آیت میں جس وعدہ کے پورا ہونے کی بشارت دی جا رہی ہے وہ وعدہ امت سے وراثت کی وجہ سے کیا گیا تھا اور سورۃ فتح میں بھی وعدہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اصالتاً ہوا تھا "ویتم نعمتہ علیک"۔ دوسرے شارحین قرآن نے یہاں اتمام نعمت سے نعمت ہدایت کی تکمیل مراد لی ہے۔ مولانا دریا بادی فرماتے ہیں کہ اتمام نعمت دین کی تکمیل سے ہوا۔ مولانا اصلاحی فرماتے ہیں اتمام نعمت سے مراد اس آخری شریعت کا اتمام ہے۔ اور مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ نعمت تمام کرنے سے مراد نعمت ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ لیکن مفتی محمد شفیع نے عام شاہراہ سے ہٹ کر یہ بات اچھی لکھی ہے کہ ___ اتمام نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا ہے جس کا ظہور فتح مکہ کے موقع پر ہوا۔

یہاں الفاظِ قرآن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دین کے لیے لفظ اکمال اور نعمت کے لیے لفظ اتمام بولا گیا ہے، دونوں میں فرق ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ کسی چیز کا اکمال یہ ہے کہ اس چیز سے جو غرض تھی وہ پوری ہو گئی اور اتمام کے معنی یہ ہیں کہ اب دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ تو اس لیے اکمال کا حاصل یہ ہوا کہ قانون الٰہی اور احکام دین کے اس دنیا میں رواج کرنے کا جو مقصد تھا وہ آج پورا کر دیا گیا اور اتمام نعمت کا مطلب یہ ہے کہ اب مسلمان کسی کا محتاج نہیں ہے۔ ان کو اللہ سبحانہٗ نے غلبہ، قوت اور اقتدار عطا فرما دیا ہے جس کے ذریعے وہ اس دینِ حق کے احکام کو جاری اور نافذ کر سکیں گے۔ یہاں حافظ ابن القیم نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اس آیت میں دین کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے اور نعمت کی نسبت خود اپنی طرف کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دین کا ظہور اہل ایمان کے افعال و اعمال کے ذریعہ ہوتا ہے اور نعمت کی تکمیل براہ راست اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔

اسلام اللہ کا منظور کردہ دین ہے

اسلام کو بطور دین اللہ نے پسند کر لیا۔ اصل ارشاد میں بحیثیت لکم الاسلام دینا آیا ہے یہاں یہ گمان کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا کہ اس آیت میں اسلام سے مراد عام مفہوم کا اسلام ہے نہ کہ مخصوص اصطلاحی اسلام، اس لیے اس سے مراد ہر آسمانی مذہب کی پیروی ہو سکتی ہے۔ اس گمان کی یہاں اس لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس آیت میں لفظ الاسلام استعمال کیا گیا ہے نہ کہ مطلق اسلام اور جیسا کہ عربی زبان کے اصول کا تقاضا ہے کہ قرآن جب الاسلام بولتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے اسلام کا محض لغوی یا عام مفہوم نہیں ہوتا بلکہ اصطلاحی مفہوم ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس بات سے اتفاق نہ کیا جائے پھر بھی اوپر کے استدلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا حقیقت پھر بھی وہی رہے گی جو بیان کی گئی۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہی ہوگا۔ اللہ کے نزدیک صحیح مقبول طریق بندگی یہ ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے۔ اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیا جائے۔ غور فرمائیے کیا اس مفہوم و معنے کا حاصل اور عملی نتیجہ کچھ اور ہوگا یقیناً نہیں۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمی پیغمبر کی حیثیت سے آجانے کے اللہ کی کامل اطاعت کی اور اپنے آپ کو پوری طرح حوالے کر دینے کی کوئی صورت اس کے سوا باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ آپ پر ایمان لایا جائے اور آپ ہی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ قرآن صراحت کے ساتھ یہ اعلان کر چکا ہے کہ یہ رسالت ساری دُنیا کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس رسالت پر ایمان نہیں لاتا یا آپ کو سچا رسول ماننے کے باوجود آپ ہی کی پیروی کا راستہ اختیار نہیں کرتا تو یہ اللہ کی کامل اطاعت نہیں بلکہ اپنے نفس کی کامل اطاعت ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی نافرمانی ٹھہرے گی۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں موجود ہے اور ایسا ثبوت موجود ہے جس کے آگے جھک پڑنے سے صرف ناانصافی اور خود پرستی ہی روک سکتی ہے۔ اگر یہ بات بھی قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور ہر رسول کی پیروی یکساں طور پر حق ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام لانے کی دعوت نہ دیتے، کیونکہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برخلاف

آپ ان سے صرف یہ کہتے کہ تورات وانجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنی نبوت کے تسلیم کرنے اور قرآن کی پیروی کا تم سے کوئی مطالبہ نہیں رکھتا لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔

یا ایہا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی تھی ایمان لاؤ اس کتاب پر جسے ہم نے اتارا ہے

نہ صرف یہ کہ آپ نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی فرمایا حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں صرف کافر ہی نہیں بلکہ پکا کافر کہا ہے۔ جیسا کہ اسی پارے کے آغاز میں پڑھ آئے کہ اہل کتاب کو انکار دین حقا کہا ہے۔ ان کے جس طرز عمل کی بنا پر یہ کہا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کے رسول مانتے تھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے حالانکہ جس طرح اللہ کے رسول وہ تھے اسی طرح آپ بھی تھے۔ پھر یہی چیز ہے جسے ایمان و کفر کے درمیان راہ نکالنا کہا گیا ہے۔ کیونکہ دوسرے انبیاء کو مان کر اگر وہ ایمان باللہ کے تقاضے پورے کر رہے تھے تو رسالت محمدی کا انکار کر کے اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کو وہ ٹھکرا بھی رہے تھے۔ پھر یہی رویہ تھا جس کو اللہ کا اور اس کے رسولوں کا کفر کرنا کہا گیا ہے کیونکہ خدا کے کسی رسول کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا دراصل نہ خدا کو ماننا ہے نہ کسی رسول کو ماننا ہے بلکہ محض اپنی خواہش نفس کو ماننا ہے۔

غرض قرآن حکیم نے اہل کتاب کے انکار اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دی ہے جو مشرکوں کے انکار کو دی تھی اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بتائے ہیں۔ اس نے اہل کتاب کے لیے اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں خدا ان سے بھی قبول نہ فرمائے گا۔

پھر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لو کان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں۔

یہ ارشادِ نبوی مسئلہ کو اس حد تک واضح کر دیتا ہے جس کے بعد وضاحت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ جس نبی کی حیثیت یہ ہو کہ دوسرے انبیاء اگر اس زمانے میں موجود ہوتے تو وہ بھی اسی کے اُمتی اور پیرو بنتے۔ اور ان کی لائی ہوئی شریعتوں کی پیروی کی گنجائش خود ان کے لیے باقی نہ رہتی۔ اس کی پیروی کی ذمہ داری اور ضرورت سے بھلا کوئی عام انسان کیسے مستثنیٰ رہ سکتا ہے اور اس کے لائے ہوئے دین کی موجودگی میں کوئی اور دین اس کے لیے کس طرح قابل اتباع ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس آیت میں اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے۔ کیونکہ جب ہر شخص کے لیے اسلام کی پیروی ضروری ہے اور اب کوئی دین اللہ کے حضور پسندیدہ اور قابل قبول نہیں ہے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ اسلام ہی شرطِ نجات ہے۔ واضح بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور ناقابل قبول ٹھہرا چکا ہے اس کی پیروی پر وہ اجر کیسے دے گا۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ

بانے کے بعد ہی وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کرتا ہے کہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین ایسا شخص آخرت میں قطعاً نامراد رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمت میں سے جس کسی شخص تک مثلاً یہودی یا نصرانی تک میری نبوت کا پیغام پہنچا۔ اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لاتے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہوگا۔ (صحیح مسلم)

اس ارشادِ نبوت میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کے لیے گئے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں۔ ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے اور ایک کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کا کوئی گروہ، کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں ہے جس پر اس کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو کھینچ تان کر نکالی جا رہی ہو بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس حدیث کے الفاظ احد من ھذہ الامۃ کا صریح مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ ھذہ الامۃ اس اُمت سے مراد اُمت اجابت نہیں بلکہ اُمت دعوت ہے۔ یعنی وہ

پورا گروہ انسانی جس کی طرف آپ نبی بنا کر روانہ کیے گئے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ گروہ جس کے لیے آپ نبی بن کر آئے پوری نوعِ انسانی پر مشتمل ہے اس لیے یہ حدیث اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں پڑنے دیتی ہے کہ آپ پر ایمان لانا ہر شخص کے لیے ضروری ہے اور شرطِ نجات ہے۔ اس فیصلے کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آتے ہیں اسی طرح دوسری قومیں اور ملتیں بھی آتی ہیں۔

غرض جہاں تک اس آیت قرآنی کے فیصلہ کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں اسلام کی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرطِ نجات قرار دیتی ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے اس کا پیغام پہنچا ہی نہ ہو جیسا کہ ۷ یسمع بی کی قید کا منشا ہے۔

آیت پر مجموعی نظر

اجزاء کی وضاحت کے بعد آیت کے مجموعی نظام پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ اس آیت میں اکمال دین، اتمام نعمت اور دین کی حیثیت سے اسلام کی پسندیدگی کے انعامات بتائے ہیں۔ اکمال دین اور اتمام نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم و اضافہ تصرف کی گنجائش نہیں ہے نہ کسی نبی کی بعثت کی حاجت، البتہ ہر دور میں نئے نئے مسائل کا انکشاف اہل علم و اجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب و سنت کے اصول و قواعد کے مطابق و ماتحت کرتے رہیں گے۔

دنیا اب تک مختلف جغرافی حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر نہایت دشوار تھا۔ اور اس میں نامہ و پیام کی بھی کوئی آسان راہ نہ تھی ہر علاقہ اپنے جغرافی اور طبعی سرحدوں کے اندر محفوظ تھا۔ دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جو راہ میں حائل رہتے ان کا عبور کرنا محال تھا۔ موٹر لاری، ریل، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ اب کاتبِ ارضی کی تاریخ میں پہلی بار یہ وقت آ رہا تھا کہ انسانیت کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع وسیع ہوں اور جس طرح نظامِ تکوینی میں ہر فرد کے لیے اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہوا کا اور روشنی کا اور پانی کا سامان حکمتِ الٰہی موجود رکھتی ہے اسی طرح نظامِ تشریعی میں رحمتِ حق نے چاہا کہ نوعِ انسانی کی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کی روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تربیت کا انتظام پیشتر سے موجود رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے بتا دیا کہ اہل ایمان کے لیے دین اسلام ایک بڑی نعمت ہے

اور یہی دین ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے، نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہوگی۔
جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوشیاں مناتے تھے لیکن حضرت ابو بکر پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے رونے کی وجہ پوچھی، عرض کیا کہ اس آیت سے اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے کیونکہ دین کی تکمیل نے رسول کی ضرورت پوری کر دی۔ حضور انور نے اس کی تصدیق فرمائی۔

اضطرار کی شرعی حد

اہلا۔ دیکھو جو کوئی بھوک سے بے بس ہو جائے نہ جو کہ دانستہ گناہ کرنا چاہے، تو اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی حلال و حرام کا قانون تو مکمل ہو چکا، اس میں اب کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ البتہ مضطر جو بھوک اور پیاس کی شدت سے بے تاب اور لاچار ہو کر وہ اگر حرام چیز کھا لے بشرطیکہ مقدار ضرورت سے تجاوز نہ کرے اور لذت مقصود نہ ہو غیر باغ و لا عاد تو اللہ تعالیٰ اس تناول محرم کو اپنی بخشش اور مہربانی سے معاف فرمائے گا گویا وہ چیز تو حرام ہی رہی مگر اسے کھا کر جان بچانے والا خدا کے نزدیک مجرم نہ رہا۔ یہ بھی اتمام نعمت کا ایک شعبہ ہے۔[1]

مخمصۃ کے معنے بھوک کے ہیں۔ بھوک سے مضطر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بھوک کی ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے کہ موت یا حرام میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راہ بظاہر کھلی ہوئی باقی نہ رہے۔ ایسی حالت میں اس کو اجازت ہے کہ حرام چیزوں میں سے بھی کسی چیز سے فائدہ اٹھا کر جان بچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ غیر متجانف کی قید اسی مضمون کو ظاہر کر رہی ہے جو دوسرے مقام پر غیر باغ و لا عاد سے ظاہر ہوا ہے، یعنی نہ دل سے چاہنے والا بنے اور نہ سد رمق سے آگے بڑھے۔ مخمصۃ کی قید سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جہاں دوسرے غذائی بدل موجود ہوں وہاں صرف اس عذر پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں آتا جیسا کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں کا حال ہے ناجائز کو جائز بنا لینے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ گوشت زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر نہیں ہے، دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی بلکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صحت بھی نہایت اعلیٰ معیار کے ساتھ قائم رکھی جا سکتی ہے۔ غیر متجانف لاثم کی قید بتا رہی ہے کہ رخصت بہرحال رخصت ہے اور حرام بہرحال حرام ہے۔ نہ کوئی حرام چیز شیرِ مادر بن سکتی ہے اور نہ کوئی رخصت ابدی پروانہ ہے اس وجہ سے یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ رفع اضطرار سے تجاوز کرے۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی زندگی بچائے گا تو اللہ بخشنے والا ہے۔

حرام کھا لینے کے لیے اضطرار کی وہ حد جس سے حرام کھانا مباح ہو جاتا ہے، علماء میں اختلافی ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ہلاکت کا اندیشہ ہو یا یقینی اور ظنِ غالب کے طور پر عضو کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، علامہ زرقانی نے امام مالک کا بھی یہی نقطۂ نظر نقل کیا ہے۔ البتہ امام نووی نے شرح المہذب میں امام شافعی کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ حرام کھانے کے لیے صرف بھوک کا زیادہ لگنا کافی نہیں ہے۔ صرف اتنا اندیشہ کافی ہے کہ اگر بھوک کی حالت میں نہ کھائے گا تو ساتھیوں سے بچھڑ جائے گا یا سواری پر سوار نہ ہو سکے گا اور چل نہ سکے گا۔ امام الحرمین کہتے ہیں کہ ان حالات کے رونما ہونے کے لیے صرف ظنِ غالب کافی ہے۔ علامہ ابنِ قدامہ نے مغنی میں صرف اندیشہ ہلاکت کو اضطرار قرار دیا ہے۔

حرام کھانا واجب ہے یا رخصت

اندیشہ ہلاکت میں کیا حرام کھا لینا واجب ہے یا صرف اجازت ہے اس موضوع پر علمائے قانون کا اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک حفظِ جان یعنی جان بچا لینا اولین فرائض میں سے ہے اور ایسے موقع پر غذا نہ کھانا خودکشی کے مترادف ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے جو شخص مباح سے مجتنب رہا، تا آنکہ مرگیا وہ خود اپنا قاتل ہے۔ آیاتِ قرآنی لا تقتلوا انفسکم اور لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اسی کی متقضی ہیں کہ جان بچانا واجب ہے۔ یہی امام مالک اور امام شافعی کا مذہب راجح ہے۔ حنابلہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ صرف شوافع میں سے ابو اسحاق اور احناف میں سے امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ واجب نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حالتِ اضطرار میں مضطر کو دو حراموں میں سے کون سا حرام کر لینے کی اجازت ہے۔ مردار کھا لینے کی یا کسی کا کھانا چوری کر کے یا غصب کر کے یا لوٹ مار کر کے کھا لینے کی؟ ابن قدامہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ مردار کھالے لیکن چوری

غصب یا ورثہ مار کر کھائے اور وجہ یہی بتاتی ہے کہ مردار کی حرمت اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور چوری وغیرہ حق العباد ہے۔ حق اللہ کے لیے اجازت ملی ہے لیکن حق العباد کے لیے اجازت نہیں ہے۔

اسی سے فقہاء نے اسلامی قانون میں نظریہ ضرورت استنباط کیا ہے اور قاعدہ لکھا ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔ یہ تفصیل کا محل نہیں ان شاء اللہ اس پر تفصیلی بحث چودھویں جلد میں آئے گی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ

مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ

فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَ

اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ

الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ

حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ

بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ

الْخٰسِرِيْنَ ۝

اے پیغمبر لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے

کیا کیا چیزیں حلال ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ جتنی اچھی

اور ستھری چیزیں ہیں سب تمہارے لیے حلال ہیں[۲۲]۔ اور
شکاری جانور جو تم نے شکار کے لیے سدھا رکھے ہوں اور شکار
کا طریقہ جیسا کچھ اللہ نے تمہیں سکھا دیا ہے تم ان کو سکھاتے
ہو تو جو کچھ وہ تمہارے لیے روکے رکھیں تم اسے کھا سکتے ہو
البتہ اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو[۲۳]۔ اور ہر حال میں اللہ کی
نافرمانی سے بچو یاد رکھو کہ اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے[۲۴]
آج ساری اچھی چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں[۲۵]
ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال
ہے[۲۶]۔ اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے[۲۷]۔ نیز تمہارے لیے
مسلمان پاکدامن بیبیاں اور کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ
ان کے مہر ان کے حوالے کر دو اور مقصود قید نکاح میں
لانا ہو[۲۸]، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے

آشنائیاں کرو۔ اور جو بھی ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرے گا تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی بیکار ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا۔

تحلیل و تحریم کا ضابطہ عام

چونکہ لوگ پچھلی پابندیوں اور سختیوں کے عادی ہو چکے تھے اس لیے بار بار پوچھتے تھے کہ ہمارے لیے کیا کیا چیزیں حلال ہیں۔ آیت ۴ میں فرمایا کہ تمام اچھی چیزیں حلال ہیں۔ صرف ان ہی چیزوں سے روک دیا گیا ہے جو اچھی نہیں ہیں۔ پچھلے صحیفوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں آئی ہیں ان میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جب آخری نبی آئے گا تو اپنی کتاب کو طیبات اور خبائث کے متعلق اللہ کے امر و نہی سے آگاہ کرے گا اور حلال و حرام کے موضوع پر ان تمام پابندیوں اور سختیوں سے آزاد کرے گا جو انھوں نے اپنے اوپر یا تو از خود عائد کر رکھی ہیں یا ان کی سرکشی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر دی ہیں۔ قرآن عزیز نے ان پیشین گوئیوں کا حوالہ سورۂ اعراف میں دیا ہے،

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً
عندھم فی التوراۃ والانجیل یامرھم بالمعروف و
ینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم
الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم

جو لوگ اس رسول نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان سے اس بوجھ اور پابندیوں کو دور کرتا ہے جو ان پر تھیں۔

یہ انہیں باتوں کا حوالہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ظہور میں آنے والی تھیں چنانچہ آپ کے ظہور نے ان میں سے ایک ایک بات کی عملاً تصدیق کر دی۔ آپ نے تمام طیب اور پاکیزہ چیزیں جائز کر دیں جن میں کچھ یہود کے یہاں حرام تھیں۔ تمام خبیث چیزوں کو حرام قرار دیا اور وہ تمام پابندیاں اور بیڑیاں ختم کر دیں جو انہوں نے یا تو از خود اپنے اوپر لاگو کر لی تھیں یا ان کی ضد سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عائد کی گئی تھیں۔ اس مرحلے پر اگرچہ یہ کام مکمل ہو چکا تھا اور یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اہلِ کتاب نے جو خبیث چیزیں جائز بنائی ہیں محض اپنی بدعت سے جائز بنائی ہیں اور جو طیب چیزیں ان پر حرام ہیں وہ محض ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر حرام ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ پابندیاں ختم ہو گئیں تو مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ حرام و حلال اور خبیث و طیب کی اس وضاحت کے بعد تمہارے لیے اب شکاری جانور بھی جائز ہے اور تم اہلِ کتاب کا کھانا بھی کھا سکتے ہو۔ اس لیے کہ اب تمہارے لیے کسی خبیث سے آلودہ ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اور ساتھ اس بات کا بھی اعلان کر دیا گیا کہ تمہارا کھانا اہلِ کتاب کے لیے جائز ہے اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ ضمناً اس حکم کی بھی تصریح کر دی کہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

۲۲ — اے پیغمبر لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کیا چیزیں حلال ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ جتنی صاف اچھی اور ستھری چیزیں ہیں سب تمہارے لیے حلال ہیں۔ پچھلی آیات میں بہت سی حرام چیزوں کی فہرست دی گئی تھی تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ "حلال چیزیں کیا ہیں" اس کا جواب دے دیا کہ حلال کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ چند چیزوں کو چھوڑ کر جن میں کوئی دینی یا بدنی نقصان ہے دنیا کی تمام ستھری اور پاکیزہ چیزیں حلال ہی ہیں اور چونکہ شکاری جانور سے شکار کرنے کے متعلق بعض لوگوں نے خصوصیت سے سوال کیا تھا اس لیے آیت کے اگلے حصہ میں اس کو تفصیلاً بتا دیا گیا تھا۔[1] یہ جواب کا صرف ایک حصہ ہے جو کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کا یہ بھی ایک انداز ہے کہ وہ کسی سوال کا جواب دیتا ہے تو اس کا آغاز بالعموم جامع بات سے کرتا ہے کہ جواب صرف سوال ہی تک محدود نہ رہ جائے بلکہ ایک وسیع دائرے میں مسائل کی رہنمائی کرے۔ جواب کے اس انداز میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ مذہبی طرزِ خیال کے لوگ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اکثر اس ذہنیت کے شکار ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں جب تک صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جاتا۔ اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر قانونیت کا تسلط ہو جاتا ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں حلال اشیا اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں۔ اور ہر کام اور ہر چیز کو اس شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ منع تو نہیں ہے۔ یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔ پوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انہیں تمام حلال چیزوں کی فہرست بتا دی جائے تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل الٹ گیا قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے بجز اس کے جسے حلال ٹھہرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے بجز اس کے جس کی حرمت کی تصریح کر دی جائے یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آزاد کر کے دنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے حلت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے سوا ساری دنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مستثنیٰ کر کے ساری دنیا اس کے لیے حلال ہو گئی۔ حلال کے لیے پاک اور ستھری کی قید اس لیے لگائی گئی کہ ناپاک چیزوں کو اس عام اباحت کی دلیل سے حلال ٹھہرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اشیاء کے پاک ہونے کا تعین کس طرح ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اصول شرع میں سے کسی اصل کے تحت ناپاک قرار پاتی ہیں یا جن چیزوں سے ذوق سلیم کراہت کرے یا جنہیں مہذب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساس نظافت کے خلاف پایا ہو ان کے سوا سب کچھ پاک ہے۔ [له]

سوال چونکہ جانوروں کے متعلق ہے اس لیے طیبات سے مراد وہ جانور ہوں گے جو اولاً تو خود اپنے مزاج اپنی سرشت اور انسان کے لیے اپنی افادیت اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اچھے اور پاکیزہ ہوں۔ ثانیاً ان کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا جاتا ہو۔ اس طرح اس سے وہ تمام جانور نکل جائیں گے جو اپنے مزاج اور سرشت کے اعتبار سے انسان کے صالح مزاج سے مناسبت رکھنے والے نہ ہوں۔ مثلاً خنزیر، کتا، بندر درندے اور شکاری پرندے وغیرہ یا مزاج سے

له تدبر و تفہیم

مناسبت تو رکھنے والے ہوں لیکن کسی خارجی سبب سے ان کے اندر خبث پیدا ہوگیا ہو مثلاً جانور مرگیا یا غیر اللہ کے نام پر یا کسی استھان پر اس کو ذبح کیا گیا ہو۔ یہ خبائث میں داخل ہیں۔ قرآن کے اس بیان سے یہ رہنمائی ملی ہے کہ شکار کیے ہوئے جانوروں میں بھی حلال صرف طیبات ہیں۔ خبائث اس سے خارج ہیں۔

سدھائے ہوئے شکاری جانور کا شکار

۲۳۔ اور شکاری جانور جو تم نے شکار کے لیے سدھا رکھے ہوں اور شکار کا طریقہ جیسا اللہ نے تمہیں سکھایا ہے تم ان کو سکھاتے ہو تو جو کچھ وہ تمہارے لیے روکے رکھیں تم لے کر کھا سکتے ہو البتہ اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو۔ شکاری کتے یا باز وغیرہ سے شکار کیا ہوا جانور ان شروط سے حلال ہے۔

اول یہ کہ شکاری جانور سدھا ہوا ہو

دوسرے یہ کہ شکار پر چھوڑا جائے

تیسرے یہ کہ اس طریقہ سے تعلیم دی گئی ہو جس کو شریعت نے معتبر رکھا ہے یعنی کتے کو سکھلایا جائے کہ شکار کو پکڑ کر کھائے نہیں، اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ گو شکار کے پیچھے جارہا ہو فوراً چلا آئے۔ اگر کتا شکار کو خود کھانے لگے یا بلانے سے نہ آئے تو سمجھا جائے گا کہ جب اس کے کہنے میں نہیں ہے تو شکار بھی اس کے لیے نہیں پکڑا ہے بلکہ اپنے لیے پکڑا ہے۔ اسی کو حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جب اس نے آدمی کی خو سیکھی تو گویا آدمی نے ذبح کیا۔[1]

چوتھی شرط یہ ہے کہ چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لو، یعنی بسم اللہ کہہ کر چھوڑو۔ ان چار شرطوں کی تصریح نص قرآنی میں ہو گئی ہے۔

پانچویں شرط جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک معتبر ہے کہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کر دے کہ خون بہنے لگے اس کی طرف لفظ جوارح اپنے مادہ جرح کے اعتبار سے اشارہ کر رہا ہے۔

ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو شکاری جانور کا مارا ہوا شکار حرام ہے۔ ہاں اگر مرا نہ ہو اور ذبح کر لیا جائے تو وما اکل السبع الا ما ذکیتم کے قاعدہ سے حلال ہو گا۔ یہ جوارح جارحہ کی جمع ہے اس کے معنے ہر شکاری جانور کے ہیں خواہ پرندہ ہو یا درندہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کا نام ہی جارحہ اس لیے ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے۔ خازن لکھتے ہیں کہ شکاری جانور کو جارحہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے ما علمتم من الجوارح کا پیوند الطیبات سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ طیبات حلال ہیں اور ان شکاری جانوروں کا شکار حلال ہے جن کو تم نے سدھایا ہو۔ شکاری جانوروں سے مراد کتے، چیتے، باز شکرے اور تمام وہ درندے اور پرندے مراد ہیں جن سے انسان شکار کی خدمت لیتا ہے۔ سدھائے ہوئے جانور کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جس کو شکار کرتا ہے اسے عام درندوں کی طرح پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سدھائے ہوئے درندوں کا شکار حلال ہے۔

اس مسئلہ میں فقہاء کا کچھ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر شکاری جانور نے خواہ درندہ ہو یا پرندہ شکار میں سے کچھ کھا لیا تو وہ حرام ہوگا۔ کیونکہ اس کا کھا لینا یہ معنے رکھتا ہے کہ اس نے شکار کو مالک کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا ہے۔ یہی مسلک امام شافعی کا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا تب بھی وہ حرام نہیں ہوتا حتیٰ کہ اگر ایک تہائی حصہ بھی کھا لے تو بقیہ دو تہائی حلال ہے اور اس معاملے میں درندے اور پرندے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ مسلک امام مالک کا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ شکاری درندے نے اگر شکار میں سے کھا لیا ہو تو وہ حرام ہوگا لیکن اگر شکاری پرندے نے کھایا ہو تو حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ شکاری درندے کو ایسی تعلیم دی جا سکتی ہے کہ وہ شکار کو مالک کے لیے پکڑ رکھے اور اس میں سے کچھ نہ کھائے لیکن تجربے سے ثابت ہے کہ شکاری پرندہ ایسی تعلیم قبول نہیں کرتا۔ یہ مسلک امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

کتے کو شکار کی ٹریننگ

کلب کتے کو کہتے ہیں، اسی سے تکلیب بنا لیا ہے جس کے معنے کتے کو شکار کی ٹریننگ دینے کے ہیں۔ مکلبین مکلب کی جمع ہے ایک معنے تو کتے کو تعلیم دینے والے کے ہیں اور دوسرے معنے شکار پر چھوڑنے والے کے ہیں۔ دونوں میں کوئی منافات نہیں اور اہل لغت نے دونوں کی گنجائش نکالی ہے۔ چنانچہ علامہ زبیدی نے تاج العروس میں منظور افریقی نے لسان العرب اور راغب نے مفردات القرآن میں تصریح کی ہے۔ مکلبین کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ یہ تعلیم و تربیت صرف کتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ابتداءً تو یہ لفظ اسی معنے کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن پھر اس کا

استعمال شکاری جانوروں کی تربیت کے لیے ہونے لگا خواہ کتا ہو یا شکاری درندوں اور پرندوں میں سے کوئی اور جانور، شکاری پرندے بھی بلا اختلاف فقہا اسی حکم میں داخل ہیں۔ ابجصاص نے تصریح کی ہے۔

اس میں کتوں کی تخصیص نہیں ہے وسیع معنے مراد لینا ضروری ہے۔ فقہاء میں اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تعلمونھن مما علمکم اللہ سے اس تربیت، ورٹریننگ کی نوعیت بتائی جا رہی ہے کہ تم نے اس سلیقہ میں سے ان کو کچھ سکھایا ہو جو اللہ نے تم کو بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تربیت میں مربی کے ذوق اس کی پسند اور ناپسند اور اس کے مقصدِ تربیت کی جھلک ہوتی ہے اور اس چیز کو جس طرح زیرِ تربیت انسان اپناتا ہے اسی طرح اپنی جبلی استعداد کی حد تک حیوانات بھی اپناتے ہیں۔ یہ چیز سدھائے ہوئے جانوروں کو دوسرے جانوروں سے بالکل الگ کر دیتی ہے اس وجہ سے ایک عام کتے کے شکار اور ایک سدھائے ہوئے کتے کے شکار میں فرق ایک امرِ فطری ہے بلکہ ایک مسلمان کے تربیت کردہ کتے اور ایک عیسائی کے تربیت کردہ کتے کے میلان اور سلیقہ میں بھی فرق ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شکاری جانور سکھائے ہوئے سدھائے ہوئے ہوں۔ فقہا نے اسی سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ یہ قید صرف وحشی جانوروں کے لیے نہیں بلکہ گھریلو جانوروں کے لیے بھی ہے چنانچہ گھریلو جانور اگر ٹریننگ پایا ہوا نہ ہو تو اس کا کیا ہوا شکار بھی حلال نہ ہوگا۔ البتہ جو جانور وحشی ہو یا گھریلو سکھایا ہوا ہوگا اس کا فعل خود شکاری کا ہوگا۔ اور فقہا نے تعلیم کا معیار جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے کتے کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سکھایا ہوا کتا شکار کو پکڑ کر خود نہ کھاتے اور باز کے حق میں رکھا ہے کہ سدھے ہوئے باز کو جب آواز دی جاتے تو وہ شکار کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلا آئے۔ اس سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ شکاری جانور سدھائے ہوئے ہوں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وہ شکاری جانور تمہارے چھوڑے ہوئے جھپٹیں نہ یہ نہیں کہ از خود شکار پکڑ لائیں اور تمہارے سامنے ڈال دیں۔

ان دو شرطوں کے ساتھ تیسری شرط یہ ہے کہ تربیت ایسی ہو کہ شکاری کتا شکار مسلمان شکاری کے لیے روکے خود نہ کھا لے۔ مما امسکن علیکم امساک کے معنے روکنے اور تھامنے کے ہیں۔ یہی اصل سوال کا جواب ہے کہ اگر مذکورہ بالا شرائط کے مطابق تربیت کیا جانور ہو تو اس کے کیے ہوئے شکاروں میں وہ شکار تمہارے لیے جائز ہوگا جو وہ خاص تمہارے

لیے روک رکھے۔ چونکہ یہاں یہ بات خصوصیت سے کہی گئی ہے اس لیے میں ان لوگوں کے مذہب کو بلحاظِ دلیل زیادہ قوی سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ شکاری جانور شکار میں سے کچھ کھا لے تو وہ شکار جائز نہ ہوگا۔ یہی بات بعض احادیث سے ثابت ہوتی ہے اور علامہ قرطبی نے اس مسئلے پر صحابہ میں سے عبد اللہ ابن عباس اور ابو ہریرہ اور تابعین میں سے عکرمہ، قتادہ، ابن جبیر اور علما اور ائمہ فقہ میں سے شعبی، شافعی، احمد، اسحاق، ابو ثور اور ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کا اتفاق نقل کیا ہے۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں والیہ ذھب اکثر الفقہاء الا البزاز، شکرہ وغیرہ شکاری پرندوں کی تادیب اس حد تک دشوار ہے اس لیے فقہا نے انہیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ کر دیا۔

شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ

آخر میں واذکروا اسم اللہ علیہ فرما کر واضح کر دیا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ لیا کرو۔ آیت میں ضمیر مجرور علیہ کے مرجع میں اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ شکاری جانور کو چھوڑتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ ان کے خیال میں ضمیر کا مرجع ما علمتم من الجوارح ہے۔ ارشادِ نبوت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتم طائی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کتے کے ذریعے شکار کر سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اسے چھوڑتے وقت تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھاؤ ورنہ نہیں اور اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تو نہ کھاؤ کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لیے پکڑا ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اگر میں شکار پر اپنا کتا چھوڑ دوں اور بعد میں دیکھوں کہ اور کوئی کتا وہاں موجود ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس شکار کو نہ کھاؤ اس لیے کہ تم نے خدا کا نام اپنے کتے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کتے پر۔

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت خدا کا نام لینا ضروری ہے اور یہی شکار کے حلال ہونے کی شرط ہے۔ اس کے بعد اگر زندہ شکار ہے تو پھر خدا کا نام لے کر اسے ذبح کر لینا چاہیے اور اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی وہ حلال ہوگا۔ فقہا نے حدیث بالا ہی سے یہ قاعدہ معلوم کیا ہے کہ ذبح حیوانات کے وقت جو بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اسی کے قائم مقام وہ بسم اللہ ہے جو شکار پر شکاری جانور کے چھوڑتے وقت پڑھی

جاتے۔ الجصاص نے احکام القرآن میں اور صاحب در مختار نے اس کی تصریح کی ہے۔

حدود اللہ کی یاد دہانی

۴۴ ۔ ہر حال میں اللہ کی نافرمانی سے بچو یاد رکھو کہ اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے یعنی ہر حالت میں خدا سے ڈرتے رہو کہیں طیبات کے استعمال اور شکار وغیرہ سے متمتع ہونے میں حدود و قیود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو جائے۔ عموماً آدمی دنیوی لذتوں میں منہمک ہو کر اور شکار وغیرہ کے مشاغل میں پڑ کر خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تنبیہ کی ضرورت تھی کہ خدا کو مت بھولو اور یاد رکھو کہ حساب کا دن کچھ دور نہیں ہے۔ خدا کے انعامات اور تمہاری شکر گزاری کا موازنہ اور عمر عزیز کے ایک ایک لمحہ کا حساب ہونے والا ہے ؎ منشا یہ ہے کہ ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بچو۔ ذرا موقع کی نزاکت چشم تصور میں لائیے خوب بھوک لگی ہوئی ہے، بہت لذیذ گوشت کا جانور شکرہ یا کتا پکڑ کر لایا ہے۔ فرحت سے بے قرار ہے کہ جلد سے جلد اس کے کباب لگیں اور بھنے ہوئے شکار سے جی بھر کر لذت حاصل کی جائے۔ اب کون اس موقع پر یاد دلائے کہ شرائط حلت ذرا مستحضر کر لیجئے۔ جانور سدھا ہوا ہے یا نہیں اسے چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ دی گئی تھی یا نہیں۔ بجز تقویٰ الٰہی کے اور کس میں اس وقت یاد دلانے کی قوت ہے۔ یہی مراقبہ ہر دشوار حکم کی تعمیل کو آسان بنا دے گا۔ قرآن حکیم میں احکام جہاں جہاں بھی آتے ہیں ان کے متصل ہی کوئی اس قسم کا فقرہ ضرور مل جاتا ہے جس سے یاد آخرت یا اللہ کے علم کل کا استحضار ہو جائے ہر شہوت کو آسان بنا دینے کا اور ہر پتھر کو پانی بنا دینے کا اس سے بڑھ کر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ گویا آخر میں اس طرح واتقوا اللہ فرما کر اللہ کے مقرر کردہ حدود اور اس کے عہد و پیمان کے احترام کی یاد دہانی یہاں بھی فرما دی کہ شکار کی حرص و آز میں خدا کے حدود حلت و حرمت کو نہ بھولنا ورنہ روز حساب بہت دور نہیں ہے۔ یہ یاد دہانی اس پہلو سے ضروری تھی کہ جب شکار معاشی ضرورت ہو تو اس میں بے احتیاطی کے کڑے امکانات ہیں۔

سب اچھی چیزیں حلال ہیں

۴۵ ۔ آج ساری اچھی چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں۔ یعنی جیسے آج دین کامل

؎ افادات شیخ الاسلام

کر دیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام پاکیزہ چیزیں بھی تمہارے لیے واقتی طور پر حلال کر دی گئی ہیں جو کبھی منسوخ نہ ہوں گی لیے یہاں یہ بات دوبارہ کہی گئی ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اہل کتاب کا جو کھانا تمہارے لیے حلال کیا جا رہا ہے اس کے لیے بھی بنیادی طور پر طیب ہونا ضروری ہے۔ اس فقرہ میں الیوم کا لفظ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہیں خبیث و طیب کا پورا امتیاز ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے تمہیں یہ اجازت دی جا رہی ہے۔ اب یہ خطرہ نہیں رہا کہ تم ان کے دستر خوان پر بیٹھ کر کسی حرام یا مشتبہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیز کو کہا جاتا ہے اور خبائث اس کا مقابل ہے گندی اور قابل نفرت چیزوں پر بولا جاتا ہے۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری، مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لیے حلال ہیں اور جو گندی، قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ جتنے جانور اسلامی قانون میں حرام کیے گئے ہیں ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب دو اصولوں کے تحت آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو جس کے نتیجہ میں وہ ذبیحہ مردار ہو جاتے۔ یہاں سورۃ مائدہ میں نو چیزوں کو حرام قرار دیا ہے" ان میں خنزیر پہلی قسم میں داخل ہے باقی آٹھ قسم دوم میں۔ قرآن عزیز نے ویحرم علیھم الخبائث فرما کر اجمالی طور پر تمام خبیث جانوروں کے حرام ہونے کا حکم دیا اور اس کی تفصیلات میں سے چند چیزیں قرآن نے صراحۃً بتا دی ہیں مثلاً لحم خنزیر اور دم مسفوح باقی چیزوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے خبیث ہونے کی ایک علامت یہ بتائی ہے کہ کسی قوم کو بطور عذاب کے اس کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہو مثلاً قرآن میں ہے وجعل منھم القردۃ والخنازیر یعنی کچھ لوگوں کو خنزیر اور بندر کی صورت میں بطور عذاب کے مسخ کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانوروں کی یہ دو قسمیں بالطبع خبائث میں داخل ہیں۔ اور بہت سے جانور ایسے ہیں کہ افعال و آثار سے ان کا خبیث ہونا عام لوگ خود ہی محسوس کر لیتے ہیں مثلاً درندے جن کا کام ہی دوسروں کو زخمی کرنا اور پھاڑنا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بھیڑیے کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

له افادات شیخ الاسلام

نے بطور ضابطہ بتایا ہے کہ ہر درندہ جانور جو دانتوں سے پھاڑ کر کھاتا ہے جیسے شیر وغیرہ اور ہر پرندہ جو اپنے پنجے سے شکار کرتا ہے جیسے باز، شکرہ وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلامی قانون نے حرام قرار دیا ہے ان میں سے ایک قسم تو وہ ہے جس میں ذاتی طور پر خبث پایا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ ان کی ذات میں کوئی خبث نہیں ہے مگر جانوروں کے ذبح کرنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اس طریقہ پر اس کو ذبح نہیں کیا گیا ہے خواہ سرے سے ذبح ہی نہ کیا گیا ہو جیسے جھٹکا یا ذبح تو کیا مگر اس پر اللہ کے نام کے بجائے کسی غیر اللہ کا نام لیا تو یہ ذبح شرعاً معتبر نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ انسان جو کچھ بھی کھاتا اور پیتا ہے وہ سب اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں لیکن جانوروں کے سوا کسی چیز کے کھانے پینے اور استعمال کرنے پر یہ پابندی نہیں ہے کہ اللہ اکبر یا بسم اللہ کہہ کر ہی یہ حلال ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہر چیز کے کھانے پینے کے وقت بسم اللہ کہنا مستحب ہے مگر یہ مدار حلت نہیں ہے برخلاف جانوروں کے کہ ان کے حلال ہونے پر شرط بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ہے اور بالارادہ جان بوجھ کر بسم اللہ اللہ اکبر کو چھوڑ دینا جانور کو مردار بنا دیتا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جانداروں کی جانیں ایک حیثیت سے سب برابر ہیں اس لیے ایک جاندار کو دوسرے جاندار کو فنا کرنا جائز نہیں ہے۔ اب جن کو جاندار کی جان لینے کی اجازت دی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ ان پر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے اس لیے جانور کو ذبح کرتے وقت اس انعام الٰہی کا استحضار ضروری قرار دیا گیا، برخلاف دوسری اشیاء کے کہ ان کی تخلیق ہی اس لیے ہے کہ انسان ان کو فنا کر کے اپنی ضروریات کی بہم رسانی کرے۔ ان پر بسم اللہ کہنے کا درجہ استحبابی ہے، وجوبی نہیں ہے۔[1]

اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے

۲۶۔ اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے۔ یہاں طعام کھانے سے مراد ذبیحہ ہے۔ یعنی کوئی یہودی یا نصرانی بشرطیکہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ بنا ہو،

---

[1] معارف م شفیع

اگر حلال جانور ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام نہ لے تو اس کا کھانا مسلمان کو حلال ہے۔ و تمہارے طعام جداگانہ نہیں ہیں۔ اہل کتاب کے کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرما دیا گیا ہے کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اہل کتاب پاکی و طہارت کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں جو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں یا اگر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں یا اس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام لیں تو اسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ان کے دسترخوان پر شراب یا سور ہو یا اور کوئی چیز حرام ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہل کتاب ہی کا جائز ہے جبکہ انہوں نے اس پر خدا کا نام لیا ہو مگر غیر اہل کتاب قرآن کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔[1]

آیت کی تشریح میں چونکہ بعض شارحین قرآن[2] غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ یہاں چند ضروری باتوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اول یہ کہ اہل کتاب کون ہیں؟ دوم یہ کہ آیت میں طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟ باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن سے معلوم ہو چکا ہے جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ، اور صحف ابراہیم وغیرہ اس لیے وہ قومیں جو ان میں سے کسی کتاب پر ایمان رکھتی ہوں اہل کتاب ہیں۔ مشرکین مکہ، مجوس، بت پرست ہندو، بدھ، آریہ، سکھ وغیرہ اہل کتاب نہیں ہیں۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب سمجھنے اور کہنے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصل تورات و انجیل پر ایمان و عمل کے پابند ہوں۔ قرآن کی بے شمار تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس پر عمل کے مدعی ہوں۔ خواہ وہ کتنی گمراہیوں کے شکار ہو چکے ہوں یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا ہے ان کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں بلکہ عزیر کو خدا کا بیٹا اور مسیح کو خدا کا فرزند

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم

قرار دیتے ہیں۔ ان کی طرف حشر کا انکار اور انکار کی بھی نسبت کی ہے لیکن ان حالات و صفات کے حامل ہونے کے باوجود قرآن نے ان کو اہل کتاب کہا ہے۔ الجصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم کے زمانہ خلافت میں آپ سے کسی گورنر نے دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات کو مانتے ہیں اور یہود کی طرح یوم السبت کی تعظیم کرتے ہیں مگر قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں سے کیا معاملہ کیا جائے۔ فاروق اعظم نے جواب دیا کہ ان کو اہل کتاب ہی سمجھا جائے۔

کیا یہودی کے لیے اصلاً یہودی ہونا اور عیسائی کے اصلاً عیسائی ہونا ان کے ذبیحے کے مسلمان کے لیے حلال ہونے کی شرط ہے؟ یا محض اسماً اور نسلاً ان کا اہل کتاب ہونا کافی ہے؟ کچھ بزرگوں نے اگرچہ یہی سمجھا ہے کہ یہودی کے لیے اصلاً یہودی ہونا اور عیسائی کے لیے اصلاً عیسائی ہونا حلت کی بنیادی شرط ہے۔ حضرت علی نے بنی تغلب کے نصاریٰ کے بارے میں فتویٰ دیا تھا کہ

> بنی تغلب کے نصاریٰ کا ذبیحہ نہ کھاؤ کیونکہ انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے علاوہ کچھ نہیں لیا۔
> (مظہری)

لیکن عام صحابہ و تابعین کی تحقیق یہی ہے کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں اس لیے انہوں نے بنی تغلب کے عیسائیوں کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا۔ چنانچہ القرطبی نے جمہور امت کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ

> جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے خواہ بنی تغلب میں سے ہو یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلے سے ہو اسی طرح ہر یہودی کا بھی ذبیحہ حلال ہے۔
> (قرطبی ص ۷۸، ج ۶)

ہاں جن عیسائیوں اور یہودیوں کے بارے میں یقینی طور پر یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو نبی ہی نہیں مانتے ہیں وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

آیت میں طعام سے مراد

طعام کے لغوی معنے کھانے کی چیز کے ہیں۔ جس میں ازروئے لغت ہر قسم کی کھانے کی چیز داخل ہے لیکن جمہور امت کے نزدیک یہاں طعام سے مراد صرف اہل کتاب کا ذبیحہ ہے کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیائے خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا حلال و جائز ہے۔ اس میں کسی کا

کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق ظاہر ہو سکتا ہے وہ صرف ان کے ذبیحہ میں ہے۔ اس لیے اس آیت میں باتفاق امت طعام اہل کتاب سے مراد ان کا ذبیحہ ہے۔ یہ مقرر ہو جانے کے بعد کہ طعام سے مراد ذبیحہ ہے یہ بات سمجھ لینی آسان ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ تین شرطوں کے ساتھ حلال ہے۔

اول یہ کہ وہ ذبیحہ ان جانوروں میں سے نہ ہو جو اسلامی قانون میں مسلمانوں کیلئے حرام ہیں جیسے سور کا گوشت وغیرہ۔

دوم یہ کہ ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جائے غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ ایسا ذبیحہ جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے یا غیر اللہ کا لیا جائے خود مسلمان کا بھی حلال نہیں ہے چہ جائیکہ یہودی اور عیسائی۔ الجصاص نے امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا یہی مذہب لکھا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ بنے ہوں اس لیے کہ مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے۔

مسلمان کا کھانا کتابی کیلئے جائز ہے

۲۷۔ اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ اس مقام پر مسلمان کے کھانے کا کتابی کے لیے جائز ہونے کا ذکر بطور مجازات اور مکافات کے استطراداً فرما دیا۔ یعنی بعض احادیث میں جو آیا ہے لا یاکل طعامک الا تقی تیرا کھانا نہ کھائے مگر پرہیزگار۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر پرہیزگاروں کیلیے تمہارا کھانا حرام ہے۔ جب مسلمان کے لیے کافر کتابی کے ذبیحہ کی اجازت ہو گئی تو ایک وجہ سے کہ ذبیحہ اور کھانا دوسروں کے لیے کیوں حرام ہو گا شاید مسلمان رک رہے تھے کہ معلوم نہیں کہ ہمارے لیے جائز بھی ہے یا نہیں کہ ہم کتابیوں کو اپنے کھانے میں سے کھلا سکیں۔ یہاں تصریح کر دی گئی ہے کہ بے تکلف جائز ہے۔ نسفی اور رازی نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے۔ یہاں یہ صراحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ نکاح کا بیان اس کے فوراً بعد آ رہا ہے۔ ذبیحہ تو طرفین سے حلال ہے لیکن نکاح کا قیاس اس پر درست نہیں ہے۔ نکاح صرف ان کی عورتوں سے مسلمان مرد کا جائز ہے۔ مسلمان عورت کا تعلق ان کے مرد سے جائز نہیں ہے۔ یہ امام رازی کی نکتہ آفرینی ہے اور خوب ہے۔

لے افادات شیخ الاسلام

شادی کا مقصد عفت ہے

۲۸۔ نیز تمہارے لیے مسلمان پاک دامن اور کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ ان کے مہران کے حوالے کر دو اور مقصود قیدِ نکاح میں لانا ہو۔ پاکدامن کی قید شاید ترغیب کے لیے ہو۔ یعنی ایک مسلمان کو چاہیے کہ نکاح کرتے وقت پہلی نظر عورت کی عفت پر ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ پاکدامن کے سوا کسی اور سے نکاح صحیح نہیں ہے[1]۔ اصل ارشاد میں محصنات آیا ہے۔ شارحینِ قرآن نے اسے پاکبازی و عفت کے معنے میں لیا ہے۔ اس کا مصدر احصان ہے۔ یہ حِصن سے بنا ہے۔ حِصن قلعہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے حَصان، احصان، محصَن اور محصِن الفاظ بنائے گئے ہیں۔ حصان قرآن میں نہیں آیا ہے مگر عرب شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ اس کے معنے پاکدامن عورت کے ہیں۔ احصان کے معنے حفاظت میں لینے کے ہیں۔ لفظ احصان سے محصنات لا کر نکاح کی غرض کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شادی کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو عصمت و حفاظت میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا پورا کرنا نکاح کا مقصد نہیں ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ صرف لطف اندوزی کا ارادہ ہو اور بس۔ اس نقطے کے ذریعے کھلے لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ شادی سے عورتوں کا مقصد یہی ہے کہ وہ عفت و عصمت کی زندگی گزاریں گی۔ اخلاق و کردار بلند رکھیں گی، اور اپنے داعیاتِ فطرت کو اپنے شوہر کے ذریعے پورا کریں گی۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے کہ شادی کرتے وقت اوّل نظر عورتوں کی پاکدامنی اور عفت و عصمت پر ہی ہونی ضروری ہے۔ گویا قرآن نے بتا دیا کہ شادی کے ذریعے گوہرِ عصمت کو محفوظ رکھا جائے۔ بہرحال نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عفت و عصمت اور ناموس و آبرو کی انمول دولت جو انسان کو بخشی گئی ہے۔

کتابی عورت سے نکاح

اس دولت کی حفاظت کا آئینی طریقہ صرف نکاح ہے۔ چونکہ نکاح کا مقصد عفت و عصمت کا تحفظ ہے اس لیے کتابی عورتوں سے شادی کرنے میں بھی احصان یعنی عورتوں کے پاکدامن ہونے کو اولیت دی ہے مگر یاد رہے کہ بتایا یہ جا رہا ہے کہ ایک مسلمان کو چاہیے کہ نکاح

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرتے وقت پہلی نظر عورت کی عفت اور پاکدامنی پر رکھے اسی لیے فرمایا کہ

> تمہارے لیے کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ ان کے مہران کے حوالے کر دو اور مقصود قید نکاح میں رکھنا ہو۔

اہل کتاب سے ایک مخصوص حکم کے ساتھ دوسرا مخصوص حکم بھی بیان فرما دیا یعنی یہ کہ کتابی عورت سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے۔ مشرکہ سے اجازت نہیں ہے وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ [1] نکاح کی اجازت صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ وہ محصنات ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں علماء کا اختلاف ہے۔ عبداللہ ابن عباس کا خیال ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کے شہری ہوں۔ رہے دارالحرب اور دارالکفر کے یہود و نصاریٰ تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا درست نہیں ہے۔ احناف اس سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بیرونی ممالک کے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا حرام تو نہیں مگر مکروہ ضرور ہے۔ برخلاف اس کے سعید بن المسیب اور حسن بصری اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے لہٰذا ذمی اور غیر ذمی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں پھر محصنات کے مفہوم میں یہاں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمر کے نزدیک اس سے پاک دامن عصمت مآب عورتیں ہیں اور اس بنا پر وہ اہل کتاب کی آزاد منش عورتوں کو اس اجازت سے خارج کرتے ہیں۔ یہی رائے حسن، شعبی اور نخعی کی ہے اور ابو حنیفہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے یعنی اس سے مراد اہل کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈیاں نہ ہوں [2]

احناف نے جو دارالکفر اور دارالحرب میں کتابی عورتوں سے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے۔ ان کے یہاں اس کے جواز کے لیے دارِ اسلام اور اسلامی حکومت کا شہری ہونا شرط ہے۔ یہ بات دلیل کی بنی تلی ترازو میں اگر رکھی جائے تو بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات انہوں نے غالباً فحوائے کلام سے استنباط فرمائی ہے۔ آیت میں الیوم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت میں وقت کے حالات کو بھی دخل ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جب اجازت مل رہی ہے اس وقت کفار کا دبدبہ ختم ہو گیا اور مسلمان ایک ناقابل شکست طاقت بن چکے تھے۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ان کو کتابیات سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

نکاح کی اجازت دی گئی تو وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تہذیب معاشرت اور اعمال واخلاق میں ان سے متاثر ہوں گے بلکہ توقع تھی کہ مسلمان ان سے نکاح کریں گے تو ان کو متاثر کریں گے اور اس راہ سے ان کتابیات کے عقائد واعمال میں خوشگوار تبدیلی ہو گی اور عجب نہیں کہ ان میں بہت سی ایمان واسلام سے مشرف ہو جائیں۔ نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت بہرحال ایک اجازت ہے اس میں آدمی کے خود اپنے اور اپنے خاندان کے دین و ایمان کے لیے جو خطرہ ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر مسلمان مردوں کو تو کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی لیکن مسلمان عورتوں کو کسی صورت میں بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں ہے خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ اجازت صرف ایک اجازت ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ اگر ماحول اسلامی تہذیب و معاشرت کا ہو اور مسلمان کسی نیک چلن کتابی عورت سے نکاح کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن کافرانہ ماحول میں جہاں کفر اور اہل کفر کا غلبہ ہو اس قسم کا چاہے اس آیت کے الفاظ کے خلاف نہ ہو لیکن اس کی روح کے خلاف ضرور ہے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی قدس اللہ سرہ العزیز نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کے معنے یہ ہیں کہ اس میں فی حد ذاتہ کوئی وجہ تحریم نہیں۔ لیکن اگر خارجی اثرات وحالات ایسے ہوں کہ اس حلال سے منتفع ہونے میں بہت سے حرام کا ارتکاب کرنا پڑے بلکہ کفر میں مبتلا ہونے کا احتمال ہو تو ایسے حلال سے انتفاع کی اجازت نہ دی جائے گی۔ موجودہ زمانے میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا بے ضرورت اختلاط کرنا ان کی عورتوں کے جال میں پھنسنا یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں وہ مخفی نہیں لہٰذا بد دینی کے اسباب وذرائع سے بچنا ہی چاہیے۔

جمہور صحابہ وتابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح فی نفسہٖ جائز ہے لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد اور خرابیاں اپنے لیے اپنی اولاد کے لیے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لیے لازمی طور پر پیدا ہوں گے ان کی وجہ سے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

الجصاص نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن الیمان جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے شادی کر لی۔ حضرت فاروق اعظم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے حضرت حذیفہ کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دے دو۔ حضرت حذیفہ نے جواب میں دریافت کیا کہ کیا یہ شادی حرام ہے۔ فاروق اعظم نے جواب میں تحریر فرمایا

کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں بالعموم عفت و پاکدامنی نہیں ہوتی ہے اس لیے مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آپ لوگوں کے گھرانے میں اس راہ سے بدکاری نہ آجائے۔ اور امام محمد بن الحسن نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابوحنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری بار فاروق اعظم نے جب حضرت حذیفہ کو خط لکھا تو اس کے الفاظ یہ تھے۔

> میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے کر آزاد کر دو۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں دوسرے مسلمان بھی اقتدا نہ کریں۔ اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگے۔ تو مسلمان عورتوں کے لیے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔
>
> (کتاب الآثار ص ۱۵۶)

اس خط کو نقل کر کے امام محمد نے لکھا ہے کہ فقہاء حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور شیخ ابن الہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ حذیفہ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے اس آیت کی بنا پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیا جب فاروق اعظم کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دے دیں۔ (مظہری)

فاروق اعظم کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ ہے جبکہ اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی، نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کر سکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں ان میں بدکاری ہو تو ان کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہو جائیں یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں۔ فاروق اعظم کی دور بیں نگاہ ان مفاسد کے پیش نظر ان بزرگوں کو طلاق پر مجبور کر رہی ہے۔ اگر موجودہ دور کا نقشہ ان کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ ان کا فیصلہ کیا ہوتا۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نفس جواز میں کوئی گفتگو نہیں اور نہ آیت قرآنی کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہے۔ البتہ فقہاء نے مفاسد پر نظر کر کے اور مصلحت شرعی کا لحاظ کر کے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بلا ضرورت ایسے نکاح سے بچنا چاہیے۔ شیخ ابن الہمام کہتے ہیں کہ کتابی عورت سے نکاح جائز ہے لیکن اچھا یہ ہے کہ نہ کرے۔ در مختار میں ہے کہ نکاح ہو سکتا ہے مگر مکروہ ہے۔

اور کتابیہ حربیہ کے ساتھ نکاح کی کراہت تو ہر شبہ سے بالا ہے۔ حضرت علی کا ایک اثر ہے جس میں اپنے کتابیہ مقیم دارالحرب سے نکاح پر کراہت ظاہر کی ہے۔ (المبسوط)

علامہ شامی نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح غیر حربیہ کے ساتھ تو مکروہ تنزیہی ہے لیکن حربیہ کے ساتھ مکروہ تحریمی ہے۔

نکاح کا بنیادی مقصد عفاف ہے

آخر میں ارشاد ہوا ہے اور مقصد قید نکاح میں لانا ہو۔ اصل الفاظ میں محصنین آیا ہے۔ یعنی قید نکاح میں لانے کے۔ گویا اس طرف اشارہ ہو گیا کہ نکاح بظاہر قید ہے لیکن یہ قید ان آزادیوں اور ہوس رانیوں سے بہتر ہے جن کی طلب میں انسان نما بہائم سلسلہ ازدواج ہی کو معدوم کر دینا چاہتے ہیں۔ گویا اس طرح صحت نکاح کی شرطوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ تم نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کا مہر ادا کرو اور بشرطیکہ نکاح سے مقصود ان عورتوں کو فی الواقع بیوی بنانا مقصود ہو۔ یہاں صحت نکاح کی دو بنیادی شرطیں آگئی ہیں، ایک یہ کہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہو۔ دوسری یہ کہ عورت کو اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو۔ ان دو شرطوں کے ساتھ مسلمانوں کے لیے کتابی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ اس آیت میں لفظ احصان عفاف اور پاکدامنی کے معنے میں ہے یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے کے ساتھ اور زندگی بھر کی رفاقت کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت و حمایت میں لے اور عورت اسی شعور و ارادے کے ساتھ اس کے حصن حمایت میں داخل ہو۔ اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو اسلامی قانون کے نکاح میں پیش نظر ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے وقتی تعلق پیدا کرتا ہے گو اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کر دی ہے اور اس کو مال بھی دے دیا ہے لیکن یہ روح احصان کے خلاف ہے۔ قرآن نے احصان کی شرط لگا کر نکاح کے بنیادی اور اہم مقصد کو واضح کر دیا ہے کہ اسلامی قانون میں نکاح کا مقصد اخلاق کی حفاظت اور عفاف ہے، اسی لیے وہ زنا کو حرام کرتا ہے اور نوع انسانی کی صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد

ۓ افادات شیخ الاسلام

سے محفوظ رکھنے والا ہو ، اسی لیے یہاں نکاح کو احصان سے تعبیر کیا ہے جو نکاح کرتا ہے وہ محصن ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محصنہ ہے ۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد و عورت کے تعلق میں احصان ہو یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو ۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر چیز کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر کسی دوسری چیز پر اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا ۔

نکاح اسلام میں اخلاقی و روحانی ادارہ ہے

۲۹ - نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو ۔ جس طرح پہلے عورت کی پاکدامنی کا ذکر کیا تھا یہاں مرد کو پاکباز اور عفیف رہنے کی ہدایت فرما دی ہے الطیبات للطیبین والطیبون للطیبات اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی نظر میں نکاح کی غرض گوہر عصمت کو محفوظ اور مقصدِ ترویج کو پورا کرنا ہے ۔ شہوت رانی اور ہوس پرستی نہیں ہے[1]

دراصل نکاح اسلام میں کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک اہم اور زبردست اخلاقی ، اجتماعی اور روحانی ادارہ ہے ۔ اس کے مصالح اور منافع فرد کے خاندان کے معاشرے کے ، سب کے لیے بے شمار ہیں ، اسی نکاح کو اردو میں خانہ آبادی کہتے ہیں ۔ اجڑے ہوئے سنسان اور ویران گھرانے اسی ذریعے سے آباد ہوتے ہیں ۔ مرد و عورت کے اس باہمی تعلق کو اسلام نے صرف اسی صورت میں جائز رکھا ہے کہ زوجین کا اس سے اصل مقصود ایک خاندان کی بنیاد رکھنا ایک مستقل معاشرہ قائم کرنا ہو ۔ اپنے کو مہذب و متمدن کہلانے والی قوموں میں نکاح کی اس صورت کے علاوہ مرد و زن کے باہمی تعلق کے لیے دو اور صورتیں بھی رائج ہیں ۔ ایک صورت تو صاف اور کھلی بدکاری کی ہے ۔ عورت زنا کے لیے آزاد ہے ۔ اس کو باقاعدہ پیشہ بنائے نہ سوسائٹی اسے اس سے روک سکے نہ حکومت ، جو مرد جب چاہے اس کے ہاں جا کر ایک خاص کرایہ دے کر اپنے جسم کا پانی بہائے اور منہ کالا کرے ۔ دوسری صورت چوری چھپے آشنائی کی ہے یعنی عصمت کے معنے ہی مٹ جائیں اور شریف و بیسوا میں کوئی فرق نہ رہے ۔ قرآن نے دونوں صورتوں کو لعنت قرار دیا ہے ۔ پہلی صورت سفاح ہے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری صورت اتخاذ خدان ہے۔ جائز صورت مرد و عورت کے جنسی تعلق کی صرف نکاح بتائی ہے نکاح چوری چھپے نہیں اعلان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں خدا کا نام درمیان میں لاکر خالق کائنات کا واسطہ ڈال کر مرد و عورت کی راحت و آسائش کا ذمہ لیتا ہے۔ اور عورت مرد کی خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول کرلیتی ہے۔ دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق قائم ہوتے ہیں، فرائض عائد ہوتے ہیں، دونوں اپنے کو مستقل پناہ کے لیے عمر کے ہر دور، مال و اقبال کے ہر اتار چڑھاؤ کے لیے حتی الامکان تیار کرتے ہیں اور یہ سب کچھ مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان کہ کر قرآن نے ازدواجی و خانگی زندگی کا وہ بلند ترین معیار پیش کردیا جس میں کوئی مادی تہذیب آج تک نہیں پہنچ سکی ہے۔[1]

ایمان و کفر کا تقابلی مطالعہ

۳۰۔ اور جو بھی ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرے گا اس کا سارا کارنامۂ زندگی بے کار ہو کر رہ جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا۔ جن کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت ملی ہے اس کا قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ مومن قانت کی حقانیت عورت کے دل میں گھر کر جائے، نہ یہ کہ کتابیات پر مفتون ہو کر الٹا اپنا متاع ایمان ہی گنوا بیٹھے اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہو کر رہ جائے۔ چونکہ کافر عورت سے نکاح کرنے میں اس فتنہ کا قوی احتمال تھا۔ اس لیے ومن یکفر بالایمان کی تہدید نہایت برموقع ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ باقی حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کو کفار سے دو حکم میں مخصوص کیا، یہ فقط دنیا میں ہے اور آخرت میں ہر کافر خراب ہے گر نیک عمل بھی کرے تو قبول نہیں ہے۔[2] حضرت شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کو دنیا کی زندگی میں جو یہ رعایت دی گئی ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور ان کی عورتوں سے شادی جائز ہے تو اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آخرت میں بھی ان کو کوئی رعایت ملے گی۔ آخرت میں ان میں اور دوسرے کافروں میں کفر کی حد تک کوئی فرق نہیں ہے۔ اس صورت میں کفر بالایمان کے مجرم کے مرتکب اہل کتاب ہوں گے اور حضرت مولانا عثمانی نے جو مطلب بتایا ہے اس کی بنیاد پر کفر بالایمان کے مجرم اہل ایمان ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اہل کتاب کے ذبیحہ کھانے

---

[1] تفسیر ماجدی [2] افادات شیخ الاسلام

اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے وہ اپنے ایمان و اخلاق کی طرف سے ہوشیار رہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر بیوی کے عشق میں مبتلا ہو کر یا اس کے عقائد و اعمال سے متاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اخلاق و معاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔ صاحبِ کشاف نے تصریح کی ہے کہ ایمان سے یہاں شرائع ایمان مراد ہیں۔ گویا ایمان مصدر ہے اور معنے میں اسم مفعول کے ہے یعنی مومن بہ وہ باتیں وہ احکام جن پر ایمان کا مطالبہ ہے۔ مقتضیات اور ایمان کے تقاضے یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو نہیں مانے گا تو اس کا خواہ کیسا ہی عمل ہو بیکار ہو کر رہ جائے گا۔ حاصل یہ ہے کہ آدمی خدا اور رسول کو ماننے کا دعویٰ بھی کرے اور ساتھ ہی خدا اور رسول کے احکام کے خلاف محض اپنی خواہشات کی اتباع میں قانون و شریعت ایجاد کر کے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ وہی ایمان جس کو قرآن نے نؤمن ببعض ونکفر ببعض سے تعبیر کیا ہے۔ کفر و ایمان دونوں کے اس ملغوبہ کی خدا کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ ایمان معتبر ہے جو نبوت کی شرطوں پر ہو۔ جو لوگ اپنی شرائط پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان ان مدعیانِ ایمان کے منہ پر پھینک مارا جائے گا۔ اور اس قسم کے ایمان کے تحت کیے ہوئے سارے اعمال خدا کے ہاں بے قیمت ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان روح ہے کوئی عمل کیسا ہی خوشنما ہو اگر روح سے خالی ہے تو اس کا شمار نیکی میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ایمان نام اسی روحِ عمل کا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ
وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ
وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا
مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ
مِنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ يُرِيدُ
لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝
وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ
إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

---

[۳۱]
اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے
ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سروں پر مسح

کرلیا کرو،[۳۲] اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت دھولیا کرو،[۳۳] اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو خوب پاک وصاف ہوجاؤ،[۳۴]

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو، پھر تمہیں پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرلو، اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرلو،[۳۵] اللہ نہیں چاہتا ہے کہ تمہارے پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک وصاف رکھے،[۳۶] اور تم پر اپنی نعمت پوری کردے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہوجاؤ،[۳۷] اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کے اس عہد کو بھی یاد کرو جس کا اس نے تم سے معاہدہ لیا ہے جب کہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا[۳۸] اور اللہ کی نافرمانی سے بچو بے شک اللہ سینوں کے اندر تک کا علم رکھتا ہے۔[۳۹]

عہد عبودیت اور نماز کی اہمیت

امام رازیؒ نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ آغاز سورت میں اہل ایمان کو عقود پورا کرنے کی تلقین کی تھی۔ بندے اور خدا کے درمیان دو قسم کے عہد ہیں ایک عہد ربوبیت، دوسرے عہد عبودیت۔ دنیا کی ساری منفعتوں کو اگر کوزہ میں بند کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ دو ہی قسموں میں محصور ہیں۔ کام و دہن کی لذت اور ازدواجی زندگی کی مزے داری۔ قرآن نے سابقہ آیات میں دونوں کے حلال و حرام کے دائرے بتائے۔ اور گویا آخر میں فرما دیا کہ عہد ربوبیت کی میری جانب سے تکمیل ہو چکی ہے۔ اب تمہیں بندے ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں رہتے ہوئے کام و دہن کی لذتوں اور ازدواجی زندگی کی لطف اندوزیوں سے بہرہ ور ہوتے ہوئے عہد عبودیت کو پوری وفاداری سے پورا کرنا چاہیے۔ ایمان کے بعد طاعات میں سب سے اونچا درجہ چونکہ نماز کا ہے اور نماز طہارت کے بغیر ہوتی نہیں ہے۔ اس لیے وضو، تیمم اور غسل کا ذکر کیا ہے۔ اور سید رشید رضا نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے کہ اصل مناسبت یہ ہے کہ پہلے کھانے اور شادی کا ذکر تھا۔ کھانے کا نتیجہ بول و براز ہے اور شادی کا نتیجہ جنابت ہے۔ بول و براز سے وضو واجب ہوتی ہے اور جنابت سے غسل کا وجوب ہوتا ہے، اس لیے یہاں اولاً وضو اور غسل کا تذکرہ کر دیا ہے۔ اور لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اوپر طعام و نکاح کے طیبات و خبائث کا ذکر فرما کر ان کی تطہیر فرمائی، اب نماز کی طہارت کا بیان ہو رہا ہے۔ نماز کی طہارت بصورت حدث وضو ہے اور بصورت جنابت غسل ہے۔ اسی ذیل میں پانی نہ ملنے یا کسی عذر کی صورت میں تیمم کی اجازت مرحمت فرما کر اس امت پر اتمام نعمت فرما دیا اور یہ بھی اس موضوع کا تکمیلی پہلو ہے۔ توحید و رسالت کے اقرار کے بعد اسلام کا دوسرا ستون نماز ہے۔ یہ عملی ارکان میں سرفہرست ہے اور دین میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی ہے، اس کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے نماز ہی ایمان کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ یہاں نماز کو ذکر کر کے اشارہ کیا ہے۔ اگر انسان کے اندر ایمان موجود ہو اور اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ بات اسی آیت میں نماز کے ذکر سے معلوم نہیں ہوتی بلکہ قریب قریب ہر اس آیت قرآنی میں دکھائی دیتی ہے جس میں دین کے بنیادی اعمال گنائے گئے ہیں۔ اس انداز بیان سے قرآن اپنے مخاطبوں کے قلب و دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ دل میں اگر ایمان کا بیج پڑ چکا

ہو تو اس سے عمل کا جو پورا نتیجہ ملے گا وہ نماز کا پورا ہوگا۔ حضرت شیخ الاسلام نے اس موقعہ پر یہ بات خوب فرمائی ہے۔[1]

اُمت محمدیہ پر جو عظیم الشان احسانات کیے گئے ان کا بیان سن کر ایک شریف اور حق شناس مومن کا دل شکر گزاری اور اظہارِ وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو جائے گا اور فطری طور پر اس کی یہ خواہش ہوگی کہ اس منعم حقیقی کی بارگاہِ رفیع میں دست بستہ کھڑے ہو کر جبینِ نیاز خم کرے اور اپنی غلامانہ منت پذیری اور انتہائی عبودیت کا ثبوت دے اس لیے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دربار میں حاضری کا ارادہ کرو یعنی نماز کے لیے اٹھو تو پاک وصاف ہو کر آؤ۔ جن لذائذ دنیوی اور مرغوباتِ طبعی کی ابتدائے سورت و ضمن پہلی آیت میں اجازت دی گئی تھی یعنی طیبات اور محصنات وہ ایک حد تک انسان کو ملکوتی صفات سے دور بہیمیت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور کل احداث و موجبات وضو و غسل، ان ہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا مرغوباتِ نفسانی سے یکسو ہو کر جب ہماری طرف آنے کا قصد کرو تو پہلے بہیمیت کے آثار اور اکل و شرب وغیرہ کے پیدا کیے ہوئے تکدرات سے پاک ہو جاؤ۔ یہ پاکی وضو اور غسل سے حاصل ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ وضو کرنے سے بندۂ مومن کا بدن پاک ہو جاتا ہے بلکہ جب وضو باقاعدہ کیا جائے تو پانی کے قطرات کے ساتھ گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں۔

۱۳ ۔ اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھو۔ یعنی سو کر اٹھو یا دنیا کے مشاغل چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو پہلے وضو کر لو، لیکن وضو کرنا اس وقت ضروری ہے جبکہ پہلے سے باوضو نہ ہو۔ آیت کے آخر میں ان احکام کی جو غرض و غایت بتائی گئی ہے یعنی ولکن یرید لیطہرکم اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ منہ وغیرہ دھونے کا وجوب اسی لیے ہے کہ حق تعالیٰ تم کو پاک کر کے اپنے دربار میں جگہ دے اگر یہ پاکی پہلے سے حاصل ہے اور کوئی ناقض پیش نہیں آیا تو پاک کو پاک کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو ضروری قرار دینے سے اُمت حرج میں پڑتی ہے جس کی نفی ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج میں کی گئی۔ ہاں مزید نظافت، نورانیت اور نشاط حاصل کرنے کے لیے اگر تازہ وضو کر لیا جائے تو مستحب ہے۔ شاید اسی لیے اذا قمتم الی الصلوٰۃ میں سلسلۂ کلام ایسی رکھی گئی ہے جس سے ہر مرتبہ نماز کی طرف جانے کے وقت تازہ وضو کی ترغیب ہوتی ہے۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

اصل ارشاد میں اذا قمتم آیا ہے اور اس کے بعد الی الصلاۃ ہے۔ قام کے بعد جب الی آتا ہے تو اس کے معنی قصد کرنے کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم نماز کا قصد کرو۔ اسی بنا پر شارحین قرآن نے اس کی تشریح اذا اردتم سے کی ہے یعنی جب تم ارادہ کرو، شاید اس تشریح سے ان بزرگوں کے پیش نظر یہ ہے کہ اس کے عموم میں بیٹھ کر نماز پڑھنے والا بھی داخل ہو جاتے۔ ارشاد کا عموم بتا رہا ہے کہ یہ طہارت ہر نماز کے لیے ضروری ہے چنانچہ داؤد ظاہری کا یہی مذہب ہے لیکن مسلمانوں کی کثرت عامہ کو اس سے اتفاق نہیں ہے، وہ وضو کو اسی پر ضروری کہتے ہیں جس کے وضو نہ ہو، اس لیے بالاتفاق یہاں اتنا فقرہ محذوف مانا گیا ہے کہ حالت وضو میں نہ ہو یعنی محدث ہو۔ اسی لیے وضو پر وضو ضروری نہیں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اس موضوع پر فقہا میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر تازہ وضو کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین کا عام تعامل بھی یہی تھا۔ اس تشریح کی اصل اساس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کا عمل ہی ہے۔ چنانچہ مسند احمد، مسلم اور اصحاب سنن نے حضرت بریدہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے لیکن فتح مکہ کے روز آپ نے ایک ہی وضو سے ساری نمازیں پڑھیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ یا رسول اللہ آج ایک ایسی بات دیکھنے میں جو کبھی نہ دیکھی تھی یعنی یہ کہ آپ نے ایک ہی وضو سے نمازیں ادا کی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بالارادہ ایسا کیا ہے۔

ایسے ہی امام بخاری اور اصحاب سنن نے حضرت عمرو عامر الانصاری کے حوالے سے بتایا ہے کہ

> میں نے انس بن مالک سے سنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو فرماتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ تمہارا طرز عمل کیا ہوتا تھا؟ فرمایا کہ ہم تو ایک ہی وضو سے اس وقت تک نمازیں پڑھتے رہتے تھے جب تک وضو نہ ٹوٹے۔

اسی سنت عملیہ کی بنا پر علما نے اجماعاً یہ قید لگائی ہے کہ جب نماز کے لیے اٹھو اور تمہارا وضو نہ ہو، امام نووی نے قاضی عیاض سے اس پر اہل فتویٰ کا اجماع نقل کیا ہے۔

نماز کے لیے وضو کی فرضیت

۳۰۲- تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لو، یعنی تر ہاتھ سر پہ پھیر لو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدۃ العمر میں مقدار ناصیہ سے

کم کا مسح ثابت نہیں ہوتا۔ مقدار ناصیہ چوتھائی سر کے قریب ہے، حنفیہ اس قدر مسح کرنے کو فرض کہتے ہیں۔[1]

یہاں وضو کے تین فرض بتائے ہیں، منہ کا دھونا، ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا اور سر کا مسح کرنا۔ ان میں پہلا فرض منہ کا دھونا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت عملی سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کلی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔ فقہا نے دونوں یعنی مضمضہ کلی کرنا اور استنشاق ناک صاف کرنا کو سنت قرار دیا ہے لیکن امام احمد، امام اسحٰق، امام ابوعبید اور ابن المنذر اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ اور اس کے واجب ہونے پر ان کا موقف یہ ہے کہ منہ اور ناک چہرے میں داخل ہیں۔ نیز احادیث میں اس کا حکم اور التزام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلی کرنا اور ناک صاف کرنا ایک امر مسنون ہے اور بس، بالکل ایسے ہی جیسے وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھولینے آداب وضو میں داخل ہیں تاکہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہے وہ اول پہلے پاک ہوجائیں۔

دوسرا فرض وضو میں ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا ہے یہ بات کہ کہنیوں کا وضو میں دھونا فرض ہے یا سنت، جمہور کی رائے میں فرض ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں رقمطراز ہیں۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کہنیوں کا دھونا فرض ہے اور اس موضوع پر امام زفر اور ابوبکر بن داؤد الظاہری کو چھوڑ کر کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ لفظ قرآنی الی المرافق میں لفظ الی کے معنے کیا ہیں؟ اگرچہ کچھ لوگوں نے اسے مع کے معنے میں لے کر بتایا ہے کہ آیت کے معنے یہ ہیں کہ کہنیوں سمیت ہاتھوں کو دھوؤ، لیکن محققین الی کو انتہائے غایت کے معنے میں ہی بتلاتے ہیں۔ ابن جریر نے بھی لکھا ہے کہ عربی زبان میں ہر غایت جو الی کے ذریعے محدود ہو۔ اس میں دونوں احتمال ہیں کہ غایت حد میں داخل ہو یا خارج ہو اور دوسرے علماء لغت نے اس کے لیے ایک ضابطہ لکھا ہے کہ الی کا مابعد اگر الی کے ماقبل کی جنس سے ہوگا تو غایت حد میں داخل ہوگی اور اگر جنس سے نہ ہوگا تو غایت خارج ہوگی۔ اس فیصلہ کا تعلق سباق سے ہے جہاں سباق کہہ رہا ہو وہاں غایت داخل ہوگی اس لیے یہاں سباق بتا رہا ہے کہ چونکہ مرافق یدین کی جنس ہے اس لیے اس کا دھونا فرض ہے،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور ثم اتموا الصیام الی اللیل میں چونکہ رات صوم کی جنس سے نہیں ہے اس لیے خارج ہے۔ خیر اس معاملہ میں رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں مرافق دھوتے تھے۔ آپ سے چھوڑنا کبھی ثابت نہیں ہے اس لیے درجہ فرضیت کہنیوں کا دھونا ہی ہے۔ اس میں درجہ استحباب ہو سکتا ہے تو کہنیوں سے آگے دھونا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کا عمل صحیح مسلم میں آتا ہے کہ

آپ نے وضو فرمایا چہرہ دھویا اور اس کو خوب دھویا، ہاتھ دھوئے تو بانہوں تک دھوئے، سر کا مسح کیا اور پاؤں دھوئے تو پنڈلیوں تک دھوئے۔

اگرچہ علماء نے اسے حضرت ابوہریرہ کا اجتہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابوہریرہ کا اجتہاد ہے ورنہ حضور ﷺ سے ایسا کرنا ثابت نہیں ہے۔ بہرحال جیسا کہ علامہ آلوسی نے ابن ہبیرہ سے نقل کیا ہے کہ کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کے دھونے کی فرضیت پر چاروں مذاہب فقہ کا اتفاق ہے۔

وضو میں تیسرا فرض سر کا مسح ہے۔ اصل ارشاد ہے وامسحوا برءوسکم۔ مسح کا مطلب بھیگے ہوئے ہاتھ پھیرنے کو کہتے ہیں۔ مسح کے معنی لغت میں ہاتھ لگانا ہیں۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے المسح الاصابۃ۔ فقرے کی ساخت کہہ رہی ہے کہ مطلق ہاتھ لگانا مراد نہیں بلکہ بھیگا ہوا ہاتھ لگانا مراد ہے کیونکہ مسح لغت میں خود متعدی ہے اور یہاں با کے ساتھ اس کا دوبارہ تعدیہ اسی معنویت کی خاطر ہے۔ اس موضوع پر علماء کا اختلاف ہے کہ مسح میں کم سے کم درجہ کیا ہے جس کے کرنے سے قرآن کا مسح کا مطالبہ پورا ہو سکتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر سر پر ایک انگلی بھی لگا دی تو قرآن کا مطالبہ پورا ہو جائے گا۔ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ کچھ سر مسح کافی ہے۔ امام مالک اور جبائی کی رائے ہے کہ سارے سر کا مسح فرض ہے۔ امام ابوحنیفہ سر کے چوتھائی حصے کے مسح کو فرض کہتے ہیں۔ وہ آیت قرآنی کو یہاں مسح میں مجمل قرار دیتے ہیں اور عمل نبوت کو قرآن کے اجمال کا تبیین بتاتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ ابن شعبہ کا بیان ہے کہ،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیشانی، عمامہ اور خفین پر مسح کیا۔

یہی سنت رسول قرآن کے لیے مبین ہے۔ یہ گفتگو مقدار فرض میں ہے ورنہ مسح کا مسنون طریقہ وہی ہے جو امام بخاری، مسلم اور اصحاب سنن نے عبداللہ بن زید کے حوالے سے بتایا ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر کا اپنے دونوں ہاتھوں سے مسح فرماتے پہلے دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے جاتے پھر دونوں کو پیچھے سے آگے کی طرف لاتے۔ یعنی آغاز مسح کا سر کے ابتدائی حصے سے کرتے اور گدی تک لے جاتے پھر دونوں ہاتھوں کو پلٹا کر وہیں لاتے جہاں سے آغاز کیا تھا۔

وہ مسح کی فرضیت کا درجہ تھا اور یہ مسح کا مسنون طریقہ ہے، چونکہ کان بھی سر کا حصہ ہیں اس لیے سر کے مسنون مسح میں کانوں کا اندرونی و بیرونی حصہ بھی شامل ہے جیسا کہ آپ آگے چل کر وضو کے مسنون طریقہ میں پڑھیں گے۔

وضو میں پیروں کا دھونا

۳۰۳۔ اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت دھو لیا کرو۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اور پاؤں ٹخنوں تک۔ مترجم محقق نے پاؤں کے بعد لفظ کو بڑھا کر نہایت لطیف اشارہ فرما دیا کہ ارجلکم کا عطف مغسولات پر ہے یعنی جس طرح منہ ہاتھ دھونے کا حکم ہے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھونے چاہئیں۔ سر کی طرح مسح کافی نہیں ہے۔ چنانچہ اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے اور احادیث کثیرہ سے یہی ثابت ہے کہ اگر پاؤں میں موزے نہ ہوں تو دھونا فرض ہے ہاں موزوں پر ان شرائط کے ساتھ جو کتب فقہ میں مذکور ہیں مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن رات تک مسح کر سکتا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ اس کا عطف ایدیکم پر ہے۔ اس وجہ سے یہ ان اعضا کے تحت داخل ہے جن کے لیے دھونے کا حکم ہے۔ وضو میں ترتیب فطری بھی ہے اور شرعی بھی۔ کچھ لوگوں نے اس کو برؤسکم کے ساتھ جوڑ کر اسے ممسوح بنا دیا ہے لیکن یہ قول متواتر قرات اور متواتر سنت کے بھی خلاف ہے اور عربیت کے بھی۔ اگر پاؤں کا مسح ہوتا تو اس کے ساتھ الی الکعبین نہ ہوتا جیسا کہ تیمم میں جہاں مسح کا حکم دیا ہے وامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ میں لفظ الی المرافق ہٹا دیا ہے اور وضو میں ہاتھ دھونے کے لیے الی المرافق کی قید لگا دی ہے کیونکہ مسح میں اس قسم کی پابندی ایک بالکل غیر مفید بات تھی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اختلاف قراءۃ کی تحقیق

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس لفظ وارجلکم الی الکعبین میں ایک قراءۃ میں ارجل منصوب ہے۔ یہ نافع، ابن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قراءۃ ہے اور دوسری قرأت میں ارجل مجرور ہے اور یہ قرأت ابن کثیر، حمزہ، ابو عمرو اور عاصم کی ہے۔ پہلی قرأت کی بنا پر وارجلکم کا عطف وایدیکم پر ہے۔ اور ترجمہ یوں ہے، اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھویا کرو۔ اس قرأت سے وضو میں پیروں کے دھونے کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ یہی اہل السنت والجماعت کا مذہب ہے۔ دوسری قراءۃ یعنی بکسر اللام کی وجہ سے وارجلکم کا عطف بظاہر لفظ بروسکم پر ہے اور ترجمہ اس طرح ہے کہ سروں اور پیروں پر مسح کرلیا کرو۔ اس قرأت سے وضو میں مسح رجلین کی فرضیت ہوتی ہے یہ اہل تشیع میں امامیہ کا مذہب ہے۔

اہل السنہ کا موقف یہ ہے کہ یہ دونوں قرأتیں متواتر ہیں۔ لیکن یہ پتہ لینا کہ ان میں مراد خداوندی کیا ہے تو اس اجمال اور اشتباہ کو دور کرنے کے لیے ہمیں نبوت کی سنت اور صحابہ کے تعامل کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ احادیث متواترہ صحیح اور صریحہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو تعلیم دی۔ اس میں پیروں کے دھونے کا حکم دیا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ھذا وضوء لا یقبل اللہ الصلاۃ الا بہ ۔ یعنی اللہ اس طرح کے وضو کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا۔ پھر آپ نے مدت العمر کبھی بھی مسح رجلین پر عمل نہیں کیا نہ سفر میں نہ حضر میں بلکہ جن کو پاؤں کے دھونے میں کوتاہی کرتے دیکھا تو باواز اعلان فرمایا ویل للاعقاب من النار ان ایڑیوں کے لیے ہلاکت ہے اور عذاب ہے جن کو پانی نہیں لگا ہے۔ چنانچہ یہ حدیث حضرت عبداللہ ابن عمر کے حوالے سے آئی ہے کہ

> ایک سفر میں حضور اقدس ہم سے پیچھے رہ گئے ۔ آپ ہم سے آملے جبکہ ہم نماز عصر کے لیے وضو کر رہے تھے اور اپنے پیروں کو پونچھ رہے تھے۔ آپ نے باواز بلند فرمایا ویل للاعقاب من النار

اگرچہ اس حدیث کے مطلب میں دونوں جانب سے کھینچا تانی ہوتی ہے۔ غسل کے مدعی کہتے ہیں کہ یہ تہدید پاؤں نہ دھونے پر ہے جبکہ مسح کے قائل دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ تہدید مسح پورا نہ کرنے پر ہے۔ اور تو اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں خود امام بخاری کا بھی یہی

میلان بتایا ہے کہ

حضور کی تہدید مسح میں کوتاہی پر تھی پاؤں کو دھونے میں کوتاہی پر نہ تھی۔

لیکن دوسری روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ تنبیہ پاؤں خشک رہنے پر ہے، چنانچہ حافظ عسقلانی نے مسلم کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ تصریح ہے واعقابھم بیض تلوح لم یمسھا الماء ان کے ٹخنوں میں وہ سپید جگہ چمک رہی تھی جہاں پانی نہ لگا تھا اور اس سے زیادہ صاف اور واضح وہ روایت ہے جو حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے مسلم میں آئی ہے کہ

آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اپنا ٹخنہ نہیں دھویا تھا۔ آپ نے

اس موقعہ پر فرمایا کہ ویل للاعقاب من النار۔

عمرو بن عبسہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضور انور نے وضو کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا پھر قدموں کو دھو جیسا کہ اللہ نے ان کے دھونے کا حکم دیا ہے اور امام ابن جریر اور امام بیہقی نے سنن کبری میں حضرت علی سے نقل کیا ہے کہ

اغسلوا القدمین الی الکعبین کما امرتم.

قدموں کو ٹخنوں تک دھو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

مشہور محقق ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں لکھا ہے کہ تیس صحابہ سے زیادہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وضو کو روایت کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آپ نے وضو میں پیروں کو دھویا ہے۔ سفر اور حضر سردی اور گرمی کسی حالت میں بھی پیروں پر مسح نہیں فرمایا۔ بعد ازاں محقق ابن امیر الحاج نے ان تیس سے زیادہ صحابہ کی روایتوں کو نام مع تخریج روایت اور حوالہ کتاب بیان کیا ہے۔ ہم یہاں ان کا مفصل بیان نقل نہیں کر سکتے لیکن ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ان صحابہ کے نام پیش کرتے ہیں۔

حضرت عثمان ابن عفان بخاری و مسلم، حضرت علی ابن ابی طالب، اصحاب سنن، حضرت عائشہ صدیقہ سنن نسائی، حضرت عبد اللہ بن عباس بخاری، حضرت مغیرہ ابن شعبہ بخاری، عبد اللہ بن زید اصحاب ستہ، ابو مالک الاشعری، مسند احمد، حضرت ابو ہریرہ مسند احمد، حضرت ابو امامہ مسند احمد، حضرت براء بن عازب، حضرت ابو جحیفہ (بزار)، حضرت وائل بن حجر، ترمذی، نفیل بن مالک ابن حبان۔ حضرت انس بن مالک دار قطنی، حضرت ابو ایوب انصاری حضرت

ابوکاہل مرفوع - حضرت عبداللہ ابن انیس طبرانی، حضرت مقداد بن معدیکرب ابوداؤد، حضرت کعب بن عمرو الیمامی ابوداؤد، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ، ابو یعلیٰ، حضرت عمر بن الخطاب، عبد بن حمید، حضرت عبداللہ بن عمر، ابن ماجہ، حضرت ابی ابن کعب ابن ماجہ، حضرت معاویہ ابوداؤد، حضرت معاذ بن جبل طبرانی - حضرت ابو رافع، طبرانی - حضرت جابر بن عبداللہ، طبرانی - حضرت تمیم بن غزیہ الانصاری، طبرانی - حضرت ابو الدرداء، طبرانی، حضرت ام سلمہ، طبرانی - حضرت عمار، ترمذی - حضرت زید بن ثابت، دار قطنی - حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوداؤد،

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ احادیث متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں پیروں کو دھوتے تھے اور عہد صحابہ سے لے کر اس وقت تک امت کا یہی عمل ہے۔ اور پوری امت کا یہ عمل خود ایک بہت بڑی طاقتور دلیل ہے جس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ دلیل عمل بہ نسبت دلیل قول کے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر قرأت جر کے بارے میں شارحین قرآن کا موقف کیا ہے؟ شارحین قرآن نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔

لفظ مسح غسل خفیف کے معنے میں ہے

اس آیت میں ارجلکم کا عطف تو برؤسکم پر ہے لیکن مسح سے مراد غسل خفیف ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں لفظ مسح کا اطلاق غسل خفیف پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام قرطبی نے ابوزید انصاری سے نقل کیا ہے کہ اہل عرب جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے نماز کے لیے وضو کیا تو بولتے ہیں تمسحت للصلاۃ نیز جب کہنا ہوتا ہے کہ وضو کے لیے پانی لاؤ تو بولتے ہیں ھات ما اتمسح بہ للصلاۃ وہ چیز لاؤ جس سے میں وضو کر لوں۔ امام ابوحاتم کہتے ہیں کہ وضو کو مسح کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وضو کرنے والا محض پانی بہا لینے سے خوش نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے اعضاء پر ہاتھ نہ پھیر لے۔ یہ محاورات کہہ رہے ہیں کہ مسح کا اطلاق غسل خفیف پر بھی ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں سر کے مسح سے سر پر تر ہاتھ پھیرنا اور مسح رجلین سے غسل خفیف مراد ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے پیروں کے مسح میں الی الکعبین کی قید لگائی ہے۔ اگر سر اور پیروں کے مسح کی نوعیت یکساں ہوتی تو یہ قید نہ ہوتی۔ جیسے سر کو بلا تعیین مقدار بیان کیا گیا ہے اسی طرح پیروں میں بھی کوئی حد اور مقدار نہ ہوتی۔

میں کعبین کی قید اور سر کا ذکر بلا قید صاف طور پر بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ ہاتھوں اور پیروں کا حکم ایک ہے اور سر کا حکم ان سے مختلف ہے۔ یہاں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ منہاج السنہ میں بڑی پتے کی بات لکھ گئے کہ عربی زبان میں لفظ مسح بمنزلہ جنس ہے۔ اس کے نیچے اس کی دو نوعیں ہیں ایک اسالہ دوسرے اصابہ، وسالہ کے معنے بہانا اور اصابہ کے معنے لگانا ہیں۔ اصل لغت کے اعتبار سے لفظ مسح دونوں معنے میں آتا ہے جیسے لفظ ذوی الارحام لغت کے اعتبار سے اصحاب الفرائض اور عصبات دونوں معنے میں آتا ہے مگر چونکہ عرف فقہ میں ذوی الفروض اور عصبات خاص قسم کے وارثوں کو کہتے ہیں، اس لیے لوگوں کی سوچ یہ ہو گئی کہ لفظ ذوی الارحام، ذوی الفروض اور عصبات دونوں ذوی الارحام کی قسم ہیں۔ عرف میں چونکہ عصبات ایک خاص نام سے پکارے جانے لگے اس لیے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ لفظ ذوی الارحام عصبات کا قسیم اور مقابل ہے۔ جیسے لفظ حیوان اصل لغت کے لحاظ سے انسان کو بھی شامل ہے مگر عرف میں غیر انسان کے لیے حیوان بولا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح لفظ مسح اصل لغت کے اعتبار سے عرفی مسح یعنی اصابہ اور غسل یعنی اسالہ دونوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وامسحوا کے تحت دو چیزوں کا ذکر کیا۔ ایک رؤسکم یعنی سروں کا جس میں مسح سے اصابہ عرفی معنے مراد ہیں۔ دوسرا ارجلکم اس میں مسح سے غسل یعنی اسالہ مراد ہے یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن میں ذو معنی لفظ کیوں استعمال ہوا ہے۔ اور دل کا پتہ نہیں لیکن علامہ زمخشری نے اس موقعہ پر جو بات بتائی ہے وہ سنانا چاہتا ہوں پاؤں ان تین اعضاءِ مغسولہ میں ہے جو کہ پانی بہا کر دھوئے جاتے ہیں اس لیے اس میں احتمال تھا کہ کہیں اسراف کا ارتکاب نہ ہو جائے جس کی قرآن میں ممانعت ہے اس لیے مغسول کا ممسوح پر عطف کر دیا۔ اور اشارہ کر دیا کہ پانی کے استعمال میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے اور ممکن ہے کہ کوئی گمان کر بیٹھے کہ پاؤں کا مسح ہونا چاہیے اسی گمان کو ختم کرنے کے لیے الی الکعبین کی قید لگا دی ہے۔

ارجلکم جوار کی وجہ سے مجرور ہے

بے شک ارجلکم میں جر کی قرأت آئی ہے اور اس کا عطف لفظ رؤسکم پر ہے لیکن معنے اس کا عطف وجوھکم وایدیکم پر ہے اور پاؤں اعضاءِ مغسولہ کے ساتھ وجوب غسل میں شریک ہے اور قرأت جر میں ارجلکم جوار کی وجہ سے مجرور ہے۔ یعنی رؤسکم کے پڑوس اور قرب ہونے کی وجہ مجرور ہے ورنہ فی الواقع اس کا پیوند وجوھکم وایدیکم سے ہے۔

قرآن اور کلام عربی میں جر جوار کی بکثرت مثالیں ہیں۔ مثلاً سورہ رحمان میں ہے یرسل علیکما شواظ من نار و نحاس اس آیت میں نحاس کو مجرور نار کے جوار کی وجہ سے پڑھا گیا ہے ورنہ اصل میں اس کا عطف شواظ پر ہے اور سورہ بروج میں ہے بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ۔ اس آیت میں لفظ محفوظ کو مجرور محض جوار کی وجہ سے پڑھا گیا ہے ورنہ اصل میں قرآن کی صفت ہے اور مرفوع ہے۔ ایک اور آیت ہے عذاب یوم محیط اس میں لفظ محیط کو یوم کے جوار کی وجہ سے پڑھا گیا ہے ورنہ فی الواقع محیط عذاب کی صفت ہے۔

امرء القیس کا شعر ہے۔

کانّ ابانا فی افانین ودقہ   کبیر اناس فی بجاد مزمّلِ

اس شعر میں مزمل کو محض جوار کی وجہ سے مجرور پڑھا گیا ہے ورنہ یہ بجاد کی صفت نہیں بلکہ کبیر کی ہے۔ عربی امثال میں بھی جر جوار کی مثالیں موجود ہیں مثلاً یہ مثل مشہور ہے جحرُ ضبٍ خربٍ ضب کا جر محض جوار کی وجہ سے ہے ورنہ خرب دراصل جحر کی صفت ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جر جوار عربی زبان میں عام ہے۔ تمام ائمہ لغت اور نحو میں کلام فصیح میں اس کے استعمال کے قائل ہیں سوائے زجاج کے کہ وہ اسے نہیں مانتا۔ ٹھیک اسی طرح قرآن کی اس آیت میں لفظ ارجلکم جوار کی وجہ سے مجرور ہے ورنہ فی الواقع وہ منصوب ہے۔

آئیے ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے۔ ہم مانتے ہیں کہ بظاہر میں وارجلکم کا عطف رؤسکم پر ہے لیکن اس کے باوجود حکم دونوں کا مختلف ہے کیونکہ عربی زبان میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ایک شے کا دوسری شے پر عطف ہوتا ہے مگر حکم میں دونوں مختلف ہوتے ہیں، اور یہ صورت وہاں ہوتی ہے کہ جہاں دو فعل متقارب المعنے ہوتے ہیں اور ہر ایک کا متعلق اور معمول جداگانہ ہوتا ہے ایسے موقع پر ایک فعل کو حذف کر دیتے ہیں مگر اس کے معمول اور مفعول کا فعل مذکور کے معمول پر عطف کر دیتے ہیں۔ بظاہر معطوف، معطوف علیہ کے ساتھ حکم میں شریک ہوتا ہے اور مفعول کو فعل مذکور کے معمول پر عطف کر دیتے ہیں۔ علامہ جمال الدین القاسمی نے محاسن التاویل میں الانتصاف کے حوالے سے لکھا ہے کہ بظاہر معطوف معطوف علیہ کے ساتھ حکم میں شریک ہوتا ہے لیکن باعتبار معنے مختلف ہوتا ہے جیسے ایک شاعر کہتا ہے:

یالیت بعلک قد غدا   متقلدا سیفا و رمحاً

اس شعر میں ورمحاً کا عطف بظاہر سیفاً پر ہے جو متقلدا کا مفعول ہے لیکن حقیقت میں

رمحا متقلدا کا مفعول نہیں ہے کیونکہ تیر گلے میں ڈالنے کی چیز نہیں۔ اصل بات یوں ہے کہ متقلدا سیفا وحاملا رمحا یعنی تلوار گلے میں ڈالے ہوتے اور نیزہ ہاتھ میں اٹھائے ہوتے۔ لیکن چونکہ حاملا اور متقلدا معنے کے لحاظ سے قریب قریب تھے اس لیے حاملا کو حذف کر دیا اور حاملا کے مفعول کا عطف متقلدا کے مفعول پر کر دیا۔ صاحب انتصاف لکھتے ہیں کہ شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش محسوس ہو کہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایسا ایجازاً اختصاراً اور کلام کو مؤکد بنانے کے لیے کیا جاتا ہے جیسے ہی اس آیت میں کیا گیا ہے اصل بات اس طرح تھی وامسحو برؤسکم واغسلوا ارجلکم چونکہ غسل اور مسح دونوں معنے کے اعتبار سے قریب قریب تھے اس لیے واغسلوا کو حذف کر کے اس کے مفعول ارجلکم کا عطف برؤسکم پر کر دیا۔

امام شافعی کی رائے

امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں قراتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے ہر قرات میں ایک جداگانہ حالت کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ قراتِ جر جس سے مسح قدمین معلوم ہوتا ہے یہ حکم اس حالت میں ہے کہ جب قدمین پر خفین ہوں یعنی جس حالت میں موزے پہنے ہوتے ہو تو مسح رجلین کرے اور اگر پیروں میں موزے نہ ہوں تو ایسی حالت میں غسل قدمین فرض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دو قراتیں دو حالتوں پر محمول ہیں۔ اس لیے کہ عقلاً یہ ناممکن ہے کہ وقت واحد اور حالت واحد میں عضو واحد کا غسل بھی فرض ہو اور مسح بھی فرض ہو۔ معلوم ہوا کہ ان دو قراتوں میں دو مختلف حالتوں کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ علامہ بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ فخر الاسلام بزدوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ توجیہ نہایت لطیف ہے اور فرماتے ہیں کہ قراتِ جر میں الی الکعبین کا لفظ مسح کی غایت نہیں اس لیے کہ مسح تو ظاہر خفین پر کافی ہے۔ کعبین تک مسح کرنا بالاجماع ضروری نہیں ہے بلکہ یہ تخفف کی غایت ہے کہ جو سیاق کلام سے معلوم ہو رہی ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ پیروں پر مسح کر لیا کرو بشرطیکہ تم ٹخنوں تک موزے پہنے ہوتے ہو اور اگر موزہ ٹخنوں سے نیچے ہو تو پھر موزوں پر مسح درست نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ پیر کھلے ہوں تو ان کو دھو لینا چاہیے اور اگر پیروں پر موزے ہوں تو مسح کر لینا چاہیے۔

مسح علی الخفین تاریخ کی روشنی میں

چونکہ آیت قرآنی ضمناً مسح علی الخفین کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ و فقہ کی روشنی میں اس کا حکم بھی معلوم کر لیا جائے۔

مسح علی الخفین کے موضوع پر متعدد احادیث آئی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے۔ شرح مسلم میں امام نووی رقمطراز ہیں کہ مسح علی الخفین کو روایت کرنے والے ان گنت صحابہ ہیں۔ امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ مجھ سے ستر صحابہ کرام نے بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسح علی الخفین کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں کہ حفاظ محدثین نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخفین تاریخ و روایت میں متواتر ہے۔ کچھ لوگوں نے ۸۰ تک تعداد بتائی ہے۔ ابن المنذر نے عبد اللہ ابن المبارک سے نقل کیا ہے کہ مسح علی الخفین کے موضوع پر صحابہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بات صاف طور پر تاریخ میں بتائی گئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مائدہ کی یہ آیت نازل ہونے کے بعد مسح الخفین کیا۔ چنانچہ امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی نے جریر کی یہ حدیث لکھی ہے کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجیٰ فرمایا۔ پھر وضو کیا اور پھر خفین پر مسح کیا۔ پوچھنے والے نے جریر سے دریافت کیا کہ تم بھی ایسا ہی کرتے ہو، انہوں نے جواباً کہا کیوں نہیں، ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو میں مسح علی الخفیں کرتے دیکھا ہے۔

امام ابو داؤد کہتے ہیں کہ جب جریر سے یہ دریافت کیا گیا کہ کیا یہ بات نزول مائدہ سے پہلے کی ہے یا بعد کی تو انہوں نے کہا کہ میں تو مسلمان ہی نزول مائدہ کے بعد ہوا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو کہتے ہیں کہ مسح علی الخفیں نزول مائدہ سے پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا۔ واقعہ یہی ہے کہ تاریخ و روایت میں مسح علی الخفین متواتر روایات سے ثابت ہے۔

مسح علی الخفین فقہ کی روشنی میں

فقہائے مذاہب کی حد تک اہل السنۃ قاطبۃً اس پر متفق ہیں کہ مسح علی الخفیں جائز ہے

حافظ ابن عبدالبر رقمطراز ہیں کہ مجھے مسح علی الخفین کے موضوع پر امام مالک کو چھوڑ کر فقہاء سلف میں سے کسی کا انکار اور مخالفت معلوم نہیں ہے۔ علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے کہ مسح کے موضوع پر تین راہیں ہیں ایک یہ مطلقاً جائز ہے یہی جمہور کا مسلک ہے، دوسرے یہ کہ سفر میں جائز ہے، تیسرے یہ کہ مطلقاً ناجائز ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں رقمطراز ہیں کہ مسح علی الخفین کا سنت ہونا اس کا متواتر ہونا اور امام مالک کو چھوڑ کر سلف کا اس پر متفق ہونا محتاج دلیل نہیں ہے۔ صرف شیعہ میں سے امامیہ اور خوارج کہتے ہیں کہ مسح علی الخفین جائز نہیں ہے۔ استدلال آیت وضو سے کرتے ہیں اور تعلیم وضو کے موقع پر حضور کے اس ارشاد سے کہ اغسل رجلیک اپنے پاؤں دھوؤ۔ اور آیت مائدہ سے مسح علی الخفین کو منسوخ بتاتے ہیں۔ علامہ شوکانی نے ان کے دلائل کا مبسوط جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس آیت کے ذریعے مسح علی الخفین کو منسوخ کہنا بہت بڑی جرأت ہے۔ آیت قرآنی میں عموم ہے، احادیث خفین اس کی مخصص ہیں اس لیے نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اصول میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ عام کی بعض خاص پر مطلق رکھی جاتی ہے یہ کہنا کہ بعد میں آنے والا عموم ناسخ ہوتا ہے۔ اس وقت تک مفید مدعا نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ آیت قرآنی بعد میں نازل ہوئی ہے اور اس کے نزول کے بعد مسح ثابت نہیں ہے۔ جریر کی سابقہ روایت اس معاملہ میں حرف آخر ہے اور یہ کہنا کہ حضرت جریر حضرت علی سے الگ ہو گئے تھے غلط، بلاریب وہ حضرت علی کے ساتھ ہی تھے۔ معاویہ کے پاس کسی وجہ سے رک ضرور گئے تھے اس لیے ان اعذار باردہ کی بنا پر ایسے جلیل القدر صحابی کی جامہ تلاشی کچھ مناسب اقدام نہیں ہے۔ حافظ عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ آیت مائدہ غزوہ مریسیع میں نازل ہوئی حدیث مغیرہ کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے اور تبوک بالاتفاق بعد میں ہے۔

مسح علی الخفین کی شرط

خفین پر مسح کے جواز کی اہم ترین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ان کو باوضو پہنا جائے۔ حضرت مغیرہ کی جو حدیث صحیحین میں آتی ہے اس میں تصریح ہے کہ

> میں ایک رات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا، وضو کے لیے پانی پیش کیا۔ آپ نے چہرہ اور دونوں ہاتھ دھوئے اور سر کا مسح کیا۔ میں نے چاہا کہ پیروں سے موزے نکال دوں۔ آپ نے فرمایا کہ مغیرہ ان کو رہنے

تھے میں نے باوضو پہنے تھے پھر آپ نے ان پر مسح کر لیا۔

اور امام حمیدی نے اپنے مسند میں جو حضرت مغیرہ سے روایت کی ہے اس میں ہے کہ

ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا کوئی شخص خفین پر مسح کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کیوں نہیں ضرور کر سکتا ہے بشرطیکہ باوضو پہنے ہوں۔

امام احمد ابن خزیمہ، ترمذی اور نسائی نے مشہور صحابی حضرت صفوان بن عسال کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خفین پر اس وقت مسح کریں جب ان کو باوضو ہو کر پہنیں، سفر میں تین دن رات اور حضر میں ایک دن رات۔ اور جنابت کے سوا کسی حالت میں نہ اتاریں۔

جمہور علماء نے مسح کے جواز کے لیے ان ارشادات نبوت کی وجہ سے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر موزے وضو کر کے پہنے جائیں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔ داؤد ظاہری کو چھوڑ کر سب کا اس پر اتفاق ہے

خفین میں مقام مسح

مسح موزوں کے بالائی حصے کا کیا جاتا ہے نچلے حصہ کا مسح نہیں ہے۔ ابو داؤد اور دارقطنی نے حضرت علی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے اور حافظ عسقلانی نے بلوغ المرام اور التلخیص میں اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

دین میں اگر رائے کی گنجائش ہوتی تو موزوں کا مسح نچلے حصہ کا ہونا چاہیے تھا نہ کہ بالائی حصہ کا۔ میں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے بالائی حصے کا مسح کرتے دیکھا ہے۔

مسند احمد، ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ

میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ موزوں کے بالائی حصہ کا مسح کر رہے تھے۔

اس لیے جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ موزوں میں مسح کے لیے بالائی حصہ کا مسح کافی ہے اور یہی مشروع ہے۔ اگرچہ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ بالائی اور زیریں دونوں حصوں کا مسح ضروری ہے اور اس سلسلے میں وہ ابو داؤد و ترمذی اور دارقطنی کی حضرت مغیرہ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں

جن میں موزوں کے بالائی اور زیریں حصے کے مسح کرنے کی تصریح ہے۔ لیکن محققین کے یہاں مغیرہ کی یہ حدیث روایتی نقطہ نظر سے ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابوزرعہ اور امام بخاری اسے صحیح نہیں مانتے ہیں۔ اس لیے موزوں کے بالائی حصہ کا مسح ہی مشروع ہے۔

موزوں کے مسح کی مدت۔

اس سے پہلے صفوان بن عسال کے حوالے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن چکے ہو کہ حالت سفر میں مدت مسح تین دن رات اور حالت حضر میں ایک دن رات ہے۔ مسند امام احمد، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے شریح بن ہانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

> میں نے حضرت عائشہ سے مسح علی الخفین کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت علی سے دریافت کرو وہ اس بارے میں مجھ سے زیادہ عالم ہیں کیونکہ وہ حضور کے ساتھ سفر میں ہوتے تھے۔ میں نے حضرت علی سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسافر کے لیے تین دن رات اور مقیم کے لیے ایک دن رات مسح کی مدت ہے۔

امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان نے حضرت خزیمہ ابن ثابت کے حوالے سے بتایا ہے کہ

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدت مسح کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مسافر کے لیے تین دن رات اور مقیم کے لیے ایک دن رات مدت مسح ہے۔

اس لیے جمہور علماء سلف کا یہی فیصلہ ہے کہ مدتِ مسح مسافر کے لیے تین دن رات اور مسافر کے لیے ایک دن رات ہے۔

اعمالِ وضو کا مسنون پیمانہ

قرآن کی اس آیت میں وضو کے چار فرض بتلائے گئے ہیں، اول منہ دھونا، دوسرے کہنیوں سمیت ہاتھ دھونا، تیسرے سر کا مسح اور چوتھے پاؤں کا دھونا، قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے اور یہ علم نبوت ہے۔ اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف علم سے نہیں بلکہ علم و عمل کے دونوں کمالوں سے نوازا ہے۔ بحیثیت ایک بشر کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ

درحقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ جو حکم آپ پر اتارا گیا۔ آپ نے خود کرکے اس کو بتایا۔ وضو، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، جہاد، ایثار و قربانی، عزم، استقلال، صبر و شکر ان کے علاوہ اور حسن عمل، حسن اخلاق کی باتیں جس قدر قرآن نے بتائیں ان کے لیے سب سے پہلے آپ نے اپنا ہی نمونہ پیش کیا۔ جو کچھ قرآن میں منشا الٰہی تھا وہ سب مجسم ہو کر آپ کی زندگی میں منظر آیا اور اس طرح کمال علم اور کمال عمل کا آپ کو اللہ نے نمونہ بنا دیا۔ اور اسی کی پیروی کا نام اسلام ہے۔ نماز کی طرح وضو کے اعمال کی بھی آپ نے تفصیل بتائی ہے مثلاً وضو کے آغاز میں نیت، بسم اللہ کہنا دائیں جانب سے آغاز کرنا، مسواک کرنا، پے در پے کرنا، ترتیب سے کرنا، آغاز میں پہنچوں تک ہاتھ دھونا، ہر عضو کو تین بار دھونا، کلی کرنا، ناک میں پانی دینا، پورے سر کا مسح کرنا، کانوں کا مسح کرنا، وضو کے بعد دعا پڑھنا وغیرہ وہ اعمال ہیں جن کے ذریعے نبوت نے نماز کی طرح وضو کی تکمیل فرمائی ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک وضو میں یہ سب اعمال سنت ہیں فرض صرف وہ چار ہیں جن کی قرآن نے رہنمائی کی ہے اور جن اعمال کی نبوت نے رہنمائی کی ہے وہ سب سنت ہیں۔

امام احمد، بخاری و مسلم نے حضرت عثمان بن عفان کے حوالے سے جو وضو کا مسنون طریقہ بتایا ہے یہ ہے کہ:

> حضرت عثمان نے وضو کے لیے پانی طلب فرمایا، آپ نے تین بار اول ہاتھ دھوئے پھر آپ نے تین بار کلی کی، تین بار ناک کو پانی سے صاف کیا، پھر تین بار چہرہ دھویا پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک تین بار دھویا۔ پھر سر کا مسح کیا۔ پھر آپ نے تین بار پاؤں دھوئے، پھر فرمایا کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔ حضور نے وضو کے بعد فرمایا تھا جو شخص میرے وضو کی طرح وضو کرے گا، پھر دو رکعت نماز پڑھے گا جس میں اپنے جی سے کوئی بات دنیا کی ذکر نہ کرے گا اللہ اس کے گناہ بخش دے گا۔

اس کردار میں تمام سنتوں کا استیعاب نہیں باقی سنتیں دوسری احادیث سے معلوم ہوتی ہیں

مثلاً:

وضو میں نیت کرنا

مالک، شافعی، احمد، لیث بن سعد اور اسحاق بن راہویہ وضو میں نیت کو شرط اور

فرض کا درجہ دیتے ہیں۔ الجصاص نے امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ بتایا ہے کہ ہر طہارت جو پانی سے وجود میں آتی ہو وہ کسی نیت کی محتاج نہیں ہے۔ یہی ابو یوسف، امام محمد اور امام ثوری کا مذہب ہے امام اوزاعی بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ بدایۃ المجتہد میں علامہ ابن رشد نے امام مالک، شافعی اور امام احمد کا مذہب یہ بتایا ہے کہ وضو میں نیت شرط ہے۔ ان بزرگوں کا استدلال اس ارشادِ نبوت سے ہے جو حضرت عمر کے حوالے سے حدیث کی متعدد کتابوں میں آیا ہے۔

> سارے اعمال معتبر نیت سے ہیں اور ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ وہ شخص جس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو یا نکاح کی خاطر عورت کی طرف ہو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوگی۔

امام ابو حنیفہ کو اس ارشادِ نبوت کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں مگر وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق مقاصد سے ہے وسائل سے نہیں۔ وضو عبادات میں مقاصد سے نہیں بلکہ وسائل سے تعلق رکھتی ہے یعنی وضو وسیلۂ عبادت ہے اسی بنا پر وضو کی نذر نہیں مانی جا سکتی ہے کیونکہ منذور کے لیے مقاصد میں سے ہونا ضروری ہے اور پھر اس ارشاد کی حیثیت آحاد کی ہے اور آحاد میں قطعیت نہیں ظنیت ہوتی ہے اور کسی چیز کے فرض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر دلیل کی قطعیت ہو اور معلوم ہے کہ قرآن اس باب میں خاموش ہے قرآن نے صرف چار ہی فرض وضو میں بتاتے ہیں۔ فرض کی حیثیت کسی کو بھی ان چار کے علاوہ دینا یہ قرآن پر اضافہ ہے۔ ارشادِ نبوت سے ہم واجب، سنت اور مستحب کو ثابت کر سکتے ہیں مگر فرض کے لیے قرآن کا منطوق ناگزیر ہے۔

وضو کے آغاز میں بسم اللہ کہنا

اس موضوع پر مختلف ارشاداتِ نبوت آئے۔ اگرچہ روایتی اعتبار سے ان کا کچھ مقام زیادہ بلند نہیں مگر علماء نے ان ارشادات کے مجموعہ سے بسم اللہ کی سنت بتائی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رقمطراز ہیں کہ تاریخی لحاظ سے اگرچہ ان کی منفرداً کچھ زیادہ اہمیت نہیں، مگر ان کی مجموعی حیثیت بتاتی ہے کہ اس کی کچھ اصل ضرور ہے۔ کچھ بزرگوں نے اگرچہ اسے واجب کہا ہے۔ احناف میں شیخ ابن الہمام نے بسم اللہ کہنے کو واجب قرار دیا ہے لیکن اکثر علماء نے سنت ہی بتایا ہے

وضو کے آغاز میں بسم اللہ کے علاوہ ذکر کا کوئی پیمانہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں. ایسے وضو کے دوران مختلف اعضاء کو دھوتے وقت ذکر کا کوئی پیمانہ حضور سے ثابت نہیں۔ مجالس الابرار میں ملا احمد رومی نے اور زاد المعاد میں حافظ ابن القیم نے اس کی تصریح کی ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ

ذکر کا ہر پیمانہ بسم اللہ کے علاوہ اور اذکار وضو کی ہر حدیث موضوع ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع پر نہ کچھ فرمایا ہے اور نہ اُمت کو تعلیم دی ہے۔

ہاں وضو کے اختتام پر ذکر کا یہ پیمانہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ، اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطہرین

مسند احمد، بخاری اور مسلم میں حضرت عمر بن الخطاب کے حوالہ سے یہ ارشاد آیا ہے کہ:

جو شخص تم میں سے وضو کرے گا اور پوری کرے گا اور پھر یہ کہے گا کہ اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھلے ہوں گے جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔

اور باقی حصہ یعنی اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطہرین ترمذی کی روایت میں آتا ہے۔ اور امام نسائی نے عمل الیوم واللیلہ میں اس کے بعد یہ اضافہ بھی لکھا ہے

سبحانک اللھم وبحمدک اشہد ان لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک

اگرچہ مرفوعاً ضعیف ہے لیکن موقوفاً امام نسائی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

وضو میں مسواک

علماء نے وضو میں مسواک کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ مسواک وضو کی سنت ہے یا نماز کی۔ امام احمد اس کو نماز کی سنت بتاتے ہیں جبکہ امام ابو حنیفہ اسے

وضو کی سنت کہتے ہیں۔ بعض بزرگوں نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ مسند احمد، بخاری، مسلم اور سنن اربع میں حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے یہ ارشاد نبوت آیا ہے،

اگر میں اپنی امت پر مشقت محسوس نہ کرتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

اور امام بخاری نے تعلیقاً یوں لکھا ہے کہ میں ان کو ہر وضو کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔ مسند احمد اور نسائی میں حضرت عائشہ کے حوالے سے یہ ارشاد بھی آیا ہے کہ،

مسواک منہ کو صاف کرنے والی ہے اور اللہ کو راضی کرنے کا ذریعہ ہے۔

صحاح اور سنن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کا یہ بیان بھی آیا ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہونے کے وقت دن ہو یا رات اور گھر میں داخل ہونے کے وقت مسواک کرتے تھے

بہرحال مسواک کرنا سنت ہے اور مقصود دانتوں کو آلائش سے صاف کرنا ہے اور یہ مقصد جس ذریعے سے حاصل ہو جائے جائز ہے لیکن مسواک ہونا افضل ہے اس کی فضیلت میں کبھی علماء دو رائے نہیں ہوتی ہیں

حدث اکبر یعنی غسل جنابت

۳۰۴ - اگر تم حالت جنابت میں ہو تو خوب پاک ہو۔ یعنی جنابت سے پاک ہونے میں صرف اعضاء بار بار دھو لو، کافی نہیں ہے۔ سطح بدن کے جس حصے تک پانی بدون تعذر کے پہنچ سکتا ہو وہاں تک پہنچانا ضروری ہے اسی لیے حنفیہ غسل جنابت میں مضمضہ اور استنشاق کو بھی ضروری کہتے ہیں۔ وضو میں ضروری نہیں سنت ہے۔[1]

سورۃ نساء میں غسل جنابت کا ذکر آداب زندگی کے سلسلے میں تھا۔ یہاں اس کا ذکر کرنے کا منشاء یہ ہے کہ یہ نماز کے لیے تمہیدی فعل ہے۔ نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔ حدث اصغر سے اور حدث اکبر سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کی تیاری کرو اور تم حالت جنابت میں ہو تو خوب پاک ہو جاؤ۔ یعنی اس طرح غسل کرو کہ جہاں جہاں تک پانی پہنچانا ممکن ہو وہاں پانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہنچاؤ۔ اصل ارشاد میں فاطّھروا آیا ہے۔ یہ طہارت سے مبالغہ ہے۔ طہارت کے معنے پاک ہونا اور اطّہر کے معنے خوب پاک ہونا ہے۔ غالباً اسی انداز بیان سے امام اعظم ابوحنیفہ نے غسل جنابت میں مضمضہ کلی کرنا اور استنشاق ناک میں پانی دینا کو فرض بتایا۔ یہ دونوں وضو میں سنت ہیں کیونکہ وضو میں صرف چہرہ دھونے کا حکم ہے اور یہاں غسل میں خوب پاک ہونے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ وضو میں اگرچہ صرف ظاہری چہرہ کا دھولینا کافی ہے کیونکہ وجہ مواجہت سے نکلا ہے، غسل میں خوب پاک ہونے کا حکم ہے کیونکہ فاطّھروا میں معنوی مبالغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسم کے دھونے میں اتنا مبالغہ کرو کہ ایک بال بھی باقی نہ رہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہے۔ اور اس کی وجہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بتائی ہے کہ جنابت کی حالت میں انسان کا رُواں رُواں غرق لذت ہوتا ہے اس لیے ازالہ جنابت کے لیے رویں رویں کا دھونا فرض کیا گیا ہے۔ بخلاف وضو کے جس کا سبب حدث اصغر ہے یعنی پیشاب اور پاخانہ وغیرہ۔ ان میں جنابت جیسی نہ لذت ہوتی ہے اور نہ غفلت۔

جنابت کی دو صورتیں

جنابت کے معنے ناپاکی کے ہیں اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ منی خارج ہو جائے خواہ بحالت بیداری ہو یا سوتے ہوئے، اور دوسرے یہ کہ مرد و عورت کی مجامعت خواہ اس میں انزال ہو یا نہ ہو۔ پہلی حالت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بلیغ انداز میں پیش فرمایا اس کا ذکر صحیح مسلم میں بحوالہ ابوسعید خدری اس طرح آیا ہے کہ انما الماء من الماء یعنی غسل واجب ہوتا ہے پانی کے نکلنے سے خواہ اس کا سبب کچھ ہو۔ اور دوسری حالت کے لیے آپ کا یہ ارشاد ہے کہ اذا التقی الختانان وجب الغسل، عورتوں کی مجامعت سے غسل واجب ہوتا ہے اور مسلم میں تصریح ہے وان لم ینزل خواہ انزال نہ ہو۔ جمہور کا یہی مذہب ہے اور ظاہر قرآن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جنابت خواہ مباشرت سے لاحق ہوئی ہو یا خواب میں مادہ منویہ خارج ہونے کی وجہ سے۔ دونوں صورتوں میں غسل واجب ہے۔ اس حالت میں غسل کے بغیر نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا اور قرآن کو ہاتھ لگانا سب ناجائز ہے۔ بہرحال جمہور کا مذہب یہی ہے کہ دونوں حالتوں میں غسل واجب ہے۔

آیت میں نماز کی یہ شرط بتائی گئی ہے کہ جنابت سے پاک ہو۔ بغیر غسل کے نماز پڑھنی جائز نہیں ہے کیونکہ جنابت کا کسل اور انقباض اس انشراح صدر اور حضور قلب کے منافی ہے

جو نماز کے لیے مطلوب ہے جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔

اس آیت میں غسل کا حکم ہے لیکن غسل کے طریقہ سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سبحانہ نے قرآن کا مبین بنایا ہے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کا طریقہ بتایا ہے۔ حضور انور کی ازواج مطہرات کے ذریعے آپ کے غسل کا جو طریقہ نقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے یہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

> حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت فرماتے پہلے ہاتھ دھوتے پھر وضو فرماتے پھر تین بار سر پر پانی ڈالتے، پھر اپنے بدن مبارک کو دھوتے۔

اس کی مزید توضیح بخاری میں اس طرح آئی ہے:

> حضرت میمونہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کے غسل کے لیے پانی رکھا۔ آپ نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے پھر استنجا کیا، پھر زمین پر ہاتھ مارا اور مٹی سے ہاتھ صاف کیے ان کو دھویا، پھر غرارے کیے اور ناک میں پانی دیا، چہرہ دھویا، سر پر پانی ڈالا، پھر آپ نے پیر دھوئے۔

سنن ابو داؤد میں حضرت علی کے حوالے سے ہے:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو غسل جنابت میں ایک بال برابر چھوڑتا ہے وہ غسل نہیں کرتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جنابت میں خوب صفائی کرنا ضروری ہے۔

پانی نہ ہو تو تیمم کافی ہے

۳۰۵۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آتے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو پھر تمہیں پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اس طرح کہ اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کو مسح کر لو۔ یعنی بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو یا سفر میں پانی بقدر کفایت نہ ملے یا مثلاً کوئی قضائے حاجت کر کے آئے اور وضو کی ضرورت ہے یا جنابت کی وجہ سے غسل ناگزیر ہے مگر پانی کے حاصل کرنے میں یا استعمال کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہ ہو، تو ان صورتوں میں وضو یا غسل کی جگہ تیمم کرے۔ وضو اور غسل دونوں کے تیمم میں کوئی فرق

نہیں ہے مگر تیمم کی مشروعیت سے جو غرض ہے وہ بہر صورت یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے۔ تیمم کے اسرار و مسائل اور اس آیت کے فوائد پانچویں پارے کے تیسرے رکوع میں مفصل گزر چکے ہیں حضرت شیخ الہند نے لامستم النساء کا جو ترجمہ کیا ہے کہ پاس گئے ہو عورتوں کے وہ محاورے کے اعتبار سے حالت جنابت ہی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ترجمہ ابن عباس اور ابو موسیٰ اشعری کی تفسیر کے موافق ہے جسے ابن مسعود نے بھی سکوتاً تسلیم کیا ہے کما فی البخاری، نیز حضرت شیخ الہند نے تیمموا کے ترجمہ میں قصد کرو کہہ کر اشارہ فرما دیا کہ اصل لغت کے اعتبار سے تیمم کے معنے میں قصد معتبر ہے اور اس لغوی معنے کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے تیمم شرعی میں بھی قصد یعنی نیت کو علماء نے ضروری قرار دیا ہے[1]

تیمم کے لغوی و شرعی معنے، صعید کی لغوی تحقیق، تیمم کا مسنون طریق، تیمم میں مسح کے اعضاء وغیرہ ہم جلد پنجم میں سورہ نساء کے نوٹ نمبر ۴۰ میں تفصیل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ فلم تجدوا ماء میں پانی نہ ملنے کا مطلب پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونا ہے خواہ یہ بسبب بیماری کے خواہ بسبب فاصلے کے یا کسی اور سبب سے ہو۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ پانی پر قدرت نہ ہو، سردی لگ جانے کا اندیشہ، بیماری بڑھ جانے کا خوف، پانی لانے میں بہت زیادہ دشواریاں، یہ سارے چیزیں پانی نہ ملنے کے حکم میں ہیں۔ حدیث میں تصریح ہے کہ عمرو بن العاص نے پانی ہوتے ہوئے بھی تیمم کر لیا۔ اس لیے کہ پانی سے انہیں سردی لگ جانے کا اندیشہ تھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی۔ حنفیہ کے یہاں سردی کے عذر پر بجائے غسل کے تیمم کر لینا بالکل جائز ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا فتویٰ یہی ہے کہ جس کو پانی سے سردی لگتی ہو اسے غسل کی جگہ تیمم کر لینا جائز ہے۔ تیمم کے ساتھ نماز با جماعت میں شرکت کی بھی حدیث میں اجازت ہے قرطبی نے بخاری کے حوالے سے لکھا ہے،

ایک شخص کو حضور نے نماز کی جماعت سے الگ بیٹھے دیکھا۔ آپ نے دریافت کیا کہ نماز میں کیوں نہیں ملے، بولے کہ میں حالت جنابت میں ہوں اور پانی نہیں ہے، فرمایا کہ تیمم کر لو، یہی کافی ہے۔

فقہاء نے یہاں تک بات کھول دی ہے کہ پانی ملتا ہے لیکن بہت گراں قیمت پر ملتا ہے یا موجود تو ہے لیکن اتنی کم مقدار ہے کہ پینے کے لیے نہ بچ سکے گا تو ایسے موقع پر پانی کا ہونا،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے نہ ہونے کے برابر ہے اور تیمم بالکل درست ہے۔ چنانچہ الجصاص نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے اس لیے فلم تجدوا ماءً کا مطلب یہ ہے کہ تم پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ پانی نایاب ہے یا اس لیے کہ ایک میل دور ہے یا اس لیے کہ اس کے استعمال سے بیمار ہو جائے گا یا پیاس کا اندیشہ لاحق ہو جائے گا۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مسافر کے لیے جواز تیمم کی شرط یہ ہے کہ وہ پانی تلاش کرے۔ ساتھیوں سے مانگے، اگر بیابان میں ہو تو دور تک نظر دوڑائے۔ اگر درمیان میں ٹیلہ یا دیوار ہو اس کے پار جائے کیونکہ قرآن نے فلم تجدوا ماءً فرمایا ہے کہ نہ پانے کا مصداق وہی ہو سکتا ہے جو طلب اور جستجو کرے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کی ملک میں پانی نہ ہو وہ فلم تجدوا ماءً کا مصداق ہے۔ اگر پانی پاس موجود نہیں ہے، کسی سے مانگنا شرط نہیں ہے پتہ کی بات یہ ہے کہ قرآن نے بیمار اور مسافر کو تیمم کی رخصت دی ہے۔ بیمار کو اس لیے کہ پانی تو موجود ہے مگر نقصان دیتا ہے اور مسافر کو اس لیے کہ پانی کا حاصل کرنا دشوار ہے اور اس تندرست کو بھی رخصت دی ہے جسے پانی دستیاب نہ ہو خواہ اسے وضو کی حاجت ہو یا غسل کی ان سب صورتوں میں تیمم جائز ہے۔ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیمار ہونا، مسافر ہونا اور حدث اصغر یا اکبر کے بعد پانی نہ ملنا جواز تیمم کے موجبات ہیں۔ بیمار کے پاس اور مسافر کے پاس پانی ہو تو تیمم میں مانع نہیں ہے۔ کیونکہ بیمار کو پانی نقصان دیتا ہے اور مسافر کو سفر میں پانی کی ضرورت ہے تو اصل لم تجدوا ماءً بیمار اور مسافر کی قید نہیں بلکہ صحت مند آدمی جو حدث اصغر یا اکبر میں مبتلا ہو اس کی قید ہے۔ یعنی اگر تندرست انسان بے وضو ہو یا جنبی ہو اور اسے پانی دستیاب نہ ہو تو اسے تیمم کی اجازت ہے۔

وضو کے نواقض

آیت او جاء احد منکم من الغائط او لامستم النساء سے بطور کنایہ یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ قضائے حاجت سے خواہ پیشاب ہو یا پاخانہ وضو ٹوٹ جاتا ہے یعنی ان دونوں راہوں سے جو کچھ معتاد طریقہ سے نکلتا ہے اس سے طہارت ختم ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی ہے کہ یہ دونوں ناپاک ہیں۔ اور ان دونوں راہوں سے غیر معتاد طریق پر جو کچھ نکلتا ہے وہ بھی نجاست ہے اور ناقض وضو ہے جیسے مذی و دی وغیرہ، اور اس سے جمہور کے نزدیک طہارت ختم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اگر ریح بھی خارج ہو تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مسند احمد، ترمذی

اور ترمذی اور ابن ماجہ میں بحوالہ ابوہریرہ حدیث آتی ہے۔

وضو نہیں مگر آواز سے یا بُو سے

امام بیہقی نے اس کی صحت کا لوہا مانا ہے اور شیخین نے ابوہریرہ کی حدیث تو نہیں مگر اس مفہوم پر مشتمل عبداللہ بن زید سے روایت کیا ہے۔

البتہ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ انسانی بدن سے جو چیزیں ان راہوں کے علاوہ دوسری جگہوں سے نکلتی ہیں، مثلاً بدن سے خون نکل آیا، ناک سے نکسیر آگئی، یہ بھی طہارت ختم کرتی ہے یا نہیں۔ قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر خاموش ہے۔ امام شافعی خون کو ناقض وضو نہیں بتاتے، امام احمد معمولی سے خون کو ناقض وضو نہیں بتاتے، لیکن امام ابوحنیفہ خون کو ناقض وضو کہتے ہیں بشرطیکہ ناپاک ہو اور خون کے ناپاک ہونے کا معیار بہنا ہے، اگر بہتا نہیں تو ناپاک نہیں ہے۔

خون کی قے کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے۔ امام شافعی خون کو ناقض وضو نہیں کہتے جبکہ امام ابوحنیفہ قے کو ناقض وضو کہتے ہیں، ہاں اگر قے معمولی ہے تو اس کو ناقض نہیں کہتے اور غیر معمولی یعنی منہ بھر کر ہو تو اسے ناقض کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ خون اور قے وغیرہ کو ان دونوں راہوں سے نکلنے والی نجاست پر قیاس کرتے ہیں کیونکہ وہاں طہارت کے وجوب کی علت صرف نجاست ہے۔

سونا بھی وضو کو توڑ دیتا ہے

سونے کے ناقض ہونے میں علماء کے درمیان اچھا خاصا اختلاف ہے۔ شارحین حدیث نے آٹھ مذاہب بتائے ہیں۔ اول یہ کہ سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے یہ شیعہ امامیہ کی رائے ہے، دوسرے یہ کہ مطلق سونا ناقض وضو ہے۔ یہ حسن بصری شوافع میں سے مزنی اور محدثین میں سے اسحاق ابن راہویہ اور ابن المنذر کا خیال ہے، تیسرے یہ کہ زیادہ سونا وضو کو توڑ دیتا ہے۔ یہ امام زہری ربیعہ امام اور امام احمد کی رائے ہے، چوتھے یہ کہ چت لیٹ کر یا کروٹ سے یا کسی چیز کے سہارے سے سوئے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور داؤد ظاہری کی رائے ہے پانچویں یہ کہ نماز میں سونا وضو کو توڑتا ہے، بغیر ان کی نماز میں نہیں، یہ زید بن علی کہتے ہیں، چھٹے یہ کہ حالت رکوع و سجود میں سونے سے وضو ٹوٹتا ہے، باقی کسی حالت میں سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے، ساتویں یہ کہ صرف حالت سجود میں سونے سے وضو ٹوٹتا ہے۔ یہ دونوں قول امام احمد سے منقول ہیں۔ آٹھویں یہ کہ سونا حدث نہیں بلکہ احتمال حدث کے حکم میں ہے اگر کوئی

زمین پر سرین کے سہارے بیٹھ کر سوتا ہے اس کا وضو ٹوٹتا ہے ورنہ نہیں۔ اس موضوع پر احادیث مختلف آئی ہیں اور سب نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ روایات کے سہارے ہی اختیار کیا ہے۔ ہاں البتہ اس بات پر امام نووی نے علماء کا اتفاق لکھا ہے کہ جنون اور بے ہوشی اور وہ تمام حالتیں جن میں زوال عقل ہو جاتے۔ ناقض وضو ہیں۔

کیا عورت کو ہاتھ لگانا ناقض وضو ہے؟

آیت کے اس حصہ او لامستم النساء سے حضرت امام شافعی نے یہ بات سمجھی ہے کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، یہی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر اور زہری کا مذہب ہے لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، عطاء ابن ابی رباح، طاؤس یمانی بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ اس آیت قرآنی میں لفظ ملامستہ کون سے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ لغت میں اس کے معنے چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں جب کنائی زبان میں یہ مباشرت کے لیے استعارہ ہے اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں کنائی معنے مراد ہیں یا لغوی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ کنائی معنے مراد ہیں یعنی مباشرت اور اسی کو امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری نے اپنایا ہے برخلاف اس کے حضرت عبداللہ ابن مسعود حضرت عمر فاروق اور حضرت عبداللہ بن عمر کی رائے یہ ہے کہ آیت میں ملامستہ اپنے لغوی معنے میں ہے اسی رائے کو امام شعبی اور امام شافعی نے اپنایا ہے۔

ہماری رائے میں ذوق تشریع سے قریب تر یہی ہے کہ آیت قرآنی میں ملامست کنائی معنے میں ہے۔ اگر چھونے کے معنے میں ہو تو خود اعمال نبوت کے لیے توجیہات تلاش کرنی ہوں گی مثلاً مسلم اور ترمذی میں حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ

> انہوں نے حضور کے قدم مبارک پر ہاتھ رکھا جب کہ آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔

اور حدیث کی متعدد کتابوں میں ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز پڑھتے۔ میں آپ کے سامنے لیٹی ہوئی ہوتی جب آپ سجدہ کا ارادہ کرتے تو پیر سے ٹہو کا دیتے۔

یہاں سید رشید رضا کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ اگر عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ اسلام میں ہوتا تو تواتر کے ساتھ اس کی نقل ہوتی۔ اور ایک نہیں بلکہ متعدد راہوں سے یہ بات روایت و حدیث کے دفتر میں ہوتی۔

کیا شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹتا ہے؟

اس موضوع پر فقہاء میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام مالکؒ اور امام اسحاقؒ کا مذہب یہی ہے کہ ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے خواہ مرد کی پیشاب گاہ ہو یا عورت کی۔ صحابہ میں حضرت عمرؓ، ان کے صاحبزادے عبداللہؓ، ابوہریرہؓ، ابن عباسؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عائشہؓ اور تابعین میں عطاءؒ، زہریؒ اور سعید بن المسیبؒ کا یہی مسلک ہے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور تابعین میں الحسن البصریؒ اور ربیعہؒ کا یہی مسلک ہے اور اس اختلاف کی بنیاد دراصل اس موضوع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل شدہ علمی سرمایہ کا اختلاف ہے جو کہتے ہیں کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے وہ حضرتؓ کی بسرۃؓ کے حوالے سے آیا ہوا ارشادِ نبوت پیش کرتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگایا وہ بغیر وضو نماز نہ پڑھے۔ یہ ارشادِ نبوت بخاری اور مسلم کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں میں آئی ہے اور جن علماء نے وضو نہ ٹوٹنے کا فیصلہ فرمایا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ مسند احمد اور سنن اربعہ میں یہ ارشادِ نبوت حضرت طلق بن علیؓ کے حوالے سے آیا ہے کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا یا رسول اللہ کوئی شخص اگر اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے اس کے ذمے وضو ہے، آپ نے فرمایا کہ وہ بھی تیرے جسم کا ایک حصہ ہے۔

اس ارشادِ نبوت کی صحت کو لوگ سب مانتے ہیں۔ حافظ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ حدیث زیادہ طاقتور ہے۔ امام علی ابن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں بسرۃؓ کے مقابلہ میں زیادہ خوبصورتی ہے۔ پہلی حدیث جس سے ان بزرگوں نے استدلال کیا ہے جو وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں اس کی صحت میں علمائے حدیث کو کافی تردد ہے۔

نزول شرائع کا مقصد

۳۰۶ - اللہ نہیں چاہتا ہے کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ تمہیں

خوب پاک کر دے، اسی لیے جو اعضاء کثیر الوقوع تھے۔ ان میں سارے جسم کا دھونا ضروری نہ رکھا صرف وہ اعضاء جن کو اکثر بلاد متمدنہ کے بسنے والے عموماً کھلا رکھتے ہیں مضائقہ نہیں سمجھتے ہیں، ان کا دھونا اور مسح کرنا ضروری بتلایا تاکہ کوئی تنگی اور دقت نہ ہو، ہاں حدث اکبر یعنی جنابت جو احیاناً پیش آجاتی ہے اور اس حالت میں نفس کو ملکوتی خصال کی طرف لے جانے کے لیے کسی غیر معمولی تنبیہ کی ضرورت ہے اس کے ازالہ کے لیے تمام بدن کا دھونا فرض کیا۔ پھر مرض اور سفر وغیرہ حالات میں کس قدر آسانی فرما دی۔ اول تو پانی کی جگہ مٹی کو مطہر بنا دیا۔ پھر اعضائے وضو میں سے نصف کی تخفیف اس طرح کر دی کہ جہاں پہلے ہی سے تخفیف تھی یعنی سر کا مسح اسے بالکل اڑا دیا۔ اور پاؤں کو شاید اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ عموماً مٹی میں یا مٹی کے قریب رہتے ہیں اور تمام اعضاء بدن کے مقابلہ وہ گرد و غبار کا زیادہ نشانہ ہیں، لہٰذا ان پر مٹی کا ہاتھ پھیرنا بے کار تھا۔ اب صرف دو عضو رہ گئے منہ اور ہاتھ ان پر کو ملنے سے وضو اور غسل دونوں کا تیمم ہو جاتا ہے۔

یہ وضو اور غسل کے حکم کی حکمت بیان ہو رہی ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پابندیوں کو سخت محسوس کیا ہو تو ان پر ان کی افادیت واضح ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر عادی طبائع پر غسل اور وضو کی یہ پابندی بڑی شاق ہوتی ہے لیکن اللہ سبحانہ نے یہ پابندی بندوں کو مشقت میں ڈالنے کے لیے قائم نہیں کی ہے۔ اگر مشقت مقصود ہوتی تو بیماری اور سفر وغیرہ کی حالت میں تیمم کی اجازت ہی نہ ہوتی بلکہ یہ بندوں کی پاکیزگی کی خاطر عائد کی گئی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ ملائکہ سے مشابہت حاصل کر کے خدا کا قرب حاصل کرنے کے اہل ہو سکیں۔ اصلاً تو پاکیزگی باطن کی مطلوب ہے، اور نماز باطن ہی کی پاکیزگی کے لیے فرض کی گئی ہے لیکن ظاہر اور باطن میں گہرا رشتہ ہے۔ ظاہر کا اثر باطن پہ باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے اس وجہ سے اسلام نے نماز کے لیے وضو کا حکم دیا ہے اور ناپاکی کی حالت ہو تو غسل کا۔

اس آیت میں اسلامی قانون کی حکمت پر روشنی ڈالی گئی ہے اگرچہ یہ آیت طہارت کے مسائل بیان کرنے کے بعد ایک اٹھتے ہوئے سوال کے جواب میں آئی ہے۔ سوال ہوا تھا کہ طہارت کے ان احکام و ضوابط کا فائدہ کیا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ یہ احکام و قوانین جو تمہارے لیے بیان ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہارے اندر ہر نوع کی پاکیزگی رونما ہو،

لے افادات شیخ الاسلام

یعنی روحانی طہارت کے ساتھ جسمانی طہارت بھی تمہارے اندر موجود ہو۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ' نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ایک یہ کہ اللہ تم پر کوئی تنگی نہیں چاہتا ہے، دوسرے یہ کہ اللہ تمہارے جسم کی پاکیزگی چاہتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلی بات میں ایک بڑی اصل اور ضابطہ کل کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ شرائع الٰہیہ میں مشقت اور تعب نہیں۔ اگرچہ یہاں اصلاً تو آیت کا تعلق احکام طہارت سے ہے لیکن ضمناً اور تبعاً اس کی حیثیت تمام قوانین اسلامی کے لیے ایک ضابطہ اور کلیہ کی ہے کیونکہ قرآن نے پورے دین کے بارے میں یہی بات فرمائی ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج یہ آیت سورہ حج کے آخر میں ہے جہاں پہلے امت کی مخصوص ذمہ داری کا تذکرہ کیا ہے کہ:

وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھو اجتبٰکم

اس عظیم ذمہ داری کے ذکر کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین کی خاطر خوب محنت کرنا، جان کھپانا جیسے عزائم امور کی بجاآوری دین میں تنگی نہیں ہے۔ تنگی نام ہے نقصان کے زیادہ ہونے کا جیسے خودکشی کرنا، جان بچانے کے لیے بقدر سدرمق حرام نہ کھانا، بیمار کو پانی استعمال کرنے کا۔ بیماری میں روزہ رکھنے کا حکم، علمائے نے اس آیت سے ایک سے زیادہ اصول وضوابط کا استخراج کیا ہے اور پھر ان پر فروع وجزئیات کی پوری قانونی عمارت قائم کی ہے۔ عبادات میں بھی معاملات میں بھی

معنوی اور ظاہری طہارت

آخر میں فرمایا ہے ولکن یرید لیطھرکم بلکہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک وصاف بنادے کیونکہ وہ خود پاک ہے پاک ہی پسند کرتا ہے، یعنی معنوی اور ظاہری ہر اعتبار سے، طہارت کا لفظ صفائے قلب اور جسمانی پاکیزگی دونوں کے لیے عام ہے۔ قرآن میں کہیں جسمانی پاکیزگی کے لیے کہیں باطنی صفائی کے لیے اور کہیں دونوں کے لیے آیا ہے۔ جسمانی پاکیزگی کے لیے سورہ مدثر میں آیا ہے وثیابک فطھر اور سورہ بقرہ میں ہے فلا تقربوھن حتی یطھرن اور آیت کو ختم ان الفاظ پر کیا ہے ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین اس میں دونوں طہارتوں کی گنجائش ہے یعنی اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو میل کچیل گندگی اور نجاست سے پاک وصاف ہوتے ہیں اور جو فواحش اور منکرات سے بے داغ ہوتے ہیں۔ اور صرف طہارت باطنی لوصفائے

قلب کے موضوع پر سورۃ مائدہ کی یہ آیت ہے اولئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم اگر قرآن کے استعمالات پر غور کیا جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ پیش نظر آیت میں دونوں معنے کی گنجائش ہے۔ وضو اور غسل کے بعد طہارت کا لفظ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ طہارت جسم کی پاکیزگی کے معنے میں ہے اور سیاق قرآنی اور طہارت کے بعد اتمام نعمت کا ذکر اس بات کا قرینہ ہے کہ طہارت صفائے قلب اور باطنی پاکیزگی کے معنے میں ہے۔

شارحین قرآن نے طہارت کے فوائد اور اس کی حکمتوں پر خوب سیر حاصل بحث کی ہے اور حرفا میں سے احیاء العلوم میں امام غزالی نے المیزان الکبریٰ میں امام شعرانی نے اور حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ نے خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ تفصیل کے لیے معالم القرآن کے صفحات متحمل نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں۔

روحانی اور جسمانی طہارت

۲۰۷۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو جاؤ:۔ پچھلے رکوع میں جو نعمائے عظیم بیان ہوئی تھیں ان کو سن کر بندے کے دل میں جوش اٹھا کہ اس منعم حقیقی کی بندگی کے لیے فوراً کھڑا ہو جاتے اسے بتلا دیا کہ ہماری طرف آؤ تو کس طریقے سے پاک ہو کر آؤ۔ یہ بتلانا خود ایک نعمت ہوئی۔ اور بدن کی سطح ظاہر پر پانی ڈالنے یا مٹی لگانے سے اندرونی پاکی عطا کر دینا یہ دوسری نعمت ہوئی۔ بندہ ابھی پچھلی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکا تھا تصدیق کر رہا تھا کہ یہ جدید انعامات فائض ہوتے، اس لیے ارشاد ہوا کہ لعلکم تشکرون یعنی ان پہلی نعمتوں کو یاد کرنے سے پہلے ان جدید نعمتوں کا جو احکام وضو وغیرہ کے ضمن میں مبذول ہوئیں شکر ادا کرنا چاہیے۔ شاید لعلکم تشکرون ہی سے حضرت بلال نے تحیۃ الوضو کا سراغ لگایا ہو۔ اس درمیانی نعمت کے شکریہ پر متوجہ کرنے کے بعد اگلی آیت میں ان سابق نعمتوں اور احسانات عظیمہ کو پھر اجمالاً یاد دلاتے ہیں جن کی شکر گزاری کے لیے بندہ اپنے مولیٰ کے حضور کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں واذکروا نعمۃ اللہ [1]

گویا اشارہ کر دیا کہ جس طرح پاکیزگی نفس ایک نعمت ہے۔ اسی طرح جسم کی پاکیزگی بھی ایک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نعمت ہے۔ انسان پر اللہ کی نعمت اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جبکہ نفس و جسم دونوں کی پاکیزگی کے لیے پوری ہدایت اسے مل جاتے، کیونکہ انسان روح و جسم دونوں کا نام ہے۔ دونوں کی تکمیل سے ہی انسانیت درجہ کمال حاصل کر سکتی ہے۔ نماز اگر روح کی طہارت اور نفس کا تزکیہ کرتی ہے تو وضو اور غسل جسم کی صفائی اور طہارت کا کام کرتی ہیں۔ اور جسم کی صفائی میں شریعت نے صرف طہارت ہی کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ طہارت کے ساتھ نظافت اور نفاست کی بھی ہدایت کی ہے اور قرآن نے مسجد کا نام لے کر یہ ہدایت کی ہے کہ خذوا زینتکم عند کل مسجد یعنی مسجد میں بن ٹھن کر کے آیا کرو۔ ظاہر ہے کہ پاک صاف اور بنا ٹھنا شخص ہی اس لائق ہے کہ مجلسی زندگی کا جز بنے۔ قرآن نے یہاں اتمام نعمت کہہ کر صاف اشارہ کر دیا کہ جو لوگ باطن کو صاف رکھتے ہیں مگر ظاہر کی پروا نہیں کرتے یا جو ظاہر کی ٹیپ ٹاپ پر زور دیتے ہیں مگر باطن کی صفائی سے یکسر غافل رہتے ہیں، قرآن کی نگاہ میں دونوں ناپسند ہیں، قرآن کا مطالبہ دونوں کو یکجا کرنے کا ہے۔

نیز لیتم نعمتہ علیکم میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نماز کے باب میں وضو اور تیمم کے ان احکام کے بعد اللہ کی نعمت تم پر تمام کر دی گئی ہے جب کہ یہود کے ہاں طہارت کے معاملے میں بڑی سخت قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ اول تو ان کی شریعت میں احکام سخت ہی تھے، پھر ان پر مزید اضافہ ان کے فقہاء کے تشددات نے کر دیا تھا۔ تیمم کا ان کے ہاں تصور بھی نہ تھا اور یہ بات تو ان کے ہاں انتہائی بددینی کی تھی کہ کوئی شخص حدث و جنابت کی حالت میں خواہ کیسی ہی معذوری و مجبوری ہو، صرف تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ یہود کے یہ تشددات بھی من جملہ ان اغلال کے تھے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دور ہونے والے تھے چنانچہ تیمم کی اجازت نے طہارت کے باب میں اللہ کی نعمت کا اتمام فرما دیا اور اس اتمام نعمت سے اس امت کو جو سہولتیں اور برکتیں حاصل ہوئی ہیں ان پر ہر آن شکر واجب ہے۔[1]

اتمام نعمت کو تیمم کے ذکر میں لا کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اسلام میں دی ہوئی قانونی رخصتوں سے تنگ دل ہونا اور نفس کا ان پر شبہ کرنا جیسا کہ عمل میں غلو رکھنے والے کرتے رہتے ہیں۔ یہ مزاحمت حق ہے۔

---

[1] تدبر قرآن۔

اُمت کو ذمہ داریوں کی یاد دہانی

۲۰۸ ـ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کے اس عہد کو بھی یاد کرو جس کا اس نے تم سے عہد لیا ہے جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا ۔ غالباً یہ وہ عہد ہے جو البقرہ کے آخر میں مومنین کی زبان سے نقل فرمایا تھا قالوا سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرتے تھے اس وقت بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق آپ کی ہر بات کو سنیں گے اور مانیں گے خواہ ہمارے منشا اور طبیعت کے موافق یا خلاف ہو یہ تو عام عہد تھا ، اس کے بعد بعض ارکان اسلام یا حسب حال اہم چیزوں کے متعلق خصوصیت سے بھی عہد لیا جاتا تھا ۔ گویا اس سورت کے شروع میں اوفوا بالعقود فرمایا تھا درمیان میں بہت سے احسانات کا ذکر کر کے جن کو سن کر ایفائے عہد کی مزید ترغیب ہوتی ہے پھر وہی اصل سبق یاد دلایا گیا ہے[1]

اس آیت میں دو باتیں تشریح طلب ہیں ، ایک اللہ کی نعمت ، دوسرے اللہ کا میثاق ، نعمت یہ ہے کہ زندگی کی شاہراہ مستقیم تمہارے لیے روشن کر دی اور دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہدایت کے منصب پر تمہیں سرفراز کر دیا ۔ اسی کو قرآن نے سورہ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیہم فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے کامل شریعت نازل کر کے اور پوری دنیا کی امامت عطا کر کے جو تم پر فضل و انعام فرمایا ہے اور تم کو جو عزت و سرفرازی عطا کی ہے ۔ یہود کی طرح سے اسے بھول نہ جانا بلکہ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا ۔ یاد رکھنا اپنے حقیقی معنے میں ہے یعنی ظاہراً و باطناً ہر پہلو سے اس کا حق ادا کرنا ، اس کے بعد اس ذمہ داری کی نوعیت ظاہر فرما دی کہ یہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایک مضبوط میثاق کی حیثیت رکھتی ہے جو خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تم سے لیا ہے اور تم نے پیغمبر کے سامنے سمعنا واطعنا کہہ کر اس میثاق کی ذمہ داری اٹھائی ہے ۔ خدا نے تمہارے لیے دنیا و آخرت کی کامرانیوں کے جو وعدے فرماتے ہیں وہ اسی میثاق پر منحصر ہیں ۔

وہ ذمہ داری کیا ہے ؟ جس کا امت کو میثاق کے ذریعے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے ۔ دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے ۔ لیکن اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین کی تھی کہ وہ آپ کے بعد حق کی شہادت دے سکے اور پھر یہ گروہ اپنے بعد کی نسل کو اس کام کے لیے تیار کرے اور یہ سلسلہ آخر تک یوں ہی چلتا رہے اس طرح حقیقت دائمی یہ قرار پاتی ہے کہ آپ کی بعثت اہل عرب کی طرف تو براہ راست تھی مگر باقی دنیا کی طرف اس اُمت مسلمہ کے توسط سے تھی جسے آپ تیار کر گئے تھے اور جو نسلاً بعد نسل تیار ہوتی رہے گی۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد اب قیامت تک یہ اس اُمت کی ذمہ داری ہے کہ دُنیا کے سامنے حق کی شہادت دیتی رہے۔

کذالک جعلناکم اُمۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس

اور اسی طرح دیتے رہے جس طرح کہ اگر نبی موجود ہوتا تو دیتا، مختصر یہ کہ یہ اُمت اپنے وجود میں اپنے پیغمبر کی قائمقام ہے اور بحیثیت اُمت اس کی زندگی کا مشن یہی ہے کہ فرض شہادت انجام دے کر اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

اُمت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے تمہیں ایک بہترین اُمت بنایا ہے تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لیے دین حق کے گواہ بنو۔ اس اُمت کی حیثیت صاف طور سے یہی مقرر کر رہا ہے۔ اُمت کی ذمہ داری کا یہی وہ میثاق ہے جس کو عہد اول کے مسلمانوں نے سمعنا و اطعنا کہہ کر قبول کیا۔ یہی سمع طاعت کا وہ میثاق ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے لیتے رہے۔ قرطبی نے حضرت عبداللہ ابن عباس کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے:

ھو العھد والمیثاق الذی جری لھم مع النبی صلعم علی السمع والطاعۃ فی المنشط والمکرہ

وہ عہد اور میثاق جو حضور سے صحابہ نے کیا کہ ہم آپ کی سنیں گے اور آپ کی طاعت کریں گے ہمیں گوارا ہو یا ناگوار۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں امام بغوی نے معالم میں اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

یہ کہنا کہ اس میثاق سے عالم ارواح کا وہ عہد ہے جو سارے بنی آدم سے اقرار ربوبیت کے بارے میں لیا گیا تھا درست نہیں ہے کیونکہ یہاں خطاب عام نوع بشری سے نہیں بلکہ اہل ایمان سے ہے اس لیے آسان اور بے تکلف تفسیر یہی ہے کہ وہ عہد مراد لیا جائے

جس کی اُمت پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ شہادت علی الناس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اسلامی تصورِ تقویٰ کا آئینہ

۳۰۹۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچو بے شک اللہ سینوں کے اندر کا علم رکھتا ہے۔ ایک شریف اور حیادار آدمی کی گردن اپنے محسن اعظم کے سامنے جھک جانی چاہیے، مروت و شرافت اور احسان مندی کا تقاضا یہی ہے کہ بندہ اس منعم حقیقی کا بالکل تابع فرمان بن جائے خصوصاً جب کہ زبان سے اطاعت و وفاداری کا پختہ عہد و اقرار بھی کیا ہو۔ ممکن ہے کہ حق تعالیٰ کی بے انتہا مہربانیاں دیکھ کر بندہ مغرور ہو جائے، اس کی نعمتوں کی قدر اور اپنے قول و قرار کی کوئی پروا نہ کرے اس لیے فرمایا واتقوا اللہ یعنی خدا سے ہمیشہ ڈرتے رہو، وہ ایک لمحہ میں تم سے سب نعمتیں چھین سکتا ہے۔ اور ناشکری اور بدعہدی کی سزا میں بہت سخت پکڑ سکتا ہے۔ بہرحال مروت، شرافت اور خوف ہر چیز کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی مخلصانہ اطاعت اور وفاداری میں پوری مستعدی دکھلائیں گے وہ علیم بذات الصدور ہے ہم جو کچھ کریں گے وہ ہمارے اخلاص و نفاق، ریاکاری یا قلبی نیاز مندی کو خوب جانتا ہے محض زبان سے سمعنا واطعنا کہنے یا شکر گزاری کے رسمی رٹے ہوئے الفاظ سے ہم اس کو دھوکا نہیں دے سکتے۔[1]

اصل تقویٰ یہ ہے کہ نفس کی خواہشوں کی طرح ذوق و ستے کی آزادیوں پر بھی احکام الٰہی کا پورا کنٹرول ہو۔ تقویٰ کا یہ تصور شاید عام ذہنوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہو مگر یہی اسلام بنیادی دین حق کا وہ خاص وصف ہے جو اسے دوسرے ادیان سے ممتاز کرتا ہے۔ قرآن جو بار بار اور ہر موقع پر تقویٰ پر زور دیتا ہے اور نبوت جو اس کی ہر موقع پر تلقین کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے پیش نظر پچھلی امتوں کی تاریخ تھی، تحریف ادیان کے تجربے تھے۔ نفس کشی اور رہبانیت کے تجربے تھے۔ قرآن کو معلوم تھا کہ اللہ کے دین کو صرف نفس کے پجاری ہی ملیامیٹ نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ اپنوں کا غلو اور تشدد اس کو نئی ہیئت اور نیا مزاج دیتے رہے ہیں۔ اور جس چیز میں یہ بے راہ روی سب سے زیادہ راہ پا سکی وہ یہی امت کی ذمہ داری ہے۔ شہادت علی الناس کے فریضہ کو لوگوں نے دین میں فالتو چیز سمجھ لیا اور اس معصوم یقین کے ساتھ سمجھ لیا، عزلت، گوشہ نشینی، خلوت خدا کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پسند ہے، پھر یہ طرز فکر آگے بڑھا او تنہائی اور اجتماعی زندگی سے گریز پائی دینداری کا کمال بن گئی اور اس کے نتیجہ میں ذمہ داری کا ان کام چھوڑ بیٹھے۔ یہ وہ پس منظر ہے جس کی موجودگی میں قرآن نے ضروری سمجھا کہ اہل ایمان کو اچھی طرح متنبہ کر دے اور ان خطرات سے اسلام کے مستقبل کو اچھی طرح محفوظ بنانے کا پورا پورا سامان کر جائے جو ہمیشہ سے دین خداوندی کو پیش آتے رہے اور لے بدل کر کچھ سے کچھ بناتے رہے ہیں اور اس غرض سے شہادت علی الناس کی ذمہ داری کے فریضہ کو خاص طور پر کھیل اور تماشہ بننے سے روک دے اس لیے قرآن نے یہ بات اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کرادی کہ اللہ تعالیٰ نے اُمت کی ذمہ داری کا جو پیمانہ مقرر کیا ہے عملاً اسے برقرار رکھا جائے۔ گویا اتقوا اللہ فرما کر تعمیلِ احکام میں اخلاص پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ،

> جو کچھ ہم نے کرنے کو کہا ہے اور جس چیز سے ہم نے روکا ہے اس کی خلاف ورزی کرکے عہد شکنی نہ کرو اور نبوت خدا کی جانب سے دین کے نام پر جو کچھ لے کر آئی ہے اس میں نہ اضافہ کرو اور نہ کمی کرو اور اس کے یاد رکھنے میں کوئی کوتاہی نہ کرو۔ اس میں کسی قسم کی تحریف نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا حال بھی ان سے ہرگز مختلف نہ ہوگا جن سے اللہ نے عہد لیا تھا یعنی اہل کتاب اور وہ اسے فراموش کر بیٹھے تھے تحریف کے خوگر ہو گئے اور پھر اپنی رائے سے دین میں اضافہ اور کمی کرتے رہے۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۸﴾
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وَّأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۹﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيٰتِنَآ
أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَحِيمِ ﴿۱۰﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَّبْسُطُوٓا إِلَيْكُمْ
أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَعَلَى
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۱﴾

اے اہلِ ایمان! تم اللہ کی خاطر مضبوطی سے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی شہادت دینے والے ہو جاؤ۔ اور دیکھو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر نہ اُبھارے،

ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات

ہے۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ

کو اس کی خبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے

اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت ہو گی، اور

بہت ہی بڑا اجر ہو گا لیکن جن لوگوں نے ہماری آیات کا

انکار کیا اور ان کی تکذیب کی تو وہ دوزخی ہیں۔ اے

ایمان والو! اپنے اوپر اللہ کا وہ انعام یاد کرو کہ جب ایک

گروہ نے پورا پورا ارادہ کر لیا تھا کہ تم پر ہاتھ بڑھاتے تو

اللہ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تھا، اللہ کی نافرمانی

سے بچو اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

میثاق کی اجتماعی ذمہ داری

پہلی آیت میں میثاق کی انفرادی ذمہ داری بتائی گئی تھی۔ اب اس آیت میں میثاق کی اجتماعی ذمہ داری واضح کی گئی ہے کہ مسلمانوں پر بحیثیت امت مسلمہ یہ ذمہ داری ہے کہ

وہ اس حق و عدل کے علمبردار بنیں جو آخری نبوت علم و عمل کی صورت میں لائی ہے خود اپنے اندر اس کو قائم کریں اور اسی کی دنیا کے سامنے شہادت دیں۔ شہادتِ حق کے دو پہلو ہیں، قولی شہادت اور عملی شہادت۔

قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک غیر مسلموں کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور عبارات میں پیش کیا جاتے یہاں تک کہ یہ دین ان کے لیے کھلی کتاب بن جاتے اور ان کے لیے اپنے دین کا پورا اور اسلام کی صداقت پا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ نہ رہے۔

عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھ لی جائے۔ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ انہیں توحید، آخرت اور رسالت وغیرہ عقائد پر ایسا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق وہ ہوں جن کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ ان کے معاملات ان ہی خطوط پر انجام پائیں جو نبوت کے علم و عمل نے متعین کر دیے ہیں۔ ان کی معاشرت، ان کی معیشت اور ان کی سیاست غرض ان کی زندگی کا پورا نظام، اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ اس نقشے کے مطابق تعمیر ہو جو اللہ و رسول نے بنا کر دیے ہیں۔ تاکہ دنیا اپنی آنکھوں سے کہ اسلام کیا ہے وہ کس قسم کے معاشرہ اور کس قسم کا اسٹیٹ وجود میں لانا چاہتا ہے۔

عملی شہادت کا مرتبہ قولی شہادت سے مقدم تر بھی ہے اور اہم تر بھی ایک تو اس لیے کہ جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے۔ دوسرے اس لیے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت شاید سو میں سے ۹۵ سے بھی زیادہ بڑی اکثریت اصلاً عملی دلائل ہی کی زبان سمجھتی ہے۔ عقلی دلائل تک اس کی رسائی بہت کم ہوتی ہے۔

یہ ہے قوامین للہ کا پورا مفہوم۔ اُمتِ مسلمہ کی عملی کوششیں اس معیار کے جس حد تک قریب ہوں گی اسی حد تک وہ قوامین للہ کے فرض میں کامیاب اور قرآن کے مطالبہ کو پورا کرے گی۔

۴۴۔ اے اہل ایمان تم اللہ کی خاطر سچائی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی شہادت

دینے والے ہو جاؤ۔ اس سے پہلی آیت مومنین کو حق تعالیٰ کے احسانات اور اپنا عہد و پیمان یاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہاں بتلا دیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ عملی رنگ میں ان سے اس کا ثبوت مطلوب ہے۔ اس آیت میں اسی پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بے شمار احسانات اور اپنے عہد وفا اقرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس محسن حقیقی کے حقوق ادا کرنے اور اپنے عہد کو سچا کر دکھانے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہو اور جب کوئی حکم اپنے آقائے ولی نعمت کی طرف سے ملے فوراً تعمیل حکم کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اور خدا کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جد و جہد اور اہتمام کرو۔ چنانچہ قوامین للہ میں حقوق اللہ کی اور شہداء بالقسط میں حقوق العباد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی قسم کی ایک آیت پانچویں پارے کے آخر میں گزر چکی ہے صرف اس قدر فرق ہے کہ وہاں بالقسط کو للہ پر مقدم کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہاں دور سے حقوق العباد کا ذکر چلا آ رہا تھا اور یہاں پہلے سے حقوق اللہ کا ذکر ہو رہا ہے اس لحاظ سے وہاں بالقسط اور یہاں شہداء کی تقدیم ہوئی ہے۔ نیز یہاں سیاق میں مبغوض دشمن سے معاملہ کرنے کا ذکر ہے جس کے ساتھ قسط کو یاد دلانے کی ضرورت ہے اور سورۂ نساء کے سیاق میں محبوب چیزوں کا ذکر ہے اس لیے وہاں سب سے محبوب اللہ کو یاد دلایا گیا ہے۔[1] ایک وجہ تو یہی ہے جو شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے لیکن ابوحیان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں ایک اور لطیف وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ میں یہ تعبیری فرق کیوں ہوا ہے کہ نساء میں کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ فرمایا اور مائدہ میں کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط فرمایا یعنی ایک جگہ بالقسط کو قوامین کا اور للہ کو شہداء کا متعلق بنا کر پیش فرمایا اور دوسری جگہ للہ کو قوامین کا اور بالقسط کو شہداء کا متعلق بنا کر لایا گیا۔ لکھتے ہیں کہ انسان دو وجہ سے جادۂ انصاف سے ہٹتا ہے غلبہ محبت اور غلبہ عداوت سورۂ نساء میں روئے سخن محبت کی طرف ہے اور سورۂ مائدہ میں روئے سخن عداوت کی طرف ہے۔ اگرچہ دونوں عنوان ایک ہی انجام بتاتے ہیں کیونکہ جو شخص انصاف کا علمبردار ہوگا وہ اللہ ہی کے لیے کھڑا ہوگا اور جو اللہ کے لیے کھڑا ہے وہ ضرور انصاف کرے گا لیکن درحقیقت یہاں قوامین کے ساتھ للہ لگا کر میثاق کی اجتماعی ذمہ داری کو یاد کرایا گیا ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اللہ کے لیے کھڑا ہونا کیا ہے۔ اللہ کے لیے کھڑے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نبوت جو علم و عمل خدا کی جانب سے لے کر آئی ہے اسے پوری دنیا میں رائج کرنے کے لیے قولاً و فعلاً معلم اور ذمہ دار ہو جاؤ۔ اس کے لیے یہاں صرف یہی نہیں فرمایا قوموا للہ جیسا کہ البقرہ میں آچکا ہے۔ نہ یہ فرمایا کہ کونوا قائمین للہ بلکہ قیام سے مبالغہ کا صیغہ لے کر آئے اور فرمایا کونوا قوامین للہ، دوسری تعبیرات کو چھوڑ کر یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اور جس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کا کام کرو بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ جس دین کو اللہ کی جانب سے نبوت علم و عمل کی صورت میں لے کر آئی ہے اس کے لیے بہت زیادہ محنت کرنے والے بن جاؤ اور یہ کام وقتی طور پر نہیں بلکہ ذاتی طور پر کرو گویا اس فقرے میں دو مطالبے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ کام خوب کیا جائے اور بہت زیادہ کیا جائے یہ بات قوام کو مبالغہ کا صیغہ لا کر بتاتی ہے، دوسرے یہ کہ یہ کام ہنگامی طور پر نہ ہو بلکہ ہمیشہ کیا جائے یہ بات قوامین کو کونوا کی خبر بنا کر بتاتی ہے مطلب یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل کو اپنانا اور قبول کرنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں بلکہ تمہارا فرض یہ ہے کہ تم دنیا کے سامنے تا قیام قیامت اس کے علمبردار اور اس کے داعی بن کر رہو اسی بلیغ معنویت کی خاطر کونوا قوامین للہ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یعنی زندگی کی ساری شاخوں میں نبوت کے علم و عمل کے علمبردار ہو جاؤ اور اس میں اجتماعی حیثیت سے خوب محنت کرو اور جانیں کھپا دو اور یہ کام اس طرح انجام دو کہ یہ تمہارا قومی نشان بن جائے گویا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ تم وہ سہارا بنو امت کی اسی اجتماعی ذمہ داری کو قرآن نے دوسرے موقعہ پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جاھدوا فی اللہ حق جھادہ

اللہ کی خاطر خوب محنت کرو جیسا کہ اس کی خاطر محنت کرنے کا حق ہے

اور پھر اس کی وجہ یہ بتائی ہے

ھو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین من قبل وفی ھذا لیکون الرسول شھیدا علیکم وتکونوا شھداء

مل: ناس ۔ (ج ۱۰)

اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے اپنے باپ ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو۔ اسی نے پہلے ہی تمہارا نام مسلم رکھا ہے اور اسی لیے رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لیے دین حق کی گواہی دینے والا ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے سامنے دین حق کی گواہی دینے والے بنو۔

اس آیت میں اُمت مسلمہ کی مخصوص حیثیت اور اس کی مخصوص ذمہ داری دونوں چیزوں کو پوری طرح اجاگر کر دیا ہے۔ اس میں اُمت کے لیے اجتبا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنے ہیں بہتر شے کا انتخاب۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس اُمت کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں عام طور پر انبیاء کے لیے استعمال ہوا ہے۔ غور فرمایئے کہ ایسا لفظ جو عموماً منصب نبوت و رسالت کی خاطر کیے جانے والے انتخاب کے لیے بولا گیا ہو اسے اگر ایک اُمت کے لیے بولا گیا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ یہ اس اُمت کے پیغمبرانہ کام کے ذمہ دار ہونے کی کھلی دلیل ہے اس کے بعد ھو سماکم المسلمین من قبل بتا رہا ہے کہ اس اُمت کو اُمت مسلمہ کے نام سے آج نہیں بلکہ مدتوں پہلے نوازا گیا ہے۔ یہ اس اُمت کے ممتاز اور غیر معمولی اُمت ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپ کی تشریف آوری سے ہزاروں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ ٹھیک اسی طرح کا معاملہ آپ کی اُمت کا بھی ہے ابھی اس کے وجود میں آنے کے لیے شب و روز کی ہزاروں لاکھوں گردشیں باقی تھیں مگر اس کے نام کا اور اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس اُمت کو یہ نام اور مقام عطا صرف اس لیے ہوا ہے کہ اس کا کام بھی اسی نام کے شایان شان انجام دینا ہے۔ بہرحال اس آیت میں یہ حقیقت ساری دُنیا کو سمجھا دی گئی ہے کہ اس اُمت کا کام دُنیا میں قوامون للہ بن کر رہنا ہے۔

اصل تو اس اُمت کے وجود کی غرض و غایت دین حق کی اپنی زندگی میں اور پھر پوری دُنیا میں برتری اور اس کا بول بالا ہے۔ شہادت، جہاد، دعوت اور قیام للہ اسی منزل تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ قرآن یہاں اس کا چہرہ پیش کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں اجتماعی حیثیت سے اس ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ

صرف یہی نہیں کہ تم دنیا میں دینِ حق کو بول بالا کرنے والے بن کر رہو بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے گواہ ہو جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ انصاف کرو بلکہ فرمایا کہ تمہیں پوری دنیا میں عدل و انصاف کو جھنڈا لے کر کھڑا ہونا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور عدل و انصاف قائم ہو۔

عدل و انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ شہداء بالقسط کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ سچی گواہی دو جیسا کہ عام شارحین قرآن کی رائے ہے لیکن اس موقع پر صرف یہی بات نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا میں اس عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں اور اس قانونی نظام کو قائم کرو جو اسلام کے نام پر نبوت نے کرائی ہے۔ قانون کی طاقت ناقابل شکست ہے کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ نہ امیر و غریب اور خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ سربراہ مملکت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک بے کس اور بے بس شہری۔ اگر کسی معاملہ میں خود سربراہ مملکت مدعی یا مدعا علیہ ہو تو عدالت میں اسے بھی اسی طرح اور اسی حیثیت میں حاضر ہونا ہوگا جس طرح اور جس حیثیت سے دوسرے لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر قانون کسی مقدمے میں اسے مجرم قرار دیتا ہے تو اسے بھی سزا لازماً بھگتنی پڑے گی۔ قرآن کے یہ الفاظ شہداء بالقسط قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ہیں۔

راہ عدل کی سب سے بڑی رکاوٹ

۴۱۔ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر نہ ابھارے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ بغیر افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلڑے کو نہ جھکا سکے۔[۱]

اس فقرے میں عدل کی راہ کے سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی

۱۔ افادات شیخ الہند

اور اس کا غصہ، غلط رویہ بھی تمہیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو۔ شیطان نے راہِ عدل سے ہٹانے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا ہے وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے یہود نے محض بنی اسماعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اس عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا جس کے وہ گواہ اور نگران بنائے گئے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اس فتنے سے بچ کر رہیں۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں کے لیے ان کے پاس ایک ہی باٹ ہو اور ایک ہی ترازو ہو۔

عدل کا مقصد یہ ہے کہ قانون کی بنا پر جو حقوق افراد کو حاصل ہیں ان کی حفاظت کی جائے اور انہیں ظلم و جور سے محفوظ رکھا جائے خواہ یگانے ہوں یا بیگانے۔ دوستی اور دشمنی عدل کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو۔

مسند امام احمد میں بحوالہ جابر بن عبداللہ یہ واقعہ آیا ہے کہ جب خیبر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے شہریوں کے زمینوں پر قبضہ [illegible] سے معاملہ طے کر لیا۔ طے شدہ معاملہ کے مطابق حضرت عبداللہ بن رواحہ کو وصولیابی کے لیے تخمینہ کنندہ روانہ کیا۔ عبداللہ نے ساری پیداوار کو اندازے سے تقسیم کر دیا کہ یہ سرکاری ہے اور یہ کاشت کرنے والوں کی۔ زمینوں پر کام کرنے والے یہودی تھے۔ انہوں نے عبداللہ کو کچھ رشوت دینے کا ارادہ کیا تاکہ بٹائی میں ان کی رعایت ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے فرمایا کہ

> اے یہودیو! سنو میں تمہارا مخالف ہوں، تم نبیوں کے قاتل ہو اور اللہ پر بے پر کی اڑاتے ہو۔ لیکن اس کے باوجود میری تم سے دشمنی مجھے جادۂ انصاف و عدل سے نہیں ہٹا سکتی۔ میں نے بیس ہزار وسق کا اندازہ لگایا ہے چاہتے ہو تو لے لو ورنہ میرا ہے۔ انہوں نے کہا اسی عدل و انصاف پر تو پوری کائنات قائم ہے ہم لیتے ہیں بس۔

عدل میں تقویٰ کی ضمانت ہے

۴۴۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔ جو چیزیں شرعاً مہلک یا کسی درجے میں مضر ہیں۔ ان سے بچاؤ کرتے رہنے سے ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اس کا نام تقویٰ ہے۔ تفصیل تقویٰ کے اسباب قریبہ اور بعیدہ بہت

سے ہیں۔ تمام اعمال حسنہ اور خصال خیر کو اس کے اسباب و معدات میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عدل و قسط یعنی دوست دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا۔ یہ خصلت حصول تقویٰ کیلئے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے اسی لیے ھو اقرب للتقویٰ فرمایا یعنی یہ عدل جس کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک تر ہے کہ اس کی مزاولت کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہو جاتی ہے۔ لہ

پہلے حکم دیا تھا کہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے بے انصافی نہ کرو۔ اب حکم ہو رہا ہے کہ عدل کرو عدل میں اور تقویٰ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لغت میں عدل نام ہے کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح تقسیم کر دینے کا کہ ان دو میں سے کسی میں ذرہ برابر کمی یا بیشی نہ ہو اور اسی سے اس میں یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جو بات ہم کہیں یا جو کام ہم کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی جائے اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے۔ علامہ فیومی مصباح فرماتے ہیں،

> عدل کے معنے ہیں معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے یہ جور کے خلاف ہے عدل فی امرہ عدلا اور عدل علی القوم عدلا اب ضرب سے آتا ہے۔

علامہ ابن الاثیر نے نہایہ میں عدل بالفتح عدل بالکسر کو مثل کے اور عدیل کو مثیل کا مرادف قرار دیا ہے۔ یہاں عدل کا مطلب یہ ہے کہ جماعتی حیثیت سے تمہارا دامن بے انصافی سے آلودہ نہ ہو۔ جس قوم اور جماعت سے تمہاری دشمنی ہو اس سے معاملات میں اور ادائے حقوق میں وقت کی مصلحتیں سیاسی تقاضے اور ملکی مفادات تمہیں عدل و انصاف کی شاہراہ مستقیم سے نہ ہٹائیں قرآن نے انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی تک اور گفتار سے لے کر کردار، اخلاق اور روحانی عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی کے ہر پہلو میں عدل کو قائم کرنے کی تلقین کی ہے عدل کا حکم قرآن میں جیسا صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں اسی طرح وہ عدل کو صرف بیگانوں تک محدود رکھنا نہیں چاہتا بلکہ اس آیت میں کھول کر منفی اور مثبت انداز میں بتایا

لہ افادات شیخ الاسلام

گیا ہے کہ یہ انصاف نہ ہو، اور پھر فرمایا کہ انصاف کرو اور پھر اس میں اور زور پیدا کیا کہ عدل ہی تقویٰ کی ضمانت ہے یعنی تقویٰ جو تمام اسلامی زندگی کی روح اور اہلِ ایمان کے ہر قول و فعل کے لیے کسوٹی ہے اس سے قریب ترین عمل یہی ہے کہ بیگانوں کی ساری عداوت کے باوجود ان کے ساتھ کوئی معاملہ عدل و حق سے ہٹ کر نہ کیا جائے اس سے عدل کے ساتھ اسلام کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تقویٰ کا مقام بھی معلوم ہوا کہ تمام نیکیاں فی الواقع اسی خیر سے وابستہ ہیں۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ عدل و انصاف اہلِ ایمان میں خدا ترسی کی صفت اور تقویٰ کا جوہر پیدا کرتا ہے۔ یعنی اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے اس گہرے احساس کو بیدار کرتا ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر ابھارتا اور ہر برے کام سے روکتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ ایک خاص قلبی کیفیت ہے جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے۔ یہ عملی رویہ اللہ کی طاعت اور رضا جوئی کا رویہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے وہ ہر وقت یہ دیکھتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے ناراض نہ ہونے پائے۔ میں کوئی ایسی حرکت نہ کر جاؤں جس کو وہ پسند نہیں کرتا اور کسی ایسے کام کے کرنے سے رک نہ جاؤں جسے وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ کی ناراضگی سے بچنے کی اور اس کی خوشنودی حاصل کر لینے کی یہ خواہش اور کوشش سوچیے عملاً کب پوری ہوتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ یہ خواہش اور یہ کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے رہے گویا تقویٰ کا مقام پا لینے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان ہر معاملے میں اپنے نفس کو لگام لگائے خواہ اس کی اپنی ذات ہو، اس کے رشتہ دار ہوں، امیر ہوں، غریب ہوں، یگانے ہوں، بیگانے ہوں، دوست ہوں یا دشمن ہوں کسی جگہ اپنی خواہشوں کو آزاد نہ چھوڑے۔ اسی کا نام عدالت یعنی افراط و تفریط سے ہٹ کر راہِ اعتدال اختیار کر لیا ہے۔ اللہ اکبر! دنیا کا کون سا قانون ہے جس نے اپنے باغیوں اور معاندوں کے حقوق کی اتنی رعایت رکھی ہے جتنی اسلامی قانون نے۔ قرطبی نے کیا اچھی بات لکھی ہے کہ کافر کا کفر اسے اس سے محروم نہیں کرتا کہ اس کے حق میں عدل کیا جائے یا اس کے شہری و انسانی حقوق ادا کیے جائیں اور جب کافر کے بارے میں قرآن کا یہ مطالبہ ہے کہ شہری زندگی میں اس کے انسانی حقوق ادا کیے جائیں تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فاسق اور بدعتی کے بارے میں قرآن کیا چاہتا ہے؟ یعنی جب منکروں باغیوں، سرکشوں کے ساتھ عدل واجب ہے تو مسلمان فاسقوں اور بدکاروں کے ساتھ بہ

وجوب کتنا مؤکد ہوگا۔ علامہ زمخشری اور امام رازی نے اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے۔ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز یہاں پر لطیف نکتہ آفرینی فرماتی ہے کہ معاملات میں طبعیات پر عمل نہ کرنا ایک مجاہدہ ہے اور یہاں اسی کی تعلیم ہو رہی ہے۔

عدالت تقویٰ کا لازمی ذریعہ ہے

۴۳۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ یعنی ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی اور دشمنی نہ روک سکے اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بنا سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا ڈر اور اس کی شان انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف ان اللہ خبیر بما تعملون کے مضمون کو بار بار مراقبہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جب کسی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے تو اس کا قلب خشیت الٰہی سے لرزنے لگے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے گا۔ اور احکام الٰہیہ کے امتثال کے لیے غلامانہ تیار رہے گا۔ پھر اس نتیجہ پر ثمرہ وہ ملے گا جسے اگلے آیت میں بیان فرمایا ہے وعد اللہ الذین آمنوا۔

اللہ کی اس ہمہ بینی اور ہمہ دانی کا استحضار ہی تقویٰ کی ہر منزل اور ہر مرحلہ کو آسان بنا دیتا ہے اسی لیے قرآن عزیز میں جہاں تقویٰ کا ذکر آیا ہے اسی کے آس پاس اللہ تعالیٰ کی ہمہ دانی اور ہمہ بینی کے اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔

عدل و انصاف کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر تقویٰ کی صفت مطلوبہ پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہے یعنی بات صرف اتنی نہیں ہے کہ عدل و انصاف تقویٰ پیدا کرتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر صحیح تقویٰ پیدا ہو ہی نہیں سکتا، بلاشبہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو تقویٰ کو نشوونما دیتی ہیں مگر عدل و انصاف اس سلسلے میں جو کام کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے دوسرا کوئی عمل اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ہمیں مذکورہ بالا آیت کے الفاظ ھو اقرب للتقویٰ کے بعد واتقوا اللہ کے اندر سے دکھائی دیتی ہے اس آیت کا منشا اگر صرف یہ بتانا ہوتا کہ عدل و انصاف کا اہل ایمان کو اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ

لہ افادات شیخ الاسلام

ان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو سکے تو اس اضافہ کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ اس لیے کیا گیا ہے کہ حصولِ تقویٰ کے بارے میں عدالت کی ناگزیر ضرورت کا اظہار ہو جائے۔ لوگوں کو عدل و انصاف کی فرضیت اور اس کی غرض و غایت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تقویٰ کے مقامِ مطلوب تک پہنچنے کے لیے عدل و انصاف بہرحال ضروری ہے کوئی بھی دوسری چیز اس سلسلے میں وہ کام نہیں کر سکتی ہے جسے یہ عدل و انصاف انجام دے سکتا ہے۔

عدل و انصاف بعض اعتبارات سے اسلام کے اصل مزاج کا سب سے بڑا شارح ہے اور دین کا جو تصور قرآن عزیز نے پیش کیا ہے اس کے امتیازی خدوخال عدل و انصاف کے آئینے میں سب سے زیادہ واضح شکل میں دکھائی دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل و انصاف انسان کو صرف عمل کا متقی نہیں بناتا بلکہ گفتار اور فکر و نظر کا بھی متقی بناتا ہے۔ وہ انسان کو صرف تقویٰ نہیں دیتا بلکہ تقویٰ کا جامع اور مانع مفہوم بھی دیتا ہے اور زبان سے دینداری کے ایک انقلابی تصور کا اعلان کرتا ہے۔ اسی معنے کے اعتبار سے عدل و انصاف اور روزے میں گہری مشابہت ہے قرآن روزے کے بارے میں بھی بتاتا ہے کہ لعلکم تتقون اس کے ذریعے تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی اور یہی بات بلند تر پیرائے میں زور دے کر عدل و انصاف کے متعلق فرمائی ہے ھو اقرب للتقوی۔ گویا عدل و انصاف صرف تقویٰ ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کو یہ ایسی حقیقت بھی سمجھاتا ہے جو عام طور سے بہت کم سمجھی جاتی ہے کیونکہ تقویٰ کا لفظ سنتے ہی ذہنوں کے اندر گھوما کچھ اس طرح کا تصور ابھرنے لگتا ہے کہ انسان اپنے نفس کے مطالبات ٹھکرانے میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھتا جائے لیکن ھو اقرب للتقوی کی تعبیر کہہ رہی ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سرکش نہ ہونے اور اپنے گفتار، کردار اور فکر و نظر میں آوارگی سے روک کر نبوت کے علم و عمل کا تابع بنائے ادا ہیں۔

تقویٰ کا منشا نفس کشی نہیں ہے

عدل و انصاف اور روزہ جو تقویٰ پیدا کرتے ہیں اس کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبطِ نفس ہے اور ضبطِ نفس میں ضبطِ رائے اور ضبطِ ذوق بھی داخل ہے یعنی جس طرح اپنے نفس کو احکامِ الٰہی کے تابع رکھا جائے اسی طرح احکامِ الٰہی کی پیروی کرنے میں اپنے ذوق و رجحان اور اپنی رائے کو بھی کسی طرح کی آزادی نہ دی جائے۔ حقیقی تقویٰ کا اصل مقام صرف اتنی بات سے حاصل

نہیں ہوتا ہے کہ نفس کو احکام خدا اور رسول کی مخالفت سے باز رکھا جاتے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان احکام کی بجا آوری اور رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی رائے لپنے رجحان اور لپنے ذوق کو اس وقت بھی کچھ بولنے کا حق نہ دیا جائے جبکہ وہ بظاہر خدا پرستی کے حق میں جاتے نظر آتے ہوں۔ انسان کو خدا کی بندگی نفیاً و اثباتاً ہر حالت میں ٹھیک اس طرح کرنی چاہیے جس کی اوپر سے ہدایت ملی ہو وہ عدل وانصاف میں جس طرح لپنے نفس کی اپنے اقربا کی اپنی قوم کی لپنے ملک کی لپنے ماحول کی ان خواہشوں کو دیوار پر دے مارتا ہے جو اسے نبوت کے علم وعمل کی بجا آوری سے روک رہی ہوں۔ اسی طرح ان احکام کی بجا آوری کی تشکیل اور حدیں مقرر کرنے میں بھی لپنے جی کی بات نہ سنے۔ بہرحال تقویٰ کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبط نفس ہے۔ اگر تقویٰ نفس کشی کا مطالبہ کرتا تو روزے کے بارے میں احادیث میں سحری کھانے اور اس میں تاخیر کرنے اور افطار میں جلدی کرنے کا ہرگز حکم نہ ہوتا۔ یہ احادیث زور دے کر کہہ رہی ہیں کہ جس تقویٰ کو روزے کا مقصد قرار دیا گیا ہے اس کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبط نفس ہے۔

اجتماعی ذمہ داری کو پورا کرنے کے نتائج

۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت ہوگی اور بہت بڑا اجر ہوگا لیکن جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور ان کی تکذیب کی تو وہ دوزخی ہیں یعنی نہ صرف یہ کہ ان کوتاہیوں کو معاف کریں گے جو بمقتضائے بشریت رہ جاتی ہیں بلکہ عظیم الشان اجر و ثواب بھی عطا کریں گے اور جنہوں نے قرآن حکیم کے ان اوصاف اور صریح حقائق کو جھٹلایا یا ان نشانات کی تکذیب کی جو سچائی کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں ان کے لیے تو دوزخ ہے[1]
یہ گویا مذکورہ بالا میثاق پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ جو لوگ اس میثاق پر قائم رہیں گے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور جو اس کو توڑیں گے ان کے لیے دوزخ ہے۔ اس سے صاف طور پر دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔
اول یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس میثاق کی ذمہ داری ڈالی ہے اسی طرح لپنے اوپر اس کے جواب میں عہد کی ذمہ داری لی ہے اس کا اظہار وعداللہ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ اللہ سبحانہٗ

[1] افادات شیخ الاسلام

کی یہ کتنی بندہ نوازی ہے کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی اور اپنی ہی پروردہ مخلوق کے ساتھ ایک معاہدے میں شریک ہوا اور جواب میں اپنی ذات پر بھی ایک عہد کی ذمہ داری اٹھائے انسان کو اللہ سبحانہ نے یہ وہ شرف بخشا ہے جس میں مخلوقات میں کوئی اس کا سہیم نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن نے اُمت مسلمہ سے بھی دنیوی اور اخروی فلاح کا وعدہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر میثاق پر قائم رہے تو تمہارے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور یہ وعدہ ہر مرحلے میں کیا گیا۔ مکہ کے تاریک ماحول میں بھی اور مدینے کے پُرآشوب دور میں بھی انہیں بھی خطاب کر کے کہا گیا جو اسلام لا چکے تھے اور انہیں بھی جو اسلام نہیں لاتے تھے۔ ایمان و عمل صالح کرنے کے نتیجے میں یہ وعدے کس طرح پُورے ہوتے اس سے دُنیا ناواقف نہیں ہے وہ جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دُنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح سچا ایمان اور اچھا عمل آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے اسی طرح دُنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان و عمل صالح کی شرط پوری کر دیں۔ دُنیا میں جس نبی کی اُمت سے بھی فلاح دُنیا کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ایمان و عمل صالح کی شرط کے ساتھ ہی کیا گیا تھا۔ خود مسلمانوں کو جب کفار پر غلبہ کی بشارت دی گئی تو آمنوا وعملوا الصلحت کی قید کے ساتھ دی گئی۔ غرض جہاں اللہ سبحانہ کا ایک عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے نوازتا ہے وہیں اس کا یہ ایک عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ ایمان و عمل صالح کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کے بغیر صرف آخرت ہی نہیں دُنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آتی۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دُنیا بھی نہیں مل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگی کی دنیوی فلاح، مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اور ضروریات زندگی وغیرہ، اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔

اسی طرح اُمت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح، آزادی، دولت مندی، سربلندی، اقتدار اور بین الاقوامی احترام وغیرہ، اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع اُمت ہو، یعنی ایک طرف تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہوتی ہو جو ایمان کے سچے اور عمل صالح کے پکے ہوں۔ دوسری اس میں وہ منضبط اجتماعی تنظیم ہو جس کے بغیر

کوئی جماعت جماعت نہیں ہوتی اور جس کی اللہ اور رسول کی جانب سے اسے انتہائی تاکید کی گئی ہے۔

مخالفوں کی سازشوں کی پروا نہ کرو

۲۵ اے ایمان والو اپنے اوپر اللہ کا وہ انعام یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے پورا ارادہ کر لیا کہ تم پر ہاتھ بڑھاتے تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تھا، اللہ کی نافرمانی سے بچو اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ عمومی احسان یاد دلانے کے بعد بعض خصوصی یاد دلاتے ہیں۔ یعنی قریش مکہ اور ان کے پٹھوؤں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچانے اور اسلام کو مٹانے کے لیے کس قدر ہاتھ پاؤں مارے، مگر حق تعالیٰ کے فضل و کرم نے ان کا کوئی داؤ نہ چلنے دیا، اس احسان عظیم کا یہ اثر ہونا چاہیے کہ مسلمان غلبہ اور اقتدار حاصل کر لینے کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے محفوظ رکھیں اور جوش انتقام میں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں جیسا کہ پچھلی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں اصول سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی کیونکہ ایسا نرم برتاؤ دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریروں اور بدباطنوں کی جرأت بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہے۔ اس کا ازالہ واتقوا اللہ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون سے فرما دیا، یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست توکل علی اللہ اور تقویٰ ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں اس سے اپنا معاملہ صاف رکھو اور جو عہد و قرار کیے ہیں ان میں پوری وفاداری دکھلاتے رہو پھر بحمد اللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔[1]

اوپر والی آیت میں اہل ایمان سے ہر حالت میں حق و عدل پر قائم رہنے اور اس کو نباہنے اور اس کی شہادت دینے کا جو عہد لیا ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اب تمہیں مخالفوں کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی ہے۔ اگر تم میثاق پہ جمے رہے اور تمہاری وفاداریاں میثاق کے مطابق نبوت کے علم و عمل سے قائم رہیں تو اللہ سبحانہٗ کی مدد و نصرت ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوگی، اور تمہارے دشمن تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہاں اسی بات کی تائید میں واقعاتی شہادت پیش کی جا رہی ہے کہ دیکھ لو ایک قوم نے اس راہ میں تمہاری مزاحمت کی کوشش کی۔ اصل ارشاد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان یبسطوا الیکم ایدیھم سے بسط ید عربی محاورات میں پکڑنے مارنے اور حملہ کرنے کو کہتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ ایسا کرنے والوں یعنی حملہ آوروں کو قرآن نے قوم کہا ہے اذ ھم قوم یہ کون لوگ ہیں۔ اشارہ اگر اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف سمجھا جاتے تو سب سے بڑے دشمن قریش مکہ تھے۔ اور ارباب تفسیر کا ایک گروہ اسی کی طرف مائل ہے۔ شیخ الاسلام کا بھی رجحان اسی طرف ہے۔ اور اگر اشارہ مابعد کی طرف ہو تو اس وقت مدینے میں سب سے زیادہ قوت مخالفین میں یہود کی تھی۔ شارحین قرآن کی ایک جماعت کا میلان اسی طرف ہے۔ بہرحال کچھ ہو قریش ہوں یا یہودی، افراد ہوں یا فرد جتانا یہ ہے کہ فکف ایدیھم کہ اللہ نے ان کے ہاتھ باندھ دیئے۔ مطلب یہ ہے کہ دشمنوں نے حملہ کرکے تمہارا قلع قمع کرنا چاہا تھا لیکن اللہ نے ان کے حملوں کو ناکام رکھا اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اسی طرح اگر تم اپنے رب سے عہد و پیمان اور میثاق پر قائم رہے اور میثاق کے مطابق تمہاری وفاداریاں اسلام سے رہیں تو اللہ بسحانہ ہر اس قوم کے مقابلے میں تمہاری مدد فرمائے گا جو تمہارے مقابلہ میں سر اٹھائے گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تم اپنے اندر تقویٰ کی روح پیدا کرو۔ غلبہ و کامیابی کی مسرت کو یاد دلا کر یہاں تقویٰ کی تلقین سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غلبہ و کامیابی میں تقویٰ کو بڑا دخل ہے۔ قناعت، بے طمعی، بے نفسی، بہادری، صداقت شعاری، ایثار، حفظ حدود غرض سیرت و کردار کی ساری انفرادی و اجتماعی خوبیاں اس ایک لفظ تقویٰ میں سمٹی ہوئی ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے وعلی اللہ فلیتوکل المومنون اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے اپنے دست و بازو اور اپنی ہمت و تدبیر پر اعتماد نہ ہو۔ اس موقعہ پر توکل کی تعلیم اس لیے دی گئی ہے کہ کامیابی و کامرانی کے بعد بڑا گھمنڈ اپنی قوت بازو اور اپنی عقل و فرزانگی پہ ہو جاتا ہے قرآن حکیم انسان کو پست ہمتی اور تعطل کی تعلیم نہیں دیتا سے برابر سرگرم عمل رکھنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا بھی روادار نہیں ہے کہ انسان خود پسندی اور خود پرستی کی بیماری کا شکار ہو جائے اس لیے وہ بار بار اس کی تعلیم دیتا ہے کہ نظر اسباب سے ہٹا کر مسبب الاسباب پر رکھنی چاہیے۔ اسی نے پہلے بھی بگڑے ہوتے کام بناتے تھے اور اب بھی وہ ہی بنائے گا۔ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادے، عزم اور تدبیر کے ساتھ انجام دینے اور اس کے نتائج کے لیے اپنی کوشش و محنت پر نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنے کا۔ اگر تدبیر اور کوشش نہ کرنے کا نام توکل ہوتا تو قرآن میں تلاش رزق کا حکم نہ ہوتا اور جنگ کی خاطر سامان جنگ فراہم کرنا اور استطاعت کے مطابق تیاری کرنے کی ہدایت نہ ہوتی۔ اس موضوع پر حافظ ابن تیمیہ نے عجیب و غریب بحث فرمائی ہے

دعا و توکل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اپنے معاملات میں اگر اللہ پر توکل ہوگا تو اللہ سے مانگے گا۔ عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی اور عالم غیب میں اللہ پر بھروسہ اور اعتماد اور اس کے سامنے گریہ وزاری کرنا قرآن کی تعلیم ہے۔ ان دونوں میں یعنی عالم غیب میں دعا و توکل اور عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی اور تدبیر ضرورت نے ہم آہنگی پیدا فرمائی ہے نہ تو اسباب سے چمٹ کر مادی ہو کر رہنے کی اجازت دی ہے اور نہ اسباب سے بیگانہ رہ کر تارک دنیا بنایا ہے۔ اسلام کا راستہ دونوں میں مفاہمت کا ہے اور مفاہمت زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ غزوہ بدر ان دونوں میں ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے ایک طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے ضوابط اختیار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا عالم شہادت میں اسباب کی حد تک میدان جنگ میں بہترین جگہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں کی ترتیب، اسلحہ کے استعمال کی ترکیب، تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب نکال جائے، پتھروں اور ڈھیلوں سے غیر پر کس وقت حملہ کیا جائے۔ یہ عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی ہے دوسری طرف عالم غیب میں اللہ پر توکل و اعتماد کا عالم یہ تھا کہ دعا میں اس قدر انہماک تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> میں بدر کے روز ایک لڑائی لڑا، پھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گرے ہوئے یا حی یا قیوم فرما رہے ہیں، میں واپس میدان جنگ میں اور لڑا، پھر گیا تو میں نے حضور کو سجدے ہی میں پایا۔ (فتح الباری)

بہرحال مادی زندگی میں کامیابی کے لیے دونوں تدبیریں ہیں ایک اسباب کے تحت عقلی تدبیر اور دوسرے اسباب پر قابو پاتے ہوئے روحانی تدبیر، روحانی تدبیر ہی کا نام توکل ہے یعنی پیدائش کی راہوں اور اپنی طاقتوں پر نہیں بلکہ خود پیدا کرنے والے اور اسباب کے خالق پر اعتماد کیا جائے اور اس سے مانگنا اس پر توکل کے منافی نہیں بلکہ اس کا تقاضا ہے۔ توکل بھی اسباب میں سے جلب منفعت اور دفع مضرت کا ایک سبب ہے۔ جمہور علماء کے خیال کے مطابق توکل سے وہ کچھ ملتا ہے جو دوسرے اسباب کی پابجائی سے نہیں ملتا۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ جو بھی اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کو کافی ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ
نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ
الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ
ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿١٢﴾

اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے بھی عہدِ اطاعت لیا تھا[46]۔ اور ان میں بارہ سردار مقرر کیے تھے[47]۔ اللہ نے فرمایا تھا دیکھو میں تمہارے ساتھ ہوں[48]۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے[49]، اور ان کی مدد کی[50]، اور اللہ کو قرضِ حسنہ دیتے رہے[51]، میں ضرور تم سے تمہاری برائیاں دُور کر دوں گا اور تمہیں ضرور باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی[52]

پھر اس کے بعد تم میں سے جو بھی راہِ کفر اپنائے گا وہ بلاشبہ شاہراہِ مستقیم سے ہٹ جائے گا۔[1]

سعادت و شقاوت کا معیار

یہاں سے سلسلہ بیان بنی اسرائیل کے واقعات کی طرف متوجہ ہو گیا ہے تاکہ ان کے حالات سے اہلِ ایمان عبرت پکڑیں یعنی یہود و نصاریٰ سے جو عہد ایمان و طاعت لیا گیا تھا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہاں اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس روش پر چلنے سے روکا جائے جس پر ان کے پیش رو اہلِ کتاب چلتے رہے تھے چنانچہ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح آج تم سے عہد لیا گیا ہے اسی طرح کل یہی عہد بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰ کی اُمت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح وہ اپنے عہد کو توڑ کر گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے اسی طرح تم بھی مبتلا ہو جاؤ۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ان آیات کا اساسی اور بنیادی مقصد مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو عہد لیا جا رہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اگر تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہارے سامنے بھی وہی نتیجہ آئے گا جو ان کے سامنے آیا، انہوں نے اطاعت کی جگہ شقاوت کی راہ اختیار کی ایسا نہ ہو کہ تم بھی ایمان و عمل کا عہد فراموش کر بیٹھو، پہلے یہود کا ذکر کیا ہے اس کے بعد نصاریٰ کا، اور اس داستان کو بیان کر کے اجمالاً یہ بتانا پیشِ نظر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کی جانب سے اللہ کا رسول نہ ماننے کی یہ علت ہے اور یہ بھی مقصد ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے اور انہیں دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔

۴۶ - اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہدِ طاعت لیا تھا۔ یعنی کچھ اُمتِ محمدیہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے پہلی اُمتوں سے عہد لیے جا چکے ہیں۔[1] یہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے شہادت پیش کی گئی ہے کہ دیکھو اس موحد قوم نے جب نافرمانی کی کیسے وبال میں مبتلا ہوئی۔ بتانا یہ ہے کہ جیسے کائنات کا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

عام قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے لیکن نہیں کہ یہاں کوئی چیز اپنا وجود رکھتی ہو اور آثار و نتائج کی گرفت سے بالا ہو جیسے اللہ سبحانہ نے اجسام میں خواص و نتائج رکھے ہوں، اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جیسے جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں، اسی طرح روحِ انسانی کے لیے بھی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور معنوی موثرات سے روحِ انسانی متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنہیں سعادت و شقاوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ سعادت ہے اور برے اعمال کا نتیجہ شقاوت ہے۔ سعادت و شقاوت کے اس نقشہ میں نسب اور نسبتیں بے کار ہیں۔ پچھلی آیت میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے کہا کہ اللہ نے تم سے ایمان و طاعت کا جو عہد لیا ہے اسے یاد کرو۔ دین کامل ظہور میں آچکا ہے اب تمہارا فرض ہے کہ تذکیر نعمت سے غافل نہ ہو اور طاعت حق میں اخلاص و استقامت کا مظاہرہ کرو۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل سے عبرت پکڑو۔ اللہ نے ان سے ایمان و طاعت کا عہد لیا تھا لیکن انہوں نے محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کی۔ سعادت و شقاوت کا پیمانہ سب کے لیے ایک ہے۔

بنی اسرائیل کا سیاسی نظام

۴۷ - اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کیے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے بارہ سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چن لیے تھے جن کے نام مفسرین نے تورات سے نقل کیے ہیں۔ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنی قوم پر عہد پورا کرنے کی تاکید اور ان کے احوال کی نگرانی رکھیں۔ عجب اتفاق یہ ہے کہ ہجرت سے قبل جب انصار نے لیلۃ العقبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان میں سے بھی بارہ ہی نقیب نامزد ہوئے۔ ان ہی بارہ آدمیوں نے اپنی قوم کی طرف سے حضور کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ جابر بن سمرہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے متعلق جو بارہ خلفاء کی پیشین گوئی فرمائی تھی ان کا عدد بھی نقباء بنی اسرائیل کے مطابق ہے اور مفسرین نے تورات سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تیری ذریت سے بارہ سردار پیدا کروں گا، غالباً یہ وہی بارہ ہیں جن کا ذکر حضرت جابر بن سمرہ کی حدیث میں ہے[1] نقیب کے معنے کھوج لگانے والا، معاملات کی تہ میں پہنچنے والا کے ہیں۔ نقب عن الشیٔ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بنا ہے اس کے معنے کھوج لگانے کے ہیں۔ اصل میں دیوار کی پھٹن کو کہتے ہیں۔ لکڑی میں سوراخ کو بھی نقب کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ قوم اور قبیلے کے سردار، زعیم، نگران، ذمہ دار کے معنے میں بولا جانے لگا ہے۔ کیونکہ سردار، زعیم کا اصل کام لوگوں کے حالات کی نگرانی اور ان کی محافظت ہی ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے شریعت کی پابندی اور اس کی حفاظت لینے کے بعد بنی اسرائیل کے ہر قبیلے پر ایک ایک نقیب اس مقصد کی خاطر مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی نگرانی کریں کہ قانون الٰہی کی حدود و قیود کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں اور ان میں کوئی چیز ایسی داخل نہ ہونے پائے جو ان کو اللہ کے عہد سے روگرداں کرے۔ بنی اسرائیل چونکہ بارہ قبیلے تھے اس لیے نقیب بھی بارہ مقرر ہوئے۔ ان کا تقرر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ ۱۲ سرداروں کا یہ قرآنی عدد تورات کے بیان کے بالکل مطابق ہے۔ تورات میں ہے کہ مصر سے نکلنے کے دوسرے برس خدا نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا:

> "تو بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا ان کے فرقوں کے مطابق اور ان کے آبائی خاندانوں کے اسم شماری کے ساتھ ہر ایک مرد سر سے سر گن کر حساب کر ۔ ۔ ۔ اور ہر فرقے سے ایک ایک آدمی پر ایک جو اپنے آبائی خاندان کا سردار ہے تمہارے ساتھ ہو۔ (گنتی)

اس کے بعد ان سرداروں کے نام درج ہیں اور تعداد میں بارہ ہیں۔ اسی طرح تورات میں دوسری جگہ کنعان پر فوج کشی سے ذرا پہلے کے موقع پر ہے۔

> خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں۔ ایک ایک مرد ان کے آبائی فرقہ میں سے جو اس میں سردار ہے بھیج دینے۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے مطابق دشت فاران میں ان کو بھیج دیا وہ سب لوگ سردار تھے۔

یہاں بھی سرداروں کی تعداد ۱۲ درج ہے۔

اگرچہ تورات میں بارہ سرداروں کا ذکر موجود ہے مگر ان کی حیثیت جو یہاں قرآن نے لفظ نقیب استعمال کر کے بتائی ہے تورات کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ تورات ان کو صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور قرآن ان کی حیثیت سیاسی و اخلاقی نگران کار کی مقرر کرتا ہے۔

یہاں علامہ بغویؒ نے تفسیر میں بنی اسرائیل کے نقباء کے نام بتا کر لکھا ہے کہ حضرت مسیح کے نقباء کی

تعداد بھی بارہ ہے جن کو حواریین کہتے ہیں اور انصار میں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقباء کی تعداد بھی بارہ ہے جنہوں نے لیلۃ العقبہ میں حضور کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ یہ بارہ نقیب ۹ قبیلہ خزرج اور ۳ اوس میں سے تھے۔ تورات میں بنی اسرائیل کے نقباء کی روانگی دو مرتبہ بتائی گئی ہے۔ پہلی بار جب حضرت موسیٰ سرزمین سینا میں تھے اس کی تفصیل تورات میں فصل اول میں ہے اور دوسری روانگی ان بارہ نقیبوں کی کنعان میں جاسوسی کے لیے ہے اس کی تفصیل تورات میں ۱۳ فصل میں ہے۔ اسرائیلی نقباء میں سے یوشع بن نون اور کالب بن یفنا کے علاوہ کسی نے حضرت موسیٰ سے وفاداری نہیں کی، جب کہ عیسائی نقباء میں سے صرف یہودا نامی نے حضرت عیسیٰ سے بے وفائی کی۔ لیکن حضور انور نے جن بارہ انصار کو یہ کہہ کر نقیب بنایا تھا اخرجوا الی منکم اثنی عشر نقیبا ان میں سے ہر ایک نے بحمد اللہ خدا کی توفیق سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کی اور آج تک تاریخ ان کے کارناموں کے گیت گا رہی ہے۔

اللہ کی معیت اور اس کا مقام

۴۸۔ اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یا تو یہ خطاب بارہ سرداروں کو ہے یعنی تم اپنا فرض ادا کرو، میری حمایت اور امداد تمہارے ساتھ ہے یا سب بنی اسرائیل کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں یعنی کسی وقت تم مجھے اپنے سے دور نہ سمجھو جو کچھ بھی معاملہ تم سرًا یا علانیۃً کرو گے وہ ہر جگہ اور ہر وقت میں دیکھ رہا اور سن رہا ہوں۔ اس لیے جو کچھ کرو خبردار ہو کر کرو[۱] یہ ایک جامع تعبیر ہے اللہ کی تائید و نصرت کے وعدے کی۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک یہ کہ اگر تم میثاق پہ قائم ہے تو میری امداد تمہارے ساتھ رہے گی اور تم ہر قدم پر اس کا مشاہدہ کرو گے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور اس میثاق کی نگرانی فرما رہا ہے۔ تمہارا کوئی عزم و ارادہ اور فکر و خیال یا حرکت و عمل اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ تمہاری خلوتوں کے رازوں کو بھی دیکھتا اور سنتا ہے وہ تمہارے دلوں کے ارادوں اور نیتوں سے بھی واقف ہے[۲]

معیت الٰہی کا تصور ایک مومن کے لیے کس قدر ہمت آفریں و شوق افزا ہے۔ اس تصور کے بعد دل میں کس قدر قوت آتی ہے اور اطمینان کی کیسی نعمت ملتی ہے۔ اس کے بعد شکست کا کوئی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام [۲] معارف م ش

امکان بھی اس کے بعد ذہن کے سامنے نہیں آسکتا۔ آج محض وزیراعظم اگر شہریوں کے ایک معمولی فرد سے کہہ دے کہ گھبراؤ مت ہم تمہارے ساتھ رہیں گے تو اسے کس قدر قوت و استقامت حاصل ہو جائے، چہ جائے کہ یہاں خالق کائنات مالک الملک، حاکم علی الاطلاق اپنی معیت کا یقین دلا رہا ہے تسکین و اطمینان کا درجہ اس کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک پہلو ہے، اب دوسرے پہلو سے دیکھئے کوئی گناہ دس استحضار معیت الٰہی کے بعد بندہ سے ممکن ہے! جہاں کوئی اپنے سے ذرا بڑا اگر نگرانی کے لیے پاس موجود رہتا ہے جب تو اس کی مروت، لحاظ یا دباؤ سے ہم اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں اور کوئی لغزش یا معصیت سرزد نہیں ہونے دیتے چہ جائے کہ ہم بیں، ہمہ دان، ہمہ توان مالک و مولیٰ کی معیت کا استحضار سر چڑھے کیا کوئی معصیت اس کے بعد ہو سکتی ہے۔ غرض ترغیب و ترہیب کے جس گوشہ سے بھی غور کیا جائے معیت الٰہی کا مراقبہ بہترین اور موثر ترین ہے۔ محققین نے یہاں یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ خدا کی معیت سے یہاں معاذ اللہ معیت جسمانی نہیں جیسی مخلوق و مخلوق کے درمیان ہوتی ہے بلکہ احاطہ، علم، قدرت، معونۃ و نصرت کے لحاظ سے ہے۔ رازی نے لکھا ہے۔

> میں علم قدرت کے لحاظ سے تمہارے ساتھ ہوں تمہاری باتوں کو اور تمہارے کردار کو دیکھ رہا ہوں، تمہارے دلوں کی گہرائیوں کو جانتا ہوں اور تمہارے اعمال پر بدلہ دینے پر پوری پوری قدرت رکھتا ہوں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

> میری معیت میری حفاظت میری نگرانی اور میری نصرت کے ذریعے ہے۔

علامہ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں کہ اللہ کی معیت علم قدرت اور نصرت کے ذریعے ہوتی ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں:

> میں معونت و نصرت کے ذریعے تمہارے ساتھ ہوں گا جب تک تم میثاق کے نگران بن کر رہو گے۔

بہرحال خدا کی معیت اور اس کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے علم و قدرت، اپنی نصرت اور مدد کے ذریعے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

میثاق کی دفعات میں اولین نماز

۴۹۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے۔

یہ میثاق کی دفعات کی تفصیل ہے۔ ان دفعات میں سب سے پہلی دفعہ اقامت صلاۃ ہے۔ جس طرح امت مسلمہ کے میثاق میں بنیادی دفعہ اقامت صلاۃ ہے اسی طرح بنی اسرائیل کے میثاق میں بھی اس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ حکمت دین کے پہلو سے دین میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی۔ اس کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے۔ نماز کی ہیئتوں کو دیکھئے اور اس کی دعاؤں، تسبیحوں اور قراتوں پر غور کیجئے۔ عاجزی اور سرافگندگی کے اظہار کی کوئی ممکن صورت نہیں جو نماز کے ظاہر اور اس کے باطن میں موجود نہ ہو۔ یہ سینے پر ہاتھ باندھے اور آنکھیں جھکائے ادب سے کھڑا ہونا، یہ کمر کا خم کرنا، یہ زمین پر پیشانی کا ڈال دینا، یہ زبان پر اللہ کی حمد کے، تسبیح کے، تکبیر کے، توحید کے کلمات کا مسلسل جاری رہنا اور یہ دل کا اللہ کی خشیت اور عظمت اور محبت سے معمور رہنا۔ آخر بندگی کی کون سی ادا ہے جس سے یہ نماز خالی ہے۔ قرآن و سنت کا مطالعہ فرمائیے تو نماز کی اہمیتوں اور فضیلتوں سے ان کے صفحات بھرے نظر آئیں گے۔ نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ اگر انسان میں ایمان موجود ہو اور اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ نماز ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان تو ہو مگر سر میں رکوع اور سجدے کی تڑپ نہ ہو ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہی کیفیت ہے جو خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے جہاں ایمان ہو وہاں نماز ضرور ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح کہ جہاں سورج نکلا ہوا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔ میثاق میں اسے دفعہ اول لا کر پیش کرنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ نماز پوری شریعت اور پورے قانون کے جذبۂ اتباع کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کی محافظ بھی۔ وہ اگر ادا ہوگی تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا ہو سکیں گے اور اگر اس کا حق ادا نہ ہو تو باقی شریعت بھی غفلت کی نذر ہو جانے سے نہیں بچ سکے گی۔ یوں سمجھئے کہ شریعت کے سارے احکام کے اندر نماز کی حیثیت وہی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ دل میں اگر حرکت اور گرمی اور زندگی موجود ہو تو جسم کے دوسرے تمام حصوں تک بھی خون کی روانی قائم رہتی ہے اور وہ زندہ رہتے ہیں لیکن جس وقت یہ دل اپنی حرکت اور زندگی کھو دیتا ہے اس وقت دوسرے اعضا بھی سرد اور بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نماز کی اس حیثیت کے بارے میں قرآن نے کئی جگہ اشارے کیے ہیں۔

میثاق کی دوسری دفعہ زکوٰۃ

میثاق کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ اگر تم نے زکوٰۃ کی ادائیگی کی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی

اور اس آیت میں بھی زکوٰۃ کا مقام نماز کے مقام سے ایک ہی درجہ نیچے دکھایا گیا ہے۔ قرآن کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں بکثرت مقامات پر ایمان کے بعد صرف دو اعمال صالح کا ذکر آتا ہے ایک نماز کا دوسرے زکوٰۃ کا۔ جب ایک معیاری مومن کا تصور سامنے لانا ہوتا ہے تو وہ عموماً اس طرح کے الفاظ فرماتا ہے۔

ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات واقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ

حالانکہ نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے اچھے اعمال اور اخلاق اور بھی ہیں جن کا وجود معیاری مومن بننے کے لیے ضروری ہے۔ پھر قرآن حکیم نے ایسا انداز بیان کیوں اختیار فرمایا ہے اور معیاری مومن و مسلم کا تصور دینے کے لیے اکثر ایمان کے بعد صرف نماز اور زکوٰۃ ہی کے نام لے کر خاموش کیوں ہو جاتا ہے، دوسری نیکیوں کا بھی کیوں ذکر نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ گفتگو کا یہ انداز اس نے بلا وجہ اختیار نہیں کیا ہے۔ غور کیجئے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نماز اور زکوٰۃ ہی دو عمل دین کی اصل بنیادیں ہیں جس نے دونوں فرائض کو اچھی طرح ادا کر لیا اس نے گویا پورے دین پر عمل کرنے کی پکی ضمانت اور عملی شہادت فراہم کر دی اور اب اس سے اس بات کا واقعی کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ دوسرے احکام شریعت سے بے نیازی کا برتاؤ کر جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس بات کا جواب آپ کو ایک طرف دین کی اور دوسری طرف نماز اور زکوٰۃ کی حقیقتوں پر نظر ڈالتے ہی مل جائے گا۔ احکام دین کی اصولی تقسیم کیجئے تو ان کی دو ہی قسمیں ہو سکیں گی۔ ایک قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق اللہ کے حقوق سے ہے۔ دوسری قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ اس طرح دین کی پیروی دراصل اس بات کا نام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق دونوں سے عہدہ برآ ہو جائے۔ نماز کی اور زکوٰۃ کی جو حیثیت قرآن و سنت میں بیان ہوئی ہے ان دونوں سے صاف عیاں ہے کہ نماز حقوق اللہ اور زکوٰۃ حقوق العباد کا مغز اور جوہر ہے۔ اگر ایک شخص نے مسجد میں نماز کا حق ادا کر دیا تو ممکن نہیں وہی مسجد سے باہر اللہ کے حقوق بھول جائے گا۔ اس سے تو یہ حقوق اسی طرح ادا ہوتے رہیں گے جس طرح چشمے سے پانی ابلتا رہتا ہے۔ اسی طرح جس نے زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا اس سے یہ ممکن نہیں کہ وہ بندگان خدا کے حقوق پامال کرتا رہے گا۔ جو شخص اپنے بھائیوں اور پڑوسیوں پر اپنی کمائی کا حصہ خود اپنی خوشی سے صرف کرے گا اور صرف ان کو اپنا احسان مند بنانے کے بجائے الٹا خود انہی کا شکر گزار ہوگا وہ تو ان کا ایک ایک حق ادا کر کے چین پا سکے گا۔

میثاق کی تیسری دفعہ ایمان بالرسل

یہ میثاق کی تیسری دفعہ ہے کہ اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ یعنی ان رسولوں پر ایمان لانا ہے جن کو میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد روانہ کروں گا جیسے داؤد، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایمان والی دفعہ کو نماز اور زکوٰۃ کے بعد ذکر کرنے کی وجہ یہی ہے کہ ان سے آنے والے پیغمبروں کے بارے میں ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا اور اس وقت لیا گیا تھا جبکہ وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لا چکے تھے یوں تو حضرت موسیٰ کے بعد آنے والے تمام انبیاء کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں اشارہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جن کا ذکر تورات میں نمایاں علامات کے ساتھ ہوا ہے بالخصوص اس میثاق میں یہ بات تورات میں واضح اور صاف الفاظ میں بتاتی ہے اور یہ حضرت موسیٰ پر آنے والی آخری وحی ہے۔

> یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ہوگی۔ (استثناء ۳۳-۲)

اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ سورہ اعراف جلد نہم میں آئے گی۔

اللہ کے رسولوں کی مدد

۵۰۔ میثاق کی چوتھی دفعہ یہ ہے کہ تم اللہ کے رسولوں کی مدد کرنا۔ اصل ارشاد میں عزرتموھم کے الفاظ آئے ہیں۔ تعزیر اس مدد کو کہتے ہیں جس میں تعظیم کی آمیزش ہو۔ خدا کے سوا قانون میں دوسری سزاؤں کو بھی تعزیر کہتے ہیں کیونکہ یہ تادیب ہے اور تادیب بھی ایک قسم کی مدد ہے کیونکہ اس کے ذریعے انسان کو نقصان رسانی سے بچایا جاتا ہے۔ اسی لیے ایک ارشاد میں ظالم کو ظلم سے روک دینے کے لیے نصرت کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ ارشاد ہے انصر اخاک ظالما او مظلوما اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔ دریافت کیا گیا کہ مظلوم کی مدد کریں مگر ظالم کی مدد کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کے ظلم سے اس کو باز رکھو۔ یہاں رسولوں کی تعزیر کا شارحین قرآن نے مطلب یہ بتایا ہے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرو (قرطبی) ان سے ان کے دشمنوں کو ہٹاؤ۔ (مدارک) مطلب یہ ہے کہ نبوت جو دعوت لے کر آئے اور جو مشن پیش کرے اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔

اس سے تعاون کرو، اس کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرو۔ اگر اس کا دشمنوں سے مقابلہ ہو تو اس کی مدد کرو۔ رسولوں پر ایمان کی دفعہ سے اس تعزیر یعنی رسولوں کی مدد کرنے کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اسے ایمان کی ترت و حیات کا پیمانہ بنا دیا گیا ہے۔ ایسے ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے جس میں رسولوں کی مدد کرنے کا کوئی جذبہ اور کوئی تقاضا نہ ہو۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ جو رسول حضرت موسیٰ کے بعد آئیں گے ان سب کی تصدیق کرو گے اور دلی تعظیم سے پیش آؤ گے اور دشمنانِ حق کے مقابلہ پر ان کا ساتھ دو گے۔

اللہ کو قرضِ حسن

۱۵۔ میثاق کی پانچویں دفعہ یہ ہے کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ پہلے زکوٰۃ کا ذکر کیا، اب یہاں قرضِ حسنہ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خالص قرآن کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ رقم ہے جو دین کی برتری کے لیے خرچ کی جائے۔ زکوٰۃ کا ادا کرنا ہر ایک کے لیے اخلاقی نہیں بلکہ قانونی طور پر ضروری ہے۔ اس دفعہ کا مقصود ہے کہ دین کی برتری اور رفاہِ عام کے سارے اجتماعی کاموں کے لیے انفرادی ذمہ داری کے ساتھ اجتماعی ذمہ داری یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مالی ذمہ داریاں ہیں جن سے وقت کے ملی تقاضوں اور مطالبات کو پورا کیا جاتا ہے، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ ایک قانونی ذمہ داری ہے اور قرضِ حسنہ اسی مالی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے اور آگے بڑھنے کی رضاکارانہ کوشش ہے تاکہ جماعتی مقاصد کے پورا ہونے کی زیادہ سے زیادہ توقع ہو سکے۔ آگے بڑھنے کی اس کوشش کو اگرچہ لوگوں کی اپنی مرضی پر رکھا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہاں ان کی مرضی ہی سب کچھ ہے اور اب اسے قانون کسی حال میں بھی اپنا پابند نہیں بنا سکتا۔ قانون اب بھی مطالبہ کر سکتا ہے۔ آیت بھی اسی طرف رہنمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال کی متعینہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی ایک مسلمان دین کے مالی مطالبات سے سبکدوش نہیں ہو جاتا اور اب بھی اس کی دولت میں حق باقی رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کے اخلاقی احساسات معاشرے کی بھوک اور ناداری پر قابو نہ پا سکے ہوں یا دین کی حفاظت اور نصرت کا فرض ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ایسی حالت میں قرضِ حسن یقیناً اخلاق سے قانونی بن جائے گا اور اس دفعہ کی رو سے اسلامی حکومت اس بات کی مجاز ہو گی بلکہ شاید یہ ذمہ داری بھی اس کی ہو گی کہ وہ غریب و نادار شہریوں کی ضرورتوں اور دین کے مفاد کی خاطر مالداروں پر مزید بار ڈالے۔

فقہاء کی اصطلاحی زبان میں جس چیز کو فرض عین اور فرض کفایہ کہا جاتا ہے اسی کو ہم نے قانونی اور اخلاقی ذمہ داری سے تعبیر کیا ہے۔ زکوٰۃ ان کے یہاں فرض عین ہے تو قرض حسن فرض کفایہ۔ فرض کفایہ کے معنے یہ ہیں کہ امت کے چند افراد یا جماعت نے ان مطالبات کو پورا کر دیا تو سب مسلمان فرض سے سبکدوش ہو گئے اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوں گے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں؛

> خدا کو قرض دینے سے مراد اس کے دین اور اس کے پیغمبروں کی حمایت میں مال خرچ کرنا ہے جس طرح روپیہ قرض دینے والا اس امید پر دیتا ہے کہ اس کا روپیہ واپس مل جائے گا اور قرض لینے والا اس کے ادا کرنے کو اپنے ذمہ لازم کر لیتا ہے۔ اسی طرح خدا ہی کی دی روزی جو چیز یہاں اس کے راستہ میں خرچ کی جائے گی، وہ ہرگز گم یا کم نہیں ہو گی۔ حق تعالیٰ نے کسی مجبوری سے نہیں محض اپنے فضل و رحمت سے اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے کہ وہ چیز تم کو عظیم الشان نفع کی صورت میں واپس کر دے۔ اور قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ اخلاص سے دو اور اپنے محبوب و مرغوب اور پاک صاف مال میں سے دو۔

نیکیاں برائیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہیں

۵۲ - میں ضرور تم سے تمہاری برائیاں دور کر دوں گا اور تمہیں ضرور باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یعنی نیکیاں جب زیادہ ہوں تو وہ برائیوں کو دبا لیتی ہیں جب آدمی خدا کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہے تو حق تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دور کر کے اپنی خوشنودی اور قرب کے مکان میں جگہ دیتا ہے۔[1]

یہ نتیجہ ہے میثاق پر پابجائی اور وفاداری کا۔ مطلب یہ ہے کہ میثاق کی ان پانچ دفعات پر اگر تم نے عمل کیا اور اس طرح تم ہمارے وفادار بن گئے ہو تو میں ان حسنات کے ذریعے تمہاری وہ برائیاں ملیامیٹ کر دوں گا جن کے دھبے تمہارے دامنوں پر ماضی میں پڑ چکے ہیں۔ برائیاں ملیامیٹ کرنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ راہ راست کو اختیار کرنے اور اللہ کی ہدایت کے مطابق فکر و عمل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے صحیح طریقے پر چلنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا نفس بہت سی برائیوں سے اور اس کا طرز زندگی بہت سی خرابیوں سے پاک ہوتا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس اصلاح کے باوجود اگر کوئی شخص بحیثیت مجموعی کمال کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے اور کچھ نہ کچھ برائیاں اس کے اندر باقی رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان پر مواخذہ نہ فرمائے گا اور ان کو اس کے حساب سے ساقط کر دے گا کیونکہ جس نے اساسی ہدایت اور بنیادی اصلاح قبول کرلی ہو۔ اس کی جزئی اور ضمنی برائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے لہ

آخر میں فرمایا ہے کہ میں تمہیں ضرور باغات میں داخل کروں گا۔ جنات کا بول قرآن میں آخرت کی پُر بہار زندگی کے لیے کنایہ ہے۔ یہودیوں کے یہاں بھی جنت اور آخرت کی پر بہار زندگی کا تصور تھا یہاں تاکید لاکر فرمایا ہے کہ اس میثاق سے وفاداری کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ عالم آخرت میں پُر بہار زندگی ہے۔

کفر شاہرہِ مستقیم سے بھٹک جانا ہے

۵۳۔ پھر اس کے بعد تم میں سے جو بھی راہِ کفر اپنائے گا وہ بلاشبہ سیدھی راہ سے ہٹ جائے گا یعنی ایسے صاف اور پختہ عہد و پیمان کے بعد بھی جو شخص خدا کا وفادار ثابت نہ ہوا اور غدر و خیانت پر کمربستہ ہوگیا تو سمجھو کہ اس نے کامیابی اور نجات کا سیدھا راستہ گم کردیا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہلاکت کے کس گڑھے میں جا گرے گا۔ بنی اسرائیل سے جن باتوں کے عہد لینے کا یہاں ذکر ہے وہ یہ ہیں، نماز، زکوٰۃ، پیغمبروں پر ایمان لانا، ان کی جان و مال سے مدد کرنا۔ ان میں سے پہلی جانی عبادت ہے دوسری مالی، تیسری قلبی و زبانی، چوتھی فی الحقیقت، تیسری ان کی اخلاقی تکمیل ہے۔ گویا ان چیزوں کو ذکر کرکے اشارہ کردیا کہ جان و مال اور قلب و قالب ہر چیز سے خدا کی طاعت اور وفاشعاری کا اظہار کرو۔ لیکن بنی اسرائیل نے چن چن کر ایک ایک عہد کی خلاف ورزی کی، کسی قول و قرار پر قائم نہ رہے۔ ان عہد شکنیوں کا جو نتیجہ ہوا اس اگلی آیت میں بیان فرماتے ہیں لہ

اصل ارشاد میں سواء السبیل آیا ہے۔ اس لفظ کی معنویت سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، خدمات اور رجحانات ہیں۔ نفس اور جسم کے مختلف مطالبے

لہ تفہیم القرآن لہ افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ رُوح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں، پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے وہ بھی بے حد و حساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدن و تہذیب کے نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں پھر دُنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصہ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو۔ اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جاتے، اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم رہے۔ اس کے سب اندرونی اور بیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں۔ اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے۔ اور مادی اشیا کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل و انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک اس کے دماغ میں اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بلا ارادہ یا بد ارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوتی ہے بغاوت شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ جھگولے ہی کھاتے رہتی ہے تمام وہ راستے جو انسان کے اپنے خود ساختہ و پرداختہ ہیں خط منحنی کی صورت میں ہیں۔ ان بہت سی غلط راہوں میں ایک ایسی راہ جو بالکل سیدھی ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ اس کی رُوح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء اور اس کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ انسانی فطرت اسی راہ کی طالب ہے لیکن انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے اس کی طرف صرف اللہ سبحانہٗ ہی رہنمائی کر سکتا ہے اور اللہ نے اپنے رسول اسی لیے روانہ کیے ہیں کہ انسانوں کو یہ راہِ راست بتائیں۔

قرآن نبوت کی پیش کردہ اسی راہ کو سواء السبیل اور صراط مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی

زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے گزر کر سیدھی چلی جاتی ہے جو اس پر چلا وہ یہاں راست رو اور آخرت میں کامیاب اور بامراد ہے اور جس نے اسے گم کر دیا وہ یہاں غلط بیں، غلط رو اور غلط کار ہے اور آخرت میں لامحالہ اسے جہنم میں جانا ہے۔

موجودہ زمانے میں بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے درپے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جارہی ہے۔ یہ نتیجہ نکال لیا کہ جدلی عمل انسانی زندگی کے ارتقاء کا فطری طریق ہے وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقاء کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ اسے ایک رُخ پر بہائے جاتے، پھر اس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے اور پھر دونوں کے امتزاج سے ارتقاءِ حیات کا راستہ بنے حالانکہ دراصل یہ ارتقاء نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہوتے ہیں۔ ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے لیے جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ سواء السبیل سے بہت دور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دوسری حقیقتیں جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعویٰ کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔ جس قدر سواء السبیل نزدیک آتی ہے۔ ان متصادم دعووں کے درمیان مصالحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں لیکن جب وہاں سواء السبیل کے نشانات دکھانے والی روشنی نہیں ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان، تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کو اس کے مقام پر نہیں ٹھہرنے دیتا بلکہ اپنے زور سے اسے دوسری جانب انتہا تک کھینچا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں ایک دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انہوں نے سواء السبیل کو دیکھ لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی سواء السبیل ہے نہ کہ خط منحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔[1]

❖

---

[1] تفہیم القرآن

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۖ
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ۙ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۖ فَاعْفُ
عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣﴾ وَمِنَ الَّذِينَ
قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا
بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ وَ
سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿١٤﴾

لہٰذا اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون بنا دیا اور اُن کے دلوں میں سختی ڈال دی[۵۴]۔ وہ کلام کو اپنے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں[۵۵]، اور جس چیز کے ذریعے ان کی یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے ہیں[۵۶]، اور تم ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے لیکن تھوڑے سے ان میں سے

ایسے نہیں ہیں،[58] ان کو معاف کردو اور ان سے درگزر کرو، اللہ حسن کار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔[58] اور جو لوگ اپنے تئیں نصاریٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا،[59] وہ بھی اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے جو اُن کو یاد کرائی گئی تھی؛[60] لہٰذا ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی اور اللہ ان کے کرتوتوں سے عنقریب اُن کو آگاہ کرے گا"[61]

میثاق سے گریز پائی اور غداری

پہلی آیت میں بنی اسرائیل سے جو میثاق لیا تھا اس کی تاریخ بیان کی تھی اب اسی میثاق کے بارے میں ان کے کردار کی تاریخ بیان ہو رہی ہے۔ اور یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی تاریخ سے بھی دونوں پہلو زیر بحث آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ سے جو عہد لیا گیا تھا اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس عہد کو توڑ کر وہ جن نتائج سے دوچار ہوتے بالاجمال ان کی طرف بھی اشارہ ہے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو عہد لیا جا رہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا ہے اگر تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہیں بھی ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جو ان کو پیش آئے۔ یاد رکھو کہ نقض عہد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو محض ماضی کی ایک سرگزشت کی حیثیت سے نہیں سنائی جا رہی ہے بلکہ اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ

مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا قرآن کا بھی وہی حشر ہوگا جو یہود و نصاریٰ کا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کے نتائج زمانوں، مکانوں اور قوموں کے بدلنے سے مختلف نہیں ہوتے، ہر جگہ ہر زمانے اور ہر قوم میں یکساں ہوتے ہیں۔ سعادت و شقاوت کا پیمانہ ایک ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ سعادت ہے اور بُرے اعمال کا نتیجہ شقاوت۔ سعادت و شقاوت کے اس نقشہ میں نسب اور نسبتیں بیکار ہیں زمانوں اور مکانوں کے اختلاف اس پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں۔

۵۴۔ لہٰذا ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون بنا دیا ، اور ان کے دلوں میں سختی ڈال دی، لعن کے معنے طرد اور ابعاد کے ہیں یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے اپنی رحمت سے ان کو دُور پھینک دیا ہے اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا فبما نقضھم میثاقھم کے لفظ سے ظاہر فرما دیا کہ ان کے ملعون ہونے کا سبب عہد شکنی اور غداری ہے جو خود انہی کا فعل ہے۔ اسباب کا سبب پر مرتب کرنا چونکہ خدا ہی کا کام تھا اس لحاظ سے جعلنا قلوبھم قاسیۃ کی نسبت اسی کی طرف کی گئی ہے[۱]

اس فقرے میں میثاق سے غداری کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر لعنت ڈال دی اور ان کے دلوں میں سختی پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے اس کو جس درجے کی عزت و سرفرازی بخشتا ہے۔ معاہدہ توڑ دینے کی صورت میں وہ اس کو اسی درجے کی ذلت کے ساتھ دھتکار بھی دیتا ہے۔ اس دھتکار کے لیے جامع تعبیر لعنت ہے یعنی کسی کو راندہ درگاہ قرار دینا۔ راندہ درگاہ قرار دینے کا پہلا اثر جو اس قوم پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے خدا کی خشیت جو دل کی زندگی کی ضامن ہے ختم ہو جاتی ہے اور دل پتھر ہو کر توبہ و انابت کی روئیدگی کے لیے بالکل بنجر ہو جاتا ہے۔ یہ حالت پیدا تو ہوتی ہے عہد شکن قوم کے اپنے عمل کے نتیجہ کے طور پر لیکن چونکہ واقع ہوتی ہے، اللہ کی مقررہ سنت کے مطابق، اس وجہ سے اس کو منسوب اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرماتا ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ جہاں بنی اسرائیل کی تاریخ حیات کا چہرہ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ مال و دولت کا حصول، حق اور باطل میں التباس، کتمانِ حق دین کا کاروبار، شخصی مسئولیت سے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

بے پرواہی، غلامی سے آزادی کے بعد سرکشی، گوسالہ پرستی، گستاخی اور بے ادبی، ظلم کاری اور معصیت پر اصرار فطرت کا فساد اور اخلاق کا بگاڑ، قتل انبیاء، اللہ کی آیات کا کفر، عہد و پیمان کے بعد اس سے روگردانی، غداری، اور عہد شکنی، حیلہ سازی، تعمق اور کثرتِ سوال اور نبوت کی شان میں گستاخیاں ان کے مزاجوں میں اسی قساوت قلبی کے مظاہر ہیں۔ قساوت عربی زبان میں ہر چیز کی سختی کو کہتے ہیں۔ سخت پتھر کو حجر قاسیہ اور ایسی زمین کو جس میں پیداوار کی صلاحیت نہ ہو ارض قاسیہ کہتے ہیں۔ قساوت یہ ہے کہ قبول کرنے اور نصیحت سے اثر پذیری کی اس میں کوئی صلاحیت نہ ہو۔ قرآن نے ایک موقعہ پر ان کی قلبی قساوت کے لیے بلیغ تشبیہہ پیش کی ہے

قست قلوبکم من بعد ذالک فہی کالحجارۃ او اشد قسوۃ

اس کے باوجود تمہارے دل سخت ہو گئے وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی سخت یعنی یہودیوں کی اخلاقی حالت اتنی گر گئی ہے یا اس درجے میں آگئی ہے کہ عبرت پذیری اور تنبیہہ کی استعداد ان میں یک قلم معدوم ہو گئی۔ ان کی اسی حالت کا نام قرآن نے قساوت رکھا ہے۔ امام حمزہ اور امام کسائی نے قاسیہ کو قسیتہ پڑھا ہے یعنی فعیلۃ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ۔ یہ قاسیہ سے بلحاظ معنے زیادہ بلیغ ہے۔ یہودیوں کی اس قساوت کا انجیل میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اس نے ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر کر کے اس آدمی سے کہا۔ (مرقس ۳ - ۵)، ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ملامت کی (مرقس ۱۶ - ۱۴)، تو اپنی سختی اور غیر تائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لیے اپنے واسطے غضب کما رہا ہے (رومیوں ۲ - ۵)

کلام الٰہی میں تحریف

۵۵- وہ کلام کو اپنے موقعہ و محل سے ہٹاتے ہیں یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں، کبھی اس کے الفاظ میں، کبھی تلاوت میں تحریف کی یہ سب اقسام قرآن وحدیث میں ذکر کی گئی ہیں جس کا قدرے اعتراف آج کل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے[1] علامہ ابوالسعود فرماتے ہیں کہ یہ فقرہ استیناف بیانی ہے اور اس کے ذریعے ان کے دلوں کی قساوت کے مرتبے کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ ایسا مقام جس میں انسان دل کی سختی کی وجہ سے اللہ کے کلام کا منہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بگاڑنے پر دلیر ہوتا ہے، قساوت کا آخری مرتبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قساوت عہد شکن قوم میں ایسی جسارت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ میثاقِ الٰہی کی خلاف ورزی پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ اس معاہدے کو اپنی خواہش کے مطابق بنانے کے لیے اس کے الفاظ و کلمات میں تحریف بھی کرتی ہے۔ یہ تحریف یہود نے کن کن شکلوں میں کی اس کی تفصیل انشاء اللہ اسی پارے میں آ رہی ہے۔ یہاں تو صرف یہودی علماء کی یہ شقاوت بتائی ہے کہ کتاب اللہ کی اطاعت کرنے کی جگہ کتاب اللہ کو اپنی خواہشوں اور رایوں کے مطابق کام میں لاتے تھے یا تو کسی آیت کا مطلب اس طرح ٹھہراتے تھے کہ بات کچھ سے کچھ ہو جاتی یا کتاب اللہ کی آیتیں سناتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ گھٹا اور بڑھا دیتے کہ اصل مطلب ظاہر نہ ہو اور جو بات بنانی چاہتے ہیں کسی نہ کسی طرح بن جائے۔ تحریف حرف سے بنا ہے اس کے معنے کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے کے آتے ہیں یعنی کسی کو ایک طرف کر دینا کیونکہ حرف لغت میں جانب اور طرف کے آتے ہیں۔ اس میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفیں آ گئیں ہیں۔ یہود و عیسائیوں کی طرح خود بھی وحی لفظی کے قائل نہیں اور اپنے صحیفوں بلکہ خود تورات تک کی محفوظیت کے مدعی نہیں ہیں۔ ان کا سارا کام عیسیوں کی طرح بجائے اصل متن کے ترجمہ کے زور پر چل رہا ہے اور ترجمہ بہتر سے بہتر ہی ہو پھر بھی اصل سے جتنا دور ہوتا جائے گا۔ ہر عقلمند جانتا ہے اس کا مقام کیا ہے؟

تورات کے متعلق قرآن کا تاریخی انکشاف

۵۶۔ اور جس چیز کے ذریعے ان کو یاد دہانی کرائی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے۔ یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ ان قیمتی نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے جو مثلاً نبی آخر الزمان کی آمد اور دوسرے معجزات وغیرہ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں مگر اپنی غفلتوں اور شرارتوں میں پھنس کر یہ سب بھول گئے بلکہ نصیحتوں کا وہ ضروری حصہ ہی گم کر دیا اور اب بھی جو نصیحتیں اور مفید باتیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان کو یاد دلائی جاتی ہیں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے لکھا ہے کہ نقضِ عہد کی وجہ سے ان میں دو باتیں آ گئیں۔ ملعونیت اور قساوتِ قلب ان دونوں کا نتیجہ یہ دو چیزیں ہوئیں۔ تحریف کلام اللہ اور عدم انتفاع بالذکر یعنی لعنت کے اثر سے ان کا دماغ مسخ ہو گیا حتیٰ کہ نہایت بے باکی اور بد عقلی سے کتبِ سماویہ کی تحریف پر آمادہ ہو گئے دوسری طرف جب عہد شکنی کی نحوست سے . . . . دل سخت ہو گئے تو

قبول حق اور نصیحت سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہ رہی اور اس طرح علمی اور عملی دونوں قسم کی قوتیں ضائع ہو گئیں۔[1]

اصل میں نسوا حظاً مما ذکروا بہ ارشاد ہوا ہے اس کی تشریح شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ ہمارے خیال میں ما ذکروا بہ سے تورات مراد ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی تورات کا ایک حصہ بھلا بیٹھے۔ دراصل تورات حضرت موسیٰ کے زمانے میں مرتب نہیں ہوئی بلکہ ان کی وفات کے اتنے دنوں کے بعد اس کی ترتیب عمل میں آئی جب کسی کو یہ علم بھی نہ رہا تھا کہ ان کی قبر کہاں ہے! اس کے مرتبین کا نام بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کون اور کن صفات کے لوگ تھے۔ استثناء باب ۳۲ کے آخر میں ہے کہ

پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں ہے۔

اسی طرح یہ الفاظ بھی اسی میں ہیں۔

اور اس وقت سے اب تک کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں پیدا ہوا۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب اپنے لانے والے کی وفات کے طویل عرصہ کے بعد مرتب ہوئی کہ لوگ اس کی قبر بھی بھول گئے۔ اس کی تعلیمات کو محفوظ رکھنا ان کے لیے کس طرح ممکن تھا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ تورات کی بہت سی باتیں وہ بھول گئے پھر جو باتیں مرتب بھی ہوئیں وہ بھی اصل الفاظ میں محفوظ نہیں رہیں بلکہ ان کے پاس اصل تورات کے بجائے صرف اس کے ترجمے رہ گئے اور یہ ترجمے بدلتے بدلتے اصل سے اتنے مختلف ہو گئے کہ یہ تمیز کرنا ناممکن ہو گیا کہ اس میں اصل کتنی بات ہے اور کتنی جامعین اور مترجمین کی حاشیہ آرائی ہے اس طرح تورات کا ایک بڑا حصہ اس کے حاملین نے ضائع کر دیا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کتاب الٰہی کو فراموش کر بیٹھے، اور یہی بات امام مجاہد نے فرمائی ہے مطلب دونوں بزرگوں کا یہ ہے کہ اصل کتاب کا کچھ حصہ فراموش کر بیٹھے۔ کچھ علماء نے نسیان کو ترک عمل کے معنے میں لیا ہے۔ معنے دونوں ہیں ایک یہ کہ کتاب کا کچھ حصہ انہوں نے طاق نسیان بنا دیا دوسرے یہ کہ انہوں نے تورات کے کچھ حصہ پر عمل کرنا چھوڑ دیا پہلے معنی حقیقی ہیں اور دوسرے مجازی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اصل حقیقت ہے نہ کہ مجاز، مجازی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

معنے اسی وقت لیے جا سکتے ہیں جبکہ حقیقی معنے میں کوئی مانع ہو۔ یہاں کوئی مانع نہیں بلکہ دوسرے موقع پر اسی مفہوم کے لیے اوتوا نصیباً من الکتاب کی تعبیر معنے حقیقی کی مؤید ہے۔ غالباً جن بزرگوں نے یہاں مجازی معنے لیے ہیں وہ اس بات کو ممکن تصور نہیں کرتے کہ تورات کا کوئی حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ تورات بھی متواتر ہے لیکن ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ تورات کا تواتر روایتی اور تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ امر واقعہ یہی ہے کہ جب اہل بابل نے ہیکل کو آگ لگائی اور شہر کو برباد کیا اور شہریوں کو مارا اور قید کیا تو یہودیوں کے ہاتھوں سے کتاب تورات ضائع ہو گئی۔ مدت کے بعد جب وہ آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے تو انہوں نے دوبارہ کچھ تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا لیکن یہ ساری تورات نہ تھی، بلاشبہ تورات کا حصہ وقت کی دستبرد سے طاق نسیان ہو کر رہ گیا۔ یہ نبوت محمدیہ کا اعجازی شاہکار ہے کہ جس چیز کی نشاندہی آج علم و تحقیق اور تاریخ کر رہی ہے۔ آپ نے اس کا اعلان ہوا صدیاں پہلے و نسوا حظا مما ذکروا بہ اور اوتوا نصیباً من الکتاب کہہ کر قرآن میں کر دیا اور بتا دیا کہ یہود نے کتاب الٰہی کا ایک حصہ فراموش کر دیا۔ اور آل عمران اور نساء میں پہلے گزر چکا ہے کہ اوتوا نصیباً من الکتاب یعنی یہودی ... تورات کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

کچھ شارحین قرآن کی رائے میں فراموش کردہ حصہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بارے میں بشارات ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن یہودی علماء کے بارے میں یوں نہ کہتا کہ یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم حالانکہ یہ ثابت شدہ حقیقت اور امر واقعہ ہے بلکہ ایمان لانے والوں نے اس پر قسم کھائی ہے۔

یہاں اور آل عمران اور نساء میں ایک ہی بات بتائی گئی ہے کہ بیت المقدس کی تباہی کے بعد سے لے کر آج تک یہودیوں کی تورات کا ایک حصہ مفقود ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ بھی ترجمہ در ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچا ہے اور اس میں بھی ان کے تصرفات، تحریفات، اضافات ہیں۔

یہودیوں کی زندگی سراپا خیانت ہے

۵۔ اور تم ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے لیکن تھوڑے سے ان میں ایسے نہیں ہیں۔ یعنی ان کی دغابازی اور خیانت کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا، اسی لیے ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی دغابازی اور مکر و فریب پر آپ مطلع ہوتے رہتے ہیں

لیکن ان میں تھوڑے سے ایسے نہیں جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ جو اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔[1]

یہاں لفظ خائنۃ سے مراد خیانت ہے۔ حضرت قتادہ سے قرطبی نے یہی معنے نقل کیے ہیں۔ اہل عرب کبھی مصدر کو صیغہ فاعل سے تعبیر کر دیتے ہیں جیسے قائلہ بول کر قیلولہ اور خاطئۃ بول کر خطیئۃ اور لاغیۃ بول کر ملامت مراد لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان یہودیوں کی نت نئی خیانتوں سے جب تک آپ کے ساتھ مطلع ہوتے رہو گے۔ یہودیوں کی پوری تاریخ ہر پہلو سے خیانت کا شاہکار ہے قرآن نے یہاں اور متعدد مقامات پر یہود کی خیانت کی داستان سنائی ہے۔ دنیوی معاملات اور دینی احوال دونوں میں ان کی خیانت کو شکست انجام کیا ہے خالص دنیوی معاملہ میں قرآن نے ان کی خیانت پر مبنی اجتماعی زندگی کا چہرہ پیش کرتے ہوئے بتایا ہے منھم من ان تامنہ بدینار لا یودہ الیک اور جب دنیوی معاملہ میں ان کی امانت کا یہ حال ہے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دینی معاملے میں کتاب کی حفاظت اور نبوت کے بارے میں پیشین گوئیوں کی حفاظت میں وہ کیوں کر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔ یہودیوں کی خیانت پر مبنی زندگی کا کچھ چہرہ جلد سوم نوٹ نمبر ۱۳۹ - ۱۴۰ - ۱۴۱ میں پیش کیا جا چکا اور بتایا جا چکا ہے کہ دین کی زندگی میں امانت و دیانت کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ زندگی میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو اور جس کسی پر جتنا ہو اس کی پوری دیانت سے رتی رتی دے۔ قرآن میں امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اثاثوں تک محدود نہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں، اور کچھ باتیں دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا امانت ہے۔ اگر کسی جگہ ملازم ہے تو اس کو ملازمت کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو انجام دینا امانت ہے۔ بہرحال خیانت ہر حال میں خیانت ہے اور دیانت ہر حال میں دیانت ہے۔

مدینہ کے اردگرد یہود کے تین قبائل موجود تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ حضور انور نے مدینہ میں قدم رنجہ فرماتے ہی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگ نہ کرنے پر اور کسی سے جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف مدد نہ کرنے پر معاہدہ کیا لیکن انہوں نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

معاہدہ سے بے پروا ہو کر اس کی ایک ایک دفعہ کو توڑا اور سیاسی طور پر خیانت کی۔ قرآن یہاں ان کی اسی خیانت سے لبریز زندگی کا حوالہ دے رہا ہے۔

عفو و درگزر حسن کاری ہے

۵۸ - ان کو معاف کردو۔ ان سے درگزر کرو، اللہ حسن کار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ یعنی جب ان کی عادت قدیمہ ہی یہ ہے تو ایسے لوگوں سے ہر چیز پر الجھنا اور ان کی ہر خیانت کا پردہ چاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ ان کو چھوڑیے اور درگزر کیجئے اور ان کی برائی کا بدلہ عفو و احسان سے دیجئے، شاید اسی سے کچھ متاثر ہوں۔ قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر سے مگر اس کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ قتال کے حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی ایسی قوم کے مقابلہ میں عفو و درگزر اور تالیف قلب سے کام نہ لیا جائے[1]

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے جس مطلب کو ترجیح دی ہے وہ آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں لیکن دوسرے علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں کن لوگوں سے عفو و درگزر ہو رہا ہے۔ ان تھوڑوں سے جن کو عام خیانت پیشہ یہودیوں سے الا قلیلا کے ذریعے مستثنیٰ کیا گیا ہے یا ان سب سے جن کے بارے میں خیانت پیشہ ہونے کا اظہار ہوا ہے۔ مشہور معتزلی مفکر ابو مسلم اصفہانی کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم ان تھوڑوں کے بارے میں ہے جن میں خیانت نہیں ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کی گزشتہ بے راہ رویوں اور خیانتوں کو معاف کر دیجئے اور ان کے غلط کار لوگوں کو نظر انداز کر دیجئے اور ان سے اس احسان کا معاملہ کیجئے جو اللہ پسند کرتا ہے لیکن اسے عام شارحین قرآن نے پسند نہیں کیا بلکہ آیت میں سب خیانت پیشہ یہودیوں سے عفو و درگزر کے حکم کو ترجیح دی ہے اور مطلب یہ بتایا کہ اگر یہ اپنی حرکات سے توبہ کرلیں اور پُرامن شہری بن کر رہنا قبول کرلیں تو ان سب کو معاف کر دیجئے۔ ان دونوں تشریحات کی روشنی میں یہ آیت قرآنی محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

بہرحال اس آیت میں قرآن نے عفو و درگزر کا حکم دیا ہے اور عفو و درگزر کو حسن کاری قرار دیا ہے۔ نکتہ سنجوں نے یہیں سے یہ بات بھی نکال لی ہے کہ جب کافروں اور کافر بھی وہ جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خائن ہیں ان سے قرآن عفو و درگزر کی ہدایت کر رہا ہے اور اسے حسن عمل اور حسن کاری قرار دے رہا ہے تو پھر غیر خائن کے ساتھ عفو و درگزر کے معاملہ کی فضیلت کے کیا کہنے ہیں۔ قاضی بیضاوی رقمطراز ہیں۔

اس میں اشارہ ہے کہ خائن کافر کو معاف کرنا حسن کاری ہے اور اگر کافر خائن نہ ہو تو اس کو بدرجہ اولیٰ معاف کیا جائے۔

اور اس میں ہمارے لیے بڑی عبرت ہے کہ اللہ سبحانہٗ جب خائن کافر کے لیے معافی کو پسند کرتا ہے تو خائن مسلمان تو اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے معاف کیا جائے۔

عیسائی نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں

۵۹ - اور جو لوگ اپنے تئیں نصاریٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے عہد لیا۔ نصاریٰ کا ماخذ یا تو نصر ہے جس کے معنے مدد کرنے کے ہیں اور یا ناصرہ سے ہے جو ملک شام میں ایک بستی کا نام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام رہتے تھے اسی لیے ان کو مسیح ناصری کہتے ہیں۔ جو لوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں وہ گویا اس بات کے مدعی تھے کہ ہم خدا کے سچے دین اور پیغمبروں کے حامی ہیں اور حضرت مسیح ناصری کے متبع ہیں۔ اس زبانی دعویٰ اور لفظی تفاخر کے باوجود دین کے معاملہ میں جو رویہ تھا وہ آگے آرہا ہے [1]

یہود کے نقض عہد کے بعد اب یہ نصاریٰ کے نقض کا ذکر ہو رہا ہے اور تمہید ہی اس انداز سے اٹھائی ہے جس سے بقول علامہ جمال الدین قاسمی یہ مترشح ہو رہا ہے کہ نصاریٰ ہونے کے مدعی محض انصار اللہ کا مصداق نہیں بلکہ اس سے کوسوں دور ہیں یا یہ کہ یہ نصاریٰ قرآن کے نزدیک نصاریٰ نہیں بلکہ صرف نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں۔ یا بقول علامہ ابوالسعود یہ تعبیر ان کے قول و فعل میں تضاد ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ علامہ ناصر صاحب انتصاف نے یہاں یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ خاص طور پر اس موقعہ پر یہ تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہ مدعیان نصرت دعویٰ نصرت کے باوجود اللہ کے دین کی نصرت میں بالکل ناکام رہے۔ ان کا قول ان کے کردار کے ہرگز مطابق نہیں ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نصاریٰ سے میثاق

۶۰- ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا وہ بھی اس چیز کا ایک حصّہ فراموش کر بیٹھے جو ان کو یاد کرائی گئی تھی۔ یعنی یہود کی طرح نصاریٰ سے بھی عہد لیا گیا لیکن یہ بھی عہد شکنی اور بیوفائی میں اپنے پیشرووں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی ان بیش بہا نصائح سے جن پر نجات و فلاح ابدی کا مدار تھا۔ کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ بائیبل نعمتوں کا وہ حصّہ باقی ہی نہ چھوڑا جو "حقیقۃً" مذہب کا مغز تھا۔[۱]

پہلے یہودیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ انہیں جو کچھ نصیحت کی گئی تھی وہ اس کا ایک حصّہ بھلا بیٹھے اب نصاریٰ کے متعلق بھی انکشاف فرمایا ہے کہ نصاریٰ بھی اپنی کتاب کا بیشتر حصّہ فراموش کر چکے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ عیسائی جن کتابوں کو انجیل کہتے ہیں وہ انجیل نہیں بلکہ حضرت مسیح کی ایک مجمل اور مختصر سی تاریخ ہے۔ مختصر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یوحنا نے اپنی انجیل کے آخر میں کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے۔

> اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیے اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کے لیے دُنیا میں گنجائش نہ ہوتی۔
>
> (یوحنا ۲۱-۲۵)

ذخیرۃ الالباب کے مصنف نے بھی بتایا ہے کہ

> انجیل مسیح کی زندگی کے نہ تو سارے اعمال کو بیان کرتی ہے اور نہ ان کے سارے ارشادات کو جیسا کہ یوحنا نے تصریح کی ہے۔

فی الواقع انجیل تو وہ مقدس کتاب ہے جس کی وحی حضرت مسیح علیہ السلام کو آئی اور جس میں زندگی کے لیے ہدایات اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بارے میں بشارات تھیں۔ اسی انجیل کا ان چاروں مورخین کے یہاں ذکر ہوتا ہے۔ چنانچہ متی کھلے لفظوں میں کہتا ہے کہ

> میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمام دُنیا میں جہاں کہیں اس خوشخبری یعنی انجیل کی منادی کی جائے گی یہ بھی جو اس نے کیا اس کی یادگاری میں کیا جائے گا۔ (متی ۲۶-۱۳)

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ان تاریخوں کو اناجیل صرف اس لیے کہہ دیا گیا ہے کہ ان کا موضوع بحث انجیل مسیح ہے اور کچھ آیتیں ان میں انجیل کی ہیں۔ اسی لیے مرقس نے اپنی انجیل کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"انجیل مسیح کا آغاز" اور بعد ازیں حضرت مسیح سے نقل کیا ہے کہ

"لوگو! توبہ کرو اور انجیل پر ایمان پر ایمان لاؤ" لہٰذا وہ انجیل جس پر ایمان لانے کا لوگوں کو حکم دیا جا رہا ہے ان چاروں تاریخوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔

عہد اول میں حضرت مسیح کی طرف منسوب کر کے ایک نہیں بلکہ ستر سے زیادہ اناجیل منصۂ شہود پر آئی ہیں کینفیہ کے کچھ مورخین کہتے ہیں کہ ان میں سے ۳۵ جھوٹی تھیں۔ اگرچہ ذخیرۃ الالباب کے مصنف نے یہ کہہ کر اناجیل کی کثرت کے الزام سے گلو خلاصی کرنی چاہی ہے کہ ایک ہی انجیل کو مختلف ناموں سے موسوم کر دیا گیا ہے اور آخر میں ۷۰ سے ہٹ کر صرف ۲۰ کا اعتراف کیا ہے اور ان بیس میں برنباس کی انجیل کو بھی شمار کیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ جواب نہ دے سکا۔

انجیل میں تحریف کا آغاز

قرن اول ہی انجیل میں تحریف شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ پولس نے اپنے اس خط میں جو اہل غلاطیہ کو لکھا ہے اقرار کیا ہے:

> مجھے حیرت ہے کہ تم اتنی جلدی مسیح کی انجیل سے دوسری انجیل کی طرف پلٹ رہے ہو حالانکہ اس کے سوا کوئی انجیل نہیں ہے۔ ہاں کچھ لوگ ہوں گے جو تمہیں انجیل مسیح سے ہٹائیں گے اور انجیل مسیح کو تبدیل کرنا چاہیں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی ایک ہی انجیل تھی۔ اور پولس ہی نے اس خط میں جو اس نے اہل کورنتھوس کے نام لکھا ہے تصریح کی ہے کہ

> یہ لوگ جو انجیل مسیح میں تحریف کر رہے تھے جھوٹے مکار لپائی فرستادے ہیں۔ انہوں نے مسیح کے فرستادوں کا بھیس لپیٹا ہوا ہے۔

کتاب اعمال کی پندرہویں فصل میں اس موضوع کی زیادہ وضاحت پیش کی گئی ہے کہ

> یہودی عیسائیوں میں وہ چیزیں پھیلاتے تھے اور ان چیزوں کی تعلیم دیتے جو حضرت مسیح کے فرستادوں کی تعلیمات کے علاوہ کچھ اور بھی۔

اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ نے اظہار الحق میں ۱۰۰ شواہد سے کتب مقدسہ میں تحریف کا ہونا ثابت کیا ہے۔ ہم یہاں مولانا موصوف کی کتاب ازالۃ الشکوک سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ اس موضوع میں عیسائیوں کی بے بسی کا کیا حال ہے۔

جب تحریف کی گفتگو میں درس ساتواں اور آٹھواں باب پانچویں نامہ اول یوحنا کا پیش کیا گیا اس پر ان کو اور پادری فرنچ صاحب کو جو ان کے شریک تھے ان درسوں میں اور اسی طرح اور کسی جگہ انجیل کے اندر وہ تحریف ماننی پڑی جس کے ہم لوگ مثبت ہیں اور صاف اقرار کیا کہ آٹھ دس جگہ انجیل مقدس کے اندر آیتوں کی تحریف ہوئی ہے اور چالیس ہزار چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور تحریفیں ہوئی ہیں۔ مگر بڑے عرصہ کے بعد قائل ہوتے کہ تحقیق سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ دس میں نہیں بلکہ چار پانچ آیتوں میں تحریف ہوئی ہے اور چالیس ہزار کی نہیں بلکہ تیس ہزار کی۔ اس پر میں نے ان سے کئی بار بذریعہ خطوط دریافت کیا کہ آپ ان چار پانچ آیتوں کو کھول کر بتائیں کہ فلانے صحیفہ یا فلاں نامہ یا مشاہدات کے فلانی آیت ہے کہ بعد اس کے کچھ عرض کروں۔ اس کے جواب میں کبھی کچھ عذر کیا اور کبھی وعدہ اور جب ان سے امید ٹوٹی تو ان کے شریک کی خدمت میں ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۰ھ کو ایک خط روانہ کیا۔

بہرحال انہوں نے بھی تفصیل سے پہلو تہی کی۔ . . . مگر اتنا غنیمت ہے کہ اپنے یہاں کے اختلاف کے عذر میں صاف اقرار کر گئے کہ انجیل کے اندر چار پانچ آیتیں یقیناً تحریف کی راہ سے گھس گئی ہیں اور یوں لکھا کہ ــــ تحریفوں کے عدد کا جو ہمارے بیان میں اختلاف ہوا ہے سو اس کی حقیقت حال یہ ہے کہ عدد کلاں کے باب میں مصنفین کا اتفاق کسی صورت میں نہیں ہے۔ چار پانچ آیتوں کے حق میں قریب یقین ہوا کہ یا سہواً یا عمداً یہ راہ تحریف متن کی درمیان میں آئیں۔ اگر سارے امور سے قطع نظر کر لیں اور فقط ان کے ارشاد ہی پر اکتفا کریں تو بھی ناظرین بانصاف کو تین باتیں ہاتھ لگتی ہیں۔

پہلی یہ کہ اہل کتاب کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ چار پانچ آیتیں انجیل میں یقیناً محرف ہیں۔ پھر بھی ان تحریف شدہ آیتوں کو اپنے سب ترجموں میں نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کی دیانت سے کب بعید ہے کہ اور مواضع میں بھی ان کے

تحریف یقینی ہو مگر چونکہ اس کا اقرار ان کے معتقد کے خلاف ہے اس لیے ان کو چھپاتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو کلام الٰہی بتاتے ہیں۔ دیکھو ساتویں، آٹھویں باب پنجم تا ہفتم اول یوحنا میں کسی تثلیثی یار نے تحریف کر کے تثلیث کو ثابت کرنے کے لیے اتنی عبادت اپنی طرف سے بڑھا دی ـــــ جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں اور تین ہیں جو زمین پر ـــــ اور اصل میں اتنی عبادت تھی ـــــ تین ہیں جو گواہی دیتے ہیں روح پانی اور لہو.. الخ اور ان جناب اور میزان الحق کے مولف نے جو ان کے شریک تھے مجمع عام میں اقرار کیا تھا کہ اس جگہ ہم بھی تحریف مانتے ہیں، باوجود اس کے دافع البہتان والا تثلیث کے ثابت کرنے کو آٹھویں فصل میں ص ۱۲۳ پر یوں لکھتا ہے کہ ـــــ

فی الحقیقت ماہیت الٰہی میں یہ تین باپ بیٹا کلمہ اور روح القدس موجود ہیں جیسا کہ یوحنا کے پہلے خط باب پنجم آیت ۷ میں ہے کہ تین ہیں جو گواہی دیتے ہیں آسمان میں، باپ بیٹا اور روح القدس یہ تینوں ایک ہیں۔

بہرحال انجیل میں تحریف کی داستان بڑی طویل ہے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس کے ثابت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے اور اظہار الحق میں تحریف لفظی اور معنوی کے لیے بے شمار شواہد پیش کیے ہیں۔

اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت

تحریف انجیل کے سلسلے میں مزید یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جن چار انجیلوں کو کلیسا نے چوتھی صدی میں اعتماد و اعتبار کا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ خود ان کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کے لکھنے والے کون ہیں۔ یہ کب لکھی گئی ہیں اور کس زبان میں لکھی گئی ہیں اور ان کے اصلی نسخے کیسے لاپتہ ہو گئے؟

آئیے کچھ خیالات اور آرا۔ آپ بھی سن لیجئے۔ "مرشد الطالبین الی الکتاب المقدس الثمین" کے مصنف کا انکشاف ہے کہ

عام مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق متی کی انجیل لوقا، مرقس اور یوحنا سے پہلے لکھی گئی ہے۔ مرقس اور لوقا نے اور وشلیم کی بربادی سے پہلے انجیل قلم بند کی۔

لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ حضرت مسیح کے روانہ ہونے کے بعد یہ کام انہوں نے کون سے سال میں کیا کیونکہ ہم اس معاملہ میں نص الٰہی سے خالی ہاتھ ہیں۔

چونکہ ان کے خیال کے مطابق سب سے پہلے متی نے انجیل لکھی ہے اس لیے متی کی انجیل کے بارے میں پہلے ان کے خیالات کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیے۔ ذخیرۃ الالباب کا مصنف یہ دعویٰ کرنے کے باوجود کہ متی نے انجیل سنہ ۴۱ میں لکھی ہے یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کون سی زبان میں لکھی ہے عبرانی یا سیرو کلدانی۔ پھر یہ بھی بتاتا ہے کہ اسی انجیل کا پھر ترجمہ یونانی زبان میں ہوا ہے اور ترجمہ ہی نے اصل متن کی جگہ لے لی متن غائب ہو گیا اور ترجمہ کو لکھنے والوں کی ہاتھ کی صفائی نے اس قدر مسخ کر دیا کہ کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا۔ ذخیرۃ الالباب ہی کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ متی نے یہ انجیل یروشلیم میں لکھی ہے لیکن یہ حضرت مسیح کی زندگی کی سوانح نہیں ہے بلکہ ایک جعلی روایت ہے۔ ڈاکٹر پوسٹ نے "قاموس کتاب مقدس" میں کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ متی نے انجیل یونانی زبان میں لکھی ہے ان شاملک توجیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کو فی الواقع یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ متی کی انجیل کس زبان میں لکھی گئی ہے۔ متقدمین مسیحی علماء کا خیال ہے کہ یہ انجیل متی نے لکھی ہی نہیں ہے۔

انجیل مرقس کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ صاحب ذخیرہ نے مرقس کا جو چہرہ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرقس پطرس کا منہ بولا بیٹا اور شاگرد تھا اور ان کی انجیل کچھ متی کی انجیل کے اقتباسات اور کچھ پطرس کے مواعظ پر مشتمل ہے اور کچھ پروٹسٹنٹ متی کی انجیل میں سولہویں فصل کی بارہ آیات کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر پوسٹ کا یہ انکشاف بڑا عجیب ہے کہ مرقس یوحنا ہی کا لقب ہے اور یہودا اور یروشلیم میں پیدا ہوا۔ پولس اور برنابا کے ساتھ تبلیغی سفر میں جا رہا لیکن برجہ نامی مقام پہ ان سے جدا ہو گیا۔ اور کہتے ہیں کہ یہی برنابا اور پولس کے باہمی تنازعہ کا باعث بنا۔ بعد ازیں پولس کے ساتھ روم کا سفر کیا ان کی انجیل کی زبان یونانی تھی۔ لیکن ڈاکٹر موصوف یہ نہیں بتا سکے کہ یہ انجیل کب لکھی گئی ہے ہاں ایریناؤس کی ایک روایت کے سہارے یہ ضرور لکھا ہے کہ مرقس کی انجیل پطرس اور پولس کی وفات کے بعد وجود میں آئی ہے۔

انجیل لوقا۔ یہ انجیل بھی روایتی اور تاریخی حیثیت سے خود اپنوں میں اتنی مضبوط اور طاقتور نہیں ہے۔ لوقا کے بارے میں صاحب ذخیرہ نے تو یہی بتایا ہے کہ انطاکیہ کا باشندہ تھا لیکن انجیل کے شارحین کہتے ہیں کہ افریقی ہے۔ اور یہ بھی بتانے والے کہتے ہیں کہ بت پرست تھا

اور حق قبول کر لیا تھا۔ پولس کا شاگرد اور اس کا معاون تھا۔ صاحب ذخیرہ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ متی اور مرقس نے اپنی اناجیل میں حضرت مسیح کی سیرت سے متعلق کچھ احوال نظر انداز کر دیئے تھے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا تو تلبیس اور تدلیس کر کے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ لوگوں کا یہی کردار لوقا کے انجیل لکھنے کا باعث ہوا۔

انجیل یوحنا۔ خود یوحنا کے بارے میں بے حد اختلاف ہے کہ کون ہے۔ ابن زبدی کا شاگرد ہے یا پولس کا، صاحب ذخیرہ فرماتے ہیں کہ یوحنا نے انجیل صرف اس لیے لکھی ہے کہ حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کرے اور اناجیل ثلاثہ کی کمی پوری کرے اور اس کی زبان یونانی تھی اور یوحنا نے یہ کام لوگوں کے بہت زیادہ اصرار کے بعد کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ اصرار نہ کرتے تو یوحنا انجیل نہ لکھتا۔ یہ انجیل تناقضات اور اضداد کا پلندہ ہے۔

ان چاروں انجیلوں کا یہ تاریخی اور واقعاتی پس منظر بتا رہا ہے کہ مسیحی دنیا اپنی دینی دستاویز کی حد تک روایت، اسناد متصل اور منقطع سے محروم ہے۔ قرآن کے اس انکشاف کی کہ و نسوا حظا مما ذکروا بہ کیسی واقعاتی تفسیر ہے۔ جو بات آج ہم علم و تحقیق سے معلوم کر رہے ہیں وہ ہی بات نبوت محمدیہ نے زبان وحی سے آج سے چودہ سال پہلے بتا دی ہے۔

اور یہ بھی مزے دار بات ہے اور نبوت محمدیہ کا یہ عجیب اعجاز ہے کہ ساری تحریفات، سارے تصرفات کے باوجود آج بھی انجیل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارات موجود ہیں چنانچہ حضرت یحییٰ کے سلسلے میں ہے:

> جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس آئے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے انکار نہ کیا بلکہ اقرار کر لیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر تو کون ہے کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں ایلیاہ نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے کہا کہ پھر ہے تو کون؟
>
> (یوحنا ۱۹-۲۲)

انہوں نے سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے

(یوحنا باب ۱-۲۵)

ایک حوالہ اور ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت مسیح دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے شاگردوں کو تسلی دیتے ہیں کہ

اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے تو میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔

(یوحنا ۱۴-۱۶)

مددگار کے لفظ اُردو انجیل میں وکیل یا شفیع بطور نسخہ کے درج ہے۔ اب آپ ہی سوچیے کہ یہ ابد تک ساتھ رہنے والا مددگار یا شفیع اور وکیل بجز نبی خاتم النبیین کے اور کون ہو سکتا ہے۔ اسی کی تاکید ایک بار پھر حضرت مسیح کی زبان سے ملاحظہ ہو۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو تمہارے پاس بھیج دوں گا وہ آکر دُنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔

(یوحنا ۱۶-۷،۸)

اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ وہ نبی آکر پرانی شریعتیں منسوخ کر دے گا اور نیا قانون، نئی شریعت چلائے گا۔

بہر حال جو کچھ وہ نہیں بھولے اس کچھ میں سے حضور انور کی ذات گرامی کے بارے میں یہ بشارات ہیں ان ہی بشارات کے سہارے قرآن حضور انور کو ان کے لیے جانی پہچانی شخصیت قرار دیتا ہے۔

الذین یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم

عیسائیوں کا باہم بغض و عناد

۶۱ - لہٰذا ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی اور اللہ ان کے کرتوتوں سے عنقریب ان کو آگاہ کرے گا۔ یعنی باہم نصاریٰ میں یا یہود و نصاریٰ دونوں میں عداوتیں اور جھگڑے ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئے۔ آسمانی سبق کو ضائع کرنے اور بھلا دینے کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا یعنی جب وحی الٰہی کی اصلی روشنی ان کے پاس نہ رہی تو اوہام و اہواء کے اندھیروں میں ایک دوسرے سے اُلجھنے لگے۔ مذہب تو نہ رہا مگر مذہب کے نام پر جھگڑے نہ تھمے بیسیوں فرقے پیدا ہو کر اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ یہی فرقہ وارانہ تصادم آخرکار آپس کی شدید ترین عداوت و بغض پر منتج ہوا۔ کوئی شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں میں بھی بیحد تفرق اور تشتت اور مذہبی تصادم موجود ہے لیکن چونکہ ہمارے پاس وحی الٰہی اور قانون سماوی بحمداللہ

بلا کم وکاست محفوظ ہے۔ اس لیے اختلافات کی موجودگی میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت برابر مرکزِ حق و صداقت پر قائم رہی اور قائم رہے گی۔ اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ کے اختلاف مثلاً پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک وغیرہ فرقوں کی باہم آویزش میں کوئی ایک فریق بھی آج شاہراہِ حق وصداقت پر قائم ہے اور نہ قیامت تک قائم رہ سکتا ہے کیونکہ وہ وحی الٰہی کی روشنی کو جس کے بغیر کوئی انسان خدا تعالیٰ اور اس کے قوانین کی صحیح معرفت حاصل نہیں کرسکتا۔ اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے ضائع کر چکے ہیں۔ اب جب تک وہ اس محرف بائیبل کے؛ ان سے وابستہ رہیں گے۔ محال ہے کہ قیامت تک ان کو زمانہ اور محض بے اصول اختلافات اور فرقہ وار بغض و عناد کی ظلمت سے نکل کر حق کا راستہ دیکھ سکیں اور نجاتِ ابدی کی شاہراہ پر چل سکیں۔ باقی جو لوگ آج نفس مذہب خصوصاً عیسائیت کا مذاق اڑاتے ہیں اور جنہوں نے لفظِ مسیحیت یا موجودہ بائیبل کو محض چند سیاسی مفادات کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اس آیت میں ان نصاریٰ کا ذکر نہیں ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ وہ بھی آیت کے تحت میں داخل ہیں تو ان کی باہمی عداوتیں اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں اور علانیہ محاربات بھی باخبر اصحاب پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

قیامت تک کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص تو قیامت تک بھی فلاں حرکت سے باز نہ آئے گا۔ اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ شخص قیامت تک زندہ رہے گا اور یہ حرکت کرتا رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو اس بات کو نہ چھوڑے گا اسی طرح یہاں الیٰ یوم القیامہ کا لفظ آنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہود و نصاریٰ کا وجود قیامت تک رہے گا جیسا کہ ہمارے زمانے کے بعض مبطلین نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا ہے۔ آخر میں ارشاد ہے کہ اللہ ان کے کرتوتوں سے ضرور ان کو خبردار کرے گا یعنی آخرت میں پوری طرح اور دنیا میں بھی بعض واقعات کے ذریعے ان کو اپنی کرتوت کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔ [1]

یہ نتیجہ بیان ہوا ہے کتاب الٰہی میں تحریف اور اس کے ایک حصہ کو ضائع کر دینے کا۔ ملت کی شیرازہ بندی، اللہ کے میثاق اور اس کی کتاب ہی سے ہوتی ہے۔ اگر اسی میں فساد و اختلال پیدا ہو جائے تو پھر ملت کو فساد و اختلال اور خون خرابے سے کیا چیز بچا سکتی ہے۔ یہ صورت حال عہد شکنی کا قدرتی نتیجہ بھی ہے اور اس جرم کی سزا بھی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نصاریٰ کے لیے اس سے نجات کی واحد شکل یہی تھی کہ قرآن کی رہنمائی میں ان تاریکیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی اور امن و سلامتی کی شاہراہ پر آجاتے لیکن ان کے تعصب نے ان کو یہ سیدھی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ اب نہ کوئی کتاب آنی ہے اور نہ کوئی رسول۔ اس وجہ سے اس جنگ وجدل سے نکلنے کا اب ان کے لیے قیامت تک کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

یہ ملحوظ رہے کہ نقض عہد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو محض ماضی کی ایک سرگزشت کی حیثیت سے نہیں سنائی جا رہی ہے بلکہ اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے بھی اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو یہود و نصاریٰ کا ہوا۔[1]

---

[1] تدبر قرآن

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اے اھل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے، تورات و انجیل کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے تھے وہ تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر جاتا ہے[۱۶]۔ بلاشبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی ہے اور ایسی کتاب آچکی جو روشن اور واضح ہے[۱۳]۔ اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودی کے پیروکار ہوں، سلامتی کی راہیں کھولتا ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر

روشنی میں لاتا ہے اور اس کو سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔“

اہل کتاب کے لیے علم و بصیرت کی روشنی

روزمرہ کا تجربہ ہے کہ انسان کی ایک سائیکالوجی یہ ہے کہ کسی سلسلۂ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ فرضی اور خیالی ہے یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کسی قدر پُر اثر انداز میں کیوں نہ ہو طبیعتیں اس سے دیر پا اور گہرا اثر نہیں لیتی ہیں، اس لیے ایک کامل سیرت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزاء کی تاریخیت پر یقین ہو، یہی سبب ہے کہ تاریخی افسانوں سے جو اثر طبیعتوں میں پیدا ہوتا ہے وہ خیالی افسانوں سے نہیں ہوتا۔ دوسرا سبب تاریخی سیرت کے ضروری ہونے کے لیے ضروری یہ ہے کہ آپ اس سیرت کاملہ کا نقشہ محض دلچسپی یا فرصت کے گھنٹوں کی مشغولی کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ آپ اپنی زندگی اس نمونہ پر ڈھالیں اور اس کی پیروی اور تقلید کریں، لیکن وہ زندگی اگر تاریخی اور واقعی طور پر ثابت نہیں تو آپ کیوں کر اس کے قابلِ عمل ہونے پر زور دے سکتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فرضی اور میتالوجیکل قصے ہیں جن پر کوئی انسان اپنی عملی زندگی کی بنیاد نہیں رکھ سکتا اس لیے پُر اثر ہونے اور لائقِ تقلید ہونے کے لیے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ اس کامل انسان کی سیرت، دعوت، تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے بالکل واضح اور صاف ہو۔ تاریکی اور خفا میں نہ ہو۔

ہر ملک، ہر قوم میں ہر زمانے میں کتنے لاکھ انسان خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں مگر آج ان میں سے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں اور جتنوں کے نام ہم جانتے بھی ہیں ان کا حال کیا جانتے ہیں۔ سب تاریکی میں ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں کو چھوڑ کر صرف اہلِ کتاب کو دیکھئے۔ ان میں سینکڑوں پیغمبر آتے لیکن نام کے سوا تاریخ نے ان کا کچھ اور حال نہ جانا۔ حضرت اسحاق، حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصہ کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے۔ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریخ کی کڑیوں سے بہرحال تاریکی میں ہیں۔ اب ان کی مقدس زندگیوں کے ادھورے اور غیر مربوط حصے کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان کر سکتے ہیں۔ یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں ان میں سے ہر ایک کی

نسبت محققین کو مختلف شکوک ہیں اور اگر ان شکوک سے ہم قطع نظر بھی کرلیں تو ان کے اندر ان بزرگوں کی تصویریں کس درجہ ادھوری ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ہم کو تورات سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ خود تورات جو کہ موجود ہے وہ اہل تحقیق کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود مصنفین انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے صدہا سال بعد عالم وجود میں آئی ہے۔ اس پر اب جرمن سکالر نے پتہ لگایا ہے کہ موجودہ تورات میں پہلو بہ پہلو ہر واقعہ کے متعلق دو مختلف صورتوں اور روایتوں کا سلسلہ موجود ہے جو باہم متضاد ہے یہی وجہ ہے کہ تورات کے سوانح و واقعات میں ہر ہر قدم پر تضاد بیانی سے سابقہ پڑتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کے حالات انجیلوں میں درج ہیں مگر ان بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو تسلیم کرتا ہے باقی انجیل غیر مستند ہیں۔ ان چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کے لکھنے والے نے بھی خود حضرت عیسیٰ کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے کس سے سن کر یہ مجموعہ لکھا۔ یہ بھی معلوم نہیں بلکہ اب تو یہ بھی مشکوک سمجھا جاتا ہے کہ جن چار آدمیوں کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ تاریکیوں کے اسی ہجوم میں قرآن کی یہ آیت کہہ رہی ہے کہ واقعاتی لحاظ سے اے اہل کتاب روشنی کا مینار تمہارے پاس اب آچکا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صرف وہ نہیں بلکہ اپنے ساتھ کتاب مبین لایا ہے۔ اب اس روشنی اور واضح کتاب کے بعد تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ یہ اللہ کی جانب سے اتمام حجت ہے۔

اللہ کا رسول یہود کی کچھ چوریاں کھولتا ہے

۴۲ - اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے۔ تورات و انجیل کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے تھے وہ تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر جاتا ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ کو خطاب ہے کہ وہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم جن کی آمد کی بشارت تمہاری کتابوں میں اس قدر تحریف ہونے پر بھی موجود ہیں تشریف لے آئے جن کے منہ میں خدا نے اپنا کلام ڈالا ہے اور جنہوں نے ان حقائق کی تکمیل کی جو حضرت مسیح ناتمام چھوڑ گئے تھے۔ تورات و انجیل کی جن باتوں کو تم چھپاتے تھے اور بدل کر بیان کرتے تھے ان میں سے سب ضروری باتیں اس نبی آخرالزماں نے ظاہر کردی ہیں اور جن باتوں کی چنداں ضرورت نہ تھی ان سے درگزر کیا۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تحریف خواہ تبدیلی الفاظ کی نوعیت کی ہو یا تبدیلی معنے کی نوعیت کی، اس کا اصل مقصد حقیقت پر پردہ ڈالنا اور خلق کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے لیے جامع لفظ اخفاء کا استعمال کیا ہے جس کے تحت ان کی لفظی و معنوی تحریفیں بھی آگئیں اور ان کی کتابوں کی وہ آیتیں بھی جن کو اہل کتاب کے علماء اس اندیشے سے عام لوگوں سے چھپاتے تھے کہ ان کے خلاف شریعت اقدام کی پردہ دری نہ ہو یا ان کی بنا پر آخری بعثت کے باب میں ان پر کوئی حجت نہ قائم ہو سکے۔ فرمایا یہ رسول تمہاری بہت سی تحریفات بے نقاب کر رہا ہے اور ایسی بھی بہت سی ہیں جن کو نظر انداز کر رہا ہے اس لیے کہ مقصود اصل حقیقت کو ظاہر کرنا اور شریعت الٰہی کی تجدید و تکمیل ہے ذکر تمہاری تذلیل۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغمبر تمہاری بعض چوریاں اور خیانتیں کھول دیتا ہے جن کا کھولنا دین حق کے قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے اور بعض سے چشم پوشی اختیار کرتا ہے جن کے کھولنے کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ پیغمبر امی ہونے کے باوجود تورات و انجیل کے اصل مضامین کو تمہاری اخفائی کار سازیوں کے باوجود وحی الٰہی سے معلوم کر کے ظاہر کر دیتا ہے اور یہ بجائے خود ایک شہادت ہے۔ آپ کے پیغمبر از علم کی اور ساتھ ہی پیغمبر اخلاق کا حال یہ ہے کہ ان مضامین کو نظر انداز کر دیتا ہے جن کے اظہار سے بجز مجرموں کی تفضیح کے اور کوئی شرعی غرض وابستہ نہیں زمخشری اور رازی نے یہی مطلب بتایا ہے۔

اسلام کی شانِ کمال

۶۳ - بلاشبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی ہے اور ایسی کتاب آچکی جو روشن اور واضح ہے۔ شاید نور سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے قرآن حکیم مراد ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ جو وحی الٰہی کی روشنی کو ضائع کر کے اہواء اور آراء کی تاریکیوں اور باہمی خلاف و شقاق کی وادیوں میں پڑے بھٹک رہے ہیں۔ جس سے نکلنے کا بحالت موجودہ قیامت تک امکان نہیں ہے۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی سب سے بڑی روشنی آگئی اگر نجات ابدی کے صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو اس روشنی میں حق تعالیٰ کی رضا کے پیچھے چل پڑو۔ سلامتی کی راہیں کھلی پاؤ گے اور اندھیرے سے نکل کر اجالے میں بے کھٹکے چل سکو گے اور جس کی رضا کے تابع ہو کر چل رہے ہو اسی کی دستگیری سے صراط مستقیم کو بے تکلف طے کر لو گے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اگرچہ کچھ شارحین قرآن نے نور اور کتاب مبین میں عطف تفسیری مان کر دونوں سے قرآن مراد لیا ہے مگر ہمارے خیال میں حضرت قتادہ اور زجاج کی بات از روئے بلاغت زیادہ وزنی ہے کہ یہاں نور سے مراد حضور کی ذات گرامی اور کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔ چونکہ آپ کی زندگی کا ایک ایک عمل قرآن کی ہدایات کا پرتو اور عکس تھا اس لیے یقیناً آپ کی زندگی پوری انسانیت کے لیے روشنی کا سامان ہے قرآن اگر آفتاب ہے تو حضور انور کی ساری زندگی اسی آفتاب کی روشنی ہے۔

اگرچہ دنیا میں انبیاء بہت گزرے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانے کے حالات کے مطابق اخلاق عالیہ اور صفات کاملہ کا ایک اعلیٰ بلند ترین معیار اور نمونہ پیش کیا۔ کسی نے صبر کسی نے ایثار، کسی نے زہد غرض ہر ایک نے دنیا میں انسان کی پیچ پیچ زندگی کے راستہ میں ایک ایک مینار قائم کردیا ہے جس سے صراط مستقیم کا پتہ لگ سکے مگر ضرورت تھی ایک نور کی جو اس سرے سے اس سرے تک پوری راہ کو اپنی تعلیمات اور عمل مثالوں سے روشن کر دے گویا ہمارے ہاتھوں میں اپنی عملی اور علمی زندگی کا پورا نقشہ مرتب کر کے دے جس کو لے کر اسی کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہر مسافر بے خطر منزل مقصود کا پتہ لے۔ اسی نور کو قرآن نے دوسرے موقعہ پر سراج منیر کہا ہے۔ گویا آپ کی ذات گرامی دنیا میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے لیے خود ہمہ تن نور اور چراغ ہے یعنی آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہے جو راہ کی تاریکیوں کو کافور کر رہی ہے۔

آپ کی تعلیم چونکہ عالمگیر تھی اور قیامت تک زندہ رہنے والی تھی اس لیے آپ کی ذات پاک کو نور، سراج منیر بنا کر روانہ کیا گیا ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ وہ واقعہ ہے جس کی بنیاد، دلائل اور شہادتوں پر قائم ہے۔

کسی زندگی کے انسانوں کے لیے نور ہونے کے لیے جو بنیادی اور اہم شرطیں ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ یعنی تاریخیت، جامعیت، کاملیت اور عملیت۔

حضور کے نور ہونے کی پہلی وجہ

تاریخیت سے مقصود یہ ہے کہ ایک کامل شخصیت کے جو سوانح اور حالات پیش کیے جائیں وہ تاریخ اور روایت کے لحاظ سے مستند ہوں۔ ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی نہ ہو۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ انسان کی ایک سائیکالوجی یہ ہے کہ کسی سلسلہ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فرضی اور خیالی ہے یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کس قدر موثر انداز میں ہو طبیعتیں اس سے دیرپا اور

گہرا اثر نہیں لیتی ہیں۔ اس لیے ایک کامل سیرت کے نمونہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزاء کی تاریخیت پر یقین ہو۔

دوسرا سبب تاریخی سیرت کے نمونہ ہونے کا یہ ہے کہ آپ اس سیرت کا کامل نقشہ محض دلچسپی یا بازمت کے گھنٹوں کی مشغولی کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی اس نمونہ پر ڈھالیں اور اس کی پیروی کریں اس لیے کسی شخصیت کے نمونہ ہونے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کی پوری زندگی تاریخی اور روایتی معیار پر پوری ہو۔ ہم تمام انبیاء کرام کا احترام کرتے ہیں اور ان کے پیغمبر ہونے کا یقین رکھتے ہیں لیکن دوام، بقا، ختم نبوت اور آخری کامل سیرت ہونے کی حیثیت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاص شرف و امتیاز حاصل ہے وہ دوسرے انبیاء کو اس لیے مرحمت نہیں ہوا کہ ان کو دائمی، آخری پیغمبر نہیں بنایا گیا۔ ان کی زندگیوں کا مقصد ایک خاص قوم کو ایک مقررہ وقت تک نمونہ دینا تھا اس لیے اس زمانہ کے بعد بتدریج وہ دنیا سے ناپید ہو گئیں۔

سامی قوم میں سینکڑوں پیغمبر آئے لیکن نام کے سوا تاریخ نے ان کا اور کچھ حال نہ جانا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصہ کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے۔ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریخ کی کڑیوں سے بہرحال گم ہیں۔ اب ان کی مقدس زندگیوں کے ادھورے اور نامربوط حصے کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان بن سکتے ہیں۔ قرآن عزیز کو چھوڑ کر یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں ان میں سے ہر ایک کی نسبت محققین کو مختلف شکوک ہیں۔ اگر ان شکوک سے ہم قطع نظر ہی کر لیں تو ان کے اندر ان بزرگوں کی تصویریں کس درجہ ادھوری ہیں۔

حضرت موسیٰ کا حال ہم کو تورات سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ خود تورات جو آج موجود ہے اہل تحقیق کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود مصنفین دائرۃ المعارف برطانیہ تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے صدہا سال بعد وجود میں آئی، اس پر اب جرمن سکالرس نے پتہ لگایا ہے کہ موجودہ تورات میں پہلو بہ پہلو ہر واقعہ کے متعلق دو مختلف صورتوں اور روایتوں کا سلسلہ ہے جو باہم کہیں کہیں متضاد ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تورات کے سوانح و واقعات میں ہر قدم پر ہم کو تضاد بیان سے سابقہ پڑتا ہے اس نظریہ کی پوری تفصیل برطانوی دائرۃ المعارف کے آرٹیکل بائیبل میں موجود ہے۔ اب ایسی صورت میں حضرت موسیٰ بلکہ آدم سے لے کر حضرت موسیٰ تک کے واقعات کی تاریخی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰ کے حالات اناجیل میں درج ہیں مگر ان بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو مانتا ہے باقی انجیل طفولیت انجیل برناباس وغیرہ نامستند ہیں ان چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کے لکھنے والے نے بھی حضرت عیسیٰ کو خود نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے کسی سے سن کر حالات کا یہ مجموعہ لکھا۔ یہ بھی معلوم نہیں بلکہ اب تو یہ بھی مشکوک ہے کہ جن چار آدمیوں کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے۔ وہ صحیح بھی ہے یہ بھی واضح طور پر ثابت نہیں ہے کہ وہ کن زبانوں میں اور کن زمانوں میں لکھی گئیں۔ سنہ [illegible] سے لے کر بعد کے مختلف سالوں تک مختلف مفسرین اناجیل ان کی تصنیف کا زمانہ بتاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش، روانگی اور تثلیث کی تعلیم دیکھ کر اب بعض امریکی ناقدین کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا وجود محض فرضی ہے۔ اس بیان سے عیسائی روایتوں کے ذریعہ سے حضرت عیسیٰ کی زندگی کی تاریخی حیثیت کتنی کمزور معلوم ہوتی ہے۔

حضور کے نور ہونے کی دوسری وجہ

کسی شخصی سیرت کے نور بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے صحیفہ حیات کے تمام حصے منظر عام پر ہوں۔ کوئی واقعہ پردہ راز اور ناواقفیت کی تاریکی میں نہ ہو۔ بلکہ اس کے تمام سوانح اور حالات زندگی روز روشن کی طرح دنیا کے سامنے ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کی سیرت کہاں تک انسانی سوسائٹی کے لیے ایک آئیڈیل زندگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس معیار پر اگر شارعین ادیان اور بانیان مذاہب کے سوانح اور سیرتوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ہستی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاتم الانبیاء ہو کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔

انبیاء سابقین میں سب سے مشہور زندگی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ موجودہ تورات کے مستند یا غیر مستند ہونے کی بحث سے قطع نظر کر کے ہم اس کے بیانات کو بالکل صحیح تسلیم کیے لیتے ہیں۔ تاہم تورات کی پانچوں کتابوں سے ہم کو حضرت موسیٰ کی زندگی کے کس قدر اجزاء ہاتھ آتے ہیں۔ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ پیدا ہو کر فرعون کے گھر پرورش پاتے ہیں۔ جوان ہو کر فرعونیوں کے مظالم کے خلاف بنی اسرائیل کی ایک دو مرتبہ مدد کرتے ہیں۔ پھر مصر سے مدین آتے ہیں۔ یہاں شادی ہوتی ہے اور ایک عرصہ تک یہاں زندگی بسر کر کے مصر واپس جاتے ہیں۔ راہ میں نبوت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ فرعون کے پاس پہنچتے ہیں، معجزات دکھاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو

مصر کو رے جانے کی رخصت چاہتے ہیں، رخصت نہیں ملتی۔ بالآخر غفلت میں اپنی قوم کو لے کر نکل جاتے ہیں۔ خدا کے حکم سے سمندر میں ان کو راہ مل جاتی ہے۔ فرعون غرق ہو جاتا ہے اور وہ اپنی قوم کو لے کر عرب اور شام میں داخل ہوتے ہیں۔ کافر باشندوں سے لڑائیاں پیش آتی ہیں۔ اسی حالت میں جب وہ بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ایک پہاڑی پر ان کی وفات ہو جاتی ہے۔ تورات استثناء کے اختتامی فقرے میں ہے۔

> سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا۔ اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پھر آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ۱۲۰ برس کا تھا اور اب تک موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل میں کوئی نبی نہیں پیدا ہوا۔

حضرت موسیٰ نے ایک سو بیس برس عمر پائی مگر غور کرو کہ ایک سو بیس برس کی عمر کے طویل زمانے کی وسعت کو بھرنے کے لیے ہم کو حضرت موسیٰ کے کیا واقعات معلوم ہیں۔ اور ان کے سوانح کے ضروری اجزاء ہمارے ہاتھ میں کیا ہیں۔ پیدائش، جوانی میں ہجرت، شادی اور نبوت کے واقعات معلوم ہیں۔ پھر چند لڑائیوں کے بعد بڑھاپے میں ۱۲۰ برس کی عمر میں ان کی وفات کی خبر ہے اور بس۔ ان واقعات کو جانے دیجیے یہ تو شخصی حالات ہیں جو ہر شخص کی زندگی میں الگ الگ پیش آتے ہیں۔ انسان کو اپنی سوسائٹی کے عملی نمونے کے لیے جن اجزاء کی ضرورت ہے وہ اخلاق و عادات اور زندگانی کے طور طریقے ہیں اور یہی اجزاء حضرت موسیٰ کی پیغمبرانہ سوانح عمری سے گم ہیں۔ ورنہ عام جزوی حالات یعنی اشخاص کے نام و نسب، مقامات کے پتے، مردم شماریاں اور قانونی اقوال بہت کچھ تورات میں مذکور ہیں۔ مگر یہ معلومات خواہ جغرافیہ، نسب ناموں اور قانون دانی کے لیے کسی قدر ضروری کیوں نہ ہوں مگر عملی حیثیت سے بالکل بے کار اور اجزائے سوانح کی قابلیت سے معرا ہیں۔

اسلام سے قرب العہد پیغمبر حضرت عیسیٰ ہیں جن کے پیرو آج یورپ میں مردم شماری کے مطابق تمام دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے زیادہ ہیں۔ مگر یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اسی مذہب کے پیغمبر کی زندگی کے اجزاء، تمام دوسرے مذاہب کے بانیوں اور پیغمبروں کے سوانح سے سب سے کم معلوم ہیں۔ آج عیسائی یورپ کے تاریخی ذوق کا یہ حال ہے کہ وہ بابل، اسیریا، عرب و شام، مصر و افریقہ، ہندوستان و ترکستان کے ہزارہا برس کے واقعات کتابوں اور کتبوں کو پڑھ کر اور کھنڈروں اور پہاڑوں اور زمین کے طبقوں کو کھود کر منظر عام پر لا رہا ہے اور دنیا کی تاریخ کے گم شدہ اوراق از سرِ نو ترتیب

لیے رہا ہے مگر اس کو سماجی معجزہ جس چیز کو زندہ نہیں کر سکتا وہ خود حضرت عیسیٰ کی زندگی کے مدفون واقعات ہیں۔ پروفیسر اینان نے کیا ذکر کیا مگر حضرت عیسیٰ کی زندگی ۳۳ برس کی تھی۔ موجودہ انجیلوں کی روایتیں اوّلاً تو نامعتبر ہیں اور جو کچھ ہیں وہ صرف ان کے آخری تین سالوں کی زندگی پر مشتمل ہیں۔ ہم کو ان کی تاریخی زندگی کے صرف یہ حصے معلوم ہیں کہ وہ پیدا ہوئے اور پیدائش کے بعد مصر لائے گئے۔ لڑکپن میں ایک دو معجزے دکھاتے، اس کے بعد وہ غائب ہو جاتے ہیں اور پھر یکایک تیس برس کی عمر میں بپتسمہ دیتے ہیں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے کناروں ماہی گیروں کو وعظ کہتے نظر آتے ہیں چند شاگرد پیدا ہوتے ہیں۔ یہودیوں سے چند مناظرے ہوتے ہیں۔ یہودی ان کو پکڑ وا دیتے ہیں اور گورنر کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے اور پھانسی ہو جاتی ہے۔ تیسرے دن ان کی قبر ان کی لاش سے خالی نظر آتی ہے۔ تیس برس اور کم از کم پچیس برس کا زمانہ کہاں گزرا اور کیونکر گزرا۔ دنیا اس سے ناواقف ہے اور رہے گی ان تین آخری برسوں کے واقعات میں بھی کیا ہے؟ کچھ وعظ، چند معجزے اور پھر سولی۔

حضورؐ کے نور ہونے کی تیسری وجہ

کسی شخصیت کے نور ہونے کے لیے تیسری ضروری شرط جامعیت ہے۔ جامعیت سے مقصود یہ ہے کہ مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لیے جن نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے! ہر فرد انسان کو اپنے مختلف تعلقات و روابط اور فرائض و واجبات کو ادا کرنے کے لیے جن مثالوں اور نمونوں کی حاجت ہوتی ہے وہ سب اس آئیڈیل زندگی کے آئینے میں موجود ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خاتم الانبیاء علیہ السلام کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ دین کیا ہے! خدا اور بندوں اور باہم بندوں کے جو فرائض و واجبات ہیں۔ ان کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری کا نام دین ہے، اس لیے ہر دین کے پیروؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے پیغمبروں اور بانیوں کی سیرتوں میں ان حقوق و فرائض اور واجبات کی تفصیلات تلاش کریں اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو اس قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں حیثیتوں سے جب آپ تفصیلات ڈھونڈیں گے تو وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ مذاہب دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں خدا کو یا تو تسلیم ہی نہیں کیا گیا ہے جیسے بدھ اور

چیں کے متعلق کہا جاتا ہے اس لیے ان مذاہب میں خدا اور اس کی ذات وصفات اور دیگر حقوق الٰہی کا پتہ ہی نہیں اور اس لیے ان کے بانیوں میں محبت الٰہی، خلوص، توحید پرستی وغیرہ کی تلاش بیکار ہے۔ دوسرے وہ مذاہب ہیں جنہوں نے خدا کو کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے۔ ان مذہبوں کے انبیاء اور بانیوں کی زندگیوں میں بھی خدا طلبی کے واقعات مفقود ہیں۔ اللہ سبحانہ کے بارے میں ہمارے عقائد کیا ہوں اور ان کے کیسے ہوں اور ان عقائد پر ان کو کس حد تک عملاً یقین تھا اس کی تفصیل سے ان کی زندگیاں بالکل خالی ہیں۔ پوری تورات پڑھ جاؤ، خدا کی توحید اور اس کے احکام اور قربانی کے شرائط کے علاوہ تورات کی پانچ کتابوں میں کوئی ایسا فقرہ نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت موسیٰ کے تعلقات قلبی اور طاعت وعبادت اور خدا پر توکل ویقین، خدا کے صفات کاملہ والٰہیہ کی جلوہ گری ان کے قلب اقدس میں کہاں تک تھی۔ حالانکہ اگر موسوی مذہب ہمیشہ کے لیے اور آخری مذہب کے طور پر آیا ہوتا تو اس کے پیروؤں کا فرض تھا کہ وہ ان واقعات کو قید تحریر میں لاتے۔ مگر اللہ سبحانہ کی مصلحت یہ نہ تھی اس لیے ان سے یہ کام نہ ہوسکا۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی کا آئینہ انجیل ہے۔ انجیل میں ایک مسئلہ کے علاوہ کہ خدا حضرت عیسیٰ کا باپ تھا ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیاوی زندگی میں اس مقدس باپ اور بیٹے میں کیا تعلقات تھے۔ بیٹے کے اقرار سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ باپ کو بیٹے سے بڑی محبت تھی مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بیٹے کو باپ سے کس قدر محبت تھی۔ وہ کہاں تک اپنے باپ کی اطاعت کرتا تھا۔ وہ اس کے آگے کبھی شب وروز میں جھکتا بھی تھا، اور آج کی روٹی کے علاوہ کوئی اور چیز بھی کبھی اس نے اس سے مانگی ہے۔ گرفتاری کی رات سے پہلے کوئی ایک رات بھی اس پر ایسی گزری جب وہ باپ کے حضور میں دعا مانگ رہا ہو۔ پھر ایسی سیرت سے ہم روحانی حیثیت سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اگر حضرت عیسیٰ کی سیرت میں خدا اور بندے کے تعلقات واضح ہوتے تو ساڑھے تین سو برس کے بعد پہلے عیسائی بادشاہ کو جس میں تین سو عیسائی علماء کی مجلس اس کے فیصلے کے لیے فراہم کرنی پڑتی اور وہ اب تک ایک ناقابل فہم راز نہ بنے رہتے۔

اب حقوق عباد کو لیجئے تو اس سے بھی حضرت خاتم النبیین کے سوا تمام دیگر انبیا اور بانیان مذاہب کی سیرتیں خالی ہیں۔

حضرت موسیٰ کی زندگی کا ایک ہی پہلو نہایت واضح ہے اور وہ جنگ اور سپہ سالاری کا پہلو ہے، ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لیے دنیوی

حقوق و واجبات ، فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ میاں ، بیوی ، باپ بیٹے ، بھائی بہن ، دوست و احباب کے متعلق ان کا کیا طرزِ عمل تھا ۔ صلح کے فرائض میں ان کا کیا دستور تھا ۔ اپنے مال و دولت کو کن مفید کاموں میں انہوں نے لگایا ۔ بیماروں ، یتیموں ، مسافروں اور غریبوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا اور ان کے ماننے والے ان امور میں ان کی زندگی کی مثالوں سے کیونکر فائدہ اٹھائیں ، حضرت موسیٰ بیوی رکھتے تھے بچے رکھتے تھے ، بھائی رکھتے تھے ، دوسرے اعزہ اور متعلقین رکھتے تھے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کا پیغمبرانہ طرزِ عمل بلاشبہ ہر حرف گیری سے پاک ہوگا مگر ان کی موجودہ سیرت کی کتابوں میں ہم کو یہ ابواب نہیں ملتے جو ہمارے لیے قابلِ تقلید اور نمونہ ہوں ۔

حضرت عیسیٰ کی ماں تھیں اور انجیل کے بیان کے مطابق ان کے بھائی بہن بھی تھے مگر ان کی زندگی کے واقعات ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ان کا تعلق ، طرزِ عمل ، سلوک اور برتاؤ نہیں ظاہر کرتے ۔ حالانکہ دنیا ہمیشہ انہی تعلقات سے آباد رہی ہے اور رہے گی ۔ مذہب کا بڑا حصہ انہی کی متعلقہ ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا نام ہے ۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ نے محکومی کی زندگی بسر کی اس لیے ان کی سیرت تمام حاکمانہ فرائض کی مثالوں سے خالی ہے ۔ وہ متاہل یعنی بیوی بچوں والے نہ تھے اس لیے میاں بیوی کے لیے حضرت عیسیٰ کی زندگی میں تقلید کا کوئی سامان نہیں ہے اور چونکہ دنیا کی بیشتر آبادی متاہلانہ زندگی رکھتی ہے اس لیے اس کے معنے یہ ہیں کہ دنیا کے بیشتر حصہ آبادی کے لیے ان کی سیرت نمونہ نہیں بن سکتی ، جس نے گھر بار ، اہل و عیال ، مال و دولت ، صلح و جنگ ، دوست اور دشمن کے تعلقات سے کبھی واسطہ نہ رکھا ہو وہ اس دنیا کے لیے جو ان ہی تعلقات سے معمور ہے کیونکر مثال ہو سکتا ہے ۔ اگر آج دنیا یہ زندگی اختیار کرے تو کل وہ سنسان قبرستان بن جائے ، تمام ترقیاں دفعۃً رک جائیں اور یورپ تو شاید ایک منٹ بھی زندہ نہ رہے ۔

حضور اقدس کے نمونہ ہونے کی چوتھی وجہ

زندگی کے نمونہ ہونے کا سب سے آخری معیار عملیت ہے ۔ عملیت سے مقصود یہ ہے کہ شارع یعنی اور بانی مذہب جس تعلیم کو پیش کر رہا ہے خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو عملی یعنی قابلِ عمل ثابت کیا ہو ۔

خوش کن سے خوش کن فلسفہ ، دلچسپ سے دلچسپ نظریے اور خوش آئند سے خوش آئند اقوال ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کر سکتا وہ عمل ہے ۔

انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے نیک اور معصوم اقوال، خیالات اور اخلاقی فلسفیانہ نظریے نہیں بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ اگر یہ معیار قائم نہ کیا جاتے تو اچھے اور بُرے کی تمیز اُٹھ جاتی اور دُنیا صرف بات بنانے والوں کا مسکن رہ جاتی۔ بتائیے کہ آج لاکھوں بانیان مذاہب میں سے کس کی زندگی کو آپ اس ترازو پر تول سکتے ہیں؟ یہ نصیحتیں پڑھیے۔

تو اپنے خداوند خدا کو اپنی ساری جان و مال سے پیار کر، تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال کر دے۔ جو تجھ کو ایک میل بیگار لے جاتے تو اس کے ساتھ دو میل جا۔ جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو کرتا بھی دے دے۔ تو اپنے تمام مال و اسباب کو خدا کی راہ میں دے دے۔ تو اپنے بھائی کو ستر بار معاف کر۔ آسمان کی بادشاہت میں دولتمند کا داخل ہونا مشکل ہے

یہ اور اسی قسم کی نصیحتیں نہایت دل خوش کن ہیں مگر عمل سے ان کی تصدیق ہو تو وہ سیرت کا ٹکڑا نہیں بلکہ معصومانہ شیریں بیانی کا شاہکار ہیں، جس نے اپنے دشمن پر قابو نہ پایا ہو وہ عفو کی عملی مثال کیسے پیش کر سکتا ہے، جس کے پاس خود کچھ نہ ہو وہ غریبوں اور مسکینوں اور یتیموں کی مدد کیوں کر کر سکتا ہے۔ جو عزیز و اقارب بیوی بچے نہ رکھتا ہو وہ ان ہی تعلقات سے دُنیا کے لیے نمونہ کیوں کر بن سکتا ہے۔ جس نے بیماروں کی تیمارداری اور عیادت نہ کی ہو وہ اس کا وعظ کیوں کر کہہ سکتا ہے جس کو خود دوسروں کے معاف کرنے کا موقع نہ ملا ہو اس کی زندگی ہم میں سے غضب ناک اور غصہ والوں کے لیے اسوہ کیوں کر بنے گی۔

نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک سلبی اور ایک ایجابی مثلاً آپ پہاڑ کے ایک غار میں جا کر عمر بھر کے لیے بیٹھ گئے تو صرف یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدیوں اور برائیوں سے آپ نے پرہیز کیا۔ یعنی آپ نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو آپ کے لیے قابل اعتراض ہو مگر یہ تو سلبی تعریف ہوتی۔ ایجابی پہلو آپ کا کیا ہے، کیا اپنے غریبوں کی مدد کی، محتاجوں کو کھانا کھلایا، کمزوروں کی حمایت کی، ظالموں کے مقابلے میں حق گوئی سے کام لیا، گرتوں کو سنبھالا، گمراہوں کو راستہ دکھایا۔ عفو و کرم، سخا، مہمان نوازی، حق گوئی، رحم، حق کی نصرت کے لیے جوش، جدوجہد، مجاہدہ، ادائے فرض، ذمہ داریوں کی بجا آوری غرض تمام وہ اخلاق جن کا تعلق عمل سے ہے۔ صرف سلب فعل اور عدم عمل سے نیکیاں نہیں بن جائیں گی۔ نیکیاں صرف سلبی پہلو ہی نہیں رکھتیں۔ زیادہ تر ایجابی اور عملی پہلو پر ان کا مدار ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہوگا کہ جس زندگی کا عملی حصہ سامنے نہ ہو اس کو "نمونہ" کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسانی زندگی کی مختلف شاخوں میں اس سے کیوں کر روشنی حاصل کرے گا۔ ہمیں تو

صلح و جنگ، فقر و دولت، ازدواج و تجرد، تعلقات خداوندی، تعلقات عباد، حاکمیت و محکومیت، سکون و غضب، جلوت و خلوت غرض زندگی کے ہر پہلو کے متعلق عمل مثال چاہیے۔ دنیا کا بیشتر بلکہ تمام تر حصہ ان ہی مشکلات اور تعلقات میں اُلجھا ہوا ہے۔ اس لیے انسانیت کو ان ہی مشکلات کے حل کرنے اور ان ہی تعلقات کو بوجہ احسن انجام دینے کے لیے عملی مثالوں کی ضرورت ہے۔ اس معیار پر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسری زندگی پوری نہیں اترتی۔ بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں نور اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ کی زندگی کے نقشہ میں چار باتیں پائی جاتی ہیں، تاریخیت، جامعیت، کاملیت اور عملیت اور دوسرے انبیاء کی زندگیاں ان خصوصیات سے خالی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سیرتیں جو ان کے بعد عام انسانوں تک پہنچیں یا جو آج موجود ہیں وہ ان خصوصیات سے خالی ہیں، اسی لیے آپ کی نورانیت کو بتانے کے لیے قرآن نے خاص طور پر اہلِ کتاب کو مخاطب کیا ہے۔ اور ایسا ہونا مصلحتِ الٰہی کے مطابق تھا۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وہ انبیاء محدود زمانہ اور متعین قوموں کے لیے تھے اس لیے ان کی سیرتوں کو دوسری قوموں اور آئندہ تک محفوظ رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دُنیا کی قوموں کے لیے اور قیامت تک کے لیے نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ کی زندگی کو ہر حیثیت سے مکمل جامع، دائمی اور ہمیشہ رہنے کی ضرورت تھی اور یہی نور ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ آپ کی ذات علم و عمل کا مجموعہ ہے۔ آپ کا عمل نور ہے اور آپ کا علم کتاب مبین ہے۔ آپ کا علم انسان کو اگر ذہنی تاریکیوں سے نکالتا ہے تو آپ کی سیرت زندگی کے لیے عمل کی صحیح شاہراہ متعین کرتی ہے۔ اس وجہ سے آپ کی سیرت نور ہے اور آپ کا علم کتاب مبین ہے۔ اہلِ کتاب کو اللہ سبحانہ نے جو روشنی عطا فرمائی تھی اس کو ضائع کر کے وہ تاریکیوں میں گم ہو گئے تھے اصل حقیقت گم تھی اور شاہراہ ناپید۔[1]

نبوت کے علم و عمل کا مقصد

۱۶۔ اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودی کے پیروکار ہوں سلامتی کی راہیں کھولتا ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ پر لگاتا ہے۔

---

[1] خطبات۔

سلامتی کی راہوں سے مراد غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے جو شخص نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے روشنی حاصل کرتا ہے اسے فکر و عمل کے ہر پہلو پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔ یہ گویا نبوت کے علم و عمل کا مقصد بتایا گیا ہے کہ نبوت کا علم و عمل اس لیے آیا ہے کہ اگر تم نے اسے اپنایا تو یہ تم کو امن و سلامتی کی راہ پر لگائے گا اور تاریکی سے نکال کر روشنی میں، کج روی اور ضلالت کی وادیوں سے نکال کر اللہ کی صراطِ مستقیم پر چلائے گا۔ بشرطیکہ تم خدا کی خوشنودی کے طالب ہو اور اپنے تعصبات کی پٹیاں اپنی آنکھوں سے کھول کر اس روشنی کو دیکھو اور اس کی قدر کرو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں رضائے الٰہی کی جستجو نہ ہو بلکہ وہ اپنی خواہشات کے پرستار بنے رہیں اس کے لیے توفیق کا دروازہ نہیں کھلتا۔ باذنہ کے لفظ سے اسی قانون کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ سعادت خدا کے اذن سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اذن ان کے لیے ہوتا ہے جن کے اندر رضائے الٰہی کی جستجو ہو۔[1] مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ اصل مقصود طلبِ رضا ہے دخولِ جنت اس کے تابع ہے۔ اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ہر قسم کی سلامتی کی راہیں کھلنے کی بنیادی شرط نبوت کے علم و عمل سے وابستگی ہے فکری بھی اور عملی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل پر ایمان اطاعت کے بغیر صرف آخرت ہی میں جنت نہیں دُنیا میں بھی سلامتی کی راہیں نہیں کھلتی ہیں۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگیوں کی دنیوی فلاح مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اور ضروریاتِ زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس، آخرت پسند اور رضائے الٰہی کے طالب ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے نبی کریم صلی اللہ علیہ السلام نے اسی حقیقت کی وضاحت کی تھی جب آپ نے یہ فرمایا تھا:

> جس نے اپنی کل کی فکر ایک ہی فکر، اپنی آخرت کی فکر، کو اپنا لیا، اللہ تعالیٰ اس کی دُنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار، دُنیا کے افکار و معاملات، نے منتشر کر رکھا ہو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ اس دُنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہو رہتا ہے۔
>
> (مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ)

---

[1] تدبر قرآن۔

ایک اور ارشادِ نبوی پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ،

جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو دُرست کر دیتا ہے اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے اور دُنیا تابع فرمان بن کر اس کے حضور کھڑی ہوتی ہے۔

اسی طرح اُمّت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح اور اس میں سلامتی کی راہیں اسی وقت میّسر آسکتی ہیں جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع رضائے الٰہی کی طالب ہو۔ یعنی ایک طرف تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہو جو نبوّت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستہ ہوں۔ دوسری طرف اس میں وہ مضبوط اجتماعی تنظیم ہو جس کے بغیر کوئی جماعت جماعت نہیں ہو سکتی ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ
قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ
الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَ
لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا
يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُودُ
وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ
بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ
يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ
مَا بَيْنَهُمَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا
يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا
مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مریم کا بیٹا مسیح ہے۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس

کی ماں کو اور روئے زمین پر جتنے انسان ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے، تو کون ہے جو اس کی بادشاہی میں دخل دینے کی جرأت کرے" آسمان و زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطانی اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے"۔ اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں"۔ آپ فرما دیجیے کہ بتاؤ پھر اللہ تم کو تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے"، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسی کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے تم بھی انسان ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے، آسمانوں کی زمین کی اور اس سب کی جو ان کے درمیان ہیں مالکی و سلطانی صرف اسی کے لیے ہے اور سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے"۔ اے اہل کتاب ایسی حالت میں کہ رسولوں کا ظہور مدتوں

سے بند تھا ہمارا رسول تمہارے پاس آیا وہ تمہارے سامنے احکام

کھول کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی رسول

نہیں بھیجا گیا نہ بشارت دینے والا اور نہ ڈرانے والا، تو اب دیکھو

بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[۲]

توحید کے متعلق غلط فہمیاں

اللہ سبحانہٗ کو، اللہ کی صفتوں کو، خدا اور بندوں کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں اور تمثیلیں مذاہب میں خوش اعتقادی کی پیداوار ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اصل خدا تو جاتا رہا اور اس کی جگہ یہ تشبیہیں اور تمثیلیں رہ گئیں اللہ سبحانہٗ کو اپنے بندوں کے ساتھ جو لطف و کرم اور محبت و پیار ہے اس کو تشبیہ و تمثیل کے رنگ میں اداکر کے مجسم کر دیا گیا۔ آرین قوموں میں چونکہ عورت محبت کی دیبی ہے اس لیے خدا اور بندے کے تعلق کو ماں اور بیٹے کے لفظ سے ادا کیا گیا اور اس لیے خدا ماں کی شکل میں آگیا۔ بعض دوسرے ہندو فرقوں میں اس بے کیف محبت کو زن و شو اور میاں بیوی کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ سدا سہاگ فقیروں نے ساڑھی اور چوڑی پہن کر اسی حقیقت کو نمایاں کیا ہے رومیوں اور یونانیوں میں بھی عورت ہی کی شکل میں خدا ظاہر ہوا ہے۔ سامی قوموں میں عورت کا برملا ذکر تہذیب کے خلاف ہے اس لیے خاندان کی اصل بنیاد باپ کو قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح بابل اسیریا اور شام کے کھنڈروں میں خدا مرد کی صورت میں جلوہ نما ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے ابتدائی تخیل میں خدا، باپ اور تمام فرشتے اور انسان اس کی اولاد قرار دیے گئے ہیں۔ بعد کو خدا کی اولاد صرف بنی اسرائیل قرار پاتی ہے۔ بنی اسرائیل کے کچھ صحیفوں میں عورت و مرد کا تخیل بھی

خدا اور بنی اسرائیل کے درمیان منظر آتا ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل اور یروشلم بیوی فرض کیے جاتے ہیں اور خدا شوہر بنتا ہے۔ عیسائیوں میں باپ اور بیٹے کی تمثیل نے اصلیت اور حقیقت کی جگہ لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے مسیح کی حقیقت ایک معمہ بن کر رہ گئی جسے ان کے علماء تفلسف، لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ الجھتے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر انکی مرکب شخصیت کے جزوِ انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کو ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا، اور جس کے ذہن پر جزوِ الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت سے ہی مسیح کی عبادت کی۔ یہ بھی عیسائیوں کے نقضِ عہد کی ایک مثال ہے کہ انہوں نے تمام عہد و میثاق کی جو جڑ ہے یعنی توحید اس پر کلہاڑا مار دیا ہے اور اللہ سبحانہٗ کی جگہ مسیح ابن مریم کو خدا بنا بیٹھے۔ قرآن اس آیت میں اس تشبیہی اور تمثیلی طریقہ کو یک قلم موقوف کر رہا ہے اور اس کے استعمال کو کفر قرار دے رہا ہے۔

۶۵ - بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مریم کا بیٹا مسیح ہے۔ یعنی مسیح کے علاوہ خدا کوئی اور چیز نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ نصاریٰ میں سے فرقہ یعقوبیہ کا ہے جن کے نزدیک مسیح کے قالب میں خدا حلول کیے ہوتے ہے معاذ اللہ یا یوں کہا جائے کہ جب نصاریٰ حضرت مسیح کی نسبت الوہیت کے قائل ہیں اور ساتھ ہی توحید کا بھی زبان سے اقرار کرتے ہیں یعنی خدا ایک ہی ہے تو ان دونوں دعووں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مسیح کے سوا کوئی خدا نہ ہو، بہر حال کوئی صورت لی جائے اس عقیدے کے کفرِ صریح ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے لے قاضی بیضاوی اور امام رازی کی رائے میں یہ عیسائیوں کے عقیدہ حلول و استحاد کا لازم ہے۔ کیونکہ موجودہ مسیحیت جس کا بانی پال ہے اصلاً تو حلول و استحاد کے اعتقاد پر مبنی ہے۔ یعنی پال کے نزدیک مسیح کی شکل میں خدا ہی نے ظہور کیا ہے لیکن بعض اعتراضات سے بچنے کے لیے اس کو اس نے اس چیستان کی شکل میں پیش کیا ہے جس کو تثلیث کہتے ہیں۔ گویا حلول اس عقیدے کی روح ہے اور تثلیث اس کی تعبیر۔ قرآن نے کہیں اس گمراہی کی روح کو واضح کیا ہے کہیں اس کی معروف تعبیر سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پال کا اصل مقصود مسیح کو خدا ثابت کرنا تھا اس کے لیے اس نے حضرت مسیح کی خارق عادت ولادت اور ان کے کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہونے سے مواد فراہم کیا لیکن

لے افادات شیخ الاسلام

انجیلوں میں چونکہ باپ اور روح القدس کا بھی ذکر تھا۔ اس وجہ سے لئے یہ محنت کرنی پڑی کہ الوہیت کے مسئلہ کا حل کرنے کے لیے کوئی ایسی تعبیر اختیار کرے کہ ان سب کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی جگہ نکل آتے۔ لیکن یہ سارا گورکھ دھندا تو بس چند بال کی کھال اُدھیڑنے والوں کے ذہن میں یا چند پیستان قسم کی کتابوں کے اندر بند رہتا ہے۔ عام ذہن تو خلاصہ پسند کرتا ہے وہ ان موشگافیوں میں کہاں پڑتا ہے چنانچہ عوام نے اس سارے افسانے میں سے صرف اتنی چیز اپنے ذہن میں راسخ کر لی کہ مسیح خدا ہیں۔ عقیدہ اتھاناسیس جو کیتھولک پروٹسٹنٹ وغیرہ سب مشہور و مقبول فرقوں میں مشترک ہے اس میں یہ الفاظ صراحۃً موجود ہیں۔

باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے جلال برابر عظمت ازلی برابر جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا۔ باپ غیر مخلوق بیٹا غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود بیٹا غیر محدود۔ باپ ازلی بیٹا ازلی۔ یونہی باپ قادر مطلق بیٹا قادر مطلق۔ ویسا ہی باپ خدا بیٹا خدا۔

الشہرستانی نے الملل والنحل میں عیسائی فرقوں کے تذکرے میں لکھا ہے کہ

ان میں سے یعقوبیہ بھی ہیں۔ ان کا عقیدہ اقانیم ثلاثہ کا ہے لیکن اتنا اضافہ ہے کہ کلمہ گوشت اور خون کا لبادہ پہن کر بصورت مسیح الٰہ بن گیا ہے ان کے بارے میں قرآن نے لقد کفر الذین قالوا میں خبر دی ہے لہٰذا کچھ کی رائے ہے کہ مسیح ہی اللہ ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ لاہوت ناسوت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

امام ماوردی نے اعلام النبوۃ میں لکھا ہے کہ عیسائیوں کے تین فرقوں میں سے نسطوریہ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسٰی اللہ ہیں۔

اللہ کی قدرت کاملہ اور اختیار ناطق

۶۶۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو "اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور روئے زمین پر جتنے انسان ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کی بادشاہی میں دخل دینے کی جرأت کرے۔ یعنی اگر فرض کرو خدائے قادر ذوالجلال یہ چاہے کہ حضرت مسیح اور مریم اور اگلے پچھلے سب روئے زمین پر بسنے والوں کو اکٹھا کر کے ایک دم میں ہلاک کر دے تو تم ہی بتاؤ کہ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ یعنی ازل و ابد کے سارے انسان بھی اگر فرض کرو مجتمع کر دیے جائیں اور خدا ایک آن میں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو سب کی اجتماعی قوت بھی خدا کے ارادے و تھوڑی

دینے کے لیے ملتوی نہیں کر سکتی کیونکہ مخلوقات کی قدرت جو عطائی اور محدود ہے خدا کی ذاتی اور لامحدود قدرت کے مقابلہ میں عدم محض ہے، جس کا اعتراف خود وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے رد میں یہ خطاب کیا جا رہا ہے بلکہ خود مسیح بن مریم بھی جن کو یہ لوگ خدا بتلاتے ہیں اس کے معترف ہیں چنانچہ مرقس کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ مقولہ موجود ہے۔

اے باپ ہر چیز تیری قدرت کے تحت میں ہے تو مجھ سے یہ موت کا پیالہ ٹلا دے

اس طرح نہیں جو میں چاہتا ہوں بلکہ اس طرح جیسے تیرا ارادہ ہے۔

پس جب حضرت مسیح جن کو تم خدا کہتے ہو اور ان کی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ جو تمہارے زعم میں خدا کی ماں ہوئیں وہ دونوں بھی تمام من فی الارض کے ساتھ مل کر خدا کی مشیت و ارادے کے سامنے عاجز ٹھہرے تو خود سوچ لو کہ ان کی یا ان کی کسی اور مخلوق کی نسبت خدائی کا دعویٰ کرنا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہوگی۔ آیت کی اس تقریر میں ہم نے ہلاک کو موت کے معنے میں لیا ہے مگر یمیتا کے لفظ کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جو مدلول لفظ یمیتا کا ہم نے بیان کیا ہے وہ اطباء کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ اس کے سوا یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں ہلاک کے معنے موت کے نہ لیے جائیں جیسا کہ راغب نے لکھا ہے کبھی ہلاک کے معنے کسی چیز کا مطلقاً نیست و نابود ہو جانا ہوتے ہیں مثلاً کل شئی ھالك الا وجھہ یعنی خدا کی ذات کے سوا ہر چیز نابید ہونے والی ہے۔ اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر خدا تعالیٰ تدبیر حضرت مسیح، ان کی والدہ اور تمام من فی الارض کو قطعاً نیست و نابود اور بالکلیہ فنا کر ڈالنے کا ارادہ کرے تو کون ہے جو اس کے ارادے کو روک دے گا۔

اوست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند
عالمے را در دمے ویراں کند

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ نبیوں کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تاکہ ان کی امت بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھا دے ورنہ نبی اس لائق کاہے کو ہیں کہ ان کے مرتبہ عالی اور وجاہت عند اللہ کا خیال کرتے ہوئے ایسا خطاب کیا جاوے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے ارادے میں کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں ہو سکتی ہے جیسے حضرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ابراہیم نے اسی اختیار ناطق اور قدرت کاملہ کی طرف اشارہ کیا ہے لاستغفرن لک وما املک لک من اللہ من شیٔ۔ میں آپ کے لیے خدا سے مغفرت مانگوں گا لیکن میں آپ کے معاملہ میں خدا کے کسی فیصلہ میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ اس آیت میں حضرت مسیح کو الٰہ و معبود بنانے پر انتہائی کی جانب سے اظہار غضب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نادانو! یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو کیا مسیح کیا ان کی والدہ اور کیا یہ ساری مخلوق، خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے، سب کو وجود اسی نے بخشا ہے اور اگر وہ ان سب کو فنا کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے، آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس میں اس کا شریک ہو، وہ جو چاہے، جس طرح چاہے اور جتنی مقدار میں چاہے پیدا کرتا اور پیدا کر سکتا ہے کسی کا بن باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا بن گیا یا خدائی میں شریک ہو گیا۔

کائنات میں سلطانی اللہ کی ہے

۶۷۔ آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطانی اللہ کے لیے ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے جو چاہے جس طرح چاہے مثلاً حضرت مسیح کو بغیر باپ کے، حضرت حوا کو بغیر ماں کے اور حضرت آدم کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر دیا۔ سب کچھ قدرت ہے کسی کا زور اس کے سامنے نہیں چلتا[1]

اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیح کی اعجازی پیدائش اور ان کے اخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکہ میں پڑ گئے کہ مسیح ہی خدا ہے وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیح تو اللہ کے بے شمار عجائب تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چوندھیا گئیں۔ اگر ان لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انہیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے۔ یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو صاحب کمال کو دیکھ کر خالق کمال کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور حاصل کرتے ہیں[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اہل کتاب کا نجات یافتہ ہونے کا غرور

۱۸ - اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ شاید بیٹے کہ بیٹے یعنی اولاد اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی بائیبل میں خدا نے اسرائیل یعقوب علیہ السلام کی نسبت پہلوٹا بیٹا اور اپنے آپ کو اس کا باپ کہا ہے۔ ادھر نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ مانتے ہیں تو اسرائیل کی اولاد اور حضرت مسیح کی امت ہونے کی وجہ سے غالباً ابناء اللہ کا لفظ اپنی نسبت استعمال کیا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیٹا کہنے سے مراد یہ ہو کہ ہم خدا کے خواص اور محبوب ہونے کی وجہ سے گویا اولاد ہی جیسے ہیں۔ اس صورت میں ابناء کا حاصل وہی ہو جائے گا جو لفظ احباء کا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہم خدا کے بیٹے اور پیارے ہیں اس لیے ہم عام نوع انسانی سے افضل و اشرف ہیں اور ہم جو کچھ بھی کریں ہمارے لیے نجات ہی نجات ہے۔ اہل کتاب کا یہی زعم باطل تھا جس نے ان کو عہد الٰہی کی ذمہ داریوں سے سب سے زیادہ بے پرواہ بنا دیا تھا۔ انہوں نے گمان کیا کہ وہ خدا کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں اس لیے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔ جنت ان کا پیدائشی حق ہے۔ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس یونہی چند دنوں کے لیے۔ اس فتنے کے اصل بانی تو یہود ہوتے ہیں لیکن آخر نصاریٰ ان کو جنت کا واحد اجارہ دار کیوں بننے دیتے حضرت مسیح نے یہودی تصور کی سختی اور قہرمانی کی جگہ رحمت و شفقت کا تصور پیدا کرنے کے لیے خدا کو باپ کے لفظ سے تعبیر کیا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ شریعت کے ظواہر و رسوم کچھ سود مند نہیں اگر دل میں نیکی اور محبت نہ ہو۔ عیسائیوں نے اس بات کو کچھ سے کچھ بنا لیا اور کہنے لگے کہ نجات کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ کفارہ مسیح پر ایمان لے آئے اور سمجھ لے کہ خدا ہمارا باپ ہے۔ وہ بھی اپنے بیٹوں پر آسمان کی بادشاہت کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔

آیت قرآنی میں نحن ہم سے مراد افراد نہیں بلکہ قوم ملت مجموعہ افراد مراد ہے۔ یعنی یہود من حیث القوم اور نصاریٰ بحیثیت ملت مراد ہیں۔ موجودہ بائیبل میں اس قسم کے حوالے موجود ہیں:

"خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے۔"

(خروج ۴: ۲۲)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔　　　(استثنا ۱۴-۱)

جب اسرائیل لڑکا ہی تھا میں نے اس کو عزیز رکھا اور بیٹے کو مصر سے بلایا۔

(ہوسیع ۱۱-۱)

جتنوں نے اسے قبول کیا، اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا۔

(یوحنا - ۱-۱۲)

جتنے خدا کی روح کی ہدایت سے ملتے ہیں وہی خدا کے بیٹے ہیں۔

(رومیوں ۸-۱۴)

یہاں ابناء اللہ سے حقیقی صلبی بیٹے مراد نہیں اور نہ ابن کے لازمی معنے ہیں۔ اس کے لیے عربی میں لفظ ولد بھی ہے۔ ابن کا اطلاق مجازی منہ بولے لڑکوں پر بھی ہوتا ہے اور عربی زبان میں ابن کا مجازی استعمال بہت زیادہ ہے۔ ابن حرب، ابن السبیل، ابن اللیل، ابن العلم، ابن یوم، وغیرہ اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب، ابن، بنت یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے چیزیں ان کی طرف منسوب ہیں۔ ازہری لغوی اور ابن العربی نے ایسے ناموں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو عربی میں کسی کے ابن کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مثلاً ابن الطین حضرت آدم کے لیے ابن اللیل چور کے لیے ابن القول باتونی کے لیے۔ بہرحال ان کے اس دعویٰ کا مطلب یہی ہے کہ ہم خاصان خدا میں سے ہیں۔ ہمارا اور عام لوگوں کا مقابلہ کیا۔ یعنی سب سے اونچی ذات والے اور خاص مقربین حق ہمیں ہیں۔ یہ ٹھیک وہی ذہنیت ہے جو ہندوستان کے برہمنوں میں پائی جاتی ہے کہ اپنے کو چندر بنسی اور سورج بنسی کہلاتے ہیں اور بڑے درد کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اندر بھی پیرزادگی، مشائخ زادگی، مخدوم زادگی کے گھمنڈ اس کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ انا للہ وانا الیہ المشتکی۔

یہودیوں کی تردید خود ان کی تاریخ سے

۷۹ - آپ فرما دیجئے کہ تو پھر اللہ تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے۔ چونکہ کسی مخلوق کا حقیقتہً ابن اللہ ہونا بالکل محال اور بدیہی البطلان ہے اور خدا کا محبوب بن جانا ممکن ہے یحبھم ویحبونہ قرآن میں ہے اس لیے اس جگہ پہلے اول محبوبیت پیارے ہونے کے دعویٰ کا رد کیا گیا۔ یعنی جو قوم علانیہ بغاوتوں اور شدید ترین گناہوں کی بدولت یہاں بھی کسی طرح کی رسوائیوں اور عذاب میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اور آخرت میں بھی حبس دوام کی سزا کا

عقلاً و نقلاً استحقاق رکھتی ہے۔ کیا ایسی باغی و عاصی قوم کی نسبت ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی ذی شعور خیال کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی محبوب اور پیاری ہوگی خدا سے کسی کا نسبی رشتہ نہیں۔ اس کا پیار اور اس کی محبت صرف اطاعت اور حسنِ عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسے کٹر مجرموں کو جو سخت سے سخت سزا کے مستحق اور مورد بن چکے ہیں شرمانا چاہیے کہ وہ نحن ابناء اللہ واحباءہ کا دعویٰ کریں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو باوجودیکہ ان کا صلبی بیٹا تھا خدا نے فرمادیا انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح لے

دراصل یہاں ان کے اس زعمِ باطل کی تردید خود ان کی تاریخ سے کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے کے سبب سے تم خدا کے مواخذے اور عذاب سے بری ہو تو تمہاری یہ محبوبیت اور تمہارا یہ چہیتا پن اس دنیا میں تمہارے کچھ کام کیوں نہ آیا۔ یہاں تو تمہاری پوری تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جب تم نے خدا سے سرکشی کی ہے۔ اس نے تمہیں نہایت عبرت انگیز سزائیں بھی دی ہیں۔ ایسی عبرت انگیز کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں مل سکتی۔ پوری قوم کی غلامی، پوری قوم کی صحرا نوردی، پوری قوم کی جلاوطنی، متعدد بار پوری قوم کا قتلِ عام اور بیت المقدس کی عبرت انگیز تباہی، یہ سارے واقعات خود تورات میں موجود ہیں۔ اگر ابراہیم و اسحاق کی اولاد ہونے کی وجہ سے تمہیں خدا کی جانب سے کوئی برأت نامہ حاصل ہے تو اس برأت نامہ نے تمہیں عذاب سے کیوں نہیں بچایا۔ بداعمالی پر دنیوی سزاؤں کا ترتب تو ایک کھلی حقیقت ہے جس سے ان کو یارائے انکار نہ تھا اور ان دنیوی سزاؤں سے عہد عتیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ حضرت تھانوی کا یہ ارشاد یہاں بالکل برمحل ہے کہ یہ آیت صراحۃً ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو اللہ کے ساتھ ایسے قرب کا دعویٰ کرتے ہیں جس میں معصیت پر بھی مواخذہ اور گرفت نہ ہو۔

قانون کی بالادستی

بل۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے پیدا کیے ہوتے انسانوں میں سے تم بھی انسان ہی ہو۔ بشر اصل لغت میں کھال کی اوپر کی سطح کو کہتے ہیں۔ تھوڑی سی مناسبت سے آدمی کو بشر کہنے لگے۔

لے افادات شیخ الاسلام

شاید اس لفظ کے یہاں اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہو کہ تم تو خدا کا بیٹا اور پیارا تو درکنار شریف اور ممتاز انسان بھی نہیں کہا جاسکتا صرف بشرہ اور شکل و صورت کے لحاظ سے خدا کے پیدا کیے ہوئے ایک معمولی آدمی کہلاتے جا سکتے ہو جن کی پیدائش بھی اسی معتاد طریقہ سے ہوتی ہے جس طرح عام انسانوں کی ہوتی ہے پھر بھلا ابنیت کا وہم کہاں راہ پا سکتا ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ جزا و سزا کا جو قانون سب کے لیے ہے وہی تمہارے لیے بھی ہے جس طرح خدا کی ساری مخلوق ہے اسی طرح تم بھی اس کی مخلوق ہو اور جس طرح سب کو خدا سے نسبت ایمان و عمل صالح کے توسل سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح تمہیں بھی اگر خدا سے نسبت حاصل ہوگی تو ایمان و عمل صالح ہی کے ذریعے حاصل ہوگی اور بس۔ اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ نسب اور نسبت کے رشتے بے کار ہوتے ہیں۔ اگر ایمان و عمل کی نعمت سے ہمدوش نہ ہو قانون یہی ہے اور سب کے لیے ہے اور قانون کی طاقت ناقابل شکست ہے۔ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ امیر و غریب اور خاص و عام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ نبی زادہ بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک عام اُمتی دُنیا کی زندگی میں بھی یہی قانون ہے اور آخرت میں نجات کا بھی یہی ضابطہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ "اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

جزا و سزا اللہ ہی کے اختیار میں ہے

اے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے آسمانوں کی زمین کی اور اس سب کی جو ان کے درمیان میں مالکی و سلطانی صرف اسی کے لیے ہے اور سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کون بخشش کے لائق ہے اور کسے سزا دی جائے جسے وہ اپنی رحمت و حکمت سے معاف کرنا چاہے یا عدل و انصاف سے سزا دینا چاہے اس میں کون مزاحم ہو سکتا ہے نہ کسی مجرم کے لیے یہ گنجائش ہے کہ اس کے قلمرو آسمان و زمین سے باہر نکل جائے اور نہ یہ کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کہیں اور بھاگ جائے۔[2]
مطلب یہ ہے کہ مغفرت اور عذاب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ جن کو مغفرت کا مستحق

---

[1]، [2] افادات شیخ الاسلام

پائے گا ان کی مغفرت فرمائے گا جن کو سزا کا مستحق پائے گا ان کو سزا دے گا۔ اگر کسی نے بزرگوں سے خاندانی نسبت یا ان کی موہوم شفاعتوں پر بھروسہ کرکے خدا کے عہد ہی کو توڑ دیا ہے تو اس کو خدا کے عذاب سے بچانے والا کوئی بھی نہ ہوگا۔ سماوات کی سلطانی بلا شرکت غیر اللہ کی ہے نہ اس میں کسی کی حصہ داری ہے اور نہ خدا کے سوا بہشتی کے لیے کوئی اور عدالت ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی نے اس موقعہ پر یہ بات پتے کی لکھی ہے کہ یہ دعویٰ مذکورہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ہمارے زمانہ کے جاہل پیرزادوں کا انتساب یا اتصال سلسلہ کی بنا پر گھمنڈ ہے کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ایک گونہ ذاتی خصوصیت اور نسبت ہے جو معاصی وغیرہ سے قطع نہیں ہوتی اور ہم کیسے ہی ہوں مگر اس انتساب یا اتصال کے زور سے ضرور جنت میں جائیں گے۔

یہود و نصاریٰ کو قرآن کی تنبیہہ

۴۷۔ اے اہل کتاب ایسی حالت میں تمہارے پاس رسول آیا جبکہ رسولوں کا ظہور مدتوں سے بند تھا، وہ تمہارے سامنے احکام کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی رسول نہیں آیا نہ بشارت دینے والا اور نہ ڈرانے والا تو اب دیکھو ...... بشارت دینے والا اور تنبیہہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی ہمارے احکام و شرائع نہایت وضاحت کے ساتھ کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس رکوع کے شروع میں بنی اسرائیل یہود و نصاریٰ کی مختلف قسم کی شرارتوں اور حماقتوں کو بیان فرما کر یہ بتلایا تھا کہ اب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے جو تمہاری غلط کاریوں کو واضح کرتا ہے اور تم کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانا چاہتا ہے اس کے بعد اس پر متنبہ فرمایا کہ اب نور ہدایت کی طرف جانا دو چیزوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ حق تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرو اور مخلوق و خالق کے متعلق غلط عقیدے مت جماؤ لقد کفر الذین قالوا سے یہاں تک اسی جز کو بیان فرمایا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ نبی الانبیاء پر ایمان لاؤ جو تمام انبیاء سابقین کے کمالات کے جامع اور شرائع الٰہیہ کے سب سے بڑے اور آخری شارح ہیں اس جزو کا بیان اس آیت میں کیا گیا ہے۔ حضرت مسیح کے بعد تقریباً چھ سو برس سے انبیاء کی آمد کا سلسلہ منقطع تھا۔ ساری دنیا الا ماشاء اللہ جہل و غفلت اور اوہام و اہواء کی تاریکیوں میں پڑی تھی۔ ہدایت کے چراغ گل ہو چکے تھے، ظلم و عدوان فساد و الحاد کی گھٹا تمام آفاق پر چھائی ہوئی تھی اس وقت سارے جہاں کی اصلاح کے لیے اللہ نے سب سے بڑے ہادی اور نذیر و بشیر کو روانہ

کیا جو جاہلوں کو فلاح دارین کے راستے بتلاتے۔ غافلوں کو اپنے انذار و تخویف سے بیدار کرے اور پست ہمتوں کو بشارتیں سنا کر ابھارے اس طرح ساری مخلوق پر خدا کی حجت تمام ہو گئی کوئی مانے یا نہ مانے۔[1]

اس آیت کریمہ میں یہ باتیں بتائی گئی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا زمانہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اہل کتاب کو تنبیہہ کہ خدا کی حجت پوری ہو چکی۔

حضور اقدس کی تشریف آوری کے بارے میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قد جاءکم رسولنا ہمارا وہ رسول جس کی بشارتیں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں، عقیدہ جس کا تمہیں شدید انتظار ہے وہ تمہارے پاس آ چکا ہے۔ یعنی جن کے بارے میں تمہیں اللہ نے حضرت موسیٰ کی وساطت سے بتایا تھا کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے بھائیوں بنی اسماعیل میں سے ضرور ایک نبی روانہ کرے گا اور جن کے بارے میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد وہ فارقلیط ضرور آئے گا جو تمہیں ہر چیز کی تعلیم دے گا۔ بشارتیں تمہاری کتابوں میں ساری تحریفات کے باوجود موجود ہیں یہی وہ نبی کامل ہے جس کے بارے میں تمہارے آباؤ اجداد نے حضرت یحییٰ سے دریافت کیا تھا۔ انجیل میں ہے کہ یہودیوں نے کاہنوں کو حضرت یحییٰ سے یہ دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا کہ کیا آپ ہی مسیح ہیں؟ انہوں نے جواب دیا نہیں پھر پوچھا کہ کیا آپ ایلیا ہیں؟ فرمایا کہ نہیں پھر سوال کیا کہ کیا آپ وہ نبی ہیں فرمایا نہیں۔

آیت میں رسول کے لیے آنے کی تعبیر بتا رہی ہے کہ مخاطبوں کو جس کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے اور چونکہ انتظار اہل کتاب کو تھا اس لیے مخاطب ان کو ہی کیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے وہ رسول جن کی آمد آمد تم اہل کتاب مدت سے سن رہے تھے وہ آ گئے۔

زمانہ فترت

دوسری بات کہ حضور انور کی تشریف آوری کا زمانہ کیا ہے۔ قرآن میں اس کے لیے علی فترۃ من الرسل کی تعبیر اختیار کی ہے فترۃ کے لغوی معنے کام کے رک جانے اور بند ہونے کے ہیں اسی سے اردو میں فتور بولا جاتا ہے۔ اصطلاح میں دو نبوتوں کے درمیانی عرصہ کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا درمیانی وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا ہے حضور کا سال ولادت ۵۷۰ء ہے اور سال بعثت ۶۱۰ء۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اس دور میں آتے ہیں جبکہ دنیا میں سلسلہ وحی کو بند ہوتے چھ صدیاں گزر گئی تھیں۔ اس وقت دنیا میں نیکی و سعادت کا جغرافیہ کیا تھا۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں مفتی محمد عبدہ مصری کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن زیادہ خوبصورت اور کامل نقشہ وہ ہے جس کی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ماقبل اسلام کی اس صورت حال کی پوری تصویر کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامان آرائش میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہل ہنر اور اہل کمال جمع ہو گئے تھے۔ جو اس سامان آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے رہتے، اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو، یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظام تمدن میں سرایت کر گیا تھا پھر ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی

محفوظ نہیں رہا تھا ہر شہری پر یہ پر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اسی کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و انکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا، بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشت کاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آب پاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا ہے اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی۔ اس پر مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادت اخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ اس ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے، اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کبھی کچھ روشنی نظر آ جاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے۔ یہ صحیح علم اور صحیح عمل اتنا نایاب تھا اور خدا کا سیدھا راستہ بتلانے والے اس قدر خال خال پائے جاتے تھے کہ ایران کے بلند ہمت اور بے چین طبیعت نوجوان سلمان فارسی کو جو اپنے قومی و نسلی مذہب (مجوسیت) سے غیر مطمئن و مایوس ہو چکا تھا اور حق و صداقت کا جویا تھا۔ ایران سے لے کر شام کی آخری حدود تک اپنے طول و طویل سفر میں صرف چار آدمی ایسے مل سکے جن سے اس کی روح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوا اور جو پیغمبروں کے بتلائے ہوئے راستہ پر قائم تھے۔

اسی عالمگیر بے راہ روی تاریکی کا نقشہ قرآن نے یہاں علی فترۃ من الرسل کے مختصر لفظوں میں

جس طرح کھینچا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام

آپ کے مقام کو ظاہر کرنے کے لیے اس آیت میں آپ کے تین وصف بیان کیے ہیں۔ ایک تبیین اور دوسرے بشارت اور تیسرے انذار۔ یہاں رسول کو بطور منصب پیش کیا ہے اور ان تین اوصاف کو بطور مقام ظاہر کیا ہے۔ منصب نام ہے عہدے کا اور مقام کہتے ہیں کام کی ذمہ داری کو۔ یہاں پیغمبر کی اولین ذمہ داری یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بیان کرتا ہے کیا بیان کرتا ہے اس کو عمومیت کی خاطر حذف کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغمبر وہ سب کچھ بیان کرتا ہے جس کی تمہیں ضرورت ہے عقائد، اعمال، اخلاق اور آداب اور احوال سب کچھ بیان کرتا ہے۔ گویا یبین لکم کے ذریعے نبوت کے دنیا میں آنے کی غرض بتائی گئی ہے کہ نبوت تمہارے سامنے اللہ کی بندگی اور پرستش کے وہ سارے ضوابط اور قوانین بیان کرے جن کی تمہیں ضرورت ہے۔ رسول دین و شریعت کے نام لوگوں کے سامنے جو کچھ بیان کرتا ہے وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ کوئی بات بھی آپ کے اپنے جی کی نہیں ہوتی ہے۔ نبی کے بیان کے اللہ کی جانب سے ہونے کا مطلب ذرا وسیع ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ سبحانہٗ اپنے احکام متعین لفظوں میں خود براہ راست یا فرشتہ کے ذریعے سے نبی کو بتائے اور نبی لوگوں کے سامنے بیان کرے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی کو جو احکام بتائے گئے ہیں ان ہی کو سامنے رکھ کر نبی اجتہاد کرے اور اللہ کی مرضیات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان سے مزید احکام نکال کر بیان کرے۔

گویا پہلی قسم کی تعلیمات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا اصلاً اور براہ راست ہوتا ہے اور دوسری قسم کی تعلیمات کا اللہ کی طرف سے ہونا نبی کے اجتہاد کے ذریعے ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نبی کا بیان ہوتا ہے۔

اہل کتاب کو تنبیہ

اس میں ان تقولوا ما جاءنا فرما کر اہل کتاب کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنی کتاب کی جن چیزوں کو تم نے چھپایا یا ضائع کر دیا ان سب کو واضح اور خدا کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہوا ہمارا رسول تمہاری طرف آیا ہے۔ اب تمہارے پاس اپنی گمراہی پر جمے رہنے کے لیے یہ عذر بھی باقی

نہیں رہا کہ پہلے رسولوں کی بعثت پر ایک زمانہ گزر گیا اور تم ایک نذیر و بشیر کے محتاج تھے۔ تمہارے اس عذر کو ختم کرنے کے لیے ہم نے نذیر و بشیر روانہ کیا۔ اب اس اتمام حجت کے بعد بھی تم نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کو بے بس ہستی نہ سمجھنا وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل کتاب کا یہ عذر کوئی قابل لحاظ عذر نہیں تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر آخری حجت پوری کر دی۔

یہ آیت اس فکری گمراہی کے خلاف کھلا چیلنج ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں۔ سبھی خدا تک پہنچانے والے ہیں۔ ایک یہودی حضرت موسیٰ کی شریعت پر عمل کرتا ہوا ایک عیسائی حضرت کو مانتا ہوا نجات یافتہ ہے چاہے وہ حضور انور کو نبی نہ مانے۔ قرآن کی اس آیت نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو ماننے کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننا اور ان کی پیروی کرنا شرطِ نجات ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ یہودی اور عیسائی سب سچے ہیں تو اس کا بالکل منطقی نتیجہ یہ تھا کہ قرآن یہود و نصاریٰ کو حضور اقدس پر ایمان لانے کی دعوت نہ دیتا بلکہ قرآن ان سے یہ کہتا کہ تورات و انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ قرآن نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی نبوت محمدیہ کی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا ہے جیسا کہ دوسروں کے لیے قرار دیا تھا۔

نہ صرف یہ کہ قرآن نے نبوتِ محمدیہ کو ماننے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے نبوت محمدیہ کو قبول نہیں کیا انہیں صاف صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی قرار دیا۔ غرض قرآن عزیز اہل کتاب کے انکارِ اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دیتا ہے جو مشرکوں کے انکار کو دیتا ہے۔ اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بتاتے ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب کے لیے ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اس آیت کی دھمکی پر غور فرمایئے آخر میں اس دھمکی کو پُر زور بنانے کے لیے فرمایا واللہ علی کل شیئ قدیر یعنی تم اگر اس پیغمبر کی بات نہ مانو گے تو خدا کی قدرت ہے کہ کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے جو اس کے پیغام کو پوری طرح قبول کرے گی اور پیغمبر کا ساتھ دے گی خدا کا کام کچھ تم پر موقوف نہیں ہے۔ [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بلکہ اس موقع پر یہ فقرہ نہایت بلیغ و لطیف ہے اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خدا بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بھیجنے پر قادر ہے اسی نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خدمت پر مامور کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس بشیر و نذیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو اللہ قادر و توانا ہے، ہر سزا جو وہ تمہیں دینا چاہے بلا مزاحمت دے سکتا ہے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَٰقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ
فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ
الْعَالَمِينَ ۝ يَٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ
لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝ قَالُوا يَٰمُوسَىٰ
إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن
يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ۝ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ
أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ
غَالِبُونَ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا
يَٰمُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ
فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي
وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ قَالَ فَإِنَّهَا
مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا
تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝

اور اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا لوگو
اللہ کا اپنے اوپر یہ احسان یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء بنائے اور
تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا تھا جو دنیا میں کسی کو نہیں
دیا[20]۔ لوگو! مقدس سرزمین میں جسے اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرما
دیا ہے داخل ہو جاؤ اور الٹے پیچھے نہ پلٹو کہ نقصان اٹھاؤ گے[21]۔
لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے
لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں۔ جب تک وہ لوگ
وہاں موجود ہیں، ہم اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے، ہاں
اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے[22]۔
اس پر ان ڈرنے والوں میں سے ان دو آدمیوں نے کہا جن کو خدا
نے انعام سے نوازا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے دروازے میں
داخل ہو جاؤ، جب تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارے لیے
ہوگا اگر ایمان والے ہو تو اللہ ہی پر توکل کرو[23]۔ وہ بولے اے

موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں تم خود جاؤ اور تمہارا رب ہی تمہارے ساتھ ہو اور دونوں ان سے جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے"۔ حضرت موسیٰ نے کہا خدایا مجھے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں ہے لہٰذا تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں فیصلہ کر دے"۔ اللہ کا حکم ہوا کہ اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی ہے یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے لہٰذا اے موسیٰ تو ان نافرمانوں پر غمزدہ نہ ہو۔"[۷۹]

اسرائیلی تاریخ کے ایک واقعہ سے استشہاد

یہود کے ابتدائی تاریخ کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ایک طرف تو یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ یہ قوم ابتدا ہی سے خدا کے عہد اور اس کے حقوق و فرائض کے معاملہ میں نہایت بودی اور نکمی رہی ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ نے ابتداء ہی سے اس کی بدعہدیاں اور نالائقیوں پر اس کو سزا بھی ہمیشہ عبرتناک دی ہے۔ اور ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ جب ایک قوم عرصہ تک غلامی کی حالت میں رہتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کے لیے جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی وہ غلامی کا امن پسند کرتی ہے اگرچہ ذلت و نامرادی کے ساتھ ہو اور مقاصد کی جدوجہد

سے بھی چرانے لگتی ہے اگرچہ اس کا نتیجہ کامرانی و اقبال ہو۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا۔ مقاصد امور کے لیے ان میں عزم و ہمت نہ تھی۔ بزدلی اور بے طاقتی نے ان کے قدم بگاڑ دیے تھے۔ واقعہ کی تفصیلات بائیبل کی کتاب گنتی، استثنا اور یشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے دشت فاران سے بنی اسرائیل کے بارہ سرداروں کو فلسطین کا دورہ کرنے کے لیے روانہ کیا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انہوں نے قوم کے مجمع عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوتے ہیں وہ بڑے زورآور ہیں ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں۔ وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قدآور ہیں۔ اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈی ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ یہ بیان سن کر سارا مجمع چیخ اٹھا کہ اے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے یا کاش اس بیابان میں ہی مرتے۔ خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنا لیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ اس پر ان بارہ سرداروں میں سے جو فلسطین کے دورے پر گئے تھے دو سردار یوشع اور کالب اٹھے اور انہوں نے اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا چلو ہم ایکدم جا کر اس ملک پر قبضہ کر لیں کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں۔ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سو ان کا خوف نہ کرو مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ انہیں سنگسار کر دو، آخر کار اللہ نے فیصلہ فرما دیا کہ اچھا اب یوشع اور کالب کے سوا اس قوم کے بالغ مردوں میں سے کوئی بھی اس زمین میں داخل نہ ہونے پائے گا۔ یہ لوگ چالیس برس تک بے خانماں پھرتے رہیں گے یہاں تک کہ جب ان میں سے بیس برس سے لے کر اوپر کی عمر کے سب مرد مر جائیں گے اور نئی نسل جوان ہو کر اٹھے گی تب ان کو فلسطین فتح کرنے کا موقع ملے گا چنانچہ اس خداوندی فیصلہ کے مطابق بنی اسرائیل کو دشت فاران سے شرق اردن تک پہنچتے پہنچتے پورے ۴۰ سال لگ گئے۔ اس دوران میں وہ سب مر گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے شرق اردن کی فتح کے بعد حضرت موسیٰ کا وصال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت یوشع نے فلسطین فتح کیا۔

۲۰ ؎ ۔ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا لوگو! اللہ کا اپنے اوپر احسان

یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاءؑ بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔
یعنی تمہارے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم سے لے کر آج تک جتنے نبی تم میں پیدا کیے۔ مثلاً حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور خود حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام پھر ان کے بعد بھی یہ سلسلہ مدت دراز تک قائم رہا۔ یہ تو نبوت کا انعام ہوا اور بادشاہی کا انعام یہ کہ فرعونیوں کی ذلیل ترین غلامی سے آزادی دلا کر ان کے اموال واملاک پر قابض کیا اور اس سے پہلے تم ہی میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزائن اور سلطنت پر کیسا تسلط عطا فرمایا۔ پھر مستقبل میں بھی حضرت سلیمان وغیرہ نبی اور بادشاہ پیدا کیے گویا دین اور دنیا دونوں کی اعلیٰ نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا۔ کیونکہ دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب نبوت اور دنیوی اقبال کی آخری حد آزادی اور بادشاہت ہے۔ یہ دونوں چیزیں مرحمت کی گئیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اللہ نے تمہیں وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا تھا یعنی اس وقت جب موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرما رہے تھے۔ بنی اسرائیل پر تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ اللہ کی نوازشیں ہو رہی تھیں اور اگر احدا من العالمین کو عموم پر حمل کیا جائے تو اس لیے صحیح نہیں ہے کہ امت محمدیہ کی نسبت خود قرآن حکیم میں تصریح ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس اور کذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس[1]

یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے تقریر کی۔ تقریر میں دو اہم اور بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں ایک یہ کہ تم پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ بے مثال ہوا ہے اور تمہیں وہ کچھ عطا ہوا ہے جو کسی کو نہیں ہوا ہے۔ یہ تقریر کس موقع پر ہوئی اور کب ہوئی؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ اس تقریر کا وہ زمانہ ہے جب بنی اسرائیل مصریوں کی غلامی و محکومی سے آزاد ہو کر جزیرہ نما سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ تازہ ترین تاریخی اور اثری تحقیق کے مطابق مصر سے خروج بنی اسرائیل کا زمانہ ۱۴۴۰ء قبل مسیح کا ہے اور فلسطین پر فوج کشی کا زمانہ ۱۴۰۰ء قبل مسیح کا۔ اس لحاظ سے حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے۔ یہ تقریر حضرت موسیٰ نے دشت فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کے لیے ابھارا ہے۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۳، ۱۴ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے ہوتے جب حضرت موسیٰ دشت فاران میں پہنچے ا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فلسطین کا علاقہ قریب آیا۔ آپ نے ۱۲ سرداروں کی ایک پارٹی کو علاقہ کے حالات دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ پارٹی اپنی مہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقے کی زرخیزی و شادابی سے متعلق تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قد و قامت اور ان کی زور آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ یہی موقع ہے جب حضرت موسیٰ نے تقریر فرمائی اور فرمایا کہ لوگو اللہ کا اپنے اوپر انعام یاد کرو کہ اس نے کیسی کیسی نعمتوں سے تمہیں نوازا ہے اس نے تم میں نبی پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔

انبیا کا مشن اور اقتدار

نبوت اور حکومت کو جمع کر کے نعمت کہا گیا ہے یعنی اللہ کا تم پر احسان عظیم یہ ہے کہ نبوت اور بادشاہت دونوں تمہارے لیے جمع فرما دی ہیں۔ اس ارشاد میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے جو کہتے ہیں کہ دین سے سیاست کا رشتہ زیادہ سے زیادہ ثانوی درجہ کا ہے۔ دین میں سیاست کو کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے نہ حکومت دین کے لیے کچھ ناگزیر ہے۔ ناگزیر ہونا تو دور رہا وہ اس کے لیے مطلوب بھی نہیں ہے نہ اس کے لیے کوشش کرنا دین کے پیرووں کی کوئی دینی ذمہ داری ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس مشن پر مامور ہوتے تھے وہ آخری عملی شکل کے لحاظ سے ایک دینی حکومت کا قیام ہی ہوتا تھا کیونکہ اقتدار حکومت کے بغیر جس طرح آج اسلام نہیں رہ جاتا اور دین خدا پورا عمل نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی بھی نبی کے زمانے میں نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ہر دور کے دین خداوندی کی نظر اس بات پر لازماً ہونی چاہیے کہ معاشرے کا اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان انبیاء میں سے بہتوں کے ساتھ حالات نے سازگاری نہ کی ہو اور اس لیے ان کی دعوتی جدوجہد کے نتائج اس حد کمال کو نہ پہنچ پاتے ہوں لیکن ظاہر ہے کہ کسی دعوت کا اس حد کمال تک نہ پہنچنا اور بات ہے اور اس چیز کا حد کمال نہ ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ نبوت کی دعوت کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اس میں اس بات کا تذکرہ تو ضرور ملتا ہے کہ ان میں سے اکثر سیاسی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ ایسا ہی چاہتے تھے۔ بلاشبہ ہر نبی کی دعوت کا اساسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی تھا۔ لا حاکم الا اللہ نہ تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم میں لا حاکم الا اللہ بھی

شامل ہے اور الوہیت کا ایک جزء حاکمیت بھی ہے۔ یعنی یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، یہ معنے بھی رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ الٰہ کو صرف حاکم سمجھنا ضرور غلط بات ہے مگر اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اللہ کے اصل مفہوم میں حاکمیت کا تصور بھی نہ مانا جائے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ کسی نبی نے اپنی دعوت ان لفظوں میں ہرگز نہ دی تھی کہ لوگو اللہ کی حکومت قائم کرو، کیونکہ اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں بلکہ ہر نبی کے الفاظ یہ ہی تھے کہ اعبدوا اللّٰہ مالکم من الٰہ غیرہ، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان الفاظ کے مفہوم میں ان لفظوں کا مفہوم بھی اپنی پوری اہمیت کے ساتھ شامل نہیں ہے کیونکہ یہ بات اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ عبادت کا مفہوم پرستش تک محدود ہو لیکن جب امر واقعہ یہ ہے کہ عبادت کے مفہوم میں پرستش اور بندگی دونوں موجود ہیں تو ان احکام دین کی پیروی کو عبادت سے کسی طرح خارج قرار نہیں دیا جا سکتا ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی آخری کڑی سیاست اور حکومت کے احکام ہوتے ہیں۔ اور جب ان احکام کی پیروی بھی عبادت ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انبیاء کی جو اصل دعوت تھی اس کے عین مفہوم ہی میں سیاسی احکام کی پیروی کا تصور بھی لازماً موجود تھا۔

بہرحال اس آیت میں نبوت اور حکومت کو اپنا انعام بتایا گیا ہے اور حضرت موسیٰ نے اپنی تقریر کا آغاز ان دو نعمتوں کے تذکرہ سے کیا ہے۔

ایک تعبیری نکتہ

ذکر تو نبوت اور حکومت دونوں کا کیا ہے مگر انداز بیان اور تعبیر اس انوکھے طرز کی ہے کہ دونوں میں جوہری فرق بتا دیا گیا ہے۔ نبوت کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی کہ جعل فیکم انبیاء تم میں انبیاء بنائے لیکن حکومت و اقتدار کے لیے انداز یہ اختیار کیا وجعلکم ملوکا تم کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ تم میں اور تم کے انداز سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ نبوت ایک مرتبہ اختصاص ہے صرف وہ نبی ہوتا ہے جسے اللہ سبحانہٗ اس منصب پر فائز فرماتا ہے۔ اس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس حکومت ایک منصب اشتراکی اور اجتماعی ہے جس میں بادشاہ کے ساتھ اس کی پوری قوم شریک ہوتی ہے اگر کسی حکومت میں قوم شریک نہ ہو تو وہ استبداد اور مطلق العنانی ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اس تقریر میں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو جن دو نعمتوں کی یاد دہانی کرائی ہے ان کا تعلق اس وقت بنی اسرائیل کے ماضی سے ہے یا مستقبل سے۔ ہماری رائے میں یہ مستقبل کے بارے میں وعدہ ہے اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سے کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے ان وعدوں کو دھیان میں رکھ کر ہمت کرو۔ اللہ کے جو وعدے مستقبل سے متعلق ہوتے ہیں بسا اوقات ان کو ماضی کے صیغوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وعدوں کی قطعیت کے اظہار کا ایک بلیغ انداز ہے۔ قرآن میں یہ اندازِ بیان بہت زیادہ اختیار کیا گیا ہے گویا یہ وعدے محض وعدے نہیں بلکہ واقعات ہیں جو واقع ہو چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ سے پہلے اگرچہ بنی اسرائیل میں بعض انبیاء مبعوث ہو چکے تھے لیکن نبوت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کے بعد شروع ہوا جو حضرت مسیح کی بعثت تک جاری رہا ہے۔ بادشاہوں کے سلسلے کا تعلق تمام تر حضرت موسیٰ کے بعد ہی کے دور سے ہے۔ اس سے پہلے خاندان کے بزرگوں کو ایک قسم کی سیادت ضرور حاصل رہی ہے لیکن اسے بادشاہی نہیں کہہ سکتے۔ تورات میں بھی اسے بادشاہی سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے۔ جن شارحین قرآن کی نظر اس نکتہ پر نہ تھی انہوں نے لفظ ملوک کی تاویل کی اور بتایا کہ ملوک ملک کی جمع ہے اور ملک وہ ہے جو آزاد، خود مختار اور صاحب حیثیت ہو حالانکہ یہاں بات ماضی کی نہیں بلکہ مستقبل کی ہو رہی ہے۔

آخری فقرہ وآتاکم مالم یؤت احدا من العالمین کی نشست بھی اپنی جگہ بالکل درست ہو جاتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا۔ یعنی نبوت اور بادشاہت دونوں تم میں جمع ہو گئیں۔ جن لوگوں نے اس کا پیوند ماضی سے جوڑا ان کو اس فقرے کے مطلب متعین کرنے میں گوناگوں پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد وہ منصب امامت و شہادت بحق ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مامور فرمایا تھا۔ کسی نے بتایا کہ اس سے توحید کی نعمت مراد ہے کوئی بولا یہ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اس عظمت گزشتہ کی طرف جو حضرت موسیٰ سے پہلے ان کو کسی زمانے میں حاصل تھی۔ کسی نے یہ نکتہ آفرینی کی کہ تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا اور تمہارے سامنے تمہارے دشمن کو دریا برد کر دیا۔ پھر آیت کی یہ تشریح کرنے کے بعد یہ دشواری سامنے آ گئی کہ اگر بنی اسرائیل کو یہ تمام دے دیا جائے تو پھر اُمت محمدی کے لیے کون سا "تمغہ" باقی بچے گا حالانکہ پورا کیس ہی سرے سے غلط ہے یہاں

مقابلہ تو اس دور کی قوموں اور نسلوں سے ہو رہا ہے نہ کہ اُمت سے۔ بے شک بنی اسرائیل اپنے زمانہ کی قوموں اور نسلوں میں یہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اُمت محمدیہ کسی نسل یا قوم کا نام نہیں ہے۔

جہاد کے لیے حضرت موسیٰ کی تقریر

۲۴ے۔ لوگو! مقدس سرزمین میں جسے اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرما دیا ہے، داخل ہو جاؤ اور الٹے پیچھے نہ پلٹو کہ نقصان اٹھاؤ گے۔ خدا نے پیشتر حضرت ابراہیم سے وعدہ فرمایا تھا کہ تیری اولاد کو یہ ملک دوں گا وہ وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کے ہاتھوں پر پورا ہو اور جہاد فی سبیل بزدلی، پست ہمتی نہ کھاؤ کہ اس سے دوبارہ غلامی کی طرف پلٹ جاؤ گے[1]

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا حوالہ ہے جو انہوں نے دشت فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملے کے لیے ابھارا ہے۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۲، ۱۴ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے ہوئے جب حضرت موسیٰ دشت فاران میں پہنچے اور فلسطین کا علاقہ قریب آیا تو چونکہ یہی علاقہ منزل مقصود تھا۔ اس وجہ سے اپنے بارہ سرداروں کی ایک پارٹی علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی۔ یہ پارٹی اپنی مہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقہ کی زرخیزی و شادابی سے متعلق تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قدو قامت اور ان کی زور آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ بیان سنتے ہی انہوں نے واویلا شروع کر دیا اور جس ملک پر قبضہ کرنے کی امنگیں لیے ہوتے یہاں تک پہنچے تھے اس پر قبضہ کرنا تو درکنار پھر مصر پلٹ جانے کی باتیں کرنے لگے اور یہ بات انہیں یاد ہی نہیں رہی کہ خدا نے ان کو اس ملک کی میراث دینے کا قسم کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے۔

یہی موقع ہے جب حضرت موسیٰ نے یہ تقریر فرمائی ہے۔ قرآن نے اگرچہ تقریر کا صرف خلاصہ دیا ہے اس لیے مقصود بالاجمال واقعہ کی طرف صرف اشارہ کرنا ہے۔ تاہم وہ سارے پہلو اس میں موجود ہیں جو اس موقعہ پر حوصلے کو بحال کرنے اور پست حوصلگی کے انجام بد سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری تھے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آیت میں ارضِ مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے۔ اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت اسحاق نے اللہ کے دین کی دعوت کا کام کیا۔ یہ علاقہ اگرچہ بعد میں کافروں اور بت پرستوں کے قبضے میں آگیا تھا لیکن توحید اور خدا پرستی کی اذان چونکہ سب سے پہلے اسی علاقے میں گونجی تھی۔ اس وجہ سے اس کو ارضِ مقدس سے تعبیر کیا۔ مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی علاقے کو بنی اسرائیل کی میراث قرار دیا اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر ان سے وعدہ کیا کہ میں نے یہ علاقہ تم کو دیا۔ تورات میں ان وعدوں کی صراحت موجود ہے۔ مثلاً استثنا میں ہے کہ

> دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عنایت کی، داخل ہو اور اس سرزمین کو جس کی بات خداوند نے تمہارے باپ دادوں ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا میراث میں لو۔ ۱-۸-
>
> تو اس زمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں ابرہام، اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا کہ اسے میں تمہیں دوں گا سکونت کرے۔ ۳۰-۲۰-
>
> مضبوط ہو جاؤ اور دلاور ہو جاؤ، خوف نہ کھاؤ اور ان سے مت ڈرو، کیونکہ خداوند تیرا خدا وہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے وہ تجھ سے غافل نہ ہوگا اور تجھ کو نہ چھوڑے گا۔ ۳۱-۶-

اس بنا پر کتب اللہ لکم کا مطلب یہ ہے کہ جس سرزمین کا تمہارے لیے اللہ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ فرمایا ہے وہ تمہارے لیے علمِ الٰہی میں مقدر ہو چکی ہے ذرا سی ہمت اور کوشش کرو تو یہ تمہیں مل سکتی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ الٹے پیچھے نہ پلٹو کہ نقصان اٹھاؤ گے۔ اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ توحید عدل و ہدایت کی دعوت میں لے کر آیا ہوں اس سے ہٹ کر بت پرستی اور ملک میں شورش اختیار نہ کرو کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں نقصان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے موقع پر نامردی اور بزدلی کا مظاہرہ نہ کرو، اس میں سرتاسر تمہارا خسارہ ہے۔ جب ایک قوم عرصہ تک غلامی کی حالت میں رہتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کے لیے جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ وہ غلامی کا امن پسند کرنے لگتی ہے۔ اگرچہ ذلت و نامرادی کے ساتھ ہو اور مقاصد کی راہ میں جدوجہد سے جی چرانے لگتی ہے اگرچہ اس کا نتیجہ کامرانی و اقبال ہو۔

خسارہ بھی دو قسم کا ہے ایک دنیوی اور دوسرا اخروی۔ دنیوی خسارہ یہ ہے کہ ارض مقدس سے محروم ہو جاؤ گے اور اخروی خسارہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں محنت کرنے کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاؤ گے۔ یہاں دونوں کا احتمال ہے۔

جہاد سے گریز پائی

۲۲۔ لوگوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں جب وہ لوگ وہاں موجود ہیں۔ ہم اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ زبردست یعنی بہت قوی ہیکل تنومند اور پُر ہیبت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم میں ان سے مقابلہ کی ہمت نہیں ہے۔ ہاں بدون ہاتھ پاؤں ہلاتے پکی پکائی کھالیں گے۔ اب معجزے کے زور سے ان کو نکال دیں بلکہ

یہ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا جو پہلے گزر چکی ہے بنی اسرائیل کی طرف سے جواب ہے کہ جب اس ملک پر ایسے عظیم الجثہ اور قد آور لوگ قابض ہیں تو ہم ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں، البتہ اگر قدرت کے کسی ایسے معجزے کے ذریعے سے جیسے تم اب تک ہمیں دکھاتے رہے ہو یہ لوگ اس علاقے سے نکل جائیں تو پھر ہم اس علاقہ پر قابض ہونے کے لیے تیار ہیں۔

جن کو یہاں جبار کہا ہے یہ عمالقہ کی قوم تھی جو ایک بڑی زور آور اور جنگ آزما قوم تھی۔ بنی اسرائیل کی پرانی حریف، تورات اور تاریخ اسرائیل اس کی خون ریزیوں کی داستان سے اٹی پڑی ہے تورات میں اس قوم کا چہرہ بنی اسرائیل کی زبانی یہ بتایا ہے کہ

> ہمیں زور نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔ گنتی ۱۳، ۳۲۔
>
> یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے ایک زمین ہے جو اپنے بسنے والوں کو نگل جاتی ہے اور سب لوگ جنہیں ہم نے وہاں دیکھا بڑے قد آور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کو ہاں بنی عناق کو جو جباروں کی نسل میں ہیں دیکھا۔ اور ہم اپنی نظروں میں ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے اور ایسے ہی ہم ان کی نظروں میں تھے۔
>
> (گنتی ۱۳-۳۳۔)

لہ افادات شیخ الاسلام

جبار کا لفظ بڑے ڈیل ڈول والے کے لئے بھی بولتے ہیں اور یہاں یہی مراد ہے۔ یہودی روایات میں خرافات کی حد تک ان کے قدو قامت کی درازی کا ذکر آیا ہے۔ عربی میں نخلة جبارہ ایسے لمبے تنے والے کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جس پر آسانی سے آدمی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ لحیانی نے اس کے معنے لمبائی طاقت اور بڑائی کے بتاتے ہیں۔ ازہری کہتے ہیں کہ جبار طویل عظیم اور قوی کو کہتے ہیں۔

ایمانی قوت کا فیصلہ

۲۳۔ اس پر ان ڈرنے والوں میں سے ان دو آدمیوں نے کہا جن کو خدا نے انعام سے نوازا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارے لیے ہوگا اگر ایمان والے ہو تو اللہ پر توکل کرو۔ وہ دو شخص حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوحنا تھے جو خدا سے ڈرتے تھے۔ اسی لیے عمالقہ وغیرہ کا ان کو کچھ ڈر نہ رہا۔

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید

ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

ان دونوں نے کہا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے پھاٹک تک تو چلو پھر خدا تم کو غالب کرے گا خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرے اور یہ بھی بتایا کہ اللہ پر توکل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسباب مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں۔ توکل یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کے لیے انتہائی کوشش کرے۔ پھر اس کے مثمر اور منتج ہونے کے لیے خدا پر بھروسہ رکھے۔ اپنی کوشش پر نازاں اور مغرور نہ ہو۔ باقی اسباب مشروعہ کو چھوڑ کر خالی امیدیں باندھتے رہنا توکل نہیں تعطل ہے۔[1]

اس آیت میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔ اول یہ کہ رجلان سے کون مراد ہیں دوم یہ کہ یخافون کا مفعول کیا ہے، تیسرے یہ کہ ان کی اس تقریر کا پس منظر کیا ہے؟

اس پر سارے شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ رجلان سے مراد یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ ہیں۔ تورات کا بیان بھی یہی ہے اور اسی کی پیروی میں مفسرین کا بھی یہی فیصلہ ہے الذین یخافون میں عام شارحین قرآن نے اللہ کو محذوف مان کر مطلب یہ بتایا ہے کہ یہ دو شخص جو اللہ سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے کہا، لیکن یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی ہے کیونکہ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

صرف یہی خدا سے ڈرنے والے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ خدا سے ڈرنے والی ایک جماعت تھی، اگر صورتِ حال یہی ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب قرآن نے الذین یخافون چھوڑ کر الذین یخافون کی تعبیر اختیار کی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈرنے والے سارے بنی اسرائیل تھے لیکن یخافون کے مفعول میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ خدا سے ڈرنے والے ، دوسرے یہ کہ دشمن سے ڈرنے والے ۔ میری رائے میں دوسری بات زیادہ وزنی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ سب لوگ جن کو دشمن کی قوت کا اندیشہ ستا رہا تھا ان میں سے ان دو نے اپنی ایمانی قوت کا مظاہرہ کیا جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور باوجود خوف کے انھوں نے اعلانِ حق کیا اور جرأت دکھائی ۔ یہ حقیقت ہے کہ جب پوری قوم اس طرح ہمت ہار بیٹھے جس طرح بنی اسرائیل ہار بیٹھے تو بہادر سے بہادر آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں ۔ بڑا ہی باوفا اور صداقت شعار ہے وہ شخص جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ لے جائے ۔ یوشع اور کالب کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کے سبب عہد و میثاق کی اس سورت میں قرآن نے ان کا ذکر کر کے ان کو زندہ جاوید بنا دیا تاکہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا ارادہ کریں وہ ان کے مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سو جاتیں تو جاگنے والے کس طرح جاگتے ہیں اور جب سب مر جاتے تو زندہ رہنے والے کس طرح زندہ رہتے ہیں ۔ قرآن نے یہاں بزدلوں کے اندر کے بہادروں اور مردوں کے اندر کے زندوں کو اس لیے نمایاں کیا ہے کہ بہادروں کے اندر بہادر اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آجائیں گے لیکن وہ ہستیاں بہت کمیاب ہیں جو مردوں کو زندگی بخشتی ہیں ۔ اگرچہ اسی راہ میں انھیں خود اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں ۔

ان دونوں مردانِ حق کی تقریر یہ ہے کہ ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون انھوں نے اعلان کیا کہ شہر کے پھاٹک سے ان پر چڑھائی کرو جب تم قدم اٹھاؤ گے تم ہی غالب رہو گے ۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ بندہ جب اپنا فرض ادا کرنے کے لیے جو کچھ اپنے پاس جو طاقت و قوت موجود ہے اس کو میدان میں جھونک دیتے ہیں تب اللہ ان کو مدد سے نوازتا ہے گھروں میں بیٹھ جانے والوں کی وہ مدد نہیں کرتا ۔ تورات میں ان کی تقریر ان الفاظ میں ہے :

> اور نون کا بیٹا یشوع اور یفنہ کا بیٹا کالب جو اس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے نہایت اچھا ملک ہے اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس .

میں دودھ اور شہد بہتا ہے ہم کو دے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو، وہ تو ہماری خوراک ہیں ان کی پناہ ان کے سر سے جاتی رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سو ان کا خوف نہ کرو تب ساری جماعت بول اٹھی کہ ان کو سنگسار کرو۔ (گنتی باب ۱۴، ۶-۱۰)

نبوت کے مقابلے میں بنی اسرائیل کا تمرد

ملے۔ وہ بولے اے موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل نہ ہوں گے تم خود جاؤ اور تمہارا رب بھی تمہارے ساتھ ہو اور دونوں ان سے جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے یہ اس قوم کا مقولہ ہے جو محض ابناء اللہ و احباءہٗ کا دعویٰ رکھتی تھی۔ مگر یہ گستاخانہ کلمات ان کے مستمر تمرد و طغیان سے کچھ بھی مستبعد نہیں۔[1] یہ کہنے والے عام بنی اسرائیل تھے۔ توریت میں اس موقعہ کی منظر کشی یوں کی گئی ہے۔ تب ساری جماعت چلا کر رو پڑی اور لوگ اس رات بھر روتے رہے، پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ و ہارون پر کڑکڑانے اور ساری جماعت نے انہیں کہا کہ اے کاش ہم مصر میں مر جاتے اور کاش ہم اسی بیابان میں فنا ہو جاتے، خداوند کس لیے ہمیں اس سرزمین میں لا کر تلوار سے مروانا چاہتا ہے اور ہماری جورواں اور بچے پکڑے جائیں۔ (گنتی ۱۴-۱-۳) تب ساری جماعت نے چاہا کہ ان پر یعنی یوشع اور کالب پر پتھراؤ کرے۔ (گنتی ۱۴-۱۰)

ظاہر ہے کہ جن کی بزدلی کا یہ عالم ہو ان کے لیے حضرت موسیٰ اور یوشع و کالب کی یہ یقین دہانی کہ خدا ہمارے ساتھ ہے تم ان سے نہ ڈرو بالکل بے سود تھی، انہوں نے یقیناً اس کے جواب میں یہی کہا ہوگا کہ خدا اگر تمہارے ساتھ ہے تو تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔

اس آیت میں جہاد کے مقابلے میں لفظ قعود لا کر بتا دیا ہے کہ جہاد کے معنی اگر محنت اور کوشش کے ہیں تو قعود کے بیٹھنا یا بیٹھ رہنا ہیں جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ان معنے میں کئی جگہ بولا گیا ہے۔ اسی کے قریب قریب جہاد کے اصطلاحی معنے یہی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی اور دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں تک کہ اس کے لیے اپنے عزیز و اقارب کی اہل و عیال کی خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا۔ اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی قوت کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو رد کرنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے پوری طرح تیار رہنا بھی جہاد ہے، اسی کے مقابلے میں لفظ قعود آیا ہے اس کے معنے بیٹھنا اور کچھ نہ کرنا ہیں۔ اس تقابل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے جب ایک قوم عرصہ دراز تک غلامی کی خوگر ہو جاتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کی خاطر جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا۔ مقاصد امور کے لیے ان میں عزم و ہمت نہ تھی۔ بزدلی اور بے طاقتی نے قدم پکڑ لیے تھے۔ جب حضرت موسیٰ نے انہیں حکم دیا کہ سرزمین کنعان میں داخل ہو جاؤ جو تمہاری موعودہ سرزمین ہے تو کہنے لگے وہاں بڑے طاقتور لوگ بستے ہیں ان کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں ہے جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم قدم نہ اٹھائیں گے۔

حضرت موسیٰ کی دُعا

۲۵ ۔ حضرت موسیٰ نے کہا خدایا مجھے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں ہے لہٰذا تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سخت دلگیر ہو کر یہ دعا فرماتی چونکہ تمام قوم کی عدولِ حکمی اور بزدلانہ عصیان کو مشاہدہ فرما چکے تھے اس لیے دعا میں بھی آپ نے اور ہارون علیہ السلام کے سوا کہ وہ نبی معصوم تھے اور کسی کا ذکر نہیں کیا۔ یوشع اور کالب بھی دونوں کے ساتھ تبعاً آگئے۔[1]

حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل سے مذکورہ بالا جواب سُن کر کسی خیر کی توقع نہ رہی اس لیے حضرت موسیٰ نے نہایت رنج و غم میں اپنے مولا سے درخواست کی کہ میرے رب میرا اپنی ذات اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی بس نہیں ہے اب تو ہمارے اور ان بدکرداروں کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اتنی طویل محنت اور اتنے عظیم معجزانہ کارناموں کے بعد بھی ان کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص بھی ہماری آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں اب تو بس اب ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ بھی فرما دے۔ ایک طرف ہم دو بھائی بے بس اور بے اختیار ہیں، اور

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری طرف یہ جم غفیر ہے ہر طرح گستاخ و نافرمان۔ یہ دُعا ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی ناکارہ قوم کی سرکشی و بغاوت اور اپنی بے بسی پوری طرح محسوس کرنے کے بعد کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تسکین کا بڑا سامان ہے جو اصلاح کی خاطر محنت کرتے ہیں لیکن نتائج سے ہمدوش نہیں ہوتے۔ قوم جب سرکشی اور نافرمانی کے لیے تل جاتی تو انبیاء تک کی محنتیں بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پھر کسی ولی، بزرگ، علامہ کی سعی اصلاح اگر ناکامیوں سے دوچار ہو جائے تو دل شکستہ کیوں ہوں۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کی دُعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔

بنی اسرائیل کو صحرا گردی کی سزا

۲۶۔ اللہ کا حکم ہوا کہ اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے لہٰذا اے موسیٰ تو ان نافرمانوں پر غمزدہ نہ ہو۔ یعنی فیصلہ کی دُعا، حسی اور ظاہری طور پر تو قبول نہ ہوئی۔ ہاں معنیً فیصلہ ہو گیا کہ وہ سب تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر حیران و سرگرداں پھرتے تھے اور حضرت موسیٰ و حضرت ہارون پیغمبرانہ اطمینان اور پورے قلبی سکون کے ساتھ اپنے منصب ارشاد و اصلاح پر قائم رہے جیسے کسی بستی میں عام وبا پھیل پڑے اور ہزاروں بیماروں کے مجمع میں دو چار تندرست اور قوی القلب ہوں جو ان کے معالجے چارہ سازی اور تفقد احوال میں مشغول ہوں۔

بنی اسرائیل اور اُمت محمدیہ

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سب قصہ اہل کتاب کو سنایا اس پر کہ تم پیغمبر آخرالزماں کی رفاقت نہ کرو گے جیسے تمہارے اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رفاقت چھوڑ دی تھی اور جہاد سے جان چرا بیٹھے تھے تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہو گی چنانچہ نصیب ہوئی ایک لمحہ کے لیے اس سامنے رکوع کو سامنے رکھ کر اُمت محمدیہ کے احوال پر غور کیجئے۔ ان پر خدا کے وہ انعامات ہوتے جو نہ پہلے کسی اُمت پر ہوتے نہ آئندہ ہوں گے۔ ان کے لیے خاتم الانبیاء سیدالرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ابدی شریعت دے کر رواز کیا۔ ان میں وہ علماء اور ائمہ پیدا کیے جو باوجود غیر نبی ہونے کے انبیاء کے وظائف کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ایسے ایسے خلفاء نبی علیہ السلام کے بعد اُمت کے قائد بنے جنہوں نے سارے جہان کو اخلاق اور اصول سیاست وغیرہ کی ہدایت کی۔

اس اُمت کو بھی جہاد کا حکم ہوا۔ عمالقہ کے مقابلے میں نہیں روئے زمین کے تمام جبارین کے مقابلہ میں۔ محض سرزمین شام فتح کرنے کے لیے نہیں بلکہ شرق و غرب میں کلمۃ اللہ بلند کرنے اور فتنہ کی جڑ اکھاڑنے کے لیے بنی اسرائیل سے خدا نے ارض مقدس کا وعدہ کیا تھا لیکن اس اُمت سے یہ وعدہ فرمایا:

وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم و لیمکنن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امناً

اگر بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام نے پیٹھ پھیرنے سے منع کیا تھا تو اس اُمت کو بھی خدا نے اس طرح خطاب کیا۔

یا ایہا الذین امنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوہم الادبار

انجام یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کے رفقاء تو عمالقہ سے ڈر کر یہاں تک کہہ گزرے کہ اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون لیکن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ سمندر کی موجوں میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو ہم اسی میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے علیحدہ نہ ہوگا۔ امید ہے کہ خدا آپ کو ہماری طرف سے وہ چیز دکھلائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، ہم اپنے پیغمبر کے ساتھ ہو کر اس کے داہنے بائیں آگے اور پیچھے ہر طرف سے جہاد کریں گے۔ خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جتنی مدت بنی اسرائیل فتوحات سے محروم ہو کر وادی تیہ میں بھٹکتے رہے اس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ کے اصحاب نے مشرق و مغرب میں ہدایت و ارشاد کا جھنڈا گاڑ دیا، رضی اللہ عنہم و رضوا ذالک لمن خشی ربہ [1]

حضرت موسیٰ کی درخواست کے مطابق اللہ سبحانہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ سرزمین مقدس کو چالیس سال کے لیے ان پر حرام کر دیا اور فرمایا کہ مدت اسی صحرا گردی میں گزار دیں گے۔ تورات میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے:-

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا، میں کب تک اس خبیث گروہ کی جو میری شکایت کرتا رہتا ہے برداشت کروں۔ بنی اسرائیل جو میرے خلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے وہ سب شکایتیں سُنی ہیں سو تم ان سے کہہ دو، خداوند کہتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم ہے کہ جیسے تم نے میرے سنتے کہا ہے میں تم سے ضرور ویسا ہی کروں گا۔ تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا جانے نہ پائے گا سوائے یفنہ کے کالب اور نون کے یشوع کے۔ اور تمہارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھہریں گے ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا وہ اس کی حقیقت کو پہچانیں گے اور تمہارا یہ حال ہوگا کہ تمہاری لاشیں اس بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں پھرتے اور تمہاری زناکاریوں کا پھل پاتے رہیں گے۔ گنتی باب ۱۴، ۲۷، ۳۴۔

ان دنوں کے شمار کے مطابق جن میں تم اس سرزمین میں جاسوسی کرتے رہے جو چالیس دن ہیں دن پیچھے ایک سال ہوگا سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھاتے رہو گے۔ تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔ میں نے جو خداوند ہوں کہا ہے کہ میں سارے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جمع ہیں ایسا ہی کروں گا اس دشت میں وہ برباد ہوں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے۔

محرمۃ علیھم کا مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر اب یہ ممکن ہی نہ ہوگا کہ ۴۰ سال سے قبل اس ارض مقدس میں داخل ہو سکیں اور جو نعمت انہیں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد فی الفور مل رہی تھی اب اس کے لیے انہیں چالیس سال انتظار کرنا ہوگا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ چالیس سال کے اندر پچھلی نسل ختم ہو جائے گی جسے مصر کی غلامانہ زندگی نے نکما کر دیا ہے اور ایک نئی نسل پیدا ہو جائے گی جس نے بیابان کی آزاد آب و ہوا میں نشوونما پائی ہوگی اور غلامانہ ذہنیت کی سمیت سے محفوظ ہوگی چنانچہ جب چالیس سال گزر گئے اور ایک نئی نسل ظہور میں آگئی تو وہ بڑھی اور موعودہ سرزمین پر قابض ہوگئی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ
اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ
اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ
لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ
مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهٗ
نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَبَعَثَ
اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ
قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ
اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝

اور اے پیغمبر ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا حال سچائی کے
ساتھ سنا دو۔ جب ان دونوں نے قبولیت کے لیے قربانی

پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول کرلی گئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں کی گئی۔ اس پر اس نے یعنی جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی کہا کہ میں یقیناً تجھے مار ڈالوں گا جس کی قربانی قبول ہوگئی تھی اس نے کہا کہ اللہ صرف متقی لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو اس پر بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹ لے اور پھر دوزخیوں میں سے ہوجائے کہ ظلم کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔ بہرحال اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کردیا اس نے اسے مار ڈالا بس وہ تباہ کاروں میں سے ہوگیا۔ اس کے بعد خدا نے ایک کوا روانہ کیا اور وہ زمین کریدنے لگا تاکہ اسے دکھاتے

کہ اپنے بھائی کی لاش کیوں کر زمین میں چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ
بول اٹھا افسوس مجھ سے اس کوے کی طرح بھی نہ ہو سکا کہ اپنے
بھائی کی لاش چھپا دیتا اس کے بعد وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوا[۹۶]۔

حسد کے لیے واقعاتی تمثیل

روئے زمین کی امامت اور قیادت کے لیے اللہ نے اُمت محمدیہ کو قبول فرمایا اور اہل کتاب کو رد کر دیا۔ بنی اسرائیل کی یہ شقاوت کہ وہ اُمت محمدیہ سے حسد میں بالکل بے لگام ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو قتل کرنے کے لیے سازش کی تھی۔ یہاں اس واقعہ کے ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کی اس سازش پر لطیف طریقے سے ملامت کرنا ہے۔ دونوں واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ سبحانہٗ نے اُمت محمدیہ کو قبولیت کا درجہ عطا فرمایا اور ان پر انے اہل کتاب کو رد کر دیا سراسر اس بنیاد پر تھی کہ ایک طرف متقیانہ سیرت تھی اور دوسری طرف فسق و فجور تھا لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ جن کو رد کیا گیا تھا اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے اور اس قصور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے وہ منصب امامت سے ہٹائے گئے تھے ان پر ٹھیک اسی جاہلیت کا دورہ پڑا جس میں آدم کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا اور اسی کی طرح وہ حسد کی آگ میں جل کر قتل کی سازشیں کرنے لگے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ حسد کرنے کے بجائے قیادت کے منصب قائم رہنے کے لیے مقدم چیز یہ ہے۔ کہ آدمی کے اندر خدا کا خوف ایسا ہو جو سخت سے سخت آزمائش میں بھی اس کے قدم راہ حق پر استوار رکھے۔ اور پھر یہ کہ امامت کے منصب سے ہٹنے کا باعث وہ فاسد جذبات ہیں جو شیطان کی انگیخت سے پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر وہ انسان کو ایسے جرائم پر آمادہ کر دیتے ہیں جو عہد الٰہی کے بالکل منافی ہوتے ہیں جس طرح اللہ کے نیک بندے پیروانِ محمد رسول اللہ عام فساد اخلاق و کردار کے باوجود متقیانہ سیرت اور اخلاق پر استوار رہے۔ انہوں نے اپنی جانوں کی پرواہ نہ کی اسی طرح اللہ کے نیک بندے ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کے

ظلم۔ تعدی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو حق وعدل کی حفاظت پر استوار رکھا اور قابیل کی دشمنی اس کو حق وعدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی یہاں تک کہ اسی حق وعدل کی حفاظت میں اس نے اپنی جان قربان کردی۔ یہاں بھی دو بھائیوں کی اولاد ہے۔ ایک طرف بنی اسماعیل ہیں، دوسری طرف اولادِ اسحاق ہے۔ بنی اسماعیل امتِ محمدیہ ہے اور اولادِ اسحاق اہلِ کتاب ہیں۔ امتِ محمدیہ عدل وحق کی علمبردار ہے اور اس کی حفاظت میں اپنی جانوں کی بازی لگا رہی ہے اور اولادِ اسحاق چڑھ رہی ہے اور ان کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہی ہے۔ قرآن واقعہ کے رنگ میں اہلِ کتاب کو ملامت کے ساتھ امتِ محمدیہ کو سمجھا رہا ہے کہ تم دنیا میں حق وعدل کے قائم کرنے آئے ہو اور اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے اس راہ کا سب سے پہلا شہید آدم کا بیٹا ہابیل ہے جس نے اپنے عمل سے بعد کی نسلوں کے لیے یہ زندہ جاوید مثال قائم کی کہ حق پر ڈٹے رہنا باطل پر زندہ رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یاایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط اور بس اہلِ کتاب کے حسد کی پرواہ نہ کرو۔ ان کے پاس قابیل کی وراثت ہے تم حق پر ڈٹے رہو کہ تم ہابیل کے کردار کے وارث ہو۔

۸۰۔ اور اے پیغمبر ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا حال سچائی کے ساتھ سنا دو۔ یعنی آدم کے دو صلبی بیٹے قابیل و ہابیل کا قصہ ان کو سنا دو، کیونکہ اس قصہ میں ایک بھائی کے دوسرے بھائی کی مقبولیت اور تقویٰ پر حسد کرنے اور اسی غیظ میں اس کو ناحق خون کرنے کے عواقب بیان کیے ہیں۔ پچھلے رکوع میں یہ بتلایا تھا کہ بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور جابروں سے قتال کرو تو خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ اب ہابیل و قابیل کا قصہ سنانا اس کی تمہید ہے کہ متقی اور مقبول بندوں کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے اور جس سے ان لوگوں کو بے انتہا تہدید وتشدید کے ساتھ منع کیا گیا تھا۔ اس کے لیے یہ ملعون ہمیشہ کیسے مستعد اور تیار نظر آتے ہیں۔ پہلے بھی کتنوں نبیوں کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے بڑے پیغمبر کے خلاف ازراہِ بغض وحسد کیسے کیسے منصوبے گانٹھ رہے ہیں۔ گویا ظالموں اور شریروں کے مقابلے سے جان چرانا اور بے گناہ معصوم بندوں کے خلاف قتل و اسر کی سازشیں کرنا یہ اس قوم کا شیوہ رہا ہے اور اس پر نحن ابناء اللہ واحباؤہ کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ اس تقریر کے موافق قابیل وہابیل کا قصہ۔ پھر اس پر من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل کہ یہ سب تمہید ہوگی۔ اس مضمون کی جو اس قصہ اور تصریح کے ختم پر فرمایا

ولقد جاءتھم رسلنا بالبینات ثم ان کثیرا منھم

بعد ذالک فی الارض لمسرفون انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ الخ [1]

اس آیت میں چند ضروری باتیں تشریح طلب ہیں۔ اول یہ کہ علیہم کی ضمیر مرجع اہل کتاب ہیں جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے اگرچہ نفس واقعہ حکمت و موعظت کے لحاظ سے عام ہے۔ جیسے یہود کے لیے سبق آموز ہے ایسے ہی مسلمانوں کے لیے بھی ہے لیکن واقعہ کی زد میں براہ راست یہود ہیں کیونکہ یہود نے اس امت کے معاملہ میں بالکل وہی طرز عمل اختیار کیا تھا جو قابیل نے ہابیل کے معاملہ میں اختیار کیا تھا جس طرح ہابیل کی عنداللہ مقبولیت سے قابیل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی، اسی طرح یہود نے جب اس امت پر ربانی نوازشیں دیکھیں تو حسد کے جنون میں ایسے بے لگام ہو گئے کہ بدبختی اور شقاوت کی آخری حدیں پھاند گئے۔

دوم یہ کہ قرآن نے جن کو ابنی آدم کہا ہے ان کا نام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن نے ان کا نام نہیں بتایا ہے۔ شارحین قرآن نے تورات کی مدد سے آدم کے ان دونوں بیٹوں کے ہابیل اور قابیل بتاتے ہیں۔ اہل عرب ان کو ہابیل اور قابیل کہتے تھے۔ قرآن نے ان کے واقعہ کے لیے نبا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ نبا کسی اہم حادثے اور واقعہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ اس آسمان کے نیچے عدل و ظلم وفاداری اور عہد شکنی، خدا خوفی اور تعدی کی کشمکش کا تاریخ انسانی میں پہلا واقعہ ہے اس لیے اس کو نبا سے تعبیر کیا ہے لیکن چونکہ واقعہ میں تاریخ کی غلط کردوں نے ہاتھ کی صفائی بھی دکھائی تھی۔ اس لیے واقعہ کے آغاز ہی میں بالحق کی قید لگا دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ واقعہ اور حقیقت ہے اور قرآن سے باہر محض داستان سرائی کے لیے جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ واقعہ اور حقیقت نہیں ہے۔ ہم یہاں اسی واقعہ کو تورات سے نقل کرتے ہیں اس کو پڑھیے اور پھر قرآن کے بیان سے مقابلہ کر کے دیکھیے تو اس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ بالحق کی قید لگانے کا مقصد کیا ہے۔

اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائن پیدا ہوا، تب اس نے کہا کہ مجھے خداوند سے ایک مرد ملا پھر قائن کا بھائی ہابیل پیدا ہوا اور ہابیل بھیڑ بکریوں کا چرواہا تھا اور قائن کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قائین اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا پھر قائین اور اس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا۔ اس لیے قائین نہایت غضبناک ہوا اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا۔ اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے پھر تو اس پر غالب آ۔ اور قائین نے اپنے بھائی ہابیل کو کچھ کہا اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے۔ تو یوں ہوا کہ قائین نے اپنے بھائی ہابل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا تب خداوند نے قائین سے کہا کہ تیرا بھائی ہابل کہاں ہے اس نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں۔ پھر اس نے کہا تو نے یہ کیا کیا تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا جس نے اپنا منہ پسارا کہ تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے جب تو زمین کو جوتے گا تو اب وہ تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہوگا۔　　　　(کتاب پیدائش باب ۴-۱-۱۲)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بالحق کی قید لگا کر قرآن نے بتا دیا کہ جو کچھ میں بتا رہا ہوں وہ واقعہ اور حقیقت ہے جس میں کوئی التباس اشتباہ نہیں، جھوٹ اور وہم کا کوئی تعلق نہیں زیادتی اور کمی کوئی نہیں ہے

تاریخی روایات میں احتیاط

اس طرح بالحق کی قید لگا کر مورخین کے لیے ایک اہم اصولی حقیقت کو فراہم کر دیا کہ روایات تاریخ کی نقل میں بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ صرف یہیں نہیں بلکہ قرآن نے ایک سے زیادہ مواقع پر اس اصول کی نشاندہی کی ہے مثلاً ان ھذا لھو القصص الحق، نحن نقص علیک نباھم بالحق۔ اس قسم کے مواقع میں قرآن کا بالحق کی قید لگانا یہ بتانے کے لیے ہے کہ نقل واقعات اور تاریخی روایات میں صداقت و واقعیت کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہیے تاریخ کی بے سند اور غیر واقعی روایات کی بنا پر دنیا میں جو مفاسد اور خرابیاں بروئے کار آئی ہیں وہ محتاج بیان نہیں مذہب کا واقعی چہرہ بگاڑنے والی چیز افسانوی روایات ہیں۔ یہودی اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مذہب، نبوت اور خدا کی کتاب تاریخیت سے بیگانہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقائق اور واقعات چھوڑ کر مذہب نام ہی عجائب و

غرائب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ سوم یہ کہ ان دونوں یعنی ہابیل و قابیل کا واقعہ تو وہی ہے جو آپ قرآن میں آگے پڑھیں گے لیکن شارحین قرآن نے دونوں کی اس قربانی کے پیش کرنے کا پس منظر بھی بتانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر رقمطراز ہیں،

دنیائے انسانی میں اضافہ کے لیے حضرت آدم کا یہ دستور تھا کہ حواء سے توام (جوڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں سے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ تھا۔ قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیر سے زیادہ خوبصورت تھی۔ قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی اس کی ہمشیر سے۔ معاملہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت آدم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی خدا تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں، جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے ارادے کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

واقعہ کا یہ پس منظر سدی نے ایک سے زیادہ صحابہ کرام مثلاً عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ سدی کے علاوہ ہمارے پاس اس واقعہ کے علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے خود سدی کا ارباب تحقیق کے یہاں کیا مقام ہے اس میں اہل علم کے خیالات اگرچہ مختلف ہیں کچھ کی ان کو حمایت حاصل ہے لیکن کچھ کی نرتے ہیں ان پر تشیع کا الزام ہے اور جوزجانی ان کو کذاب کہتے ہیں۔ اگر ان کی صداقت کا لوہا مان بھی لیا جائے تو پھر بھی آدم کے بیٹوں کا یہ واقعہ اپنی عبرت و موعظت کے لیے کسی پس منظر کا محتاج نہیں ہے۔

ہابیل و قابیل کی قربانی

۲۷۔ جب ان دونوں نے قبولیت کے لیے قربانی پیش کی تو ان دونوں میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔ یعنی آدم علیہ السلام دستور کے موافق جو لڑکی ہابیل کے نکاح میں دینا چاہتے تھے قابیل اس کا طلبگار رہا۔ آخر حضرت آدم کے اشارے سے دونوں نے خدا کے لیے کچھ نیاز کی کہ جس کی نیاز قبول ہو جائے لڑکی اسی کو دے دی جائے۔ آدم علیہ السلام کو غالباً یہ یقین تھا کہ ہابیل کی ہی نیاز قبول ہو گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آتش آسمانی ظاہر ہوئی۔ اور ہابیل کی نیاز کو کھا گئی اور یہی علامت اس وقت عنداللہ قبول کی تھی لے جمال الدین قاسمی

لے رجالات سندھ و اسلام

نے لکھا ہے کہ ہابیل کی نذر مخلصانہ تھی اس نے اپنے گلے کی بہترین بھیڑ پیش کر دی تھی وہ قبول ہو گئی۔ بڑے بھائی قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار کا ناقص حصہ پیش کیا وہ قبول نہ ہوا۔ قبولِ نیاز کی اس وقت علامت یہ تھی کہ آسمان سے آگ آ کر نذر قبول کر لیتی تھی تورات میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

قرآن کا لفظ صدقہ اور قربانی دونوں کے لیے آتا ہے جو چیز بھی اللہ کے حضور بمقصد قربِ الٰہی پیش کی جائے وہ قربان ہے یہودیوں میں کئی قسم کی قربانیں تھی۔

۱۔ وہ قربانیں جن کو گناہوں کی معافی کے لیے نذرِ آتش کیا جاتے۔ ۲۔ وہ نذرانے جو آٹے زیتون اور لوبان پر مشتمل ہوں، ۳۔ پیداوار کا تر و تازہ پھل۔ عیسائیوں میں قربان وہ شراب اور روٹی ہے جسے کاہن مقدس بنا لے۔ اصل میں عربی لفظ قربان مصدر ہے ہر وہ چیز جس کے ذریعے بطورِ نیاز اللہ کا قرب حاصل کیا جاتے قربان ہے۔ یہاں قرآن نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ ہابیل اور قابیل کو قبولیت اور عدمِ قبولیت کا پتہ کیسے چلا کیونکہ یہ وضاحت قرآن کے پیشِ نظر مقصد کے لحاظ سے غیر ضروری تھی لیکن اسرائیلی روایات کہتی ہیں کہ قبولِ نیاز کی اس وقت علامت یہ تھی کہ آتشِ آسمانی آ کر کھا جاتی اور تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر خداوند نے دی تھی۔

مدارِ قبولیت صرف تقویٰ ہے

۲۸۔ اس پر اس نے یعنی جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی کہا کہ میں یقیناً تجھے قتل کر دوں گا اور جس کی قربانی قبول ہو گئی تھی اس نے کہا کہ اللہ صرف متقی لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ قابیل یہ دیکھ کر آتشِ حسد میں جلنے لگا اور بجائے اس کے کہ مقبولیت کے وسائل تلاش کرتا غیظ و غضب میں اپنے حقیقی بھائی کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔ اس پر بھی ہابیل نے شرافت و متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ کہا کہ اگر تیری قربانی قبول نہیں ہوئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ خدا کے یہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی تقویٰ چلتا ہے۔ گویا میری نیاز جو قبول کر لی گئی اس کا سبب تقویٰ ہے تو بھی اگر تقویٰ اختیار کرے تو اللہ کو تجھ سے کوئی ضد نہیں ہے[1]

ہابیل نے ایسی اصولی بات کہی جس میں قابیل کی ہمدردی اور خیر خواہی بھی تھی کہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ پرہیزگار اور متقی کا عمل قبول کرتا ہے۔ اگر تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرتے تو تمہاری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قربانی بھی قبول ہو جاتی۔ تم نے ایسا نہیں کیا تو قربانی قبول نہ ہوئی اس میں میرا کیا قصور ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ تقویٰ میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قبول طاعت میں خشیت الٰہی کا استحضار ہو، دوسرے یہ کہ کوشش اس کی کرے کہ طاعت سے رضائے الٰہی کے سوا کچھ اور مقصود نہ ہو، تیسرے یہ کہ غیراللہ کی شرکت و آمیزش ذرا نہ ہو۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ تقویٰ سے یہاں مراد شرک سے بچنا ہے۔ لہٰذا جو شرک سے محفوظ ہو اور توحید پر قائم ہو تو جن اعمال میں اس نے صدق نیت سے کام لیا وہ مقبول ہوں گے اور جو شرک و معصیت دونوں سے بچ کر رہا وہ قبول و رحمت دونوں کا حقدار ہے۔ اس فقرے کو علمائے حق نے عبادت گزاروں اور اللہ کے دین کا کام کرنے والوں کے لیے بہت بڑا تازیانہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عامر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت رو رہے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تو عمر بھر اعمال صالحہ اور عبادات میں مشغول رہے پھر رونے کی کیا وجہ؟ فرمایا تم یہ کہتے ہو اور میرے کانوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گونج رہا ہے انما یتقبل اللّٰہ من المتقین مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری عبادت قبول بھی ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میرا کوئی عمل اللہ تعالیٰ قبول فرمالیا تو یہ وہ نعمت ہے کہ ساری زمین کا سونا بن کر اپنے قبضہ میں آجاتے تو بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھوں۔ ایسے ہی حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں کہ اگر یہ بات یقینی طور پر طے ہو جاتے کہ میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہو گئی تو میرے لیے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص کو خط میں یہ نصائح لکھیں کہ:

میں تجھے تقویٰ کی تاکید کرتا ہوں جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ اور اہل تقویٰ کے سوا کسی پر رحم نہیں کیا جاتا اور اس کے بغیر کسی چیز پر ثواب نہیں ملتا۔ اس بات کا وعظ کہنے والے تو بہت ہیں مگر عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے اور جو عمل مقبول ہو جاتے وہ چھوٹا کیسے کہا جا سکتا ہے۔[1]

---

[1] معارف ص ۳۸۹

ہابیل کا عظیم کردار

۲۸۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو اس پر بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

> اگر کوئی ناحق کسی کو مارنے لگے اس کو رخصت ہے کہ ظالم کو مارے اور اگر صبر کرے تو شہادت کا درجہ ہے۔

اور یہ حکم اپنے مسلمان بھائی کے مقابلے میں ہے ورنہ جہاں انتقام و مدافعت میں شرعی مصلحت اور ضرورت ہو وہاں ہاتھ پیر کو توڑ کر بیٹھنا جائز نہیں ہے مثلاً کافروں اور باغیوں سے قتال کرنا، والذین اذا اصابھم البغی ھم ینتصرون۔ آخر میں فرمایا کہ انی اخاف اللہ مطلب یہ ہے کہ میں تجھ سے ڈر کر نہیں بلکہ اللہ سے ڈر کر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک شرعاً گنجائش ہے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین نہ کروں۔ ایوب سختیانی فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھلایا۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اپنا گلا کٹوا دیا لیکن اپنی رضا سے کسی مسلمان کی انگلی نہ کٹنے دی[۱]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مدافعت نہ کروں گا۔ یہ ہے کہ تو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا تو میرے قتل کی تدبیریں کرنا چاہے تو تجھے اختیار ہے لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے یہ کوشش نہ کروں گا کہ میں پہلے ہی تجھے مار ڈالوں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملہ کی مدافعت نہ کرنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میرے قتل کے درپے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری گھات میں لگا ہوا ہے تب بھی میں اس کے قتل کی فکر نہ کروں اور اسی بات کو ترجیح دوں کہ ظالمانہ اقدام اس کی طرف سے ہو نہ کہ میری طرف سے ہو۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السلام کے اس نیک بیٹے نے کہی[۲]

---

[۱] افادات شیخ الاسلام [۲] تفہیم القرآن

یہ بات یہاں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ میدان جنگ میں مقابلے کی صورت نہیں ہے بلکہ بھائی کا بھائی سے معاملہ ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس صورت میں صحیح مومنانہ رویہ یہی ہے کہ آدمی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی بھائی قتل کے درپے ہے اس کے قتل کے لیے پہل نہ کرے لیکن پہل نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنا بچاؤ بھی نہ کرے۔ ہابیل نے پہل کرنے کی نفی کی ہے بچاؤ کی نفی نہیں کی۔ اپنی جان یا اپنے مال کی مدافعت خوف خدا کے منافی نہیں ہے۔
ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر شخص مجھ سے میرا مال چھیننا چاہتا ہے تو میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کروں۔ ارشاد ہوا کہ اس کو خدا کا خوف دلاؤ سائل نے کہا اگر وہ خدا کا خوف نہ مانے ارشاد ہوا کہ اپنے گردوپیش کے مسلمانوں سے اس کے مقابلے کے لیے مدد چاہو۔ سائل نے کہا کہ اگر میرے اردگرد ایسے لوگ نہ ہوں ارشاد ہوا کہ پھر حکومت سے مدد چاہو سائل نے کہا کہ اگر حکومت کے ذمہ دار بھی دور ہوں، ارشاد ہوا اپنے مال کی حفاظت کے لیے لڑو تا انکہ اپنے مال کو بچا لو یا شہید ہو جاؤ[1]

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم جیسا کہ دھمکی دے رہے ہو میرے قتل کے لیے اقدام کرنا چاہتے ہو تو میں یہ فرض کر کے کہ تم میرے قتل کے درپے ہو تمہارے قتل میں پہل کرنے والا نہیں ہوں میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

یہاں مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی کی وہ حدیث قابل تنقید ہے جس میں سعد بن ابی وقاص نے دربار نبوت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ اس معاملہ میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص میرے گھر میں گھس آئے اور مجھے قتل کرنے کے لیے دست درازی کرے تو میں کیا کروں؟ فرمایا کہ ابن آدم ہابیل کا کردار پیش کر اور آپ نے یہ آیت گرامی تلاوت کی۔

بار گناہ پہل کرنے والے پر ہے

۲۹۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹ لے اور پھر دوزخیوں میں سے ہو جائے کہ ظلم کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔ یعنی میرے قتل کا گناہ بھی اپنے دوسرے گناہوں کے ساتھ حاصل کرے۔ ابن جریر نے مفسرین کا اجماع نقل کیا ہے کہ باثمی کے معنے یہی ہیں۔ باقی جنہوں نے یہ لکھا

[1] تدبر قرآن

ہے کہ قیامت میں مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈالے جائیں گے وہ مضمون بھی ایک حیثیت سے صحیح ہے مگر محققین کے نزدیک وہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے۔ اب ہابیل کے کلام کا حاصل یہ ہوا کہ اگر تو نے یہی ٹھان لی ہے کہ میرے قتل کا وبال اپنے سر رکھے تو میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ کوئی مدافعت اپنی جانب سے نہ کروں حتیٰ کہ ترک عزیمت کا حرف بھی مجھ پر نہ آئے اور تیرے عمر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ تیرے سر چڑھے اور مظلومیت کی وجہ سے میرے گناہ اتریں لے

عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، حسن اور قتادہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ اور امام ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر نے اسی کو اپنایا ہے اور جلالین میں حافظ سیوطی نے بھی اسی کو ترجیح دی۔ اس کے علاوہ شارحین قرآن نے اس کے دوسرے مطالب بھی بتاتے ہیں مثلاً صاحب اتحاف سے القاسمی نقل کرتے ہیں۔

میں تمہارے قتل میں پہل اس لیے نہیں کرتا کہ میں کوئی بار گناہ اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ اگر تم اس جرم کے لیے پہل کرنا چاہتے ہو تو کرو اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو میرے قتل کا بار گناہ بھی تمہارے سر ہوگا اور میری طرف سے مدافعت کے نتیجے میں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کا گناہ تمہارے ہی سر ہوگا اس لیے کہ اس کا سبب میں نہیں بلکہ تم ہی بنو گے۔

صاحب معالم امام بغوی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر تو میرے قتل سے باز نہ آیا تو قیامت کے روز تیری گردن پر تیرے گناہ کا بھی بوجھ ہوگا اور میرے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ڈالا جائے گا کیونکہ روز قیامت مظلوم مقتول کے گناہ قاتل پر ڈالے جائیں گے۔ اس طرح دونوں کا بوجھ تجھے اٹھانا پڑے گا اس لیے کہ اللہ کے یہاں قاتل کی سزا یہ ہے کہ اس کے ذمہ اس کا گناہ بھی لکھا جاتے اور اس کے مقتول کا بھی اور اس کو دوہری سزا دی جاتے۔ یہ امام مجاہد کا قول ہے۔

اس آیت میں اس اصول عدل کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں فعلی البادی مالم یعتد المظلوم کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اگر مظلوم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہوگی تو جو کچھ اسے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کرنا پڑا ہے اس کا بار گناہ پہل کرنے والے پر ہے باقی اور انک میں تقابل مماثلت کا ہے۔

لے افادات شیخ الاسلام

قتل مومن کا انجام تباہ کاری ہے

۵۸۔ بہرحال اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل کرنے پر آمادہ کردیا اس نے اُسے مار ڈالا بس وہ تباہ کاروں میں سے ہوگیا۔ شاید ابتدا میں کچھ جھجک ہوگی۔ شدہ شدہ نفس امارہ نے خیال پختہ کردیا اور یہی کیفیت عموماً معاصی کی ابتدا میں ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ تباہ کاروں میں سے ہوگیا۔ دنیوی خسران تو یہ کہ ایسا نیک بھائی جو قوتِ بازو بنتا ہاتھ سے کھویا اور خود پاگل ہوکر مرا۔ حدیث میں ہے کہ ظلم اور قطع رحم دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے اور اخروی خسران یہ کہ ظلم و قطع رحم قتل عمداً عدواناً کا دروازہ دنیا میں کھول دینے سے ان سب گناہوں کی سزا کا مستحق ہوا اور آئندہ بھی جتنے اس نوعیت کے گناہ دنیا میں کیے جائیں گے سب میں بانی ہونے کی وجہ سے اس کی شرکت رہی جیسا کہ حدیث میں مصرح ہے۔[۱]

شیخ الاسلام نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں بحوالہ عبداللہ بن مسعود نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> دنیا میں ظلماً جو بھی مارا جاتا ہے اس میں آدم کے بیٹے کا حصہ ہوتا ہے کیونکہ دنیا میں پہلے ظالمانہ قتل کا موجد وہی ہے۔

قرآن نے قاتل کی اندرونی کشمکش کے اظہار کے لیے طوعت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ باب تفعیل ہے اور باب تفعیل اپنے مادے کے لیے دو زائد چیزیں ظاہر کرتا ہے ایک تدریج اور دوسرے تکرار۔ مطلب یہ ہے کہ قاتل کو اس کا حسد دیر تک بار بار قتل پر آمادہ کرتا رہا۔ اور قابیل اس معاملے میں کروں نہ کروں کی کشمکش سے دوچار رہا۔ بالآخر اس کے حسد نے اس کو اس ہولناک جرم پر آمادہ کردیا۔ ابتداءً ہر مجرم کو یہی جھجک پیش آتی ہے لیکن جب وہ مجرمانہ احساسات و جذبات کی پرورش کرتا رہتا ہے تو اس کا ضمیر بالکل مردہ ہوجاتا ہے اور وہ جرم کے لیے دلیرانہ قدم اٹھا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہابیل کی اس موثر تقریر سے قابیل ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اس کے نفس نے اس کام پر رفتہ رفتہ دلیر و مستعد بنا دیا اور اسے اس کی نظر میں خوشگوار اور پسندیدہ بنا دیا۔ یہ حال ہر بدی اور معصیت کا ہے۔ ابتداءً ہر فطرت سلیم اس سے رکتی ہے، ہچکچاتی ہے لیکن نفس رفتہ رفتہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس کی جانب مائل اور اس پر گرویدہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی طرف سے جھجک ہٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ انسان اسے بے دھڑک کر گزرتا ہے۔

زمین میں مُردے کو دفن کرنے کی تعلیم

۳۱۔ اس کے بعد خدا نے ایک کوا روانہ کیا اور وہ زمین کریدنے لگا تاکہ اسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیونکر زمین میں چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بول اٹھا کہ افسوس مجھ پر کہ میں اس کوے کی طرح بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا اس کے بعد وہ پچھتانے لگا۔ چونکہ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہ تھا اس لیے قتل کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کیا کرے۔ آخر ایک کوے کو دیکھا کہ زمین کرید رہا ہے یا دوسرے مُردے کوے کو مٹی ہٹا کر زمین میں چھپا رہا ہے اسے دیکھ کر کچھ عقل آئی کہ میں بھی اپنے بھائی کی لاش دفن کر دوں اور افسوس بھی ہوا کہ میں عقل و فہم اور بھائی کی ہمدردی میں اس جانور سے گیا گزرا ہوا۔ شاید اسی لیے حق تعالیٰ نے ایک ادنیٰ جانور کے ذریعہ سے اسے تنبیہ فرمائی کہ ذرا اپنی وحشت و حماقت پر کچھ شرمائے۔ جانوروں میں کوے کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کھلا چھوڑنے پر بہت شور مچاتا ہے۔[1]

اس طرح ایک کوے کے ذریعے آدم کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر متنبہ کیا اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوے سے پیچھے کیوں رہ گیا بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے بعد کا فقرہ فاصبح من الندمین اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے لیکن پچھتانا وہ نافع ہے جس کے ساتھ گناہ سے معذرت پر انکسار اور فکرِ تدارک بھی ہو۔ اس موقع پر اس کا پچھتانا حق تعالیٰ کی نافرمانی پر نہیں بلکہ اپنی بدحالی پر تھا جو قتل کے بعد اسے لاحق ہوئی۔ دراصل قاتل اب بکمال حسرت و ندامت یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے تو اس مردار خوار جانور کے برابر بھی شعور نہیں ہے۔ تورات میں ہابیل کی تدفین کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ شارحین تورات نے ایک پرندہ کا ذکر کیا ہے کہ اس کے عمل تدفین کو دیکھ کر آدم و حوا نے بھی ہابیل کا لاشہ دفن کیا لیکن پرندہ کا نام کو انہیں فاختہ آیا ہے۔ قرآن نے کھول کر بتایا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن دو کوؤں کی کہانی قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں صرف ایک کوے کا ذکر ہے۔ علامہ گیلانی فرماتے ہیں کہ قرآن میں اختصار ہے لیکن اگر قرآن ہی کے بیان پر اکتفا کر لیا جاتے اور یوں کہا جاتے کہ قابیل قتل کے بعد حیران تھا کہ اس نعش کو کیا کرے۔ ابھی تک نسل آدم موت سے دوچار نہ ہوئی تھی۔ یکایک اس نے دیکھا کہ ایک کوے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا۔ قرآن میں یہی بات بتانے کے لیے بحث مضارع کا صیغہ لایا ہے۔ قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لیے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہیے قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو بھی چھپانے کی اہلیت نہیں رکھتا ندامت سے سر جھکا لیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کو سپرد خاک کر دیا۔

دمشق کے شمالی حصے میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتل ہابیل کے نام سے مشہور ہے اور اس کے متعلق حافظ ابن عساکر نے احمد بن کثیر کے تذکرے میں ایک خواب بھی نقل کیا ہے لیکن خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا

بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ

وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ

رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ

لَمُسْرِفُوْنَ ۝

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا تھا، کہ جس کسی نے انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی زندگی بچالی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔ اور بلاشبہ ان کے پاس ہمارے رسول پے در پے کھلی کھلی ہدایات لے کر آتے لیکن اس پر بھی اُن میں اکثر ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

قانون قصاص کی حکمت و عظمت

آدم کے دو بیٹوں کا تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے کتنی ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں اولاً یہ کہ قتل پر کوئی خدا ترس آمادہ نہیں ہوتا ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہوتا۔ ثانیاً یہ کہ اس کی عمومی وجہ بغض و حسد ہوتی ہے۔ ثالثاً یہ کہ قاتل خدا کے احکام کا باغی ہوتا ہے اور سخت گنہگار۔ رابعاً یہ کہ قاتل دین و دنیا دونوں لحاظ سے خسارے میں رہتا ہے۔ تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حق سبحانہ نے قرآن میں تفصیل سے یہ واقعہ اس لیے بیان کیا ہے تاکہ لوگ اس کی قباحت کو محسوس کریں اور اس گناہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قتل کی تاریخ بیان کی ہے تاکہ لوگوں کو اس سے عبرت ہو اور سنجیدگی سے اس کے نشیب و فراز پر غور کر سکیں یہاں قرآن نے واضح کیا ہے کہ قتل ناحق سب سے بڑا جرم ہے اس سے بڑھ کر کوئی اور جرم نہیں ہے کیونکہ یہ چیز روئے زمین کا امن و امان تباہ کرتی ہے اور انسانوں کا سکون قلب چھین لیتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ بلیغ تعبیر جو ہو سکتی ہے قرآن نے اسے اختیار کیا ہے تاکہ قتل کی شناعت اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل امن و امان کو برقرار رکھنے کی جو بلیغ تعبیر اللہ تعالیٰ نے یہاں اختیار فرمائی ہے اس سے بڑھ کر دوسرا پیرایہ بیان ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص کا قاتل پوری کائنات انسانی کا قاتل ہے۔ اس کے مختلف معنے بیان کیے گئے جس کی تفصیل آپ ابھی پڑھیں گے۔ یہاں مجھے امام ابن جریر کی یہ بات بہت پسند آئی ہے کہ:

> اس آیت میں عقوبت کی عظمت اور وعید کی شدت مراد ہے اور بتانا ہے کہ ایک انسان کا ناحق خون اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کو اسی طرح حرکت میں لے آتا ہے جس طرح تمام انسانوں کا قتل۔

منشا یہ ہے کہ گنہگاروں میں بدترین گنہگار قاتل ہے۔ صحابہ کرام نے اس مسئلہ کو خوب سمجھا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ جن دنوں باغیوں نے حضرت عثمان کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا میں کسی طرح حضرت عثمان کی خدمت میں پہنچ گیا اور درخواست کی کہ حضرت میں امداد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ میری باتیں سن کر آپ نے فرمایا

کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ تو پوری انسانیت اور ساتھ میرا قاتل بن جائے؟ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میرا جواب سن کر حضرت عثمان نے فرمایا کہ،

سن لو اگر تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو سمجھو لو کہ تم پوری انسانیت کے قاتل ہو۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر واپس آگیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عثمان نے خود جام شہادت نوش کر لیا مگر تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ یہ تھی عملی تفسیر اس آیت کی اور یہ مقام تھا حضرت عثمان کی نظر میں امن و امان کا جس کا ہمارے اس دور میں تصور بھی ناممکن ہے۔

اس آیت میں دراصل قانون قصاص کی حکمت بیان ہو رہی ہے کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ہے۔

۳۲۔ اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا تھا یعنی ناحق قتل و خون ریزی میں جو دنیوی اور اخروی نقصانات ہیں اور جو بد نتائج اس پر مرتب ہوتے ہیں حتیٰ کہ قاتل بھی اس حرکت کے بعد بسا اوقات پچھتاتا اور کف افسوس ملتا ہے۔ اسی سبب سے بنی اسرائیل کو ہم نے یہ ہدایت کی تھی[1]۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ ذالک سے اشارہ قصہ قتل ہابیل کی جانب نہیں بلکہ ان مفاسد کی جانب ہے جو قتل ناحق سے پیدا ہوتے ہیں۔ السید رشید رضا لکھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس جرم اور اس فعل کی وجہ سے جو ظلم و عدوان کی صورت میں دو بھائیوں میں رونما ہوا ہم نے بنی اسرائیل کو یہ ہدایت دی تھی۔ اور دوسرے شارحین لکھتے ہیں کہ چونکہ بنی اسرائیل کے اندر انہی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدم کے اس بیٹے نے کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھ دیئے تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائیبل پائی جاتی ہے وہ فرمان خداوندی کے الفاظ سے خالی ہے۔[2]

ہابیل کی صدا میں تمام نوع انسانی کی راست بازی اور نیک عملی بول رہی تھی، اور قابیل کے عمل میں تمام ظالم انسانوں کی شقاوت کا ہاتھ تھا۔ اب انسان کے سامنے دو راہیں کھل گئیں، نیکی و راستی کبھی انسان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے گی ظالم کا ہاتھ ہمیشہ رنگین رہے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ اسی بنا پر خدا نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا۔[3]

یہ سوال کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر بنی اسرائیل کی تخصیص کیوں ہے۔ اس وجہ کا تقاضا

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم [3] ترجمان القرآن

تو یہ کیوں کہا جاتا کتبنا علی الناس، ہم نے پوری انسانیت کو یہ ہدایت دی ہے۔ شارحین قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں بنی اسرائیل کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ وہ قابیل کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے حسد رکھتے تھے اور یہ حسد ان کو قتل کی سازشوں پر ابھار رہا تھا ان کے اسی کردار پر تعریض کے لیے بنی اسرائیل کا ذکر ہوا ہے۔ ورنہ یہ واقعہ تو بنی اسرائیل سے بہت پہلے کا ہے۔ اور معلوم ہے کہ جان کے بدلے جان کا قانون ہر ملت میں ابتداء سے موجود رہا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی ملت میں بھی یہ قانون موجود تھا جیسا کہ تورات کی کتاب پیدائش کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہاں ضابطہ فوجداری کی تاریخ بتانی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ بنی اسرائیل اللہ کے میثاق کے معاملہ میں اتنے دلیر اور بے باک ہیں کہ یہ جاننے کے باوجود کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے برابر اللہ کی زمین میں فساد کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے من اجل ذالک کا اشارہ شر و فساد کی اس ذہنیت کی طرف ہے جس کا قابیل نے اظہار کیا اور جس کا مظاہرہ ان یہودیوں کی جانب سے ہوتا رہتا ہے اور ہو رہا ہے جو قابیل کی سنت بد کی پیروی کر رہے ہیں، یعنی کینہ، جذبات اور شیطانی تحریکات کے تحت اللہ کے بندوں کا خون بہاتے ہیں۔

انسانی جان کی حفاظت

۸۸۔ کہ جس نے انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی زندگی بچالی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔ ملک میں فساد کرنے کی بہت سی صورتیں ہیں مثلاً اہل حق کو دین حق سے روکے یا پیغمبروں کی اہانت کرے یا العیاذ باللہ مرتد ہو کر اپنے وجود سے دوسروں کو مرتد ہونے کی ترغیب دے و قس علی ذالک اور زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اول روئے زمین پر بڑا گناہ یہ ہی ہوا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اس کے بعد رسم پڑ گئی اسی سبب سے تورات میں اس طرح فرمایا کہ ایک کو مارا جیسے سب کو مارا، یعنی ایک کے ناحق خون کرنے سے دوسرے بھی اس جرم پر دلیر ہو جاتے ہیں۔ تو اس حیثیت سے جو شخص ایک کو قتل کر کے بدامنی کی جڑ قائم کرتا ہے گویا وہ سب انسانوں کے لیے قتل اور عام بدامنی کا دروازہ کھول رہا ہے اور جو کسی ایک کو زندہ کرتا یعنی کسی ظالم قاتل کے ہاتھ سے بچاتا ہے گویا وہ اپنے عمل سے سارے انسانوں کے بچانے اور مامون کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ لہ

لہ افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی زندگی کا بقا منحصر اس چیز پر ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقاء و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیات انسانی کے احترام اور ہمدردی نوع کے جذبے سے خالی ہے۔ لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افراد انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے۔[1]

دنیا میں سب سے زیادہ قابل حفاظت اور لائق اہمیت انسانی جان ہے۔ غریب ہو یا امیر، بادشاہ ہو یا فقیر، بچہ ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، شہر کا رہنے والا ہو یا دیہاتی، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل۔ پھر وہ اپنے خاندان کا چشم و چراغ ہو یا محتاج و دست نگر گھرانے کا، مسلم ہو یا غیر مسلم، تندرست ہو یا بیمار و ناکارہ ہر ایک کو ایک وفادار شہری کی حیثیت سے حق حاصل ہے کہ ملک میں آزادی کا ساتھ رہے۔ آسودہ زندگی بسر کرے اپنے خیال و عقیدے میں اس کو آزادی ہو، کوئی پابندی نہ ہو اور ہر خطرہ و اندیشہ سے اس کا دل مطمئن ہو۔ قرآن نے دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں قتل انسانی کی اجازت نہیں دی ہے۔ ایک یہ کہ جان کا بدلہ لیتا ہو، دوسرے یہ کہ ملک میں دنگا و فساد کیا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ انسان کو مارنا قرآن کے نقطہ نظر سے پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ قرآن نے افساد فی الارض اور سفک دم کو ہم پلہ بتایا ہے کسی جان کو مارنا خواہ کسی طرح ہو اور خواہ کسی وجہ سے ہو، قرآن نے سب پر قدغن قائم کر دی ہے۔ مشرکین نکہ فقر و فاقہ کو حیلہ بنا کر قتل ناحق کا خون اپنے سر لیتے تھے۔ قرآن میں مشرکین کی اس قبیح رسم کا ذکر آٹھویں پارے میں آرہا ہے۔ تنگدستی کے اندیشہ سے بچوں کو مار ڈالنا اور ننگ و عار کے خیال سے بچوں کو قتل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ قرآن نے ان کو سختی کے ساتھ بچوں کے قتل سے روکا اور فقر و فاقہ کے وساوس کو یہ کہہ کر دور کیا کہ نحن نرزقھم وایاکم۔

اس آیت میں قرآن نے قتل و خونریزی کو اولاً ترغیب و ترہیب کے ذریعے بند کرنے کی

---

[1] تفہیم القرآن۔

کوشش کی ہے اور لوگوں کے دلوں میں خون ناحق کی برائی بٹھائی اور اس کی مخالفت کی حکمت بتائی اور ان مفاسد پر روشنی ڈالی جو خون ناحق سے پیدا ہوتے ہیں ساتھ ہی امن و امان سے جو اس کا گہرا رشتہ ہے اسے اجاگر کیا تاکہ انسان گناہ سے اپنے آپ کو بچائے۔ علماء نے تصریح کی ہے چنانچہ محدث ابن جریر نے حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ:

یہ آیت قرآنی ہمارے لیے رہنما اصول ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ ان کے خون ہمارے خونوں سے زیادہ محترم نہیں ہیں۔

امام شاطبی نے الموافقات میں یہ قاعدہ لکھا کہ گزشتہ امتوں کے جو قوانین و احکام قرآن میں ذکر ہوتے ہیں وہ سب حق ہیں اور امت اسلامیہ بھی اس کی مخاطب ہے جب تک قرآن ہی سے استثنا معلوم نہ ہو۔

سب سے بڑا گناہ

اس آیت میں ناحق ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل بتایا ہے۔ اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ای الذنب اعظم عند اللہ خدا کے یہاں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے، فرمایا یہ کہ تو خدا کا کسی کو ہمسر و شریک بنائے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے پھر پوچھا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر یہ کہ تو اپنے بچہ کو روزی کھانے کے اندیشے سے مار دے۔

امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

سب سے بڑا گناہ شرک ہے جو ظاہر اور بے غبار ہے اور پھر قتل ناحق ہے جو اسی کے قریب قریب ہے اسی لیے ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ شرک کے بعد اکبر الکبائر قتل ناحق ہے۔ امام شافعی نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سات تباہ کن چیزوں سے بچو۔ آپ سے پوچھا گیا کہ وہ کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ کا شریک بنانا اور اس شخص کو قتل کرنا جس کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہو، ہاں حق شرعی کے ساتھ۔ (مسلم)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز میں قتل و خون ریزی کی شناعت ذہن نشین کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ ایک بار آپ نے خونِ ناحق کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا۔

مومن جب تک ناحق خون ریزی میں مبتلا نہیں ہوتا اپنے دین کے بارے میں کشادگی میں رہتا ہے۔ (بخاری)

کتنا موثر انداز بیان ہے کہ آدمی پڑھنے کے ساتھ ہی یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا مجھے اس گناہ سے بچائے قتل و خون ریزی بند کرنے کی جو کوشش اسلام نے کی ہے وہ اپنی آپ مثال ہے اور اس سلسلے میں جو موثر سے موثر انداز بیان ہو سکتا ہے وہ سب اس نے اختیار کیے ہیں۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ،

مومن اس وقت تک ہمیشہ نیکیوں میں تیز رو اور نیکوکار رہتا ہے جب تک ناحق خون ریزی نہیں کرتا مگر جب وہ اس گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر وہ سست پڑ جاتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ان تباہ کن کاموں میں سے جن میں انسان اپنے آپ کو ڈال کر بچا نہیں سکتا اور اس کی ہلاکت ضروری ہے۔ یہ بھی ہے کہ کوئی ناحق خون بہاتے جس کی کوئی شرعی وجہ نہ ہو۔

اشارۂ قتل کا گناہ

قتل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنا ہاتھ خون آلود نہ کرے مگر اپنے اثر و رسوخ اور جاہ و اقتدار سے کام لے کر کسی دوسرے کو اس میں استعمال کرے اور اس کے ذریعے کسی بے گناہ کو قتل کرا دے اسلام اس صورت کو بھی برداشت نہیں کرتا اور اصل مجرم صاحب اثر و رسوخ ہی کو گردانتا ہے حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قاتل اور آمر کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔

آگ ستر حصوں میں تقسیم کی گئی ہے ان میں سے ۶۹ حصے اس کے لیے ہوں گے جو قتل کا حکم دیتا ہے اور ایک حصہ اس قاتل کے لیے ہے جو دوسرے کے کہنے سے قتل کرے۔ (جمع الفوائد عن احمد)

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن قاتل و مقتول بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوں گے مقتول عرض کرے گا کہ اے مولیٰ قاتل سے پوچھئے کہ اس نے مجھے کس قصور پر قتل کیا۔ قاتل آمر کی طرف

اشارہ کرکے جواب دے گا پروردگار اس نے مجھے حکم دیا تھا۔ اس جواب کے بعد قاتل وآمر دونوں کے ہاتھ پکڑے جائیں گے اور دونوں کو ایک ساتھ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ (جمع الفوائد)

ہتھیاروں پر پابندی اور اس کی وجہ

قتل تو بہرحال قتل ہے۔ اسلام یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آدمی ایسی ہیئت اختیار کرے جس سے کسی کو کوئی زخم پہنچنے کا احتمال ہو یا کسی کے دل میں اس کی طرف سے شبہ بھی پیدا ہو۔ حضور انور کا ارشاد ہے:

جو ہم پر ہتھیار اٹھاتے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (بخاری)

حافظ ابن جریر تحریر فرماتے ہیں:

ہتھیار اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ ان سے جنگ کی جائے تاکہ ان کو خوف زدہ کیا جائے لہٰذا وہ شخص اس وعید میں داخل نہ ہوگا جو مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ایسا کرے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار لے کر چلنے سے منع فرمایا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو دھوکہ سے کوئی خراش آجائے یا کوئی کمزور دل اپنے قلب کی کمزوری کی وجہ سے ننگی تلوار دیکھ کر خطرہ محسوس کرنے لگے۔ ارشاد ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار دینے سے منع فرمایا ہے۔

قتل وخون ریزی کی برائی ذہن نشین کرنے اور دنیا سے فتنہ وفساد مٹانے کے لیے آپ نے فرمایا ہے:

دوزخ کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ ان مجرمین کے لیے ہے جو میری امت پر تلوار چلاتے۔ (مشکوٰۃ)

کوئی ایسا پیرایہ بیان باقی نہیں چھوڑا گیا ہے جس سے امت کا ذہن اس سلسلے میں براہ راست متاثر ہو سکتا ہو۔ مختلف انداز سے کوشش کی گئی ہے کہ انسان قتل وخون ریزی کے نقصان کو سمجھ کر اس سے بیزاری کا اعلان کرے اور فتنہ وفساد سے دامن بچا کر رکھے۔ ایک موقع پر حضور انور نے فرمایا کہ:

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے اس پر

فرشتے لعنت کرتے ہیں تا آنکہ وہ اسے رکھ نہ دے اگرچہ اس کا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ (مشکوٰۃ)

شاہ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں۔

> اس حدیث میں اشارے سے مقصود ہنسی اور مذاق کے طور پر اشارہ کرنا ہے کیونکہ سچ مچ قصد وارادے کے معنے یہاں بن نہیں سکتے اور ہنسی و مذاق پر لعنت ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کام سے شدت سے روکا جا رہا ہے۔

پیرایہ بیان ہر موقعہ پر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن میں انسانی خون اور امن وامان کی قدر و قیمت مضبوطی سے جم جائے اور اس سلسلے میں مزید چون وچرا کی گنجائش باقی نہ رہے۔ انسانی جان کی حفاظت اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ موجودہ دور میں امن وسلامتی کا تصور بھی مشکل ہے۔ یہ اسلام ہی کو فخر حاصل ہے کہ اس نے پوری قوت کے ساتھ انسانی احترام کی برتری کا اعلان کیا اور ساری کائنات کو انسان کا تابع اور خدمت گزار قرار دیا۔

خون کی اہمیت اسلام میں

انسانی زندگی میں انسانی خون کی عظمت اور قدر وقیمت کا مزید اندازہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے لگائیے جو عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے صحیح بخاری کی کتاب الآیات میں آتا ہے:

> قیامت میں جس مسئلہ کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کا کیس ہوگا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس ارشاد نبوت میں خون کی اہمیت کا بیان ہے۔ اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

> قیامت میں پہلا فیصلہ خون کا ہوگا۔ یعنی ان مقدمات کا فیصلہ سنایا جائے گا جو قتل سے متعلق ہوں گے۔ اس حدیث میں مسئلہ قتل کی اہمیت کا اظہار ہے اس لیے کہ آغاز ہمیشہ اہم معاملے سے ہوتا ہے۔

یہاں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق من قتل نفسا بغیر نفس سے ہے۔ یعنی ناحق خونریزی کرنا۔ اسے قرآن کبھی بغیر نفس سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی اسی کو الا بالحق کہہ کر ظاہر کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جواز قتل کی اس وقت اجازت ہے جب جان کے بدلے میں جان لینا ہو۔ اور اس وقت اجازت ہے جب ملک میں فساد کر رہا ہو۔ زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلام نے دے رکھی ہو۔

زمین میں فساد کی ممانعت

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر فساد کی مذمت اور اس کی ہلاکت خیزیاں بیان کی گئی ہیں ہر زمانے میں اس مہلک خباثت کی نشاندہی کی گئی ہے جو انسانی امن و سکون کے لیے شدید طور پر ضرر رساں ہے۔ فساد کا لفظ جب مطلق استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ تمام معاشرتی و اخلاقی اور فکری برائیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کتاب الایمان میں لکھتے ہیں۔

صلاح کا لفظ جب مطلق استعمال ہو تو تمام امور خیر کو شامل ہوتا ہے اور ایسے ہی لفظ فساد تمام برائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ کسی ملک اور قوم میں اطمینان و سکون کی دولت فراوانی کے ساتھ اس وقت تک نہیں پائی جاسکتی جب تک ان اسباب کا سرے سے قلع قمع نہ کیا جائے جو انسانی چین اور سکون و اطمینان کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان تمام لوگوں کا پوری قوت سے سر نہ کچل دیا جائے جو انسانی راحت و عافیت پر شب خون مارنے کے عادی مجرم ہیں۔ چنانچہ اسلام نے ان تمام اسباب و محرکات کی سختی کے ساتھ نگرانی کی ہے جو انسانی آبادی میں شور و ہنگامہ، دنگا و فساد اور فتنہ پروری کے ممد و معاون بنتے ہیں۔ اسلام سراسر رحمت و رأفت ہونے کی وجہ سے ایک لمحہ کے لیے اپنے معاشرے میں ایسی چیزوں کو گوارا نہیں کرتا جو ملک کے امن و امان اور خرمن عافیت پر بجلی بن کر گرتی ہیں۔ اور نہ افراد انسانی پر ترس کھاتا ہے جو قوم اور ملک کی خوشگوار زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں نہ وہ اپنوں کی پرواہ کرتا ہے اور نہ غیروں کی نہ مسلم کی نہ غیر مسلم کی۔ نہ دارالاسلام میں بسنے والوں کی نہ دارالحرب میں بسنے والوں کی اس کی عدالت میں مجرم خواہ کوئی ہو اس کو سزا ضرور ملتی ہے۔ وہی افراد جن کی حرمت و عزت کے لیے اس کی پوری مشینری حرکت کرتی رہتی ہے۔ جب ان ہی کے دامن جرم سے داغ دار ہو جاتے ہیں تو جرم کے اقرار یا اس کے ثابت ہو جانے کے بعد اسلام کی نگاہ لطف و کرم میں کسی رحم کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ زمین میں فساد اور قانون امن و امان کی خلاف ورزی انتہائی ہلاکت خیز ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں فساد کی بے انتہا مذمت کی گئی ہے اور مفسدین سے بیزاری کا اعلان کیا ہے یہ فساد خواہ کفر و شرک کے راستہ سے آئے یا جماعتی نظم میں خلل اندازی سے آئے۔ یہ شخصی مظالم کا

نتیجہ ہو یا اجتماعی بگاڑ کا یہ برائی جس روپ میں آئے ہر حال میں برائی ہے۔ فساد کے موضوع پر قرآن میں جو آیات ہیں ان کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن پاک نے فتنہ و فساد کے استیصال کے لیے کیا کیا انداز اختیار کیا ہے۔

ملک میں فساد کی صرف تین ہی صورتیں نہیں ہیں بلکہ تین سے زیادہ ہیں جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے۔ صرف قرآن ہی کا اس منظر سے مطالعہ کیا جائے تو فکری و اعتقادی، معاشرتی و اخلاقی، معاشی و اقتصادی، سیاسی و اجتماعی فسادات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔

فسادات پر اسلام میں دو طرح کی سزائیں ہیں حدود اور تعزیرات۔

جن جرائم اور فسادات کی سزائیں قرآن و سنت میں صراحۃً مذکور ہیں وہ حدود کہلاتی ہیں۔ اور جن جرائم کی سزاؤں کو اسلام نے عدالت کے صوابدید اور اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا ہے ان کو تعزیرات کہتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ — اللہ سبحانہٗ جن نافرمانیوں اور قانون شکنی پر حد مقرر کی ہے ایسی نافرمانیاں ہیں جن میں گوناں گوں مختلف مفاسد ہیں ان جرائم کی وجہ سے زمین میں فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہوتی ہے اور انسانوں کے سکون و اطمینان پر ڈاکہ زنی بھی۔

ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے

آخر میں دو باتیں ارشاد ہوتی ہیں ایک یہ کہ ایک کا قاتل پوری انسانیت کا قاتل ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایک کا قاتل اور سب کا قاتل قانون کی نظر میں برابر ہوگا۔ قانون عدالت، ضابطہ کی نظر میں دونوں کی مساوات کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ مقصود قاتل کی فطرت پر روشنی ڈالنا ہے۔ جو ظالم و فاجر ایک شخص کی بھی جان بلا وجہ اور بے قصور لے ڈالنے میں نہیں ہچکچاتا اس کی جسارت اور خباثت نفس سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ سارے انسانوں کو تہ تیغ کر ڈالے۔ یہ بات قرآن میں لفظ کانما پر غور کرنے سے سمجھ میں آ رہی ہے۔ اصل چیز تو قاتل کی نظر میں قانون و شریعت کی بے وقری اور اس کی خلاف ورزی پر اس کی دلیری ہے۔ قرطبی نے صحیح لکھا ہے ایک کے قتل کو حلال جاننے والا سب کے قتل کو حلال سمجھتا ہے۔ اور امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ ایک کے قاتل کو سب قاتلوں سے تشبیہ سے مقصود قتل کی شناعت اور برائی میں مبالغہ اور اس جرم کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اور قاضی بیضاوی کا یہ کہنا بھی بالکل بجا ہے چونکہ ایک کا قاتل خون کے تقدس

کو تباہ کرکے لوگوں کے لیے قتل کی شاہراہ بناتا ہے اور لوگوں کو اس کے عمل کے ذریعے دلیری ہوتی ہے اس لیے ایک کا قاتل سب کا قاتل ہوتا ہے۔ قرآن کی اس بلیغ تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ساری انسانی برادری کی حیثیت اکائی کی ہے۔ یہاں ایک کی جان سب کی جان ہے یہاں ہر ایک کا خون قابل احترام ہے۔

قانون کی ذمہ داریاں ہر فرد پر ہیں

اس آیت کے اشارات کی مدد سے معاشرے کے ہر فرد کی جو قانونی ذمہ داریاں معلوم ہوتی ہیں وہ بھی سن لیجئے۔

اول یہ کہ قرآن کی یہ تعبیر کہہ رہی ہے کہ ہر حادثہ قتل پوری قوم میں ایک ہلچل پیدا کرے جب تک اس کا قصاص نہ لیا جائے گا۔ ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس تحفظ سے محروم ہو گیا ہے جو اب تک اسے حاصل تھا۔ قانون ہی سب کا محافظ ہوتا ہے اگر قانون کی عمارت منہدم ہو گئی تو صرف مقتول ہی قتل نہیں ہوا بلکہ ہر شخص قتل کی زد میں ہے۔

دوم یہ کہ قاتل کا کھوج لگانا صرف مقتول کے وارثوں کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کی ذمہ داری ہے کیونکہ قاتل نے صرف مقتول ہی کو قتل نہیں کیا بلکہ سب کو قتل کیا ہے۔

سوم یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کو خطرے میں ڈالے تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کی حفاظت و حمایت تا بہ حد مقدور اس پر واجب ہے کیونکہ جو شخص کسی مظلوم کی حمایت و نصرت میں قدم اٹھاتا ہے وہ صرف مظلوم ہی کی حمایت میں سینہ سپر نہیں ہوتا بلکہ تمام مخلوق کی حمایت میں سینہ سپر ہوتا ہے۔

چہارم یہ کہ اگر شخص کسی قتل کو چھپاتا ہے یا قاتل کے حق میں جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کا ضامن بنتا ہے یا قاتل کو پناہ دیتا ہے یا قاتل کی دانستہ وکالت کرتا ہے یا دانستہ اس کو جرم سے بری کرتا ہے وہ گویا خود اپنے اور اپنے باپ بھائی بیٹے کے قاتل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے کیونکہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔

پنجم یہ کہ کسی مقتول کے معاملہ میں مقتول کے وارثوں یا حکام کی مدد کرنا بھی درحقیقت مقتول کی مدد کرنا ہے۔ اسی لیے قرآن میں قصاص کو زندگی فرمایا ہے۔

قانون اور اس کی یاد دہانی

۹۸۔ اور بلاشبہ ان کے پاس ہمارے رسول پے درپے کھلی کھلی ہدایات لے کر آتے لیکن اس پر بھی ان میں اکثر ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔ ترجمہ میں بینات سے حضرت شیخ الہند نے کھلے ہوئے حکم مراد لیے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بینات سے وہ کھلے کھلے نشان مراد لیے جائیں۔ جن سے کسی پیغمبر کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہو۔ بنی اسرائیل کی اکثریت ایسے کھلے نشان دیکھ کر اور ایسے کھلے احکام سن کر بھی اپنے ظلم و طغیان اور دست درازیوں سے باز نہ آئے۔ انبیاء معصومین کو قتل اور آپس میں ناحق خون کرنا ان کا ہمیشہ سے وتیرہ رہا ہے اور آج بھی معاذ اللہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا ایذارسانی اور مسلمانوں کی تذلیل کے لیے ہر قسم کی ناپاک سازشیں سوچتے رہتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب تورات کے حکم کے مطابق کیفما اتفق کسی آدمی کا ناحق مار ڈالنا اتنا بڑا جرم ہے کہ گویا اس کا قاتل تمام دنیا کے انسانوں کا قاتل ہے تو دنیا کے سب سے زیادہ کامل و اکمل انسان اور سب سے زیادہ مقبول و مقدس جماعت کے قتل و ایذارسانی کے پیچھے پڑنا اور ان سے لڑائی اور مقابلہ کے لیے کمر باندھنا خدا کے نزدیک کتنا بھاری جرم ہے۔ خدا کے سفراء سے لڑائی تو درحقیقت خدا ہی سے لڑائی ہے شاید اسی لیے اگلی آیت میں ان لوگوں کی دنیوی اور اخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا اور پیغمبر سے لڑائی کرتے ہیں یا دنیا میں طرح طرح کے فساد پھیلا کر مسرفون فی الارض کے مصداق بنتے ہیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو یہ قانون بتا دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اتمام حجت کے لیے برابر ان کے اندر خدا کے رسول بھی آتے رہے جو نہایت واضح احکام و ہدایات اور نہایت بلیغ تعلیمات کے ذریعے سے ان کو آگاہ کرتے رہے کہ اللہ کے عہد و میثاق کی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہو جائیں لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود یہ لوگ خدا کی زمین میں لگاتار مختلف قسم کی زیادتیاں کرتے رہے ہیں۔ آخر میں ان کثیرا منھم بعد ذالک فی الارض لمسرفون کہہ کر نہایت بلیغ اشارہ فرما دیا کہ مفسد تو سب ہی تھے لیکن ان کی اکثریت صرف فساد ہی نہیں کرتی تھی بلکہ فساد میں حدود سے تجاوز کر چکی تھی اور یہ اسراف بھی ان کی زندگی میں رچ بس گیا تھا۔ رچنے بسنے کی طرف جملہ اسمیہ لا کر اشارہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا ہے۔ فساد نام ہے حدِ اعتدال سے نکل جانے کا اور اسراف کہتے ہیں چھوٹ اور بے لگام ہونے کو مطلب یہ ہے کہ وہ ملک میں صرف جادۂ اعتدال ہی سے نکلے ہوئے نہ تھے بلکہ ان کی اکثریت اس فساد میں چھوٹ اور بے لگام ہو چکی تھی اور ان کی پوری زندگی اسی پر چل رہی تھی۔ اللہ نے جو قانون اتارا ہے اس میں اگر نافرمانیوں کے ذریعے خلل اندازی کر دی جائے تو قانون کا اجتماعی، معاشرتی اور سیاسی نظام برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر نہ تو نظامِ تکوینی کے ساتھ اس کے نظامِ سیاسی کی ہم آہنگی رہتی ہے اور نہ اس کے نظامِ اجتماعی و سیاسی میں کوئی ربط قائم رہ جاتا ہے۔ اسی صورت کو یہاں اسراف سے تعبیر فرمایا ہے۔

مدینہ کے یہود اور ان کا اسراف

اس اصولی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیے جس کا تجربہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مسلمانوں کو لگاتار یہودیوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یہود کے متعدد قبائل مثلاً بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع مدینہ کے حوالی میں آباد تھے۔ انہوں نے یوں تو مسلمانوں کے ساتھ امن و صلح اور باہمی حمایت و مدافعت کے معاہدے کر رکھے تھے لیکن ایک دن بھی انہوں نے معاہدوں کا احترام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور مدینہ سے ان کے قدم اکھاڑنے کی سازشیں کرتے رہے۔ قریش نے مسلمانوں پر جتنے حملے کیے سب میں درپردہ یہودی شریک تھے۔ انصار و مہاجرین کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی بھی انہوں نے بار بار کوشش کی۔ صحابہ بلکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی بھی انہوں نے بارہا تدبیریں کیں۔ اگرچہ ان کی یہ چالیں اکثر و بیشتر ناکام رہیں لیکن متعدد نہایت اندوہناک واقعات بھی پیش آئے۔ عورتوں اور بچوں کے اغواء اور قتل میں بھی یہ نہایت شاطر اور سنگدل تھے۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہود کی طرف سے اپنی جان اور عزت کے معاملہ کھٹکا لگا رہتا تھا حد یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو وہ کسی قضیے کے طے کرانے اور کسی معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے بلاتے تھے ان کے بھی ہلاک کرنے کی سازش پہلے سے تیار کر لیتے تھے۔ اس آیت میں اس صورتحال کی طرف اشارہ ہے۔

اور حافظ ابن جریر نے یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل صرف قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرکے مفسد ہی نہ تھے بلکہ اپنی پوری قانون اسی کی بغاوت پر قائم کرکے انبیاء کی اپوزیشن اور ان کے مدمقابل بن گئے تھے اور یہی ان کا اسراف تھا۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ
فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ
خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ
فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن
تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

بلاشبہ ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں[۹۰] یہی ہے کہ قتل کر دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے، یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذاب عظیم ہے[۹۱]۔ مگر ہاں جو لوگ ان میں سے قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے[۹۲]۔

قانون اور نظم کے لیے خطرہ

پچھلی آیت قرآنی میں یہ بات پڑھنے کے بعد ملک کے نظم و نسق کو پامال کرنا اور امن و سلام کو تباہ کرنا بہت بڑا سنگین جرم ہے قاری کا ذہن اس کا منتظر ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ اس سنگین جرم کی سزا کیا ہے؟ اس جرم کی سنگینی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی سزا بھی سنگین ہو قرآن ذہن میں اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب اس آیت میں دے رہا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اسلام نے قائم کیا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوتے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کے شہری ہوتے ہوئے عام اس سے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔

قانون کی خلاف ورزی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے، اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و امان اور نظم و نسق کو درہم برہم کر دے لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، لوٹ مار، اغوا، تخریب، اور اس نوع کے سنگین جرائم اسلامی حکومت کے لیے لا۔ اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت جو اقدامات کرے ان کی تفصیل ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔ اسلامی نظام جب کسی ملک میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر ہو یا بڑے پیمانے پر، قتل و غارت گری اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر پُرامن زندگی کو تباہ کرنے کی کوشش کرے اس کی سزا یہاں بتائی گئی ہے۔

۹۰۔ بلاشبہ ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسُول سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلاتے پھرتے ہیں یہی ہے بدامنی کرنے سے اکثر مفسرین نے اس جگہ رہزنی اور ڈکیتی مراد لی ہے مگر الفاظ کو عموم پر رکھا جائے تو مضمون زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ آیت کی جو شانِ نزول

احادیثِ صحیحہ میں بیان کی گئی ہے وہ بھی اسی کو متقضی ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر رکھا جائے۔ اللہ اور اس کے رسُول سے جنگ کرنا یا زمین میں فساد و بدامنی پھیلانا یہ دو لفظ ایسے ہیں جن میں کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ، رہزنی اور ڈکیتی، ناحق قتل و نہب مجرمانہ سازشیں اور مغویانہ پروپیگنڈے سب داخل ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر جرم ایسا ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے جو آگے مذکور ہیں کسی نہ کسی سزا کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے لے

جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہ ہی اللہ اور اس کے رسُول سے لڑتے ہیں۔ ملک میں فساد پھیلانے کی قباحت کی سنگینی بتانے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے اسی لیے محققین کے نزدیک دونوں فقروں کے درمیان حرف واو تفسیری ہے۔ اس لیے آیت میں دوسرا فقرہ یسعون فی الارض فساد پہلے فقرے یحاربون اللہ و رسولہ کی تشریح و تفسیر ہے اور اس کی مراد بتا رہا ہے۔ یہاں اس سے مراد ڈاکو اور رہزن ہیں۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ اکثر مفسرین اور سارے فقہا کے نزدیک آیت میں ڈاکو اور رہزن مراد ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ یہ آیت اپنے عموم کے لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہے جو بھی ان صفات کا حامل ہو۔ امام رازی بھی حافظ ابن کثیر کے ہمنوا ہیں۔ الجصاص نے ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ آیت کا مصداق صرف مسلمان ڈاکو ہیں۔ مسلمان تو غیر مسلمان ہیں اسلامی مملکت غیر مسلم شہریوں کے جان و مال دونوں اللہ و رسُول کے بخشے ہوئے حفظ و امن میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان پر حملہ کرتا ہے تو وہ بلا شبہ فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی اللہ و رسُول سے محاربہ ہے۔ گویا اس طرح اس آیتِ قرآنی میں ان فسادیوں کو محارب قرار دیا گیا ہے جو لوگوں کی راحت چھینتے اور فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ بندگانِ خدا کا امن و امان جو لوگ غارت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول سے جنگ کرتے ہیں۔ سارے انسان اللہ کی "عیال" ہیں جس کی خبر خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ان میں جو "عیال اللہ" کو فساد کر کے اذیت پہنچاتے اللہ کے ساتھ اس کے محارب ہونے میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول نے ان فتنوں سے منع فرمایا ہے اور اس کی قباحت بیان کی ہے۔ اس کے باوجود لوگ فتنہ پردازی کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔ ان کو باغی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

لے افادات شیخ الاسلام

فتنہ و فساد کے مختلف عنوان ہوتے ہیں۔ کبھی آدمی صرف ہنگامہ اٹھا دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص بے انتہا پریشانی سے دوچار ہوتا ہے۔ کبھی یہ منظم سازش کے ذریعے ہوتا ہے خواہ یہ لوٹ مار کرنے والوں کی جماعت ہو یا رہزنوں کی پھر وہ اسلامی مملکت کے باغی ہوں یا انسانی امن وسلامتی کے دشمن ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو کبھی پسند نہیں کرتا اور نہ کسی کو عدالت تک پہنچنے پر معاف کرتا ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو، امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا گدا، وزیر ہو یا چپراسی، مسلم ہو یا غیر مسلم جرم ثابت ہو جانے یا اقرار کے بعد ہر ایک کی قرار واقعی سزا ہوتی ہے۔ ابن رشد رقمطراز ہیں،

> محارب خدا و رسول وہ ہے جس کا خون اس لڑائی سے پہلے محفوظ ہو اور وہ مسلمان اور اسلامی مملکت کا غیر مسلم شہری ہے۔

اس فتنہ و فساد کی گرم بازاری جس عنوان سے بھی کوئی کرے اور جہاں بھی کرے اسلام کی نگاہ میں وہ مجرم ہے۔ بدایۃ المجتہد میں ہے۔

> محاربہ یہ ہے کہ ہتھیار سونتے یا رہزنی کرے۔ اگر یہ معاملہ آبادی سے باہر ہو تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ رہزنی اور بدامنی ہے اور اگر آبادی کے اندر ہو تو اس میں اختلاف ہے البتہ امام مالک فرماتے ہیں کہ آبادی کے اندر اور باہر دونوں برابر ہیں۔

اور فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ اس کا مصداق صرف وہ جماعت یا فرد ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکہ ڈالے اور اسلامی حکومت کے قانون کو بزور بازو توڑنا چاہے عام انفرادی جرائم کرنے والے چور، گرہ کٹ اس میں داخل نہیں ہیں۔

محاربین کی سزا

۹۱۔ یہی ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے یہ ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

ایسے مجرم پر دو حق ہیں ایک اللہ تعالیٰ کا دوسرا انسانوں کا۔ اللہ تعالیٰ کا اس لیے کہ اس نے اس کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور اس کی حدود کو توڑا۔ اور انسانوں کا اس لیے کہ اس نے

انسان کے جان یا مال اور یا دونوں کو اذیت پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حق کا تقاضا ہے کہ اس پر شرعی حد قائم ہو اور انسانی حقوق کا مطالبہ ہے کہ اس سے بدلہ لیا جائے۔ زخم و قتل کا بھی اور مال و دولت کا بھی چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ،

> جب کوئی رہزنی کرے اور بدامنی پھیلائے تو دیکھا جائے گا کہ اس نے قتل کا ارتکاب بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے گا پھر قتل کیا جائے گا اور پھانسی پر چڑھایا جائے گا۔ اور اگر اس نے صرف قتل کیا ہے اور مال نہیں لیا ہے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ اور اگر صرف مال چھینا ہے اور قتل نہیں کیا تو اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا اور اگر یہ صورت پیش آئی کہ اس نے نہ قتل کیا اور نہ مال لوٹا تو صرف قید کر دیا جائے گا۔ (احکام القرآن)

خلاصہ یہ ہے کہ صاحب قوت فسادیوں کی چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ کسی سے ازراہ فساد لڑیں اور اسے مار ڈالیں اور اس کا مال بھی چھین لیں تو اس صورت میں ان کا دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا۔ پھر ان کو قتل کیا جائے پھانسی پر لٹکایا جائے گا تاکہ ان کی یہ سزا پوری قوم اور سارے ملک کے لیے سامان عبرت ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فسادیوں اور ڈاکوؤں نے کسی مسلم یا ذمی سے لڑائی کی اور اسے قتل کر ڈالا۔ مگر مال نہ لیا تو ایسے فسادیوں کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر ڈالیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مال لوٹ لیا مگر قتل نہیں کیا تو اس صورت میں ان کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے اور بایاں پیر بھی۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ لڑائی اور فساد تو کیا مگر نہ مال گیا اور نہ جانی نقصان ہوا اس صورت میں ان کی سزا جلا وطنی ہے۔

مفسدین کو سزا دینے کے مسئلہ میں تو اتفاق ہے لیکن ائمہ کا تفصیل میں باہم اختلاف ہے اور منشاء اختلاف یہ ہے کہ سزا کے بیان میں حرف "او" آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ دو معنے دیتا ہے تخییر اور تنویع۔ سعید بن المسیب، عطاء ابن ابی رباح، و الحسن البصری، ضحاک، ابراہیم نخعی، مجاہد اور امام مالک اس کو تخییر کے لیے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عدالت کو اختیار ہے کہ رہزنوں کی قوت و شوکت اور جرائم کی شدت و خفت کے پیش نظر یہ چاروں سزائیں دے یا ان میں سے کوئی ایک دے اور امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد اسے تنویع کے لیے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رہزنوں کے لیے

رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں۔ جس کی تفصیل آپ سن چکے ہیں۔ لیکن ابن الصاص نے امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت کر کے اس صورت میں جب کہ رہزنوں نے قتل اور لوٹ دونوں کا ارتکاب کیا ہو یہ بھی لکھا ہے کہ :

> اگر رہزنی اور بدامنی پھیلانے والے قتل کا بھی ارتکاب کریں اور مال بھی لوٹ لیں تو اس صورت میں امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عدالت کو چار طرح کے اختیارات ہیں ان میں سے جونسی صورت بھی اسے مناسب معلوم ہو عمل میں لائے، دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ کر قتل کر ڈالے یا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ کر پھانسی دے دے یا صرف پھانسی پر چڑھا دے یا صرف قتل کر دے اور ہاتھ پیر نہ کاٹے۔ (احکام القرآن)

قرآن کے الفاظ بھی اس کے موید ہیں کہ حالات کی نوعیت اور بدامنی و قانون شکنی کے موجودہ اور متوقع اثرات کے لحاظ سے عدالت ان میں سے جو بھی اقدام کرے کر سکتی ہے۔ عربی زبان میں او کا استعمال اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے اس لیے مجھے ان لوگوں کی رائے درست معلوم ہوتی ہے جو عدالت کو اختیار دیتے ہیں کہ قیام امن و قانون اور استیصال فتنہ کے نقطہ نظر سے ان میں سے جو بھی صورت اس کو مفید اور مؤثر معلوم ہو اسے اختیار کر سکتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ان فسادی مردم آزار اور رہزنوں کو ہر حال میں سزا ملے گی۔ تفصیل میں اختلاف ہے سزا دینے میں نہیں۔ اس میں سب کا اتفاق ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ یہ رہزنی کر کے شہری زندگی کا امن و سلام خراب کرتے ہیں بلاشبہ یہ کام اپنے مفاسد کے اعتبار سے چوری سے بڑھ کر ہے۔ صاحب البنایہ رقمطراز ہیں۔

> یہ بڑا فتنہ اس لیے ہے کہ اس کا نقصان عام شہریوں کو پہنچتا ہے اس طرح کہ راستہ کا امن و امان ختم ہو جاتا ہے اور رہزنی شروع ہو جاتی ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی سزا بہت سخت ہے اس میں ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹے جاتے ہیں اور قتل و صلب کی سزا دی جاتی ہے۔

محاربہ کی شرطیں

محاربہ اور رہزنی کے لیے یہ شرط ہے کہ ان فسادیوں کے پاس اتنی قوت اور ایسا دبدبہ ہو کہ مسافر اور دوسرے لوگ جن پر حملہ آور ہوتے ہیں مقابلہ کی تاب و طاقت نہ رکھتے ہوں خواہ یہ حملہ آور

حملہ میں ہتھیار استعمال کریں یا کوئی دوسرا آلہ خواہ دن میں ہو یا رات میں۔ اسی طرح آبادی میں ہو یا آبادی سے باہر پھر یہ حملہ آور ایک ہو یا بہت ہوں ہر حال میں یہ رہزن ہیں اور ان کی سزا آیت بالا کے مطابق ہوگی درمختار میں ہے:

> رہزنی جو بھی کرے سرقہ کبریٰ ہے اگرچہ رات میں آبادی کے اندر ہو اور اسی پر فتویٰ ہے۔

علامہ ابن عابدین الشامی لکھتے ہیں:

> لفظ من کے ساتھ تعبیر اس لیے کیا ہے کہ رہزنی کا جماعت کی صورت میں ہونا شرط نہیں ہے بلکہ اگر ایک شخص بھی یہ کام کرے گا جس کے پاس طاقت وقوت ہو تو اس پر بھی یہی حکم ہوگا۔

پھر یہ فساد کرنے والے اور امن وامان کے دشمن مرد ہوں یا عورتیں، غلام ہوں یا آزاد سب کو سزا ہوگی کسی کو معاف نہ کیا جائے گا۔

رات میں اگر یہ ڈرائیں اور لوٹ مار کریں تو اس وقت ہتھیار کی شرط نہیں ہے البتہ دن میں اس کارروائی کے لیے ہتھیار کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

> رات میں آبادی کے اندر کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلح ہوں یا نہ ہوں، دونوں حالتوں میں ڈاکو کا حکم رکھتے ہیں۔ اور ایسا ہی وہ دن میں بھی رہزن کا حکم رکھتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ مسلح ہوں امام ابو یوسف سے یہی روایت ہے جس پر مشائخ نے فتویٰ دیا ہے تاکہ مفسدین کا شر دُور ہو سکے۔

جلاوطنی کا مفہوم

نفی کے معنے ہیں جلاوطن کر دینا۔ مگر جلاوطنی ایسی ہو کہ فسادی اپنی سزا بھی پالیں اور دوسرے لوگ اس کی اذیت رسانی سے محفوظ بھی ہو جائیں۔ اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں جلاوطن کر دیا گیا تو کچھ دنوں ممکن ہے کہ اجنبیت کی وجہ سے کچھ نہ کرے لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر پوری ڈھٹائی سے وہ شب خون مارے گا تو یہ کوئی سزا نہیں ہے کیونکہ نہ پبلک اس کی اذیت کوشیوں سے محفوظ ہوتی اور نہ اس پر پابندی عائد ہوتی ہے۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ ملک بدر کر دیا جائے لیکن یہ اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ دارالحرب کا رُخ کرے گا اور دار کفر میں ایسے

شخص کے متعلق اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ایمان و اسلام سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے اس لیے یہ بھی درست نہیں ہے۔ چونکہ یہ مجرم اس کا پہلا جرم ہے اس لیے قتل بھی جائز نہیں لہٰذا یہاں جلاوطنی یہی ہے کہ اسے جیل روانہ کر دیا جائے کہ عوام سے اس کا رشتہ باقی نہ ہے اور پوری آبادی سے جلاوطنی کی زندگی گزارے۔ محققین علماء کی یہی رائے ہے۔ قرآن نے او ینفوا من الارض کی تعبیر اختیار کی ہے اس کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی کہ جیل میں ڈال دیا جائے اور یا ملک سے مجرمین کا انڈیمان کے طرز پر علاقہ بنایا جائے اور وہاں روانہ کر دیا جائے۔ کیونکہ منشا یہ ہے کہ اسے سزا بھی ملے اور اس کے شر سے شہری زندگی محفوظ بھی ہو جائے۔ بلاشبہ قید میں ڈالنا ہی ایسی صورت ہے کہ اس کی سزا بھی ہو جائے گی اور اس کے شر سے شہری محفوظ بھی ہو جائیں گے ابوبکر الجصاص نے پوری بحث کے بعد لکھا ہے۔

پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ نفی کے معنے یہ نہیں کہ اسے تمام آبادی سے جلاوطن کر دیا جائے سوائے جیل کے جہاں اس کے لیے فتنہ و فساد ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا اور کوئی محل نہیں ہے۔

قتل و رہزنی سے پہلے گرفتاری

اسلام مفسدین کا دشمن ہے جب تک وہ اپنے اعمال بدسے تائب نہ ہو جائیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ایسے افراد کو معاف نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ فتنہ پرداز اور مردم آزار افراد لوٹ مار قتل خونریزی سے پہلے گرفتار ہو جائیں۔ پھر بھی سزا کے بعد جیل میں بند کر دیے جائیں اور اس وقت تک بند رکھے جائیں گے جب تک توبہ نہ کر لیں۔

اگر مال وغیرہ لیتے اور قتل کے ارتکاب سے پہلے وہ گرفتار کر لیے جائیں تو سزا کے بعد ان کو جیل خانہ میں بند کر دیا جائے اور قرآن میں نفی کا یہی مطلب ہے اور یہ اس وقت تک بند رہیں گے جب تک توبہ نہ کر لیں۔ اور اس توبہ کے لیے نیکوکاروں کے آثار کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔

سزا اجتماعی حیثیت سے دی جائے گی

اس طرح کے حالات میں سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ گروہی حیثیت سے دی جائے گی اگر قتل، اغوا، لوٹ مار، آتش زنی کے واقعات پیش آئے ہیں تو یہ جستجو نہیں کی جائے گی کہ متعین

طور پر ان جرائم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا ہے بلکہ ان کی ذمہ داری میں رہزن گروہ کا ہر فرد شریک سمجھا جائے گا اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا اس لیے کہ ہر جرم کے ارتکاب میں سب نے مجموعی اثر نے کام لیا ہے۔ صاحب الہدایہ رقمطراز ہیں۔

> ان ڈاکوؤں میں سے ارتکاب جرم خواہ ایک نے کیا ہو مگر حد تمام پر جاری ہوگی یہی امام مالک اور امام احمد کی رائے ہے کیونکہ یہ رہزنی کی سزا ہے یہ قصاص نہیں ہے بلکہ حد ہے اس میں مساوات معتبر نہ ہوگی لہٰذا تمام ہی جرم میں برابر ہوں گے۔

جب سارے کے سارے اس گروپ میں شریک ہیں تو قاعدہ کے مطابق سب ہی مجرم ہیں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے کہ کوئی قتل کرتا ہے کوئی دوسرا کام جماعت میں تقسیم کار ہوتا ہے۔ درمختار میں ہے،

> اگر جماعت میں سے کسی سے بھی مال چھیننے، قتل کرنے اور ڈرانے کا مظاہرہ ہو جائے تو سب پر احکام مذکورہ جاری ہوں گے۔

حافظ ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ اگر وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے پھر بھی سب کے سب قتل کیے جائیں گے کیونکہ خلفاء راشدین سے یہی ثابت ہے۔

هذا هو المأثور عن الخلفاء الراشدين

(السياسة الشرعية)

عکل اور عرینہ والوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کے اونٹوں کو ہنکالے جانے اور ان کے چرواہوں کو قتل کرنے کی پاداش میں جو عبرت انگیز سزا دی تھی، امام بخاری نے اس کو اسی آیت کے تحت درج کیا ہے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع کے ساتھ جو معاملہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ بھی اسی حکم الٰہی کے تحت کیا۔ سیدنا ابوبکر نے مانعین زکوٰۃ کی جو سرکوبی کی وہ بھی ہمارے نزدیک اسی حکم کے تحت ہوئی۔ حضرت عمر نے یہود کو جو عرب سے آخری بار نکالا وہ بھی اسی حکم خداوندی کی تعمیل تھی۔

حافظ ابن تیمیہ نے حضرت فاروق اعظم کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رہزنوں کی جماعت کے اس شخص کو بھی قتل کروا ڈالا جو اونچی جگہ بیٹھ کر راہ گیروں کو دیکھا کرتا تھا کہ کون شخص کدھر سے آرہا ہے اور ادھر ڈاکو لوٹ مار میں مشغول تھے۔

حد اور قصاص میں فرق

ایک صورت یہ ہے کہ قتل کیا لیکن مال نہیں چھینا تو اس صورت میں یہ مجرم حد میں قتل کیا جائے گا

بر قصاص میں۔ حد اور قصاص میں فرق یہ ہے کہ قصاص ولی مقتول معاف کر سکتا ہے لیکن حد کو کوئی بھی معاف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے قتل کو کوئی معاف کر سکتا ہے اور نہ روک سکتا ہے کیونکہ یہ خالص اللہ کا حق ہے۔ جب مجرم کا قتل اس بنیاد پر ہو کہ اس نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور قانون شکنی کا مرتکب بنا ہے لہٰذا اس حد میں ان شرائط کی رعایت نہ ہوگی جو قصاص کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں بلکہ محارب ہونے کی حیثیت سے اسے قتل کیا جائے گا اور اس کے اعوان و انصار کو بھی، قتل کا ہونا کافی ہے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس چیز سے مارا ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں :

> عدم شرط کا خلاصہ یہ ہے کہ قاتل اور معین مددگار سب قتل کیے جائیں گے خواہ تلوار سے مارا ہو یا پتھر اور لاٹھی سے۔

رہزنوں کی نماز جنازہ نہیں ہے

آخر میں فرمایا ہے ذلک لھم خزی فی الدنیا یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے یہ اس شبہ کا ازالہ ہے جو مذکورہ بالا سزاؤں سے متعلق ان لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے جو اللہ و رسول کو چیلنج کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے بتایا ہے کہ دنیا میں ان کی یہ رسوائی دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت کا ذریعہ ہوگی اور اس کے اثر سے ان لوگوں کے اندر بھی قانون کا ڈر اور احترام ہوگا جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ مجرد قانون کی افادیت و عظمت کی بنا پر اس کا احترام کریں۔

یہیں سے فقہاء نے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ اس امن و امان کے دشمن کو نہ غسل دیا جائے اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے البتہ دفن کر دیا جائے گا۔ در مختار کے باب الجنائز میں ہے:

> نماز جنازہ چار شخصوں کے علاوہ اور تمام مسلمانوں کی فرض ہے۔ ان چار میں باغی اور ڈاکو بھی ہیں ان کو غسل نہ دیا جائے گا اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

ایسا برتاؤ اس وجہ سے کیا گیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کی اور امن و راحت جیسی قیمتی دولت برباد کرنے کی سعی کی اس لیے یہ اس سزا کا مستحق قرار پایا کہ اس کی توہین و تذلیل ہر پہلو سے ہو تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو لوگ خدا و رسول کے مقابلہ میں جرات و جسارت کا اظہار کریں اور بغاوت کا اعلان کریں وہ مستحق ہیں کہ دنیا میں رسوا ہوں۔

حقوق اللہ و حقوق العباد

یہ یاد رہے کہ اگر حق اللہ اور حق العبد دونوں جمع ہو جائیں مثلاً شرپسندوں نے مال چھین لیا اور اسے زخمی بھی کر دیا تو اس صورت میں حق اللہ پر عمل کرتے ہوئے حق العبد کو نظر انداز کر دیا جائے گا کیونکہ جب حد جاری ہو چکی تو عصمت نفس ختم ہو سکتی ہے۔ حد اور قصاص دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

گرفتاری سے پہلے توبہ

۹۲۔ مگر ہاں جو لوگ ان میں سے قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی مذکورہ بالا سزائیں جو حدود اور حق اللہ کے طور پر ہیں وہ گرفتاری سے قبل توبہ کرنے سے معاف ہو جاتی ہیں۔ حقوق العباد معاف نہ ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی کا مال لیا تھا تو ضمان دینا ہوگا۔ قتل کیا تھا تو قصاص لیا جائے گا ہاں ان چیزوں کو معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو ہے۔ اس حد کے سوا باقی حدود مثلاً حد زنا، حد شرب خمر، حد سرقہ اور حد قذف توبہ سے متعلق ساقط نہیں ہوتی ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ خاص اختیارات صرف ان کے خلاف استعمال کیے جائیں گے جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی بغاوت پر اڑے رہے ہوں اور حکومت نے اپنی طاقت سے ان کو مغلوب و مقہور کیا ہو جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی توبہ کر لیں ان کے خلاف ان کے پہلے رویہ کی بنا پر کوئی ایکشن نہ لیا جائے گا۔

مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اوپر جو سزا مذکور ہوئی وہ حد اور حق اللہ کے طور پر ہے جو کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتی۔ قصاص اور حق العبد کے طور پر نہیں کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف ہو جاتا ہے لہٰذا جب گرفتاری سے پہلے ان لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہو جاتے تو حد ساقط ہو جائے گی۔ البتہ حق العبد باقی رہے گا۔ اگر کسی نے مال لیا ہوگا تو اس کا ضمان دینا پڑے گا اور قتل کیا ہوگا تو اس کا قصاص لیا جائے گا لیکن اس میں قصاص و ضمان معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو ہوگا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں حق اللہ تو معاف ہو گیا لیکن حق العبد مجرمین سے چمٹا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہر حال پر رحم فرمایا لیکن حقوق العباد سے بری قرار نہیں دیا۔ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں۔

> جب وہ حد ساقط ہو جاتی ہے جو قرآن کی آیت میں مذکور ہے تو انسانی حقوق واجب ہو جائیں گے جیسے قتل کرنا، زخمی کرنا، مال کا تاوان اور جب حد واجب ہو گی تو انسانی حقوق ختم ہو جائیں … مالی حق ہو یا جانی۔

قانون کی سختی اور سنگینی

ممکن ہے کہ اسلامی سزاؤں کی اس سختی پر کچھ وہ لوگ چیں بجبیں ہوں جو اللہ و رسول کو چیلنج کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کائنات میں حقیقی عزت اللہ اور رسول کے لیے ہے وللہ العزۃ ولرسولہ۔ اس وجہ سے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے کی جسارت کرتے ہیں وہ اسی سنگین سزا کے مستحق ہیں۔ ساری قیاسی اور عقلی بحثوں کو چھوڑ کر صرف عملی اور تجربی حیثیت سے دیکھ لیا جائے کہ جن ملکوں میں اپنے ہاں قانون کو نرم سے نرم کر کے سزائیں ہلکی کر دی ہیں ان کے ہاں جرائم اور بدامنی کا کیا حال ہے؟ اور ان قوموں میں زندگی کا دھارا کیا ہے جہاں اب تک اسلامی تعزیرات و حدود کا نفاذ ہے۔ امریکہ برطانیہ فرانس اور دوسرے ممالک کا ریکارڈ جرائم کے لحاظ سے، چوروں ڈاکوں، قتل و غارت کے لحاظ سے کیا ہے اور نجد و حجاز اور کویت کا کیا ہے بدنام زمانہ لوٹ کھسوٹ، کشت و خون میں عرب کے بدو تھے لیکن اب روز روشن میں ان کو مہذب دنیا کے ڈاکوؤں سے کیا نسبت ہے۔ یہ خوش اعتقادی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ عقلی بات بھی یہی ہے کہ معاش معیشت اور معاشرت کا جو بہترین نظام اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور فرد و اجتماع دونوں کے لیے فراغ خاطری اور آسائش و سہولت کے جتنے مواقع بہم پہنچائے ان کے بعد بھی جو ظالم اللہ کی ان نعمتوں کی شدید ناشکری کر کے امن عامہ پر ڈاکے ڈالتا ہے اور اللہ کے بندوں کی جان و مال بجبر لینا چاہتا ہے ایسا خبیث الفطرت ایسی سخت سزا کا مستحق ہے۔

موجودہ زمانے میں جرم اور مجرمین کے لیے فلسفہ کے نام سے جو ہمدردانہ اور ملحدانہ نظریات پیدا ہو گئے ہیں یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ انسان بظاہر جتنا بھی ترقی کرتا جاتا ہے دنیا اتنی جہنم بنتی جا رہی ہے۔ اسلام اس قسم کے جاہل نظریات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اس کا قانون ہوائی نظریات پر نہیں بلکہ انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔

حدود زواجر ہیں کوافر نہیں

قانونی نقطہ نظر سے یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اسلام میں حدود کی حیثیت کیا ہے کیا ان کا مقصد جرائم پیشہ لوگوں کے جرائم پر پردہ ڈالنا ہے یا ان کی حیثیت معاشرے کو جرائم سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر ان کی حیثیت پہلی ہے تو پھر یہ کوافر ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس فرد کو یہاں اپنے جرم کے نتیجہ میں قرآنی سزا مل چکی ہے وہ پاک وصاف ہو گیا ہے اور آخرت میں اس سے کوئی بازپرس نہ ہوگی یعنی یہ سزا اس کے سارے گناہوں کے لیے پردے کا کام دے گی۔ اگرچہ اسلامی قانون کے بعض مدارس کا میلان بھی ہے لیکن ہمیں یہاں قرآن کی یہ آیت ان لوگوں کی مؤید بن کر نظر آتی ہے۔ جو کہتے ہیں کہ حدود کی حیثیت زواجر کی ہے یعنی ان کی مدد سے معاشرے کو برائیوں سے روکا جاتا ہے اس آیت میں دنیوی سزا بیان کر دینے کے بعد بتایا گیا ہے ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سزا تکفیر سیئات کا کام نہیں کرتی ہے۔ لیکن کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ محاربین کی خصوصیت ہے کہ ان کو دنیا و آخرت میں سزا ملے گی اور ان کی سزا ان کے گناہوں کا کفارہ نہیں ہوتی خواہ یہ مجرم مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ السیوطی نے ابن الفرس کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ محاربین کی سزا ان کے لیے کفارہ نہیں ہوتی ہے جبکہ دوسری حدود کفارہ ہو جاتی ہیں۔ عارف شعرانی نے المیزان میں شیخ الاسلام زکریا سے سنا ہے، کہ محاربین کے سوا دنیا و آخرت میں عذاب کسی کے لیے نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ۝

اے پیروان دعوت ایمانی اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو کہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو جاؤ۔ بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اگر ان کے قبضہ میں روئے زمین کی ساری دولت آجائے اور اتنا ہی اور بھی پھر یہ سب کچھ روز قیامت عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ دے دیں جب بھی ان سے قبول نہ کیا جائے

گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[۹۴] **وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے باہر نہ آسکیں گے ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔**[۹۵]

اسلام کی سب سے بڑی ذمہ داری

پہلی آیت میں تعزیری قانون بتایا گیا تھا، اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ تعزیری قوانین انسان کی حیات خارجی اور باطنی زندگی کی اصلاح نہیں کرتے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو صرف تعزیرات سے درست نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ خود انسان کا نفس بھلائی کی طرف مائل اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی روشنی سے منور نہ ہو جائے۔ تعزیری قوانین بیکار ہیں جب تک کہ افراد اور نظام دونوں کی اصلاح ساتھ ساتھ نہ ہو۔ وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو محض تعزیری قوانین کی مدد سے تمدن کے جملہ مسائل و مشکلات کا حل دریافت کرنا چاہتا ہو۔ اسلام کا مقصد انسان کی تکمیل ذات اور تسخیر نفس ہے اور تعزیری قوانین اس مقصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ وہ خارجی زندگی اور باطنی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے بھی اپنا ایک اصلاحی نظام رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ افراد کی تکمیل ذات اور ان کی شخصیتوں کے نشوونما کا مناسب انتظام کرے کیونکہ نظامات درست نہیں ہو سکتے جب تک افراد درست نہ ہو جائیں۔ زندگی میں تعزیری قوانین اس وقت تک بیکار ہوں گے جب تک پاکیزہ شخصیت اور عمدہ سیرت کے نشوونما کا سامان نہ ہو۔ بہتر سے بہتر تعزیری ڈھانچہ بھی برے نتائج پیدا کر سکتا ہے اگر اس نظام کو چلانے والے افراد نیک نیت، ایماندار، مجاہد، قرب الٰہی کے متلاشی، زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے نہ ہوں یا بحیثیت مجموعی ان اخلاقی صفات سے عاری ہوں جن کے بغیر اسلامی نظام کا قیام غیر ممکن ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے صرف خدا کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا ہے بلکہ انہیں دنیا کی اجتماعی صلاح و فلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کا

عہدہ برآ ہونے کے لیے ہیئت اجتماعی میں وہ تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جاتے کہ وہ اپنے اقرار میں سچے ہیں۔ اسلام صرف طرز فکر نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک راہ عمل ہے جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ تبدیلی کی اسی کوشش کا نام جہاد ہے اور جہاد اسلامی زندگی کا اصل الاصول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضہ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جاتے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے اسی لیے قرآن نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں خدا کی نافرمانی سے بچو اور طاعات و اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرو اور اس کے ساتھ راہ خدا میں خوب محنت کرو، جانیں کھپاؤ، اوقات لگاؤ، اموال خرچ کرو اگر تم نے یہ کام کر لیے تو فلاح یقینی ہے۔

۹۲۔ اے پیروان دعوت ایمانی اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو تاکہ تم کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ۔ وسیلہ کی تفسیر ابن عباس، مجاہد، ابووائل حسن وغیرہم اکابر سلف نے قرب سے کی ہے تو وسیلہ ڈھونڈھنے کے معنے یہ ہوں گے! اس کا قرب و وصول تلاش کرو، قتادہ نے کہا ای تقربوا الیہ بالطاعۃ والعمل بما یرضیہ یعنی خدا کی رضا حاصل کرو اس کی فرمانبرداری اور پسندیدہ عمل کے ذریعے سے ایک شاعر کہتا ہے:

اذا غفل الواشون عدنا لوصلنا
وعاد التصافی بیننا والوسائل

اس میں بھی معنے قرب و اتصال کے مراد ہیں اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ وسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ منزل ہے جو دنیا میں سے کسی ایک بندے کو ملے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اذان کے بعد میرے لیے خدا سے وہی مقام طلب کیا کرو۔ تو اس مقام کا نام بھی وسیلہ اسی لیے رکھا گیا ہے کہ جنت کی تمام منزلوں میں وہ سب سے زیادہ عرش رحمان کے قریب ہے اور حق تعالیٰ کے مقامات قرب میں سب سے بلند واقع ہوا ہے۔ بہرحال پہلے فرمایا کہ ڈرتے رہو اللہ سے لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ اور بچھو سے ڈرتا ہے اور شیر بھیڑیے سے ڈر کر بھاگتا ہے اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اس کی خوشنودی اور رحمت سے دور نہ جا پڑو۔ اسی لیے اتقوا اللہ کے بعد وابتغوا الیہ الوسیلہ فرمایا یعنی اس کی ناخوشی اور بعد و ہجر سے ڈر کر قرب و وصول حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کسی چیز سے ہم قریب اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ درمیانی راستہ قطع کر لیں جس پر چل کر اس کے پاس پہنچ سکتے ہوں اسی کو فرمایا وجاہدوا فی سبیلہ۔

جہاد کرو اس کی راہ میں یعنی اس پر چلنے کی پوری پوری کوشش کرو لعلکم تفلحون تاکہ تم اس کی نزدیکی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو۔ پچھلے رکوع کے آخر میں ان لوگوں کی دنیوی اور اخروی سزا بیان کی تھی جو خدا اور رسول سے جنگ کرتے اور ملک میں بدامنی اور فساد پھیلاتے ہیں۔ اس رکوع میں مسلمانوں کو ان سزاؤں سے ڈرا کر بتلایا گیا کہ جب شقی اور بدبخت لوگ خدا و رسول سے جنگ کریں تو تم خدا اور رسول کی طرف ہو کر جہاد کرو وہ اگر زمین میں فساد پھیلاتے ہیں تو تم اپنی کوشش اور حسن عمل سے امن و سکون قائم کرنے کی فکر کرو۔[1]

ہمارے نزدیک ہیں یہاں چونکہ اہل ایمان مخاطب ہیں اس لیے اتقائے کے معنے صرف ڈرنے کے نہیں بلکہ خدا کی نافرمانی سے دامن بچانے کے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو اپنایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تقویٰ جب طاعت کے ساتھ آتا ہے تو اس سے مراد محرمات سے بچنا اور منہیات کو چھوڑنا ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی روح المعانی میں یہی لکھا ہے۔

اللہ نے اہل ایمان کو اپنے اعمال میں متقی بن کر رہنے کا حکم دیا ہے

حضرت عمر نے ابی بن کعب سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے انھوں نے کہا کہ اما سلکت طریقا ذا شوک؟ تم کبھی ایسے راستہ میں نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں فرمایا ہاں چلا ہوں بولے کہ فما عملت اس حالت میں تم نے کیا کیا، فرمایا شمرت و اجتھدت میں نے کوشش کی کہ دامن سمیٹ کر نکل جاؤں کہا فذالک التقویٰ بس یہی تقویٰ ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں چپہ چپہ پر خدا کی نافرمانیوں کے کانٹے بچھے ہوں ان سے بچنا اور ہٹ جانا ہی تقویٰ ہے۔ گویا تقویٰ نام ہے محرمات و منہیات اور رذائل سے دامن کو بچا کر رکھنے کا۔

اس آیت میں فلاح اور کامیابی کی راہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان رکھتے ہوتے اگر

۱۔ تمہارا دامانِ ایمان رذائل سے پاک ہو،

۲۔ فضائل اعمال و اخلاق کی متاع تمہارے دامن میں ہو۔

اور ان دونوں کو رکھتے ہوئے اللہ کی راہ میں تمہاری محنتیں اور کوششیں لگ رہی ہوں تو پھر دین و دنیا میں فلاح و کامیابی کی تمہیں امید رکھنی چاہیئے اور اگر یہ نہیں تو پھر بنی اسرائیل کی طرح اس خوش فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہمارے پاس نسبی شرافت ہے اور ہم پیغمبر زادے ہیں کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اندریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

ان چاروں میں ترتیب طبعی ہے پہلے فکر صحیح یعنی ایمان پھر رذائل سے بچنا، پھر فضائل کا اثاثہ فراہم کرنا اور ان کے ساتھ محنت اور تگ ودو کرنا، کامیابی کی ساری عمارت ان ہی چار سے بنتی ہے۔

وابتغوا الیہ الوسیلۃ میں اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ اور احوال صادقہ فراہم کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

وسیلہ کے لغوی معنے

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ وسیلہ نام ہے رغبت اور چاہت کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچنے کا، اگر رغبت کے بغیر پہنچتا ہے تو پھر وسیلہ نہیں بلکہ وصیلہ ہے۔ یہ لفظ قربۃ کی طرح ہے۔ اور لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے کہ وسیلہ مرتبہ درجہ اور قربت کا نام ہے وسّل فلان الی اللہ وسیلہ کے معنے ہیں ایسا عمل کیا جس سے اللہ کا قرب حاصل ہو گیا۔ لبید شاعر کہتا ہے :

ارى الناس لا يدرون ما قدر امرهم ؟

بلى كل ذى راى الى الله واسل ،

شارحین قرآن نے بھی وسیلہ کے یہی معنے بتائے ہیں۔ حافظ ابن جریر لکھتے ہیں کہ وسیلہ بمعنے قربت ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں الوسیلۃ القربۃ مفسرین قرآن میں ابو وائل، الحسن، مجاہد، قتادہ، عطا ابن ابی رباح، ابن زید اور عبداللہ ابن کثیر نے بھی یہی معنے بتاتے ہیں۔ اللہ سے قربت کا بہترین ذریعہ احکام الٰہی کی تعمیل اور اعمال صالحہ ہیں۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے ذریعے درجات میں اللہ کا قرب تلاش کرو، اور اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ کی فراہمی کا طریقہ صرف ایک ہے کہ نبوت کی راہ سے آتے ہوتے علم و عمل سے زندگی میں بھرپور وابستگی ہو۔ بہرحال وسیلہ کے معنے قرب کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ زندگی میں نبوت کے لائے ہوتے علم و عمل کے مطابق اعمال صالحہ کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرو اور فضائل پیدا کرو، الغرض وسیلہ کے معنے قرب کے ہیں اور فقرے کے معنے یہ ہیں کہ اللہ کا قرب تلاش کرو، وسیلہ کے معنے ذریعہ کے نہیں ہیں جیسا کہ ہم اردو میں بولتے ہیں کہ فلاں کے وسیلہ سے مجھے کامیابی ہو گئی۔ لوگوں نے قرآن میں عربی کے وسیلہ کو اردو کا وسیلہ سمجھ کر اس کی نئے انداز میں تشریح کی ہے اور اس آیت گرامی کو بزرگوں سے استعانت اور استغاثہ کا سہارا بنا لیا ہے۔ آیت قرآنی کا منطوق تو اپنی

جگر بے غبار ہے لیکن خود وسیلہ یعنے ذریعہ کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ وسیلہ یعنے ذریعہ کے تین مطلب ہیں ایک یہ کہ کسی مخلوق سے مانگے اور دُعا و طلب گاری کے لیے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلائے یہ بالاجماع حرام ہے اور اس موضوع پر اُمت میں دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ کسی شخص سے دُعا کی درخواست کرنا، یہ ایسے شخص کے حق میں جائز ہے جس سے دُعا کی درخواست ممکن ہو، میت میں یہ امکان چونکہ کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے اس لیے میت سے یہ دعائی توسل جائز نہیں ہے۔ صحابہ کرام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دُعا کی درخواست کرتے تھے۔

تیسرے یہ کہ اللہ سے دُعا کرنا کہ اے اللہ اس مقبول بندے کے طفیل میرا یہ کام کر دے۔ جمہور کے نزدیک یہ جائز ہے لیکن حافظ ابن تیمیہ اسے ناجائز کہتے ہیں اور اس موضوع پر قاعدۃ جلیلۃ فی التوسل والوسیلہ کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا ہے لیکن اقسام، استعانت، استغاثہ اور توسل میں کوئی فرق نہیں کیا۔ جو لوگ جائز کہتے ہیں ان کا موقف یہ ہے کہ توسل میں کسی مخلوق سے کچھ نہیں مانگا جاتا اور نہ مخلوق سے مدد لی جاتی ہے صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اے اللہ ہماری یہ دُعا فلاں نیک بندے کے طفیل قبول فرما لے اور یہ بھی یاد رہے کہ اختلاف صرف جواز میں ہے ورنہ دُعا میں اس انداز کے مسنون اور مستحب ہونے کا کوئی مدعی نہیں ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جواز میں کوئی نقلی اور عقلی خرابی نہیں ہے۔ البتہ عوام کو دینی مصلحت اور انتظام شریعت کے لیے منع کیا جاتے تو ہم بھی حافظ ابن تیمیہ کے ساتھ ہیں لیکن گفتگو کا موضوع مسئلہ کی تحقیق ہے اور وہ جواز ہے

اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مشہور محدث علامہ قاضی محمد بن علی الشوکانی کے رسالہ الدر النضید سے اس مسئلہ کی تحقیق نقل کر دیں، انہوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اچھا بھی ہے معتدل بھی ہے اور خالص علمی رنگ میں ہے۔ ان کے ایک دوست نے ان سے اس موضوع پر سوال کیا ہے اور انہوں نے اس کا جواب دیا ہے۔ اگرچہ جواب استعانت، استغاثہ، تشفع اور توسل کے ابحاث پر مشتمل ہے لیکن ہم ان کی توسل سے متعلق رائے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں،

توسل کسی بندے کا اپنے پروردگار سے کوئی چیز طلب کرنے کیلئے کسی دوسرے بندے کو بطور وسیلہ استعمال کرنا، اس کے بارے میں شیخ عزالدین ابن عبدالسلام کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی سے توسل کرنا جائز نہیں ہے بشرطیکہ وہ حدیث جو اس پر دلالت کرتی ہے صحیح مان لی جائے اور غالباً ان کا مقصود وہ حدیث ہے جو نسائی

نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں بیان کی ہے اور اسے درست قرار دیا ہے اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی اسے روایت کیا ہے کہ

ایک نابینا حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری بینائی جاتی رہی ہے میرے لیے اللہ سے دعا کیجئے، حضور نے اس سے فرمایا کہ وضو کر دو رکعت نماز پڑھ اور کہہ

اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک محمد انی استشفع بک فی رد بصری اللھم شفع النبی فی

اے اللہ میں آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اے محمد میں آپ کی شفاعت چاہتا ہوں اپنی بینائی کے لوٹنے میں اے اللہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے حق میں میرا شفیع بنائیے۔

اور اس کے بعد اسی نابینا سے حضور نے فرمایا کہ اگر تیری کوئی حاجت ہو تو اسی طرح کر لے اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی لوٹا دی۔

اور توسل کے بارے میں دو رائیں ہیں۔

اول توسل وہی ہے جس کا ذکر حضرت عمر بن الخطاب سے صحیح بخاری میں ہے کہ اے پروردگار بارش نہ ہونے کے وقت ہم تیرے رسول کو تیری بارگاہ میں بارش کی دعا کے لیے لاتے تھے اور تو ہم پہ باران رحمت نازل فرماتا تھا اب چونکہ وہ ہم میں نہیں ہیں اس لیے ان کے چچا عباس کو لاتے ہیں تو گویا حضرت عمر کا توسل بارش کے لیے دعا کرانا تھا یعنی اللہ کی بارگاہ میں حضرت عباس وسیلہ تھے یعنی حضرت عباس ان سب کے ساتھ مل کر دعا کرتے تھے اور حضرت عمر بھی ان کی معیت میں دعا کرتے تھے۔ یعنی دعا میں صرف شرکت ہی توسل تھی اور بس۔

دوسرا توسل یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد بھی اور آپ کی موجودگی میں اور آپ کی عدم موجودگی میں یکساں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل ہو سکتا ہے اور یہ امر مخفی نہیں کہ حضور انور کی زندگی میں آپ سے توسل اور آپ کے بعد کسی دوسرے سے توسل صحابہ کے اجماع سکوتی سے ثابت ہے کیونکہ حضرت عمر نے جب حضرت عباس سے توسل کیا تو کسی نے آپ کو نہیں ٹوکا۔

میرے نزدیک شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی رائے کہ آپ کے سوا کسی دوسرے سے توسل جائز نہیں ہے صحیح نہیں ہے اور اس کے دو وجوہ ہیں۔

۱۔ صحابہ کا اجماع جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے شیخ کی رائے کے خلاف ہے

۲۔ اللہ کی بارگاہ میں اہل فضل و علم سے توسل کرنا فی الحقیقت ان کے اعمال صالحہ اور مزایائے فاضلہ کا توسل ہے کہ ہر بزرگ اعمال ہی کے باعث بزرگ ہوتا ہے لہٰذا جب کہنے والا کہتا ہے کہ لے اللہ میں فلاں عالم کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتا ہوں تو وہ باعتبار اس کے علم کے ہوتا ہے۔ صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غار کے تین پناہ گزینوں کا ذکر فرمایا جن کے غار کے منہ پر پتھر آگیا تھا تو ان میں سے ہر ایک نے اپنے سب سے بڑے عمل سے توسل کیا تو خدائے ذوالجلال نے اسے قبول فرمایا اور پتھر کو غار کے منہ سے ہٹا دیا۔ لہٰذا اگر شیخ عزالدین بن عبدالسلام یا ان کے متبعین مشددین کا خیال صحیح اور اعمال صالحہ کا توسل شرک یا ناجائز ہو تو ان کی دعا کیوں قبول ہوتی اور وہ پتھر کیوں ہٹتا۔ اور حضور انور واقعہ بیان فرمانے کے بعد اس کا انکار کیوں نہ فرماتے۔

اللہ کی بارگاہ میں انبیاؑ و صلحاء کا توسل پر منکرین اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں۔ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔

اور فلا تدعوا مع اللہ احداً اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔

اور لہ دعوۃ الحق والذین یدعون حقیقی پکار تو اللہ کے لیے ہے اور جن کو وہ اللہ کے من دونہ لا یستجیبون لھم بشیٔ سوا پکارتے ہیں وہ ان کی کسی چیز کو قبول نہیں کر سکتے

لیکن یہ اعتراضات اس قسم کے توسل پر وارد ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسے محل نزاع میں دلیل بن سکتے ہیں جو یہاں موجود نہیں کیونکہ پہلی آیت ما نعبدھم بتا رہی ہے کہ وہ حصول تقرب کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے اور معلوم ہے کہ عالم کے ساتھ توسل کرنے والا اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ یہ جانتا ہے کہ اسے فقط علم کی وجہ سے قربت حاصل ہے اسی لیے وہ اس سے توسل کرتا ہے اور اسی طرح فلا تدعوا مع اللہ احداً میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو پکارا جائے مثلاً یا اللہ اور یا فلاں اور عالم کے ساتھ توسل کرنے والا سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں پکارتا بلکہ اس سے توسل صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ صاحب عمل صالح ہے گویا عامل کی ذات سے نہیں بلکہ اس کے عمل صالح سے توسل کیا جاتا ہے جیسا کہ غار میں گرنے

والے تین آدمیوں نے کیا۔

اور ایسے ہی اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد والذین یدعون من دونہ بتا رہا ہے کہ یہ کفار ان کو پکارتے تھے جو ان کا جواب نہیں دے سکتے تھے اور اپنے پروردگار کو نہیں پکارتے جو ان کا جواب دے سکتا ہے اور معلوم ہے کہ بزرگ اور عالم سے توسل کرنے والا سوائے اللہ کے کسی کو نہیں پکارتا، نہ وہ غیر اللہ کو پکارتا ہے اور نہ غیر اللہ سے دعا کرتا ہے۔

اس تقریر سے مانعین توسل کی اور تمام دلیلیں بھی بیکار ہو جاتی ہیں مثلاً ان کا استدلال مندرجہ ذیل آیت سے

یوم لا تملک نفس لنفس شیأً والامر یومئذ للہ۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یوم الدین کو امر اللہ تعالیٰ کے لیے منفرد ہو جائے گا اور اس کے سوا کسی معاملے میں کسی کو کوئی قدرت نہیں اور انبیاء میں سے کسی نبی یا علماء میں سے کسی عالم سے توسل کرنے والا بھی یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ اس کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کا امر یوم الدین میں شریک ہے۔ کیونکہ جو شخص ایسا عقیدہ رکھے چاہے وہ انبیاء کے بارے میں یا دوسرے اشخاص کے بارے میں تو وہ نہایت سخت فاش گمراہی میں مبتلا ہے۔

اسی طرح ان کا استدلال منع توسل کے بارے میں لیس لک من الامر اور قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً سے بھی درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امر الٰہی میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن ان سے آنحضرت سے توسل کرنے یا آپ کے سوا انبیاء اور اولیاء سے توسل کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی ہے[1]

توسل کا انکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار ہے اور شفاعت کا انکار قرآن کا انکار ہے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود یعنی شفاعت عظمیٰ کے اعزاز سے مشرف فرمایا ہے اور لوگوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس شرف عظیم کی درخواست کریں اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ مقام محمود کی درخواست

---

[1] یہاں تک ترجمہ ہم نے الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید کے اس ترجمہ سے نقل کیا ہے جو مشہور اہلحدیث عالم مولانا محمد علی ایم اے کنٹب سوداگر حرم مکی نے کیا ہے اور جو لاہور سے ۱۹۳۲ء میں جمعیت تبلیغ دعوۃ اسلام نے شائع کیا ہے اس سے آگے وہ ترجمہ ہے جو العدل ۲۹ جون ۱۹۳۲ء میں شائع کیا ہے۔

کیا کر دو آپ کر دیا جائے گا اور اُمت کے حق میں آپ کی سفارش منظور کی جائے گی، ہاں شفاعت کا حق اللہ سبحانہٗ کی اجازت سے ہوگا پھر خاص اس کو جس کے لیے اللہ منظور فرمائیں۔

اسی طرح منکرین کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کر انی لا اغنی عنکم من اللہ شیئاً میں تمہیں اللہ سے ہرگز نہیں بچا سکتا۔ پیش کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ جواز توسل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ جب کسی کو اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو میں اس کے خلاف نہیں کر سکتا اور یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ توسل ناجائز ہے کیونکہ متوسل کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ وسیلہ امر الٰہی میں دخیل ہے بلکہ اس کا تو مطلب ہوتا ہے کہ اختیار کل صرف اللہ کو حاصل ہے اور میں اسی سے درخواست کرتا ہوں۔ ہاں پہلے ایسے شخص کے عمل کو پیش کرتا ہوں جو اللہ کے ہاں مقبول ہے اور بس تاکہ وہ اجابت دعا کا سبب یعنی وسیلہ بن جائے۔[1]

بہرحال اس پر تو جملہ اکابر علماء و محدثین اور فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ دعا میں توسل بالاعمال الصالحہ درست ہے جس کے استدلال میں صحیحین کی وہ روایت شاہد ہے جس میں تین آدمیوں کا ذکر ہے جو کسی پہاڑ کے غار میں پھنس گئے تھے اور اعمال صالحہ کا توسل کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگی اور اس مصیبت سے رہائی پائی۔ یہ تو امر متفق ہے ہاں اس میں بعض حضرات کا اختلاف ہے کہ توسل کسی کی ذات کے ساتھ کرنا درست ہے یا نہیں۔ جمہور علماء محدثین اور فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی دعا میں یوں کہے کہ الٰہی بحرمت فلاں یا بوسیلہ یا بواسطہ یا بعد قہ یا بحق فلاں میرا یہ کام کر دے تو ایسا کرنے میں کوئی خرابی نہیں یہ جائز اور مباح ہے۔ دعا کا اصل قاعدہ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے دعا کرنے والا اللہ کی حمد و ثنا کرے اس کے بعد درود شریف پڑھے پھر دعا مانگے، جیسا کہ احادیث میں صراحۃً کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ یہ درود شریف کا پڑھنا بھی ایک قسم کا توسل ہے۔

جوازِ توسل کے دلائل

اب ہم یہاں اس موضوع پر قرآن و حدیث اور بزرگانِ دین کے کچھ اقوال ذکر کرتے ہیں تاکہ مسئلہ کی حقیقت بالکل واضح ہو جائے۔

---

[1] الدر النضید

قرآن میں ہے

کذالک حقا علینا ننج المومنین اسی طرح ہم پر حق ہے کہ ہم ایمان والوں کو بچائیں۔ اس آیت کی تشریح میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں

یہ ایسا حق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کریم پر لازم کرلیا ہے

قرآن میں دوسری آیت ہے۔

وکان حقا علینا نصر المومنین

حق ہے ہم پر ایمان والوں کی مدد کرنا۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کے تحت مشہور محدث ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حضرت ابوالدرداء کی روایت نقل کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ

میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عزت و ناموس کی طرف سے دفاع کرے گا تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ قیامت کے روز اس سے جہنم کی آگ ہٹائے، پھر آپ نے یہی آیت قرآنی تلاوت فرمائی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک گدھے پر سوار تھا۔ میرے اور آپ کے درمیان صرف پالان کے پچھلے حصہ کا فاصلہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

معاذ جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے

معاذ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جب وہ شرک نہ کریں تو اللہ ان کو بخش دے۔ (بخاری و مسلم)

مسند احمد اور ترمذی میں حضرت ثوبان کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

جو مسلمان صبح و شام تین بار رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و محمد نبیا" کہے گا تو اللہ پر حق ہے کہ ایسے شخص کو قیامت کے دن راضی کرے۔

ترمذی میں حضرت معاذ بن جبل کا بیان ہے کہ حضور کا ارشاد ہے:

جس نے رمضان کے روزے رکھے، نماز ادا کی، بیت اللہ کا حج کیا، معاذ

کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ حضور نے زکوٰۃ کا ذکر کیا یا نہیں تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اس بندے کو بخش دے خواہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرے یا اپنے ملک میں رہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے قاعدہ جلیلہ فی التوسل والوسیلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی مخلوق کے حوالے سے اللہ سے نہ مانگے اور یوں نہ کہے کہ اے اللہ میں آپ سے بحق انبیاء سوال کرتا ہوں۔ ایسی عبارت فقہ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ دراصل فقہا کی یہ تعبیر علی الاطلاق نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فقہا معتزلہ کے عقیدے کی تردید کرتے ہیں کیونکہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ جو چیز بندے کے لیے اصلح ہو وہ اللہ پر حق ہے اسی کی تردید کے لیے فقہا نے یہ تعبیر اختیار کی ہے لیکن وہ حق جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و احسان سے اپنے ذمے لیا ہے اس کی تردید نہیں احادیث بالا میں اسی حق کا ذکر ہے یعنی حق التفضل والکرم لا حق الوجوب۔ توسل میں یہی حق دعا مانگنے والا استعمال کرتا ہے ظاہر ہے کہ فقہاء کے پیش نظر باطل فرقے مجبرہ اور معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اس کی تردید منظور ہے نہ کہ مطلقاً عدم جواز، ورنہ ان مذکورہ بالا حدیثوں کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے گا۔

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

اور دعا کے آداب میں یہ ہے کہ دعا مانگنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توسل کرے تاکہ دعا مستجاب ہو۔

مولانا مدنی کی قیمتی تحقیق

حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی توسل کی نہایت ہی قیمتی تحقیق فرمائی ہے، فرماتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ لفظ حق متعدد معنوں میں آتا ہے۔

واجب عقلی، واجب شرعی، مستحق، ثابت، مشابہ بالواجب، موجود، احترام اور اہتمام بالشان۔

عربی زبان میں لفظ حق مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شراح حدیث عینی قاری اور عسقلانی وغیرہ اور قاموس، لسان العرب، مجمع البحار وغیرہ علمار لغت فرماتے ہیں کہ واجب عقلی کے معنے میں سلف میں اختلاف ہوا۔ معتزلہ چونکہ عدل اور اصلح کو اللہ تعالیٰ پر عقلاً واجب قرار دیتے ہیں اس لیے اہل توحید کی مغفرت کو اللہ تعالیٰ پر واجب کہتے ہیں اور یہ حق بندوں کا اس پر لازم بالالزام

العقلی قرار دیتے ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کسی فعل کو اللہ تعالیٰ پر عقلاً اور ذاتاً واجب نہیں کہتے اس لیے یہ دعا کرنا اللھم انی اسئلک بحق الانبیاء والمرسلین اہل اعتزال کے موافق ہوگا۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہوگا۔ قرون تابعین اور تبع تابعین میں معتزلہ کا بہت زور و شور تھا اس لیے فقہاء نے سداً للذریعہ منع فرما دیا تھا اب جبکہ ان کے عقائد معدوم ہوگئے تو اشتباہ ہی معدوم ہوگیا تو اس لفظ کے استعمال میں پہلے معنے کے ارادہ کرنے کا احتمال ہی نہیں بلکہ دوسرے معانی ہی لیے جاتے ہیں اس لیے اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ شرح نقایہ جلد ثانی کتاب الکراہیہ میں ہے ،

حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ دعا میں بحق فلاں کہنا ناجائز ہے خواہ نبی ہو یا ولی ، اور ایسے ہی بحق البیت الحرام یا بحق المشعر الحرام کہنا ناجائز ہے کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بے شک ان کا حق وجوباً نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کا حق بتایا ہے یا حق سے مراد حرمت ہے تو پھر یہ وسیلہ کے باب سے ہوگا اور آداب دعا میں توسل بتایا گیا ہے جیسا کہ الحصن الحصین میں ہے ۔

علامہ ابن عابدین الشامی رد محتار میں رقمطراز ہیں ۔

اس مسئلہ میں امام ابو یوسف نے جواز کا موقف اختیار کیا ہے اور فتاوی تاتارخانیہ میں ہے کہ اس موضوع پر ایسے آثار آئے ہیں جن سے جواز معلوم ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وجوبی حق اللہ تعالیٰ پر کسی کا نہیں لیکن اس نے اپنے فضل سے ان کا حق اپنے ذمہ لیا ہے اور یا حق سے مراد حرمت ہے اور یہ باب وسیلہ سے ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعا میں بحق فلاں یا بحرمت فلاں کہنا نہ صرف جائز ہے بلکہ وارد اور مستحسن ہے[1] یہ بات دھیان میں رہے کہ دعا میں انبیاء کا توسل صرف جائز ہے اور ساری گفتگو جواز ہی کے اردگرد گھوم رہی ہے ورنہ توسل کے وجوب ، سنت اور استحباب کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اسی بنا پر فاروق اعظم نے حضرت عباس کی دعا کا توسل اختیار کیا تھا۔ کیونکہ زندہ کا دعائی توسل ایک مسنون پیمانہ تھا۔ اس پیمانہ کو چھوڑ کر محض جائز کو اختیار نہیں کیا یعنی بے شک یہ جائز تھا کہ حضرت عمر یوں

---

[1] فیوضات حسنی

دعا کر لیتے کہ اے اللہ بحرمت النبی باران رحمت نازل فرما دے مگر آپ نے افضل صورت کو اختیار کیا۔ بہر حال یہ ایک ضمنی بحث تھی ورنہ آیت قرآنی کے منطوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کچھ پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی وجہ سے یہاں چند اشارات لکھ دیئے گئے ورنہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ کا مطلب صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا قرب تلاش کرو اور اس قرب کا ذریعہ ایمان و اعمال صالحہ ہیں اور ایمان و عمل میں مدار ہدایت نبوت کا لایا ہوا علم و عمل ہے اور نبوت کے علم و عمل کا موضوع ذات پیغمبر ہے اس طرح ذات نبوت بھی وسیلہ ہے اور ذات نبوت تک پہنچنے کی جس قدر راہیں ہیں وہ سب وسائل ہیں۔ صحابہ کرام، تابعین عظام، مجتہدین، محدثین، صوفیائے کرام، مفسرین قرآن حتیٰ کہ علوم آلیہ اور عالیہ کے مؤلفین و شارحین اشارۃً وسیلہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ جن بزرگوں نے مشائخ طریقت کو وسیلہ کہا ہے اسی معنے کے اعتبار سے کہا ہے مثلاً مولانا اسماعیل شہید فرماتے ہیں کہ

> مرشد بلاشبہ راہ خدا کا وسیلہ ہے قرآن میں ہے وابتغوا الیہ الوسیلۃ اس آیت میں فلاح کے لیے چار چیزیں مقرر فرمائی ہیں۔ ایک ایمان، دوسرا تقویٰ، تیسرے طلب وسیلہ اور چوتھے اللہ کی راہ میں جہاد، اہل سلوک اس آیت سے اشارہ سمجھے ہوئے مرشد کو وسیلہ گردانتے ہیں۔

اور ایسی ہی بات شاہ ولی اللہ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم سے بھی منقول ہے۔ بہر حال یہ اس آیت کا مفہوم تو ہو سکتا ہے مگر اس کا منطوق وہی ہے جو عرض کر دیا گیا۔

جہاد اور اس کی قسمیں

چوتھی بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے وہ وجاھدوا فی سبیلہ یعنی اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔ یہ دنیا خیر و شر کا مسکن ہے یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں ہیں اور برائی کی بھی، اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کے لیے پوری آزادی ملی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور باہم ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت کو قبول نہ کیا جائے بلکہ سرے سے اس دعوت کو برداشت ہی نہ کیا جائے اس لیے قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں اہل ایمان کا رویہ کیا ہو۔ قرآن اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی کوشش کی جائے مسلسل کی جائے اور

آخری حد تک کی جاتے اسی کوشش کو قرآن و سنت کی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔ جہاد کے لفظی معنے ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی اپنی کوششیں صرف کی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جاتے۔ اس لیے راہِ خدا میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کر دینے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالے جو بس میں ہو۔

ظاہر بات ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جو جدوجہد کی جاتی ہے اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے جیسے حالات ہوتے ہیں انہی کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ موقع پرستی نہیں ہے بلکہ عین اصول پسندی ہے کیونکہ کوئی جدوجہد محض جدوجہد کی خاطر نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے اور کسی مقصد کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جدوجہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو ورنہ جدوجہد میں تو سب کچھ لگا دیا جاتے گا مگر اس کا حاصل شاید ہی کچھ نکلے اور یہ یقیناً کوئی دانشمندی کی بات نہ ہوگی اور جو بات دانشمندی کی نہیں ہوتی وہ اصول پسندی کی بھی نہیں ہو سکتی اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کب کیا ہو؟ اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی جو مختلف قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ تین ہیں۔ داخلی جہاد، دعوتی جہاد، مسلح جہاد،

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے میں جو برائیاں سر اٹھاتی نظر آئیں ان کے خلاف آواز اٹھائی جاتے اور انہیں مٹا دیا جاتے۔ کیونکہ اندر کی برائیاں اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرے سے برائیاں مٹانے کے لیے یہ ہدایت دی ہے کہ:

> مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا اس کو اپنی اُمت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقہ کو مضبوطی سے اختیار کیے رہتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آتے جن کا حال یہ ہوتا کہ کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کی ان کو ہدایت نہ ہوتی، لہٰذا جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے

اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا
وہ بھی مومن ہے اس کے بعد ایمان کا رائی برابر بھی درجہ نہیں ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد صرف ایک خبر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ہدایت اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مقصد امت کو یہ بتانا ہے کہ آئندہ چل کر اسے بھی اگر ایسے ہی حالات درپیش آئیں تو اسے کیا کرنا چاہیے ۔

اس حدیث سے دو باتیں صاف اور کھل کر سامنے آتی ہیں

ایک تو یہ کہ مسلم معاشرے کے اندر جو برائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش جہاد ہے ۔

دوسرے یہ کہ اس جہاد کی عملی صورتیں کیا ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایمانی مرتبہ کیا ہے سب سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس برائی اور ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اتنی جرأت نہ ہو کہ کسی معنے اور کسی صورت میں بھی ہاتھ کی قوت استعمال کی جاسکے تو پھر زبان کی قوت سے کام لیا جائے ، برائی کو کھلم کھلا برائی کہا جائے ، نصیحت کی جائے سمجھایا جائے ، آخرت یاد دلائی جائے ، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرایا جائے اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجر و توبیخ بھی کی جائے اور اگر اتنی بھی ہمت نہ ہو تو ایسا لازماً کیا جائے کہ اس برائی کے خلاف دل بے چینی سے بھر جائے ، آنکھوں میں وہ کانٹا بن کر چبھتی رہے ، آرزو کی جائے کہ یہ برائی جلد مٹ جائے ، دعائیں کی جائیں کہ اللہ اپنے اس بندے کو شیطان کے حملے سے بچائے ۔ اس کے ضمیر کو زندہ اور اس کے ایمان کو بیدار کر دے تاکہ اس برائی سے اسے نفرت ہو جائے اور اس نحوست سے وہ اپنے کو پاک کرے ۔

مسلم معاشرے کو پاک کرتے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں ان میں سے ہر شکل جہاد ہے کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے کا ایک حصہ ہے اور ان کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے ۔

برائیوں کے مٹانے اور اچھائیوں کے بروئے کار لانے کی جن کوششوں کو یہاں جہاد کہا جارہا ہے اسی کا دوسرا نام قرآن و سنت کی زبان میں امر بالمعروف نہی عن المنکر ہے ۔

دعوتی اور فکری جہاد

فکری جہاد کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جن شبہات کو

پیش کیا جاتے ان کا مناسب جواب دیا جاتے اور کوئی ایسا ذہن نہ دیا جاتے جو اسلام کے چہرے کے لیے باریک سا حجاب بھی بن سکتا ہو۔ مکی دور تمام تر اسی جہاد کا دور تھا جب کہ اللہ سبحانہٗ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ

فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہٖ جھادا کبیرا۔

ان منکرین کا کہا نہ مانو اور قرآن کے ذریعے ان سے بھرپور جہاد کرو۔

قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے ان قرآنی نوامیس کو برابر پیش کرتے رہو جو اسلام کی سچائی کو اور ان کے وجوہ انکار کو بے وقعتی کو کھول کر رکھ دیتی ہیں اور اس طرز استدلال سے ان کے موقف کی کمزوری برابر عیاں کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھایا ہے یہ کام پورے زور کے ساتھ انجام دیتے رہو یہاں تک کہ انہیں اپنے انکار کے حق میں کہنے کے لیے کوئی نام کی بھی معقول بات نہ رہ جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو زبان کا جہاد فرمایا ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے، ابوداؤد میں ہے:

مشرکوں سے اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور زبانوں سے جہاد کرو۔

دعوتی اور فکری جہاد دراصل عقل و استدلال کے ہتھیاروں سے لڑنے کا نام ہے یہ لڑائی اس وقت تک لڑنی چاہیے جب تک کہ اسلام کی مخالفت کے سارے فکری اور استدلالی قلعے مسمار نہ ہو جائیں خواہ ان کا تعلق الٰہیات سے ہو اور چاہے طبیعیات سے، تمدن و تہذیب کے میدان کے ہوں یا معاشیات و سیاسیات کے، سائنس سے حاصل کیے ہوتے ہوں یا فلسفہ سے۔

مسلح جہاد

مسلح جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ روکنے والوں کے خلاف مسلح جنگ کی جاتے۔ اور اس وقت تک کی جاتے جب تک وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جاتے۔ یہ جہاد کی آخری شکل ہے اور اس کا دوسرا اصطلاحی نام قتال ہے اور عمل کے میدان میں یہ جہاد کی سب سے مشکل اور صبر آزما قسم ہے لیکن دین کے بقا کے لیے بہت ضروری ہے جیسا کہ اسی وقت واضح کر دیا گیا تھا جس وقت کہ اس مسلح جہاد کا سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا۔

کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم

یہ قتال اور مسلح جہاد اسلام اور اہل اسلام کے حق میں بہتر کس طرح ہے اس کی وضاحت ان دو رہنما آیتوں میں ملے گی جن میں قتال کی غایت بتائی گئی ہے مثلاً

و قاتلوا ھم حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ

یعنی جنگ کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ صاف ہو جائے اور فتنے کی حالت ختم ہو جائے فتنہ قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کی تفصیل آپ دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں۔

جہاں تک ان رکاوٹوں کا تعلق ہے جنہیں دور کرنے کے لیے مسلح جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر شخص محسوس کرے گا کہ وہ سب ایک ہی نوعیت کی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ان کے خلاف کیے جانے والے جہاد کی نوعیت بھی ایک سی نہ ہو گی بلکہ اس میں بھی فرق ہو گا۔ جائزہ بتاتا ہے کہ یہ رکاوٹیں اصولی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن کا تعلق اسلام لا چکنے والوں سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ جو لوگ اسلام لا چکے ہیں انہیں اسلام لانے کے جرم میں ستایا جاتے اور مطالبہ کیا جاتے کہ اسلام سے باز آ جاؤ اور اس غرض سے ان کے خلاف طاقت بھی استعمال کی جاتے۔ دوسری وہ جس کا تعلق غیر مسلم حلقوں سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو پیش ہی نہ کرنے دیا جاتے یا ان کے اوپر ایسا ایک اجتماعی نظام مسلط رکھا جاتے جس کے ہوتے ہوتے انہیں اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ہی نہ مل سکے اور جب رکاوٹیں دو طرح کی ہوتی ہیں تو ان ہی کی مناسبت سے جہاد بھی دو قسم کا ہو گا دفاعی اور اقدامی۔

ان دونوں قسموں پر تفصیلی بحث اور ان کی شرائط آپ کو انشاء اللہ سورۃ حج پارہ ۱۷ میں ملیں گے۔

کفر کے لیے عذاب کا اشتداد

۳۶ - بلاشبہ جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے اگر ان کے قبضے میں روئے زمین کی ساری دولت آ جائے۔ اور اتنا ہی اور بھی۔ پھر سب کچھ روز قیامت عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے دیں تو ان سے قبول نہ کیا جائے گا ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ انسان خدا سے ڈرنے اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے ہی سے فلاح و کامیابی کی امید کر سکتا ہے۔ اس آیت میں متنبہ فرما دیا کہ جن لوگوں نے خدا سے روگردانی کی وہ

آخرت میں اگر روئے زمین کے سارے خزانے بلکہ اس سے بھی زیادہ خرچ کر ڈالیں اور فدیہ دے کر عذاب الٰہی سے بچنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہوگا، غرض وہاں کی کامیابی تقویٰ، ابتغائے وسیلہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتی ہے رشوت اور فدیہ سے نہیں ہو سکتی۔[1]

موقعہ و محل دلیل ہے کہ یہاں راہ کفر اختیار کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے فلاح کی راہ ایمان، تقویٰ، قرب الٰہی کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ سے ہٹ کر بے بنیاد سہاروں اور خیالی سفارشوں کے اعتماد پر زندگی گزاری۔ کبھی اپنے نسب کے عالی ہونے اور کبھی اپنی نسبت کے اشرف ہونے کے خیال میں پڑ گئے اور یہ اُمید باندھ بیٹھے کہ فلاح ہمارے حصہ میں ہے، اور آخرت میں نجات کے لیے یہ چیزیں کافی ہیں ان کو غلط فہمی یہ ہے کہ مدار نجات اور معیار فلاح جس طرح اس دُنیا میں لین دین ہے ایسے ہی آخرت میں بھی دے دلا کر کام چل جائے گا قرآن بتا رہا ہے اور بار بار بتاتا ہے کہ کفر کا فدیہ آخرت میں نہ نسب سے ہوگا نہ نسبت سے جیسا کہ بنی اسرائیل کا خیال ہے اور نہ جاہ و منصب اور مال و دولت سے ہوگا جیسا کہ مشرکین کا خیال ہے مطلب یہ ہے کہ ان چار چیزوں کے بغیر نجات نہ ہوگی اگر یہ لوگ زمین کے تمام خزانے اور اس کے ساتھ انہی کے برابر مزید خزانوں کے مالک بن جائیں اور ان سب کو عذاب الٰہی سے بچنے اور چھٹکارے کیلئے فدیہ میں دیں جب بھی ان کا فدیہ قبول نہ ہوگا۔

کفر کے لیے عذاب کا امتداد

۹۵ - وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے باہر نہ نکل سکیں گے ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار مومنین ایک مدت تک دوزخ میں رہ کر پھر نکالیں جائیں گے اور حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے جنت میں داخل کر دے گا یہ آیت ان احادیث کے مخالف نہیں ہے کیونکہ یہاں شروع آیت سے صرف کفار کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مومنین کے متعلق اس آیت میں کوئی حرف نہیں ہے۔[2] پہلی آیت میں کفر کے لیے جس عذاب کے اشتداد کا ذکر ہوا تھا۔ اس آیت میں اسی عذاب کے امتداد کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل یہ آیت گرامی یہاں بطور استیناف بیانی آئی ہے یعنی اس میں دو جملوں

[1] ۔[2] افادات شیخ الاسلام

ہیں اٹھے ہوتے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ سننے والوں نے جب پہلی آیت سُنی تو فوراً ذہن میں سوال آیا کہ جب ان سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا تو پھر ان کا کیا بنے گا، جواب دیا کہ یہی بنے گا کہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔

پہلی آیت یعنی ان الذین کفروا۔ جو بطور ممارست لنز الی تھی مگر وہ استیناف اُٹھے ہوئے سوال کے جواب کے لیے نہیں بلکہ اپنے سے پہلی آیت کے مضمون کو موکد اور زور دار بنانے کے لیے ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ آخرت میں کامیابی کا مدار ایمان کے ساتھ رذائل سے بچنے فضائل کو اپنانے اور اللہ کی راہ میں ان تھک محنت پر ہے۔ یعنی مدارِ نجات خود انسان میں ہے انسان سے باہر نہیں ہے جیسا کہ کفار سمجھتے ہیں کہ فدیہ سے کام چل جائے گا۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ دُنیا و آخرت میں انسان کی جسمانی و روحانی سعادت کا رشتہ خود انسان کی اپنی ذات سے وابستہ ہے۔ عیسائیوں کے عقائد کے مطابق انسان کی نجات مسیح کے فدیہ میں ہے لیکن مسلمان کے اعتقاد میں انسانی سعادت کا مدار خود انسان کا ایمان و عمل صالح سے آراستہ ہونا ہے اسی راہ سے انسان رضائے الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ دُنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا مدار یہی ہے۔ شاید یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ دین تو انسان کو آخرت کی طرف جھکاتا ہے اور دُنیا سے بے پروا بناتا ہے۔ پھر اسے ایمان و تقویٰ، اعمال صالحہ اور اللہ کی راہ میں جہاد سے وابستہ ہونے کے نتیجے میں دُنیا کی فلاح کیسے مل سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے آپ کو آٹھویں پارے کا انتظار کرنا ہوگا لیکن یہاں یہ اصولی حقیقت ذہن نشین کر لیجیے کہ دولت یہ عزت، یہ اقتدار حکومت جنہیں دُنیا کی فلاح کہا جاتا ہے دین کی نگاہ میں بجائے خود محبوب چیزیں نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں اور اس کا فضل ہیں۔ چنانچہ قرآن نے آیات میں ان کو یہی حیثیت دی ہے۔ ابھی ابھی آپ ایک رکوع پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اذکروا نعمة اللّٰه علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا۔ اسی طرح آپ چودہویں پارے میں پڑھیں گے۔

ضرب اللّٰه مثلا قریة کانت اٰمنة مطمئنة یاتیها رزقها رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللّٰه

اس میں زندگی کی سہولتوں اور رزق کی فراوانیوں کو اللہ کی نعمتیں کہا گیا ہے۔

اور پھر یہ کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے اس کا منصب یہی ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام ہاتھ میں لے اور اسے اپنے مالک کے احکام کے مطابق چلائے۔

یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیرِ نظر خلش اس حد تک بالکل حل ہو جاتی ہے کہ دنیا کی عزت دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین داری سے منافی ہو، کیونکہ جو چیزیں اللہ کی نعمت اور اللہ کا فضل ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتیں۔

یہ تو ہوا دنیوی عزت و دولت کے فضل اور نعمت ہونے کا تقاضا۔

اب انسان کے پیدائشی منصب کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ اس کا تقاضا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہوتی رہے جس طرح کہ باقی کائنات میں پوری ہوتی رہتی ہے تو جب یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے اس فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں اُس وقت تک یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہو گی کہ انہیں اس زمین کے اقتدار سے محروم رکھے دوسری طرف خود ان فرض شناس اور خدا کے فرمانبردار بندوں کے لیے بھی یہ بات کسی طرح صحیح نہ ہو گی کہ وہ اس اقتدار کے حاصل کرنے سے بے نیازی برتیں۔ جس کے بغیر وہ اپنے فرض خلافت سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو وہ تو ان کے لیے صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو جائے گی۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھئے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان صرف اُخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حقدار اور طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی سچی دینداری کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے اور صحیح الفکر مسلمان کی دعا یہ ہوتی ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا
مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۞ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ
وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۞ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ
لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، ان[96]
کے کیے کی پاداش میں، اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے
طور پر اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔[97] پھر جس نے اپنے
اس ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کرلی تو اللہ تعالیٰ اس پر منظر
عنایت فرمائے گا بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔[98] کیا تم
نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی
ہے وہی جس کو چاہے سزا دیتا ہے اور جسے چاہے

معاف کر دے اور اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ ۹۹

اسلام میں ضابطہ دیوانی

اسلامی نظام اپنے شہریوں کو چار چیزوں کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، ایک جان، دوسرے مال، تیسرے آبرو و عزت، چوتھے ایمان و دین۔ جیسے وہ جان کی حفاظت کے لیے قانون فوجداری پیش کرتا ہے، اسی طرح وہ مال کے لیے دیوانی ضابطہ لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ جیسے وہ جان کی قدر و قیمت جتاتا اور اس کی حفاظت کا نظم قائم کرتا ہے تاکہ شہری سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں ٹھیک اسی طرح وہ شہریوں کے اموال کی بھی حفاظت کرتا ہے تاکہ شہریوں کا سکون مجروح نہ ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ سرمایہ کو راحت و عافیت کے پہنچانے میں بہت بڑا دخل ہے۔ سرمایہ محفوظ نہ ہو تو زندگی پریشانیوں سے دوچار ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اسی لیے مال کو زینت سے تعبیر کیا ہے المال والبنون زینۃ الحیاۃ الدنیا۔ اس تعبیر میں مال کو اولاد سے پہلے لائے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو مال و دولت سے کس قدر شدید لگاؤ ہے۔ اسی شدت کا قرآن نے اس طرح اظہار کیا ہے وانہ لحب الخیر لشدید یہ حقیقت ہے کہ دولت جسے انسان جائز طریقے پر کماتا ہے۔ مالک کو اپنی املاک کی حفاظت کرنے اور دوسروں کو ان پر دست اندازی سے روکنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حق ملکیت کے حق کے اولین لوازم میں سے ہے۔ حق ملکیت کو موثر اور حقیقی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مالک کو اس بات کا اختیار ہو کہ وہ دوسرے افراد کو بغیر کسی حق کے اس میں مداخلت کرنے سے روک سکے۔ قرآن نے اس آیت گرامی کے ذریعے مالک کے حق تحفظ کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس حق کے استعمال کو بعض حالات میں ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ اہم مقاصد اور مصالح ضائع نہ ہو جائیں جو ملکیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اپنی ملکیت کی حفاظت کے لیے انسان اپنی جان تک دے سکتا ہے جو خود اللہ کی ایک مقدس امانت ہے۔ اپنی ملکیت کی حفاظت میں مارا جانے والا شہادت کا درجہ پاتا ہے۔ صحیح بخاری میں بحوالہ عبداللہ بن عمرو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

من قتل دون مالہ فھو شھید۔

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا ہے وہ شہید ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر میرے پاس کوئی شخص میرا مال چھیننے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اسے اپنا مال نہ دو۔ اس نے کہا کہ اگر وہ مجھ سے لڑائی کرے تو آپ کا کیا خیال ہے آپ نے فرمایا کہ تم بھی اس سے لڑائی کرو، اس نے کہا کہ اگر وہ مجھے قتل کر دے تو؟ آپ نے فرمایا کہ تم شہید ہو گئے۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے قتل کر دوں تو آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

جب کسی ملک سے کسی دوسرے کا حق بھی متعلق ہو تو اس کا تحفظ صرف ایک انفرادی حق نہیں بلکہ ایک قانونی ذمہ داری بھی ہے۔ قرآن نے چوری کی سزا کا تعین اسی قانونی ذمہ داری کی خاطر کیا ہے۔ مرشد الحیران میں ہے جو شخص کسی چیز کا مالک ہو اس پر اس چیز کی حفاظت واجب ہے جس سے وہ انتفاع کر رہا ہے۔

۹۶- اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یعنی پہلی مرتبہ چوری کرے تو داہنا ہاتھ گٹے پر سے کاٹ دو۔ باقی تفصیل کتب فقہ میں ملیں گی۔ پچھلے رکوع میں ڈکیتی وغیرہ کی سزا ذکر کی گئی تھی درمیان میں بعض مناسبات کی وجہ سے جن کو ہم بیان کر چکے ہیں مومنین کو چند ضروری نصائح کی گئیں۔ اب پھر اسی پچھلے مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یعنی وہاں ڈکیتی کی سزا مذکور ہوئی تھی اس آیت میں چوری کی سزا بتلا دی۔[1]

چوری کی تعریف

قرآن میں السارق اور السارقہ کے الفاظ بولے ہیں۔ یہ چونکہ صفت کے صیغے میں ان سے اشارہ یہ بات بھی جا رہی ہے کہ اس کام کی نوعیت ایسی ہو جسے چوری کہا جا سکے اور جس کے مرتکب کو چور کہہ سکیں۔ لغوی معنے کے اعتبار سے تو مطلقاً ہر چوری سرقہ ہے۔ لیکن قانون کی زبان میں اس سے مراد غیر کے مال کو کسی خاص جگہ اور کسی خاص مقدار میں چپکے سے لے لینا ہے۔ قانون کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دائرے میں چوری کے چوری ہونے کے لیے نہیں بلکہ چوری کے قابل قطع ید ہونے کے لیے کچھ شرطیں ہیں یہ ممکن ہے کہ ادائے حقوق کی حد تک ایک ایک عمل چوری تو ہو سکتا ہے مگر قابل سزا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ راہ چلتے کسی درخت سے پھل توڑ لیتے ہیں یا کسی کھیت سے کچھ سبزی بغیر مالک کی مرضی کے چپکے سے اٹھا لی یا کسی کی نال سے کچھ لکڑیاں لے لیں یا کسی کے کچن سے کچھ روٹیاں لے لیں۔ یہ سب چوریاں ہیں اور ناجائز و حرام ہیں مگر یہ وہ قانونی چوری نہیں ہے جس پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ چوری وہ کہلائے گی جو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں عاقل بالغ نے سنظر بچا کر کی ہو۔ بشرطیکہ جس چیز کی چوری کی گئی ہے وہ کسی کی ملک ہو اور قیمتی ہو۔ فقہا نے چوری کے چوری ہونے کے لیے ایک سے زیادہ شرطیں بتائی ہیں مثلاً چوری کسی قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کی گئی ہو۔ محفوظ مال کی کی گئی ہو۔ وہ چیز چور کے پاس امانت نہ ہو اور اس میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو بہرحال چوری کے قانونی ہونے کے لیے ان باتوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس کا مطلب نہیں کہ یہ چوری نہیں بلکہ مطلب یہ کہ چوری تو ہے اور ناجائز بھی لیکن ہاتھ کاٹنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر عدالت تعزیر دینا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

چوری کا نصاب

چوری کے قانونی اور قابل سزا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ چیز جس کی چور نے چوری کی ہے اس کی مالیت دس درہم ہو۔ یعنی ساڑھے سات ماشے چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔ یہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اس سے کم پر چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ فقہا کا باہم اختلاف ہے کہ کتنی مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹا جاتے۔ علمائے ظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ سرے سے اس سلسلے میں کوئی نصاب نہیں ہے۔ ہر حال میں ہاتھ کاٹا جاتے گا خواہ زیادہ مال چوری کرے یا تھوڑا، قطع ید کے لیے نفس مال کی چوری کافی ہے۔ ائمہ اربعہ میں جن کا مذہب پوری دنیا میں رائج ہے۔ ان میں امام مالک نصاب سرقہ تین درہم قرار دیتے ہیں اور امام شافعی چوتھائی دینار یہ مقدار بھی تین درہم کے برابر ہے۔ امام اعظم نے جو دس درہم بتلائے ہیں یہ مقدار اس اعتبار سے مناسب تر ہے کہ اس نصاب میں تین درہم اور ربع دینار سب شامل ہو جاتے ہیں اور چونکہ معاملہ ایک انسانی عضو کے کاٹنے کا ہے اس لیے احتیاط اسی کی متقاضی ہے۔

جو لوگ کوئی نصاب نہیں مانتے وہ آیت قرآنی کو استدلال میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اس میں نصاب کی کوئی قید نہیں ہے۔ جمہور جو نصاب کے قائل ہیں حدیث نبوی پیش کرتے ہیں۔
امام مالک اور امام شافعی حضرت عائشہ کی یہ حدیث دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ

چور کا ہاتھ نہ کاٹا جاتے مگر چوتھائی یا اس سے زیادہ دینار کی چوری پر (متفق علیہ)

دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈھال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی۔

امام اعظم ابوحنیفہ دس درہم نصاب کی دلیل میں عمرو بن شعیب کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

چور کا ہاتھ دس درہم سے کم مالیت کی چوری پر نہ کاٹا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے ڈھال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جس کی قیمت ایک دینار یا دس درہم تھی۔ (ابوداؤد و نسائی)

ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

دس درہم سے کم کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب مال مسروقہ ڈھال کی قیمت کے برابر ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا اور پھر ڈھال کی قیمت کے سلسلے میں صراحت ہے۔

ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔

ایک دفعہ ایک چور دربار فاروقی میں حاضر کیا گیا جس نے کچھ کپڑے چرائے تھے۔ حضرت عمر نے حضرت عثمان سے فرمایا کہ آپ اس کی قیمت لگائیں۔

حضرت عثمان نے اس کپڑے کی آٹھ درہم قیمت لگائی۔

ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ نصاب سرقہ کم از کم تین درہم اور زیادہ سے زیادہ دس درہم حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ دس درہم ایسا نصاب سرقہ ہے جس میں ہاتھ کاٹنے میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس پر سب کا اتفاق ہے خالباً احتیاط کے اسی پہلو کے پیش نظر احناف نے دس درہم نصاب سرقہ قرار دیا۔ ابن عربی کا قول ہے کہ

سفیان ثوری فن حدیث میں اپنا بلند مقام رکھنے کے باوجود اسی کے قائل ہیں کہ دس درہم سے

کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے اس لیے کہ ہاتھ ایک محترم عضو انسانی ہے اور ایسا محترم حصہ بدن اس وقت تک مباح قرار نہیں دیا جا سکتا ہے جب تک اس پر لوگوں کا اجماع و اتفاق نہ ہو جائے اور یقیناً دس درہم ایسا نصاب ہے جس پر سب نے اتفاق کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دس درہم یا اس سے زیادہ کی چوری پر اسلام چور کو معاف نہیں کرتا ہے البتہ اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال بحفاظت رکھا گیا ہو جو مال محفوظ جگہ میں نہ ہو گا اس کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ چور نے یہ خیال کیا ہو کہ مالک مال کو اس کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ حفاظت خواہ حقیقتہً ہو یا حکماً۔ حقیقتہً مثلاً کسی سپاہی یا چوکیدار کے پہرے میں ہو اور حکماً مثلاً مکان کے اندر صندوق وغیرہ میں ہو۔ سر راہ اور کھلے پڑے ہوئے مال کے اٹھا لینے پر حد سرقہ نہ ہو گی۔ چوکیدار اور پہرہ دار وغیرہ اگر چوری کریں تو وہ خیانت کے جرم میں ملزم ہوں گے حد سرقہ کے مستوجب نہ ہوں گے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال کسی کی ملک ہو غیر مملوک مال کی چوری پر حد نہ ہو گی۔

چوری کا ثبوت

چوری کے ثبوت کے دو ہی طریقے ہیں ایک اقرار دوسرے شہادت، اور ظاہر ہے کہ شہادت عدالت میں ہو گی اس لیے چوری کی سزا انفرادی نہیں ہو گی بلکہ عدالت کے ذریعے ہو گی اور عدالت کا وجود حکومت پر موقوف ہے اس لیے علماء نے اس آیت سے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ امت پر نظام حکومت قائم کرنا ضروری ہے کیونکہ حدود کا نفاذ درجہ فرض میں ہے اور نفاذ کی صورت پوری امت کے اجماع کے فیصلہ کے مطابق افراد سے ممکن نہیں اس لیے حکومت کا نظام ضروری ہے۔ امام رازی نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ

متکلمین نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ حکومت کا قائم کرنا امت کے فرائض میں داخل ہے۔

امام رازی کا یہ کہنا بالکل برمحل اور بجا ہے۔ کیونکہ اسلامی قانون جن احکام و ہدایات پر مشتمل ہے ان میں سے بے شمار احکام ایسے ہیں جن کی تعمیل ایک سیاسی نظام اور ایک با اختیار حکومت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ احکام قانونی و سیاسی و اجتماعی کی پیروی بھی ٹھیک اسی طرح ضروری ہے جس طرح دوسرے حکموں کی، کیونکہ یہ بھی اسی طرح قرآنی احکام ہی ہیں جس طرح کہ وہ دوسرے

احکام اور ان کی بھی سمجھا اور یہی اسی طرح تقاضائے ایمان ہے جس طرح ان کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے احکام میں کسی انتخاب کی آزادی نہیں دی ہے کہ جن کی چاہیں تعمیل کریں اور جنہیں چاہیں چھوڑ دیں اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی میری جانب سے نازل کیا گیا ہے سب کی پیروی کرو اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا بلکہ میرے حکموں میں اپنے منشا کے مطابق تفریق کی جن احکام پر چاہا عمل کیا جن کو چاہا چھوڑ دیا تو یہ ایمان کی نہیں کفر کی روش ہوگی۔ چنانچہ یہود کا عقدہ ہمارے سامنے ہے جن پر اسی طرح کے طرزِ عمل کی بنا پر صاف لفظوں میں یہ جرم عائد کیا گیا تھا کہ

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

قانونِ اسلام میں مساوات

اس آیت میں صفت کے صیغے لا کر اشارہ کر دیا ہے کہ یہ چوری کی صفت جہاں بھی پائی جائے گی وہ سزا کا مستحق ہے۔ اس میں امیر غریب، حاکم و محکوم اور چھوٹے بڑے میں کوئی امتیاز نہیں ہے جو بھی چوری کا مرتکب ہوگا سزا پائے گا۔ خواہ کوئی بھی ہو، مرد ہو یا عورت، کافر ہو یا مسلمان، شہری ہو یا دیہاتی، اس قانون میں اس کی ہرگز گنجائش نہیں ہے کہ کوئی بڑا آدمی یا شریف خاندان کا فرد جرم کرے تو اسے معاف کر دیا جائے اور غریب و نادار کرے تو اسے سزا کے شکنجے میں کس دیا جائے بلکہ جس جرم کی جو سزا حق تعالیٰ کی طرف سے متعین ہے سب کے لیے ہے، نہ انگریزوں کے قانون کی طرح کالے گورے کا امتیاز ہے اور نہ منو مہاراج کی طرح برہمن شودر کی کوئی تفریق ہے۔

زمانۂ نبوت کا چوری ہی کا واقعہ مشہور ہے اور امام بخاری، امام مسلم صحیحین میں اس کے راوی ہیں کہ ایک دفعہ ایک مخزومی عورت نے چوری کی اور سرکارِ نبوت میں اس کی چوری ثابت ہو گئی تو قریش پر طبعی طور پر یہ گراں گزرا کہ ایک نامی گرامی خاندان کی خاتون کا ہاتھ اس جرم میں کاٹا جائے اس لیے کہ اس سے پورے قبیلہ کی توہین ہوتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ طے کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے ممکن ہے کہ اس سے بچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ صحابہ کرام بہرحال آپ کے مزاج شناس تھے اس لیے کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ سب نے مل کر حضور انور کے چہیتے حضرت اسامہ کو اس کے لیے تیار کیا کہ وہ خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر اس موضوع پر آپ سے بات کریں۔ لوگوں کے مشورے کے مطابق حضرت اسامہ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر ترجمانی کی اور اس مخزومی عورت کے سلسلے میں بات شروع کی۔ یہ سننا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تمتما

اطہار رنگ بدل گیا اور ارشاد فرمایا اے اسامہ تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد میں سفارش کے لیے حاضر ہوتے ہو، پھر آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں ہے کہ بنی اسرائیل صرف اس وجہ سے تباہ ہو گئے کہ انہوں نے باہم امتیازی سلوک برتنا شروع کر دیا تھا - ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کمزور آدمی چوری کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد جاری کرتے، اس کے بعد آپ نے فرمایا:

خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ دیکھ کر حضرت اسامہ کانپ گئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیے، اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے بعد آپ نے بلا رو رعایت اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حسب قانون ہاتھ کاٹا گیا۔ وہ خاتون اس کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہی ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ وہ کبھی کبھی میرے گھر آتی تھیں۔

اس واقعہ سے اس اسلامی قانون کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

شریف وکمین، قوی وکمزور سبھوں پر حدود کا اجراء ضروری ہے۔ کسی حال میں اس سزا کا معطل کرنا درست نہیں ہے، نہ سفارش سے مرعوب ہو کر اور نہ ہدیہ وتحفہ سے مرہون ہو کر، جو حاکم اور امیر اقامت حدود پر قادر ہونے کے باوجود حد قائم نہ کرے تو ایسے افراد حکومت پر اللہ اور فرشتوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے کچھ قبول نہ فرماتے گا۔ اور ان کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے دنیا سے دنی خریدتے ہیں، رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس کی سفارش اللہ کے احکام کے نفاذ میں آڑ بن جاتے وہ اللہ کے احکام کا مخالف ہے۔

چوری کی سزا میں رعایت

دس درہم یا اس سے زیادہ کی چوری پر خواہ وہ سکہ ہو یا اس کی قیمت کی کوئی چیز ہو، دونوں صورتوں میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ مثلاً ایسی چیزیں جو سریع الفساد ہوتی ہیں جیسے گوشت اور پھل وغیرہ۔ یہ چیزیں

دس درہم سے زیادہ کی بھی اگر کوئی چوری کرے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ،

پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

معمولی چیزوں کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

معمولی چیزوں کی چوری پر زمانہ نبوت میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔

کھانے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں۔ حضور کا ارشاد ہے کہ،

کھانے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی کوئی سزا نہیں ہے۔

حضرت علی اور حضرت عثمان کا فیصلہ ہے اور صحابہ کرام میں سے کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا ہے کہ پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ نیز سیدنا عمر و علی رضی اللہ عنہما نے سرکاری خزانہ سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا۔ اور اس معاملہ میں بھی صحابہ کرام میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے، اچکے، لٹیرے اور خائن کا بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا حضور انور کا ارشاد ہے،

خیانت کرنے والے لٹیرے اور اچکے کے لیے قطع ید کی سزا نہیں ہے۔

ان ماخذ کی بنیاد پر مختلف ائمہ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطع ید کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پھل ترکاریاں گوشت، پکا ہوا کھانا، غلہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو۔ کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں وہ قطع ید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہے کہ ان چوریوں پر سرے سے سزا ہی نہ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

رشتہ داروں کی چیز کی چوری

اسی طرح کوئی اپنے قریبی رشتہ دار کی کوئی چیز چرالے تو اس کو بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔ جیسے اولاد ماں باپ کی چیز چوری کرے یا باپ اولاد کی چیز یا بیوی شوہر کی چیز چرالے

اور شوہر بیوی کی۔ قریبی رشتہ داروں میں بھائی بہن، چچا، ماموں اور پھوپھی بھی داخل ہیں۔ تفصیل کے لیے قانون کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ واضح رہے کہ چوری کے ثبوت میں عدالت کے پاس ذرا بھی تاویل کی گنجائش نکل آئے گی تو پھر عدالت ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دے سکے گی اس لیے کہ لینے والا کہہ سکتا ہے کہ میری نیت چوری کی نہ تھی بلکہ اس ارادہ سے اٹھایا تھا۔ مثلاً کوئی قرآن چوری کرے، اس میں وہ کہہ سکتا ہے کہ پڑھنے کے لیے لیا تھا۔ چوری کے ثبوت کے لیے چور کا خود اقرار ضروری ہے جس میں کسی جبر و اکراہ کو دخل نہ ہو۔ یا دو قابلِ شہادت مردوں کی گواہی ہو۔

کب کون سا عضو کاٹا جائے

ہاتھ کون سا کاٹا جائے اور کہاں سے کاٹا جائے۔ اس سلسلہ میں ائمہ قانون کا احادیث کے پیشِ نظر فیصلہ ہے کہ دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور صرف پہونچا اتروایا جائے گا۔ ہاتھ کی صراحت خود قرآن کی اس آیت میں ہے اور دایاں کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ عبداللہ ابن مسعود سے آیت کی قرأت فاقطعوا ایمانھما اس طرح بھی آئی ہے۔ شیخ ابن الہمام فتح القدیر میں رقمطراز ہیں،

> دایاں ہاتھ کا تعین عبداللہ بن مسعود کی قرأت میں ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ کاٹو اور یہ قرأت مشہورہ ہے لہٰذا خبر مشہور کا درجہ لے حاصل ہے جس سے مطلق کی تقیید درست ہے۔ فتح القدیر ج ۵ ص ۱۵۳۔

رہا یہ سوال کہ کہاں سے کاٹا جائے تو بتایا جا چکا ہے کہ ہتھیلی سے نیچے والا جوڑ کاٹا جائے گا حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ

> نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک چور کا ہاتھ جوڑ سے کاٹا جو ہتھیلی کے نیچے ہوتا ہے۔

اس سے مراد ہتھیلی اور کلائی کے درمیان کا جوڑ ہے اور کاٹنے کے بعد خون بند کرنے کی فوری ترکیب کی جائے۔ زمانۂ نبوت و صحابہ میں گرم لوہے سے داغ دیا جاتا تھا تاکہ خون بند ہو جائے ورنہ ہلاکت مقصود نہیں ہے۔ حدیث میں ایک چور کا واقعہ ہے کہ وہ خدمت نبوی میں حاضر کیا گیا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس نے چوری نہیں کی۔ کہ جو ور خود بول اٹھا یا رسول اللہ میں نے چوری کی ہے یہ سن کر آپ نے فرمایا:

اسے لے جاؤ اور ہاتھ کاٹ کر اسے داغ دو۔

حضرت علی کے متعلق یہ صراحت آئی ہے کہ

آپ نے چوروں کے ہاتھوں کو کلائی سے کاٹ کر داغ دیا۔

داغنا اس لیے جاتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو تمام جسم کا خون بہہ جائے گا اور چور ہلاک ہو جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ

اگر داغا نہ جائے تو ہاتھ کی کٹائی ہلاکت کا ذریعہ ہو جائے گی حالانکہ منشا زجر و تادیب ہے نہ کہ موت و ہلاکت۔

دوبارہ چوری کی سزا

سزا یافتہ چور جب دوبارہ چوری میں گرفتار ہو کر آئے اور اس کی چوری ثابت ہو جائے تو اس کا بایاں پیر کاٹا جائے اور تیسری بار چوری کرے گا تو اسے ہمیشہ کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک ہاتھ ایک پیر باقی رکھا جائے گا تاکہ وہ بالکل لنجا اور کھانے پینے سے مجبور ہو کر نہ رہ جائے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ

چور جب چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ پھر اگر چوری کرے تو بایاں پیر کاٹا جائے۔ اور تیسری بار چوری کرے تو قید خانہ میں ڈال دیا جائے تاکہ اس میں خیر و صلاح آ جائے۔ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اسے اس طرح بنا دوں کہ کھانے اور استنجا کے لیے کوئی ہاتھ اور چلنے کے لیے کوئی پیر باقی نہ رہے۔ فتح القدیر ج ۵ ص ۱۵۵۔

اگرچہ قانون کے بعض مدارس یہ بھی کہتے ہیں کہ تیسری مرتبہ چوری ثابت ہو تو پھر دوسرا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا پاؤں لیکن بات یہ ہے کہ وہ اس طرح قوم و ملک پر بار بن جائے گا۔ ایک طرف وہ سارے اعضاء سے محروم ہو جائے گا۔ دوسری طرف اس کے کھانے پینے اور پاخانہ پیشاب کرانے کی ساری ذمہ داری حکومت پر آ جائے گی اور ایسا شخص سرکار کے لیے وبال بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ احناف نے اس کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ اس حد تک کہ اگر کسی چور کا دایاں ہاتھ شل ہو چکا ہے اور ایسے ہی ایک پاؤں تو اس کا نہ ہاتھ کاٹا جائے اور نہ پاؤں۔ ہدایہ میں صراحت ہے

چور کا بایاں ہاتھ شل یا کٹا ہوا ہو یا اس کا دایاں پیر کٹا ہوا ہو تو اس کا پہلی

دفعہ میں دایاں ہاتھ اور دوسری دفعہ بایاں پیر کاٹا جائے گا کیونکہ اس طرح کرنے میں چلنے اور پکڑنے کی قوت سے محروم کر دیتا ہے۔

جس حدیث میں تیسری مرتبہ میں دوسرا ہاتھ اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا پیر کاٹنے کا حکم ہے۔ اولاً محدثین نے اس کی صحت میں کلام کیا ہے ثانیاً اگر وہ حدیث صحیح ہو تو اس صورت میں علماء اسے سیاست پر محمول کرتے ہیں۔

چوری کے مفاسد

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے تصرف میں لاتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو کچھ حاصل کرتا ہے۔ دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے اور اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔ بے وجہ دوسروں کے گھر میں داخل ہونا۔ اس کی ملکیت کا جائزہ لینا یہ فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمائے پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے اس لیے وہ اس کو بڑی بیدردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اختفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ قرآن نے اس کے انسداد کے لیے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی۔ سورہ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی خواتین سے لیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چوری نہ کریں گی۔ فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئی ہیں تو آپ نے ان سے بھی عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہندہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔ فرمایا کہ تم ان کے مال سے اتنا لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہو اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو

چوری نہیں ہے۔

چور کی سزا کی حیثیت

۹۷۔ ان کے کیے کی پاداش میں اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے طور پر اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔
چونکہ غالب ہے اس لیے اسے حق ہے کہ جو چاہے قانون نافذ کرے کوئی چون و چرا نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ حکمت والا بھی ہے اس لیے یہ احتمال نہیں کہ محض اپنے اختیار کامل سے کام لے کر کوئی قانون بے موقع نافذ کر دے، نیز وہ اپنے ناتواں بندوں کے اموال کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کر سکے یہ اس کی عزت اور غلبہ کے منافی ہے اور چوروں کو یوں ہی چھوڑ دے یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ آیت میں بما کسبا نکالا من اللہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جو سزا چور کو دی جا رہی ہے وہ مال مسروق کا بدلا نہیں بلکہ اس کے فعل سرقہ کی سزا ہے تاکہ اسے اور دوسرے چوروں کو تنبیہ ہو جائے۔ بلاشبہ جہاں یہ حد جاری ہوتی ہے وہاں دو چار ہی کی سزا پانے کے بعد چوری کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔ آج کل مدعیان تہذیب اس قسم کی سزاؤں کو وحشیانہ سزا بتاتے ہیں لیکن چوری کرنا اگر ان کے نزدیک کوئی مہذب فعل نہیں ہے تو یقیناً آپ کی مہذب سزا اس غیر مہذب دستبرد کے استیصال کا جواب نہیں ہے۔ اگر تھوڑی سی وحشت کو رہنا کر بہت سے چور مہذب بنائے جا سکتے ہیں تو تہذیب کے علمبرداروں کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کے تہذیبی مشن میں اس وحشت سے مدد مل رہی ہے۔ بعض نام نہاد مفسر قرآن بھی اس کوشش میں ہیں کہ قطع ید کی سزا کو چوری کی انتہائی سزا قرار دے کر اس سے ہلکی سزا دینے کا اختیار شریعت حقہ سے حاصل کر لیں، مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو چوری کی اس سے ہلکی سزا قرآن کریم میں کہیں موجود ہے اور نہ عہد نبوت و صحابہ میں اس کی کوئی نظیر پائی گئی۔ کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں جتنے چور پکڑے گئے ان میں ایک بھی ابتدائی چور نہ تھا جس پر کم از کم یہاں جواز ہی کے لیے قطع ید سے کوئی ہلکی ابتدائی سزا جاری کی جاتی۔

کسی ملحد نے پرانے زمانے میں اس حد سرقہ پر یہ بھی شبہ کیا تھا کہ جب شریعت نے ایک ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار رکھی ہے تو اتنا قیمتی ہاتھ جس کے کٹنے پر پانچ سو دینار واجب ہوں دس درہم کی چوری میں کس طرح کاٹا جا سکتا ہے۔ ایک عالم نے اس کا جواب دیا انها لما كانت امينة كانت ثمينة، فلما خانت هانت، یعنی جو ہاتھ امین تھا قیمتی تھا جب چوری کر کے خائن ہوا تو ذلیل ہو گیا۔[1]

دراصل اس فقرے میں قطع ید کے دو سبب بتاتے ہیں ایک یہ کہ یہ مجرم کے جرم سرقہ کی سزا ہے دوسرے یہ کہ یہ سزا نکال ہے۔ نکال کے معنے کسی کو ایسی سزا دینے کے ہیں جو دیکھنے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہو۔ یہ دونوں باتیں چوری کی سزا میں بیک وقت مطلوب ہیں یعنی یہ پاداش عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بھی۔ جو لوگ ان دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتے وہ بسا اوقات اسی غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ جرم کے اعتبار سے سزا زیادہ سخت ہے حالانکہ اس سزا میں صرف اس جرم ہی کی سزا نہیں ہے جو مجرم سے سرزد ہوا ہے بلکہ ان بہت سے جرائم کی روک تھام بھی اس میں شامل ہے جن کا وہ اپنے فعل سے محرک بن سکتا ہے اگر اس کو ایسی سزا دی جاتی جو دوسروں کے حوصلے پست کر دے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جنس کی طرح مال کی بھوک بھی انسان کے اندر بڑی شدید ہے اگر اس حرص کو ذرا ڈھیل مل جائے تو پھر اس کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ زمانے کے حالات میں کافی سامانِ بصیرت ہے۔

اس زمانے کے کسی متمدن سے متمدن ملک کے صرف ایک سال کے وہ ہولناک جرائم جمع کر لیے جائیں جو محض چوری کی وجہ سے پیش آتے ہیں تو وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں، لیکن تہذیب جدید کے مارے ہوئے انسان کی پیشانی یہ سن کر تو عرق آلود ہو جاتی ہے کہ چوری پر کسی کا ہاتھ کٹ جائے لیکن ان ہزاروں دل ہلا دینے والے واقعات سے اس کا دل نہیں پسیجتا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ چوری کی راہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ چوری کوئی منفرد جرم نہیں بلکہ یہ جرائم کا مجموعہ ہے جس سے قسم قسم کے ہولناک جرائم جنم لیتے ہیں۔ اگر چوری کی راہ مسدود ہو جائے تو یہ یا تو بالکل ناپید ہو جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انتہائی حد تک کم ضرور ہو جائیں گے۔ چنانچہ تجربہ گواہ ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے نہ صرف چوری کے واقعات انتہائی حد تک کم ہو گئے بلکہ دوسرے جرائم میں بھی کمی آ گئی۔ پھر اگر کچھ ہاتھ کٹ جانے سے ہزاروں سر ہزاروں گھر، اور ہزاروں آبروئیں محفوظ ہو جائیں، ظلم و شقاوت اور حرث و نسل کی بربادی کے بہت سے ابواب کا خاتمہ ہو جائے تو عقل سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ مہنگا سودا نہیں ہے بلکہ نہایت بابرکت سودا ہے۔[1]

ہاتھ کی قیمت اسلام میں

شیخ الاسلام نے اس کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اعضاء انسانی اسلام میں

---

[1] تدبر قرآن

بڑی قدر وقیمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قانون میں صراحت ہے کہ اگر کوئی کسی انسان کا ہاتھ کاٹ دے تو اسے اسلام کی عدالت سے پانچ سو دینار کی سزا ملے گی اور یہ رقم حکومت کے خزانے میں داخل کرنے کے بجائے اس شخص کو دی جائے گی جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے۔ حضور انور کا ارشاد ہے کہ :

ایک ہاتھ میں آدھی دیت ہے۔

حد یہ ہے کہ اگر کوئی ایک شخص کی ایک انگلی کاٹ دے تو اس کی دیت بھی اسے دلائی جائے گی۔ اسلام میں ایک انگلی کی قیمت دس اونٹ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

دونوں ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت برابر ہے، ہر انگلی کی دیت دس اونٹ ہیں۔

غور کریں کہ جس ہاتھ کی قیمت اسلام میں پانچ سو دینار ہے وہ محض دس درہم کی چوری پر فوراً کاٹ دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اسلام اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں پُرامن شہری زندگی کی کیا اہمیت ہے۔ اور اسے قائم رکھنے کے لیے وہ کس سختی سے کام لیتا ہے۔

حافظ ابن القیم اعلام الموقعین میں رقمطراز ہیں۔

ایک طرف چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹنے کا حکم اور دوسری طرف ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار مقرر کرنا انتہائی حکمت ومصلحت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ دونوں جگہ احتیاط ملحوظ ہے اور مال واعضاء دونوں کی حرمت کا لحاظ ہے۔ چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹنا مال کی حفاظت کے لیے ہے اور پانچ سو دینار دیت مقرر کرنا ہاتھ کی حفاظت کی خاطر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسلام کے پیش نظر انسان کے مال کی بھی حفاظت ہے اور اس کے ہاتھ کی بھی۔ یعنی دونوں کی حرمت باقی رہے۔ اس کی صورت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو اسلامی قانون نے اختیار کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :

اگر ہاتھ کی دیت صرف چوتھائی دینار ہوتی تو ہاتھوں کا قانونی تحفظ نہ ہوتا اور اگر نصاب سرقہ پانچ سو دینار مقرر کیا جاتا تو پھر غریبوں کے اموال کے تحفظ کا

سامان نہ ہوتا اور چوریاں زیادہ ہوتیں۔ لہٰذا حکمت کے تقاضے سے دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا اور اس طرح کرنے میں دونوں کی قدر و قیمت باقی رہی ہے۔

قاضی عبدالوہاب مالکی نے کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ،

صیانۃ العضو اغلاھا ارخصھا

خیانۃ المال فافہم حکمۃ الباری

اور امام شافعی کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے،

ھناک مظلومۃ غالت بقیمتھا

وھاھنا ظلمت ھانت علی الباری

اور شمس الدین الکروری فرماتے ہیں،

یقیمۃ الید نصف الالف من ذھب

فان تعدت فلا تسوی بدینار

سب کا حاصل یہ ہے کہ ہاتھ جب تک برائی سے بچ کر رہا قیمتی رہا اور جب برائی کے کر آیا بے قیمت ہو کر رہ گیا۔

چوری میں ہاتھ کیوں کاٹا جاتا ہے

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ چوری میں ہاتھ کیوں کاٹا جاتا ہے جب کہ دوسرے جرائم میں اعضا کاٹنے کا حکم نہیں ہے۔ بات معقول ہے مگر ذرا اس پر غور فرمائیے کہ اگر ہر مجرم کا وہ عضو کاٹ دیا جاتا جس سے وہ ارتکاب جرم کرتا ہے تو انسانی معاشرے میں ایک تباہی آ جاتی اور اصلاح کی جگہ اس سے بڑی خرابیوں سے معاشرہ دوچار ہو جاتا۔ اگر بدنظری کے جرم میں آنکھیں نکال لی جائیں، برائی سننے کی پاداش میں اس کی قوتِ شنوائی ختم کر دی جاتی ایذا زبانی کرنے والے کی زبان قلم کر دی جاتی، زانی کو عضو تناسل سے محروم کر دیا جاتا تو پھر کیا ہوتا، یہی نا کہ سزائیں زواجر نہ ہوتیں بلکہ انسانی زندگی کے لیے بربادی اور تباہی کا سامان ہو جاتیں۔ حالانکہ مقصد جرائم کو ختم کرنا اور انسانوں کی اصلاح ہے۔ قرآن و نبوت کا پیش نہاد مٹانا نہیں بلکہ بنانا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں جتنی قوتیں رکھی ہیں انہیں صحیح مصرف میں خرچ کرنا سکھائیں، اور انسانی زندگی میں اعتدال پیدا کریں۔ یہی حال حدود کا ہے۔ یعنی بندوں کو ظلم و جور سے ہٹا کر

صحیح راہ پر ڈال اور ایسی سزا دینا جس سے نفسیاتی طور پر دوسرے انسان متاثر ہوں اور ان کو اس طرح کے کاموں کی جرأت نہ ہونے پائے۔ ہر جرم میں قطع اعضاء سے یہ منشا پورا نہیں ہوتا۔

یہ سوال کہ چور کا ہاتھ ہی کیوں کاٹا جاتا ہے اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ چور چھپ چھپا کر چوری کرتا ہے اور بھاگتا ہے۔ گویا اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کا مال لے کر بھاگے اور کسی کو کانوں کان پتہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کردار کی بنا پر ان کی سزا ایسی تجویز کی کہ اس کے چھپانے کے جذبات کا ردِ عمل سامنے آجاتے اور ساری دنیا پر عیاں ہو جاتے کہ یہ شخص چور ہے۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حدود پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ بھی سننے کے لائق ہے فرماتے ہیں:

" حق سبحانہ نے جن نافرمانیوں اور قانون شکنی پر حد مقرر کی ہے وہ ایسی نافرمانیاں ہیں جن میں گوناں گوں اور مختلف قسم کے مفاسد ہیں۔ ان جرائم کی وجہ سے زمین میں فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ مسلمان اور دوسرے شہریوں کے سکون و اطمینان اور پُر امن شہری زندگی پر ڈاکہ زنی ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض جرائم ایک بری لت کی حیثیت رکھتے ہیں، جب انسانی قلوب میں یہ پیوست ہو جاتی ہے تو انسان کو بُرے کاموں پر ابھارتی ہے۔ ادھر مظلوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ غریب بسا اوقات اپنے سے ان جرائم کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ لہٰذا ان نافرمانیوں اور گناہ کے ایسے کاموں میں صرف عذابِ آخرت سے ڈرانا کافی نہیں ہوتا بلکہ ایسی سخت تکلیف پہنچانے اور ملامت کرنے کی بھی ضرورت ہے جو ان کو ان کاموں سے روک دے جیسے جنس کی ناروا خواہش کردہ شہوت اور عورتوں کے حسن و جمال سے برانگیختہ ہوتی ہے اور یہ فعل عموماً فاعل و مفعول کی باہمی رضامندی سے انجام پاتا ہے لہٰذا اگر اس جرم کے لیے سزا متعین نہ ہو تو روکنا اور انسانوں کی آبرو کو محفوظ رکھنا مشکل ہوتا۔ اسی طرح چوری ہے کہ انسان کو جب کوئی روزگار میسر نہیں آتا تو وہ چوری کی طرف مائل ہوتا ہے اور یہ کام اس طرح چھپ کر کرتا ہے کہ کسی کی نگاہ نہ پڑنے پاتے، یا ڈکیتی کہ مظلوم میں اس کے دفعیہ کی تاب نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی سزا بھی یقینی طور پر سخت ہو۔ چوری کی سزا میں ہاتھ کا کاٹا جانا یقیناً ایک دردناک منظر ہے۔ ہاتھ کا کٹا ہوا ہونا ایک عار کی چیز ہے اور اس سزا کے اثر کو لوگوں سے چھپانا بھی چاہے تو چھپا نہیں سکتا۔"

عدالت کو سزا معاف کرنے کا حق نہیں

آیت میں من اللہ کے اضافہ سے اشارہ کر دیا ہے کہ جب مقدمہ عدالت میں پہنچ جائے اور چور کی چوری ثابت ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے سزا سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ یہ وہ سزا ہے جو اللہ کی جانب سے ہے۔ اس میں انسان کو دم مارنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ یہ شرط ضرور ہے کہ چوری کے ثبوت میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہے۔ اگر ذرا سا شبہ بھی پیدا ہو گیا تو پھر کسی کو ہاتھ جیسی نعمت سے محروم نہ کیا جائے گا۔

ہاں جب تک معاملہ عدالت میں نہ پہنچے صاحب معاملہ کو اختیار ہے کہ وہ معاف کر دے حضرت زبیر کا بیان ہے کہ معاملہ جب عدالت میں پہنچ جائے تو اس میں سفارش کرنے والے اور سفارش قبول کرنے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت صفوان بن امیہ مسجد میں سر کے نیچے چادر رکھ کر سو رہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے آہستہ سے وہ چادر کھینچ لی اور بھاگنا چاہا مگر پکڑا گیا۔ حضرت صفوان اسے ساتھ لے کر دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا۔ حضور انور نے ثبوت کے بعد ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، حضرت صفوان کو یہ دیکھ کر رحم آ گیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں نے یہ چادر اسے ہبہ کر دی ہے، مطلب یہ تھا کہ درگزر فرمایئے۔ آپ نے فرمایا:

میرے پاس لانے سے پہلے ہی کیوں نہ ایسا کیا؟

یعنی پہلے ہی کیوں نہ معاف کر دیا، یہاں کیوں لائے۔ اب عدالت میں پیش ہو جانے کے بعد معافی کی کوئی صورت نہیں۔ چنانچہ اس چور کا حسب قانون ہاتھ کاٹا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چور جب حاضر عدالت ہو جائے اور اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر عدالت کے فرائض میں سزا دینا ہے۔ خود مدعی اور صاحب مال بھی معاف کرنا چاہے تو اس کا مجاز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

حدود کا معاملہ جب تک حکام کے پاس نہ پہنچے اس وقت تک لوگ خود معاف کر سکتے ہیں لیکن جب حکام تک مقدمہ آ جائے تو وہ کتاب اللہ کے مطابق ہی فیصلہ کریں۔

(مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۵۹)

حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

باہم حدود معاف کر دیا کرو اس لیے کہ حد کا جو معاملہ میرے پاس پہنچ گیا اس میں حد واجب ہو گئی۔ (ابوداؤد)

چور کی سزا میں رحم کی اپیل نہیں

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سزا میں رحم کی کوئی اپیل نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ سزا اگرچہ عبرتناک ہے مگر جرم کے مطابق ہے اور انسانی طبیعت خواہ جس قدر بھی اس سے متاثر ہو مگر لے مجرم کو سزا دینے میں عملاً رحم نہ کرنا چاہیے۔ اللہ کی ذات عزیز اور غالب ہے اس وجہ سے اس کو حق ہے جو چاہے حکم کرے۔ اور حکیم ہے اس لیے اس کا حکم حکمت پر مبنی ہے اس کے بندوں کو خواہ اس کے سزا کی جا ترہے اور نہ یہ زیبا ہے کہ وہ اس کے کسی حکم کو خلاف حکمت قرار دیں۔ اس میں رد و بدل جائز نہیں ہے۔ انسان قانون ساز نہیں ہے قانون کا نافذ کرنے والا ہے، زنا کی سزا جہاں قرآن نے بتائی ہے وہاں یہ بات صراحۃً کہہ دی ہے۔

لا تاخذکم رافۃ فی دین اللہ

تم کو ان دونوں پر اللہ کے قانون کے بارے میں کوئی رحم نہ آئے۔

قرآن کے قانون سرقہ کا تقابلی مطالعہ

اس موضوع پر عبدالقادر عودہ نے التشریع الجنائی الاسلامی کی جلد اول میں اچھی بحث کی ہے، ہم یہاں کچھ اضافہ کے ساتھ ان کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

اسلام نے چوری کی جو سزا مقرر کی ہے اس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں، اب آپ اس کے مقابلے میں دوسرے قوانین کا مطالعہ کریں کہ وہ چور کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل کے یہاں جو قانون ملتا ہے وہ یہ ہے،

۱۔ اگر چور نقب زنی کرتے پکڑے اور کوئی مار بیٹھے اور وہ مر جائے تو اس کے لیے خون نہ کیا جائے۔ (خروج ۲۲۔)

۲۔ اگر چوری کی چیز چور کے ہاتھ میں زندہ پائی جائے تو وہ ایک ایک کے دو دو دے۔ (خروج)

کوئی تاکستان یا کھیت کھلاتے اور چارپائے اس میں چھوڑ دے یا دوسروں کے میدان میں چرائے تو اپنا اچھا سے اچھا کھیت اور بہتر سے بہتر انگوری باغ اس کے بدلے میں دے۔

۴۔ تم چوری نہ کرو اور نہ جھوٹا معاملہ کرو۔

مصر قدیم نے چوری کے سلسلے میں جو قانون بنایا تھا وہ یہ تھا

مصر میں چوری کوئی بڑا جرم نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ وہاں چوری کا ایسا عجیب و غریب طریقہ رائج تھا جس کی نظیر دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص پولیس کا افسر ہوتا تھا وہی چوروں کا سب سے بڑا سرغنہ ہوتا تھا۔ جو شخص چوری کا پیشہ اختیار کرتا وہ اپنا نام پتہ مذکورہ بالا افسر کے دفتر میں درج کراتا اور جب چوری کرتا تو اس کی پوری کیفیت بھی اگر درج کراتا، رپورٹ ہونے پر پولیس چوتھائی مال بطور تاوان مالک سے لے کر باقی مال واپس کر دیتی، وصول شدہ مال میں سے کچھ حصہ چور کو ملتا اور کچھ سرکاری خزانے میں داخل ہو جاتا، اور بس۔ (نظام سلطنت اکبر شاہ)

ہندوستان کے مقنن منو مہاراج کا جو قانون منو سمرتی میں لکھا ہے یہ ہے:

خاندانی عورت یا عمدہ جواہرات کو جو چرا لے تو اسے قتل کر دینا چاہیے۔ جو چور نقب زنی کر کے رات میں چوری کرتے ہیں۔ ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر ان کی تشہیر کرنی چاہیے۔ جو چور اول مرتبہ اول بار گرہ کاٹے اس کا انگوٹھا اور انگوٹھے کے پاس کی انگلی کاٹنا چاہیے اور دوسری بار ارتکاب جرم ہو تو ہاتھ پاؤں کاٹ دینا چاہیے اور تیسری مرتبہ میں قتل کر دینا چاہیے۔ ش/۲۷۳ ۲۷۴

سرکار برطانیہ کا بنایا ہوا قانون یہ ہے:

جو کوئی شخص سرقہ کا مرتکب ہو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی سزا دی جائے گی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہو سکتی ہے یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں ہوں گی۔

ان سب کے مقابلے میں اسلام نے چوری کی جو سزا متعین کی ہے وہ انسان کی نفسیات سے بالکل قریب تر ہے کہ اس سزا کا تصور ہی سے لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ تجربہ کے لیے ان قوانین کے ساتھ اسلام کا قانون جاری کر دیا جائے تو بڑی آسانی سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس سزا میں

کیا تاثیر ہے۔ اگرچہ چند مہینوں میں اس سزا کے اجراء کے بعد جرم نہ ہونے کے درجہ میں نہ ہو جائے تو پھر جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی یہ قانون رائج ہوا چوری کا نام و نشان مٹ گیا۔

چور کی چوری سے توبہ اور اصلاح

۹۸۔ پھر جس نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ کر لی اور اپنے کو ٹھیک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس پر نظر عنایت فرمائے گا بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔ یعنی توبہ اگر ٹھیک ٹھیک ہو جس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چوری کا مال مالک کو واپس کرے اور اگر تلف ہو گیا ہو تو ضمان دے اور اگر ضمان نہ دے سکے تو معاف کرالے اور اپنے فعل پر نادم ہو اور آئندہ کے لیے اس سے مجتنب رہنے کا عزم رکھے تو اس طرح کی توبہ سے اُمید ہے کہ حق تعالیٰ اخروی عقوبت جس کے مقابلہ میں دنیوی سزا کی کچھ حقیقت نہیں ہے اس پر سے اٹھالے گا۔[1]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کرے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کرکے اللہ کا صالح بندہ بن جائے وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا۔ اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھو دے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدنیتی سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ تو اس کے معنے یہ نہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہو گیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اسی لیے قرآن عزیز چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو انتظام تمدن کے لیے ہے۔ اس سزا سے نفس پاک نہیں ہو سکتا۔ نفس کی پاکی صرف توبہ اور رجوع الی اللہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں ہے کہ ایک چور کا جب آپ کے حکم سے ہاتھ کاٹا جا چکا تو آپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا کہو استغفر اللہ و اتوب الیہ۔ اس نے آپ کی تلقین کے مطابق یہ الفاظ کہے، پھر آپ نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اللّٰھم تب علیہ خدایا اسے معاف کر دے [1]

اس آیت میں لفظ ظلم اپنے فاعل کی طرف بھی مضاف ہو سکتا ہے اور اپنے مفعول کی طرف بھی۔ فاعل تو خود چوری کرنے والا ہے اور مفعول وہ ہے جس کی چوری ہوئی ہے۔ مفعول کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں اس کے معنے یہ ہونگے کہ اس ظلم کے بعد جس کا اس نے اس مظلوم کا مال چرا کر اس پر کیا ہے اور پہلی صورت میں معنے یہ ہوں گے۔ اس ظلم کے بعد جو اس ظالم نے اپنے آپ پر کیا ہے اور دونوں معنے یہاں صحیح ہیں لیکن زیادہ راجح دوسرے لگتے ہیں۔ توبہ کے بعد اصلاح کا ذکر در حقیقت توبہ کی ایک لازمی شرط کی حیثیت سے ہے۔ بندہ جب کوئی اس طرح کا جرم کرتا ہے تو ایک تو وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے، دوسرے وہ اپنے نفس کی یا دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے۔ خدا سے معاملہ درست کرنے کے لیے تا حدِ امکان اپنے رویہ کی اصلاح اور اپنے ظلم کی تلافی ناگزیر ہے۔ بغیر اس دوطرفہ عمل کے توبہ بالکل بے معنے ہو کر رہ جاتی ہے [2]

یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اجرائے حد کفارہ سرقہ کے لیے کافی نہیں ہے۔ سزا ملنے کے بعد جب تک توبہ نہ کرے اور اصلاحِ حال نہ کرے تو اس گناہ کی سزا اخروی معاف نہ ہوگی۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی ہے کہ حدود کوافر نہیں بلکہ زواجر ہیں۔ یعنی یہاں جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ انتظامِ تمدن کے لیے اور معاشرہ کو برائی سے بچانے کے لیے ہیں اس لیے نہیں کہ اس کے ذریعے اخروی سزا کا کفارہ ہوگا۔

ایمان باللہ اور تصورِ سیاست

۹۹۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے وہی جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کر دے اور اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ یعنی جب حقیقی سلطنت اور حکومت اسی کی ہے تو بلاشبہ اسی کو یہ اختیار ہوگا کہ جسے مناسب جانے معاف کر دے اور جسے اپنی حکمت و عدل کے موافق سزا دینا چاہے سزا دے اور نہ صرف یہ کہ اسے معاف کر دینے اور سزا دینے کے کلی اختیارات حاصل ہیں بلکہ ان اختیارات کے استعمال سے کوئی روکنے والا بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ [3]

---

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن [3] فوائد شیخ الاسلام

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا رب اور الٰہ ہی نہیں بلکہ ملک بادشاہ اور مالک بھی ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی بادشاہ حاکم اور قانون ساز اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ اس کی مسلمہ اور اہم صفتوں میں سے ایک ہے۔ جب تک انسان کو اس صفت کا یقین نہ ہو وہ اللہ پر ایمان رکھنے والا مانا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی بنا پر آغاز الم تعلم سے کیا گیا ہے۔ بظاہر مخاطب حضور انور ہیں لیکن سنایا مسلمانوں کو جا رہا ہے کہ زمین و آسمان میں بادشاہت اللہ کی ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قانون کے تابع بنائے، نہ کوئی اس سے بھاگنے کی کوشش کرے نہ کوئی اس سے دوسروں کو بچانے کی تدبیر کرے۔ گویا مخاطبوں کو درس توحید دیا جا رہا ہے کہ توحید صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ رکوع و سجود اسے کیا جائے یہ بھی توحید ہے کہ یہ یقین پیدا کیا جائے کہ زمین کا ایک ایک ذرہ اللہ کی مِلک ہے اور یہاں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے وہ اللہ کی ملک ہے جب مِلک بھی اس کی اور مُلک بھی اس کا یعنی مالک بھی وہی اور بادشاہ بھی وہی ہے تو پھر اسے اپنی ملک میں پورا تصرف حاصل ہے اور اپنے ملک میں حکم کے نافذ کرنے سے اسے کون روک سکتا ہے اعلانِ شہنشاہت کے بعد اپنی قدرت کا اعلان یہ بتانے کے لیے ہے کہ بندوں کے نفع و نقصان کا رشتہ اسی سے وابستہ ہے۔ یہ بات اس وجہ سے ضروری تھی کہ جو سیاسی فوجداری احکام اس سورت میں بیان ہوتے ہیں پہلی امتیں ان ہی میں ڈگمگائی ہیں۔ انہوں نے ان سے بچنے کے لیے چور دروازے نکال لیے یہاں تک کہ یہ تمام قوانین بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اگر اس کی حقیقت کا کھوج لگایا جائے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ان قوموں نے توحید کی وہ حقیقت فراموش کر دی جس کی اس آیت میں یاددہانی کرائی گئی ہے۔

يَأَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ
قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۛ سَمَّاعُونَ
مع
لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ
بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ
لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ
لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ
قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيمٌ ﴿٤١﴾ سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِنْ
جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۖ وَإِنْ تُعْرِضْ
عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿٤٢﴾ وَكَيْفَ
يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ
يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٣﴾

ع

اے پیغمبر وہ لوگ تمہارے لیے غمگینی کا باعث نہ ہوں جو کفر کی راہ
میں تیز گامی کر رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو زبان سے
ایمان کے مدعی ہیں مگر ان کے دل ایمان نہیں لاتے اور یا
ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں[١٠٠]۔ یہ لوگ جھوٹ کے لیے جاسوسی
کرنے والے ہیں ان لوگوں کے لیے جو تمہارے پاس نہیں آتے
جاسوس ہیں[١٠١]۔ یہ لوگ کتاب اللہ کے حکموں کو باوجودیکہ ان کا
صحیح محل متعین ہے اپنے مقام سے ہٹا دیتے ہیں[١٠٢]، اور لوگوں سے
کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہ دیا جائے تو بچ
کر رہو[١٠٣]، اور دیکھو جس کے لیے اللہ ہی فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ
کر لیتا ہے تم اس کو اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکتے[١٠٤]۔ یہ وہی
لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ پاک کرنا نہیں چاہتا ہے ان کے
لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا

عذاب ہے[105]۔ یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں

لہٰذا اگر تمہارے پاس آئیں اور تم سے فیصلہ چاہیں تو آپ کو اختیار

ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش ہو جاؤ[106]۔

اور اگر کنارہ کشی اختیار کرو گے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے

اور اگر فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو بلاشبہ اللہ انصاف کرنے

والوں کو پسند کرتا ہے[107]۔ اور یہ لوگ تمہیں منصف کیسے بناتے

ہیں جبکہ تورات ان کے پاس موجود ہے اس میں اللہ کا حکم ہے

اس کے باوجود وہ اس سے روگرداں ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ

ایمان والے نہیں ہیں[108]۔

ایمان اور سیاست کی کشمکش

ان آیات میں منافقین اور یہود کی اس سازش کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو انہوں نے قرآن کے سیاسی قوانین کی گرفت سے بچنے اور ایک دوسرے کو اس سے بچانے کے لیے باہم کر رکھی تھی۔ ان آیات کے نزول تک اگرچہ اسلام کا سیاسی اقتدار بروئے کار آ چکا تھا لیکن ابھی یہ اقتدار مکمل نہیں تھا۔ یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کے باقاعدہ اور قانونی شہری نہ تھے بلکہ اسلامی حکومت

کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی۔ اور ان کے مقدمات کے فیصلے انہی کے قوانین کے مطابق ان کے اپنے جج کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدمات لانے کے لیے وہ ازروئے قانون مجبور نہ تھے لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنا چاہتے تھے ان کا فیصلہ کرانے کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس امید پر آتے تھے کہ شاید آپ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔ ان کی عدالتیں ویسے بھی قیام عدل و انصاف کے نقطہ نظر سے بالکل بے جان اور بے مصرف ہو چکی تھیں۔ اول تو یہود نے خود ہی قانون کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے مسخ کر کے بالکل بے اثر کر دیا تھا، دوسرے جھوٹ اور رشوت کا ان کی سوسائٹی میں اتنا ہنگامہ تھا کہ کسی معاملہ میں نہ گواہوں کی گواہی کام دیتی اور نہ عدالتوں کے انصاف کا کوئی وزن تھا۔ اقتدار کی یہ دوعملی اور یہودی عدالتوں کی انصاف فروشی ان لوگوں کے لیے ایک چور دروازہ فراہم کرتی تھی جو قانون کے تقاضوں سے گریز پائی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ منافقین اور یہود اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سازش کرتے کہ جن معاملات میں ان کو توقع ہوتی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے فیصلہ ان کے حسبِ منشا ہو جائے گا۔ ان کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے۔

یہاں خاص طور پر جس مقدمہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلقات پائے گئے۔ تورات کی رو سے ان کی سزا رجم تھی یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہ چاہتے تھے اس لیے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے . . . . کرایا جائے اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو مان لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ مانا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ حضور انور کو تورات کے احکام کی خبر نہیں اور اگر خبر بھی ہو تو یہ ایک نئی دعوت لے کر آئے ہیں تورات والا حکم کیوں دینے لگے بس بہتر ہے کہ معاملہ ان کے حضور میں پیش کر دیا جائے، مجرم سزا سے بھی بچ جائیں گے اور ذمہ داری بھی ہم پر نہ رہے گی۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کے افادات میں مطالعہ کریں گے۔ ایمان و دیانت کی اس کشمکش میں یہودی اور منافقین چاہتے تھے کہ ایمان کے دعویدار بھی رہیں اور خدا کے

قانون سے بچے رہیں۔ قرآن نے ان آیات میں ان کی اسی دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔

۱۰۰۱۔ اے پیغمبر وہ لوگ تمہارے لیے غمگین کا باعث نہ ہوں جو کفر کی راہ میں تیز گامی کرتے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو زبان سے ایمان کے مدعی ہیں مگر ان کے دل ایمان نہیں لاتے یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں۔ یعنی منافقین اور یہود بنی قریظہ۔ پچھلی آیات میں ڈکیتی اور چوری وغیرہ کی حدود بیان کی گئی تھیں اب کچھ ان قوموں کی حالت سناتے ہیں جنہوں نے حدود اللہ میں تحریف کر کے اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق ٹھہرایا۔ اس کا مفصل واقعہ بغوی نے معالم میں یہ لکھا ہے کہ خیبر کے ایک یہودی مرد اور عورت نے جو شادی شدہ تھے زنا کیا، باوجودیکہ تورات میں اس جرم کی سزا رجم سنگسار کرنا تھی مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی کہ یہ سزا جاری کی جاتے۔ آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو مدینہ میں ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کتاب میں زانی کے لیے رجم کا حکم نہیں ہے کوڑے مارنے کا حکم ہے تو بنو قریظہ کے یہود میں سے کچھ لوگ ان کے پاس بھیجو کیونکہ وہ ان کے ہمسائے ہیں اور ان سے صلح کا معاہدہ بھی کر چکے ہیں وہ ان کا خیال معلوم کر لیں۔ چنانچہ ایک جماعت اس کام کے لیے روانہ کی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کر لیں کہ زانی محصن کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں۔ اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیتے ہیں تو ان پر رکھ کر قبول کر لو اور رجم کا حکم دیں تو مت مانو۔ ان کے دریافت کرنے پر حضور نے فرمایا کہ تم میرے فیصلہ پر رضامند ہو گے؟ تو۔ انہوں نے اقرار کر لیا۔ اللہ کی جانب سے جبریل رجم کا حکم لے آئے مگر وہ لوگ اپنے اقرار سے پھر گئے۔ آخر حضور نے فرمایا کہ فدک کا بسنے والا ابن صوریا تم میں کیسا شخص ہے۔ سب نے کہا کہ آج روئے زمین پر "موسٰی" کا اس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ نے اس کو بلوایا اور نہایت ہی شدید حلف دے کر پوچھا کہ تورات میں اس گناہ کی سزا کیا ہے؟ باوجودیکہ دوسرے یہود اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے جس کا پردہ حضرت عبداللہ بن سلام کے ذریعے فاش ہو چکا تھا تاہم ابن صوریا نے جو ان کا معتمد تھا کسی نہ کسی وجہ سے اس کا اقرار کر لیا کہ بے شک تورات میں اس جرم کی سزا رجم ہی ہے۔ بعدہٗ اس نے ساری حقیقت ظاہر کر دی کہ کس طرح یہود نے رجم کو اڑا کر زنا کی سزا یہ رکھ دی ہے کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں، کالا منہ کر کے اور گدھے پر سوار کر کے گشت کرایا جائے۔ الحاصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مرد و عورت پر رجم کی سزا جاری کی اور فرمایا کہ اے اللہ آج میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو دنیا میں نافذ کیا اس کے بعد کہ وہ اسے مردہ کر چکے تھے یہ واقعہ ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لفظِ رسول سے خطاب یہاں یہ حقیقت ظاہر کر رہا ہے کہ رسول کی اصل ذمہ داری صرف اللہ کے دین کی تبلیغ اور انذار و تبشیر کے فرض کی ادائیگی ہے۔ اس امر کی کوئی ذمہ داری رسول پر نہیں ہے کہ لوگ اس کی دعوت کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر رسول نے اپنا فرضِ رسالت ادا کر دیا ہے تو وہ عنداللہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔ لوگ اگر کفر کی راہ میں سبقت کرتے ہیں تو اس کی پرسش رسول سے نہیں ہونی ہے بلکہ خود لوگوں سے ہونی ہے۔ پھر جو بات رسول سے متعلق نہیں اس کا غم رسول کیوں کرے۔ یہاں چونکہ مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین اور یہود کی مخالفانہ سازشوں پر تسلی دینا اور اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ جن کا فتنہ میں پڑنا سنتِ الٰہی کے بموجب مقدر ہو چکا ہے وہ فتنہ میں پڑ کر رہیں گے۔ یہاں امام رازی نے یہ نکتہ آفرینی خوب کی ہے کہ یا ایھا النبی تو قرآن میں متعدد بار آیا ہے لیکن یا ایھا الرسول سے خطاب قرآن میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک یہاں دوسرے اسی پارے کے آخر میں یا ایھا الرسول بلغ، اور ان دونوں جگہوں پر یہ طرزِ خطاب شرف و عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ سارے تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے فطرتِ انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان حدِ فاصل ہو سکتی ہیں۔

یسارعون میں تیز گامی سے اشارہ یہاں منافقین و یہود دوستی کی طرف ہے کہ یہ لوگ خدائی قوانین سے گریز پائی کے لیے یہود کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب کوئی معاملہ اور قضیہ پیش آتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو حضورِ انور کی عدالت میں پیش کرنے کی جگہ یہود کی عدالت میں لے جائیں تاکہ وہاں سے حسبِ منشا فیصلہ حاصل کر سکیں حالانکہ اللہ و رسول کی عدالت کے ہوتے ہوئے کسی اور کی عدالت کی طرف رجوع کرنا ایمان و اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف لوٹنا ہے۔ جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار و اقدار کی اسلامی نظامِ حیات کے مقابلے میں خدمت کرتے ہیں اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض روزہ نماز تسبیح و تہلیل کی بنا پر اپنے کو نجات کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں ان کو غور کرنا چاہیے کہ کہیں وہ بھی قالوا آمنا ولم تؤمن قلوبھم کا مصداق تو نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ غیر اسلامی نظام سے ان کی وابستگی اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ نہ صرف ان میں ان نظاموں سے باہر نکلنے کی خواہش باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو ان کی تمام کوششیں

ان باطل نظاموں کی بقاء و حفاظت میں مصروف ہو جاتی ہیں، انا للہ فالی اللہ المشتکی ۔

منافقین کا چہرہ

۱۰۱ ۔ یہ لوگ جھوٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کے جاسوس ہیں جو تمہارے پاس نہیں آتے ۔ سماعون کے معنے ہیں بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے ۔ پھر بہت زیادہ سننا کبھی تو جاسوسی پر اطلاق ہوتا ہے اور کبھی اس کے معنے ہوتے ہیں بہت زیادہ قبول کرنے والا جیسے سمع اللہ لمن حمدہ ۔ میں سننے کے معنے قبول کرنے کے ہیں ۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے یہاں پہلے معنے مراد لیے ہیں لیکن ابن جریر وغیرہ محققین نے دوسرے معنے پر محمول کیا ہے سماعون للکذب یعنی جھوٹ اور باطل کو بہت زیادہ ماننے والے اور قبول کرنے والے سماعون لقوم آخرین یعنی دوسری جماعت جس نے ان کو بھیجا اور خود تمہارے پاس نہیں آئی ان کی بات بہت زیادہ ماننے والے ۔[1]

یہ منافقین و یہود کی ملی جلی خصلت بتائی جا رہی ہے ۔ اس کے دو مطلب ہیں ۔ سماعون کا لفظ سمع سے مبالغہ کا صیغہ ہے یہ لوگ چونکہ خواہشوں اور چاہتوں کی بندگی میں بے لگام ہو چکے تھے اس لیے ان کو سچائی سے نفرت تھی اور جھوٹ ان کا من بھاتا کھانا تھا ۔ ان کے نفس کی پیاس اسی سے بجھتی تھی ۔ انہیں جھوٹی گواہی، جھوٹی عدالت، اور جھوٹا فیصلہ چاہیے اور وہ نظام حیات جس کی عمارت ناخداشناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہو ۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی مجالس میں جھوٹ کی خاطر آتے ہیں تاکہ یہاں جو کچھ دیکھیں اور سنیں ان میں جھوٹ کی اپنی جانب سے آمیزش کرکے لوگوں میں پھیلائیں اور اہل ایمان کو بدنام کریں ۔ سماعون لقوم آخرین کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ جاسوس بن کر آتے ہیں اور حضور کی مجلس میں اور اہل ایمان کے پاس اس لیے آتے ہیں کہ یہاں سے کوئی راز کی بات مل جائے تو اسے آپ کے دشمنوں تک پہنچا دیں ۔ گویا وہ اپنے ذوق و شوق سے اور حق و انصاف کے لیے نہیں آتے بلکہ دوسروں کے بھیجے ہوئے آتے ہیں ۔ دوسروں سے اشارہ یہود کے علماء اور لیڈروں کی طرف ہے ۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے الزامات عائد کرنے اور افترا پردازیاں کرنے کے لیے

---

[1] افادات ۔ شیخ الاسلام

مواد فراہم کرنے آتے ہیں تاکہ لوگوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے براہ راست تعلقات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔

یہودیوں کی کلام الٰہی میں تحریف

۱۰۲۔ وہ لوگ کتاب اللہ کے حکموں کو باوجودیکہ ان کا صحیح محل متعین ہے اپنے مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔ یعنی خدا کے احکام میں تحریف کرتے ہیں، کہیں کی بات کہیں لگا دیتے ہیں بلکہ یہ وصف ان یہودی علماء اور زعماء کا بیان ہو رہا ہے جو خود سامنے نہیں آتے اور جن کے اشاروں پر منافقین ناچ رہے ہیں۔ یعنی توراۃ کے جو احکام ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہیں ان کے اندر جان بوجھ کر رد و بدل کرتے ہیں اور الفاظ کے معنے بدل کر من مانے احکام ان سے نکالتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام کا موقع و محل اور اس کا محل و مصداق متعین ہو جانے کے باوجود اس کو اس موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں جس سے حکم کا مقصد بالکل فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کسی حکم کا موقع و محل اور محل و مصداق واضح نہ ہو جس کی وجہ سے قاضی و مفتی تطبیق میں غلطی کر جائیں تو ان کو معذور کہا جا سکتا ہے لیکن موقع و محل کے تعین کے باوجود اس حکم کو اس کے موقع و محل سے ہٹانا صریح تحریف دین ہے۔

غرض پوری ہو تو مانو ورنہ نہیں

۱۰۳۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہ دیا جائے تو اس سے بچ کر رہو۔ یعنی اگر کوڑے لگانے کا حکم ملے تو قبول کرو ورنہ نہیں۔ گویا خدا کی شریعت کو اپنی ہوا کے تابع رکھنا چاہتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ ان منافقین کو یہ سکھا کر آپ کے پاس روانہ کرتے ہیں کہ اگر تمہارے معاملہ کا فیصلہ یہ ہو تو مان لینا اور اگر یہ نہ ہو تو اس کو نہ قبول کرنا۔ گویا اول تو علمائے یہود اور زعمائے قوم خود ہی تحریف کے چور دروازے سے مجرم کے لیے راہ فرار کی نشاندہی کر دیتے ہیں لیکن اگر کارروائی[1] کچھ زحمت محسوس کرتے ہیں تو معاملہ سرکار نبوت کی عدالت میں بھیجتے ہیں لیکن ہدایت یہ دے دیتے ہیں کہ منشا پورا ہو تو مان لینا ورنہ طرح دے جانا۔ منشا یہ ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ جو لوگ اس طرح کے فتنہ کاروں کا شکار ہو جاتے ہیں ان کو ان کی قسمت پر چھوڑ دو آپ ان کی اس حالت پر غمگین نہ ہوں۔ اس آیت میں عوام کے لیے علماء کے اتباع کا ایک ضابطہ بھی بتا دیا ہے کہ اگرچہ عوام کے لیے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتویٰ پر عمل کریں۔ لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کر لیں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے پہلے کیا کرتا ہے کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس بیماری کے لیے کون سا ڈاکٹر ماہر ہے اور کون سا حکیم اچھا ہے۔ کہ کی ڈگریاں کیا کیا ہیں، اس کے مطلب میں جانے والے مریضوں پر کیا گزرتی ہے۔ اپنی امکانی تحقیق کے بعد بھی اگر کسی غلط ڈاکٹر کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کر دی تو وہ قابلِ ملامت نہیں، لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی حکیم کے جال میں پھنس گیا اور پھر کسی مصیبت کا شکار ہو گیا، تو وہ اپنی خودکشی کا خود ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لیے دینی زندگی کے بارے میں ہے کہ اگر انہوں نے اپنی بستی کے اہلِ علم و فن اور تجربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدا بنایا اور اس کے فتویٰ پر عمل کیا تو وہ عند اللہ اور عند الناس معذور ہو گا۔ ایسی ہی حالت کے بارے میں حضور کا ارشاد ہے فان اثمه علی من افتی یعنی ایسی صورت میں گناہ کا بوجھ مفتی پر ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم و مقتدیٰ قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں ہے تو اس کا وبال تنہا اس مفتی پر اور عالم پر نہیں ہے بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے۔ قرآن کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے سمٰعون للکذب یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں، افسانے من گھڑت کہانیاں سننے کے عادی ہیں۔ اور امانت و دیانت کی تحقیق کیے بغیر ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں[1]

شقاوت کا قانون

۴۱۔ اور دیکھو جس کے لیے اللہ ہی فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیتا ہے تم اسے اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتے۔ ہدایت و ضلالت، خیر و شر کوئی چیز بھی بدون ارادہ خداوندی عالم وجود میں

---

[1] معارف م شفیع

نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس کا انکار کرنا اس کے تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ چوری نہ کرے۔ اب اگر وہ شخص اپنے ارادے میں کامیاب رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ خدا اس کے مقابلہ میں عاجز ہو۔ اگر خدا ہی کا ارادہ بندے کے ارادے پر غالب آتا ہے تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں کبھی چوری وغیرہ کسی شر کا وجود نہ ہو اور اگر خدا خیر و شر میں سے کسی چیز کا بھی ارادہ نہیں کرتا تو اس سے معاذ اللہ اس کا تعطل یا غفلت و سفاہت لازم آتی ہے تعالیٰ اللہ عن کل الشرور، ان تمام صورتوں پر غور کرنے کے بعد ناچار یہی ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز بھی اس کے ارادہ تخلیق کے بدون موجود نہیں ہو سکتی، یہ مسئلہ نہایت مہم اور طویل الذیل ہے۔ ہمارا قصد ہے کہ اس قسم کے مسائل سے متعلق مستقل مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔ واللہ الموفق [1]

ہمارے نزدیک یہ مشکلانہ نکتہ سنجی ایک بڑے محقق کے پہناتے علم کے مطابق ہے ورنہ اس جیسے مقام کے لیے آسان تعبیر یہ ہے کہ صداقتیں دو ہیں اور دونوں اپنی جگہ پر صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرے ذرے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ کوئی چیز کوئی کام اور کوئی حالت نہیں جو اس کے ارادے کے بغیر حرکت کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کے ارادے کے تحت ہیں یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور بالخصوص اسلام کی جان ہے۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت کی تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں۔ ظلم و انصاف کے نام کی دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جائے۔ کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام اور برے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تام حاصل ہے اور اس کا ارادہ ہر جزو و کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا۔ اور اسی پر وہ فطرت کے سامنے دُنیا کی عدالت میں اور آخرت میں مواخذہ اور بازپرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے۔

قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ خدا کے ارادہ کے بغیر پتہ بھی نہیں گرتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔ یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل ارادہ و مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنے ارادہ و حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی کچھ و طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری تکلیف بازپرس اور مواخذے کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوئی بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار ہو، انما الاعمال بالنیات اس تطبیق سے نہ تو اللہ سبحانہٗ کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمامتر مجبور ہونا لازم آتا ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔

اس آیت میں ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنت الٰہی کا بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل میں انسان کو اختیار کی نعمت دے کر آزماتا ہے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے اور دیکھتے سنتے شر کو خیر پر اور باطل کو حق پر ترجیح دیتے ہیں۔ نہ خدا کی تنبیہات سے سبق حاصل کرتے ہیں اور نہ اہل حق کی نصیحتوں سے وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر اور اپنے عقل و ارادے کو اس درجہ کند اور بے حس بنا لیتے ہیں کہ ان کے اندر حق کی طرف بڑھنے کا کوئی عزم اور حوصلہ سرے سے باقی ہی نہیں رہتا۔ باطل ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کو اللہ اس فتنے ہی میں چھوڑ دیتا ہے اس لیے اللہ کی طرف سے فتنہ میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ برے میلانات پرورش پاتے دیکھتا ہے اس کے سامنے پے درپے ایسے مواقع لاتا ہے جس میں اس کی

سخت آزمائش ہوتی ہے اگر وہ شخص ابھی برائی کی طرف پوری طرح نہیں جھکا ہے تو ان آزمائشوں سے سنبھل جاتا ہے اور اس کے اندر بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی جو قوتیں ہوتی ہیں وہ ابھرآتی ہیں لیکن اگر وہ برائی کی طرف پوری طرح جھک چکا ہوتا ہے اور اس کی نیکی اس کی بدی کے مقابلہ میں شکست کھا چکی ہوتی ہے تو ہر ایسی آزمائش کو قعہ پر وہ زیادہ سے زیادہ بدی کے پھندے میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وہ فتنہ ہے جس سے کسی انسان کو بچا لینا اس کے کسی خیر خواہ کا کام نہیں ہے اور اس فتنہ کا شکار صرف افراد ہی نہیں بلکہ قومیں بھی ہوتی ہیں۔ منشا یہ ہے کہ جس شخص کے دین کی اللہ آزمائش لینا چاہتا ہے تو اس کے سامنے آزمائش کے لیے مواقع لاتا ہے جس میں اس کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ ٹھیک اس طرح جیسے سونے کو آگ میں تپا کر اس کا کھوٹ منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ آپ کے قبضہ و اختیار میں ایسے شخص کو خدا کی جانب سے ہونے والے امتحان سے بچانا نہیں ہے ٹھیک اس طرح جیسے تانبے کو سونا بنانا آپ کے قبضہ و اختیار میں نہیں ہے۔ زمین کی کانیں ہوں یا انسانی اخلاق و اعمال کی کانیں ہوں سب کے لیے اللہ کا ضابطہ ایک ہے اور ناقابل تبدیل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ اسی اٹھتے ہوتے سوال کا جواب اگلے فقرہ میں دیا جا رہا ہے کہ جب یہ لوگ خود ہی اپنی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس یہ مصر ہیں تو اللہ کی سنت یہی ہے کہ بندے کے عزم فعل پر اس فعل کی تخلیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس قانون تکوینی کو کوئی روک نہیں سکتا۔

شقاوت کا آخری مرحلہ

۱۰۵- یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ پاک کرنا نہیں چاہتا ہے ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بہت بڑا عذاب ہے۔ اول منافقین اور یہود کا طرز عمل بیان فرمایا جس میں یہ چند اعمال بالخصوص ذکر کیے گئے ہیں۔ ہمیشہ جھوٹ اور باطل کی طرف جھکنا۔ اہل حق کے خلاف جاسوسی کرنا بد باطن اور شریر جماعتوں کو مدد پہنچانا۔ ہدایت کی باتوں کو تحریف کرکے بدل ڈالنا، اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کسی حق بات کو قبول نہ کرنا۔ جس قوم میں یہ خصال پائی جائیں اس کی مثال ایسے مریض کی سمجھو جو نہ دوا استعمال کرے نہ مہلک اور مضر چیزوں سے پرہیز کرے۔ اطبّاء اور ڈاکٹروں کا مذاق اڑاتے۔ فہمائش کرنے والوں کو گالیاں دے، نسخہ پھاڑ کر پھینک دے یا اپنی لغاتے سے اس کے اجزا بدل ڈالے اور یہ عہد بھی کرے کہ جو دوا

میری خواہش کے خلاف ہرگز کبھی استعمال نہ کروں گا۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی ڈاکٹر یا طبیب خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر معالجہ سے دستبردار ہو کر یہی ارادہ کرے کہ اس کی بے اعتدالیوں، غلط کاریوں، ضد اور ہٹ دھرمی کا خمیازہ بھگتنے دو تو کیا یہ طبیب کی بے رحمی یا بے اعتنائی کا ثبوت ہوگا یا خود مریض کی خودکشی سمجھی جائے گی۔ اب اگر مریض اس بیماری سے ہلاک ہو گیا تو طبیب و ڈاکٹر کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس نے علاج نہیں کیا اور تندرست کرنا نہ چاہا بلکہ بیمار خود ملزم ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کو تباہ کیا اور طبیب کو موقع نہ دیا کہ وہ اس کی صحت واپس لانے کی کوشش کرتا۔ ٹھیک اسی طرح یہاں یہود کی شرارت، ہوا پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی کو بیان فرما کر جو یہ لفظ فرماتے ومن یرد اللہ فتنتہ الخ اور اولٰئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم (یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا) اس کا یہی مطلب ہے کہ خدا نے ان کی استعداد بد اور بدکاریوں کی وجہ سے اپنی نظر لطف و عنایت ان پر سے ہٹالی جس کے بعد ان کے راہ پر آنے اور پاکی قبول کرنے کی کوئی توقع نہیں رہی۔ آپ ان کے غم میں اپنے کو نہ گھلائیں لقولہ تعالیٰ لا یحزنک الذین باقی رہا یہ شبہ کہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ ان کی سب شرارتوں اور غلط کاریوں کو جبراً روک دیتا اور مجبور کر دیتا کہ وہ کوئی ضد اور ہٹ دھرمی ہی نہ کر سکیں تو بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدا کی قدرت کے آگے یہ چیز کچھ مشکل نہ تھی ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلھم جمیعاً لیکن اس دنیا کا سارا کارخانہ ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کے خیر و شر کو اکتساب پر مجبور نہ کیا جائے۔ اگر خیر کے اکتساب پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لیے کوئی محل نہ ہوتا۔ مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم، ذوالبطش الشدید، قائم بالقسط اور مالک یوم الدین۔ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا لیے کا مظاہرہ ہو، کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انتظام کلام کے سوا کوئی غرض نہیں بتلا سکا لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔ اس سے زائد تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں بلکہ اس قدر بھی ہمارے موضوع سے خارج ہے[1]

شیخ الاسلام نے جس متکلمانہ انداز میں یہاں سخن نوازی فرمائی ہے اس کی بزرگی اور برتری

---

[1] فوائد شیخ الاسلام

قطعاً بے غبار ہے لیکن عوام کو سمجھانے کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود پاک ہونا نہیں چاہتے ہیں الا یہ کہ خدا خود زبردستی ان کو پاک کر دے مگر ایسی زبردستی سے پاک کرنا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے یعنی اللہ کی عادت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے کے بغیر از خود کسی کو پاک کرے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی آتی ہے مگر کن کے لیے بتصریح فرما دیا۔

وما یضل بہ الا الفاسقین اور فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم اور واللہ لا یھدی القوم الفاسقین اور بل طبع اللہ علیھا بکفرھم۔ ان تینوں میں سے ہر ایک پر غور کرو۔ ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بد اعمالی مقدم ہے اور اللہ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا موخر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اترنا علت اور انسانوں کا کفر و گناہ و نفاق معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا فسق و فجور، کجی، زنگ، کفر، انحراف نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے۔ اور یہی طبعی اصول بھی ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو کیسی سخت نادانی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت میں بھی اسی سنت الٰہی کی طرف جو قرآن میں ختم قلوب کے الفاظ سے تعبیر ہوتی، اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں کی تطہیر کے لیے [illegible] کے ہاں ایک خاص ضابطہ ہے۔ لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلتے ہیں اگر اثنائے راہ میں ان کو کوئی ٹھوکر لگ جاتی ہے وہ گر پڑتے ہیں لیکن گرنے کے بعد پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور توبہ و اصلاح کے ذریعے سے دامن جھاڑ کر پھر چل دیتے ہیں تو خواہ ہزار بار گریں اور اٹھیں لیکن ان کے دامان دل پر زنگ جمنے نہیں پاتا۔ لیکن جو لوگ برائی اور نافرمانی ہی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور گناہوں کے مشاغل ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کے دلوں پر آہستہ آہستہ اتنی گندگی جم جاتی ہے کہ ان کی پاکی کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی ہے۔ اللہ ایسے پاک کرنا نہیں چاہتا جو خود پاک ہونے کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔ اللہ کا دستور یہ نہیں ہے کہ جو خود پاکیزگی کا خواہاں نہ ہو اور اس کے لیے کوشش نہ کرے اسے جبراً پکڑ پکڑ کر پاکیزہ بنائے۔ یہودیوں کے یہ زعما۔ اور ان کے پیروکار گندگی کے ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ ان کی طبائع میں طہارت قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اللہ تو ان کو ہی پاک کرتا ہے جو خود پاکیزگی کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے کوشش کرے۔

اسلامی مملکت میں اجنبیوں کے مقدمات

۴۲۔ یہ جھوٹ سننے والے اور حرام مال کھانے والے ہیں۔ لہٰذا اگر تمہارے پاس آئیں اور تم سے فیصلہ چاہیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ وغیرہ اکابر سلف سے منقول ہے کہ حضور کو یہ اختیار ابتداء میں تھا۔ آخر میں جب اسلام کا تسلط اور نفاذ کامل ہو گیا تو ارشاد ہوا و ان احکم بینھم بما انزل اللہ یعنی ان کے نزاعات کا فیصلہ قانون شریعت کے مطابق کرو۔ مطلب یہ کہ اعراض اور کنارہ کشی کی ضرورت نہیں ہے پہلے یہ اس دور کی بات ہے جبکہ یہودی اسلامی حکومت کے باقاعدہ شہری نہ تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی تھی۔ اور ان کے مقدمات کے فیصلے ان ہی کے قوانین کے مطابق ان کے اپنے جج کرتے تھے۔ اس لیے علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں جو اختیار دیا گیا ہے کہ یہ صرف واقعہ کے ساتھ خاص ہے یا سب معاہدین کا یہ حکم ہے اور یا پھر آیت تمام دنیائے کفر کے بارے میں ہے۔ مختار یہ ہے کہ یہ اسلامی حکومت تمام غیر مسلم شہریوں کے بارے میں نہیں بلکہ معاہدین کے بارے میں یہ آیت ہے۔ آج بھی غیر مسلم اگر اسلامی حکومت کے شہری نہ ہوں بلکہ اسلامی مملکت میں کسی معاہدے کے تحت قیام پذیر ہوں تو اسلامی حکومت کے حکمرانوں کو اختیار ہے کہ چاہیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو نہ کریں وقت کی مصلحت کا جو تقاضا ہو اس پر عمل کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے حکمرانوں پر فیصلہ تو اسلامی حکومت کے شہریوں کے درمیان کرنا واجب ہے۔ دوسرے ملک کے شہریوں کے لیے واجب نہیں ہے صرف جائز ہے حسب ضرورت و مصلحت، قرطبی اور رازی نے اسی کو اپنایا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اوپر قیام عدل کی ذمہ داری اصلاً صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو تمہارے دائرہ اقتدار و اطاعت کے اندر ہیں۔ جو اس سے باہر ہیں جن کی وفاداری ابھی تقسیم ہے۔ جو آپ کے پاس بھی آتے ہیں اور دوسروں سے ساز باز بھی رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری شرعاً آپ پر نہیں ہے مصالح کا تقاضا ہو تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کر دو اور نہ ہو تو رد کر دو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

امت مسلمہ کو اس کے فرائض کی یاددہانی

۱۰۷ ۔ اور اگر کنارہ کشی اختیار کرو گے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر اور بدمعاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامن عدالت ناانصافی کے چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے۔ یہی وہ خصلت ہے جس کے سہارے زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔

پہلی آیت میں یہ تو آپ کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف رکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلامی مملکت کے شہری نہ ہوں اور وہ بطور خود اپنے مقدمات کا آپ سے فیصلہ کرانا چاہیں تو آپ چاہیں تو فیصلہ کردیں اور چاہیں تو نہ کریں لیکن اگر ان کا فیصلہ کرنا چاہیں اور مصالح کا بھی تقاضا ہو تو یہ قطعی ہے کہ آپ کو ہر حال میں اللہ کے قانون پر مبنی ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس کا اختیار نہیں ہے کہ فیصلہ کسی اور قانون کے مطابق کردیا جائے۔ دراصل یہ بات آپ کے حوالہ سے اُمت کو سنائی گئی ہے اور سنانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پہلے اسی آیت میں منافقین اور یہود کا یہ ملا جلا چہرہ پیش کیا تھا کہ سماعون لکذب اکالون للسحت یعنی یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے حرام خور ہیں۔ یہ دونوں مہلک بیماریاں ہیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ یہ دونوں بیماریاں ان میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا پورا معاشرہ اس کا شکار تھا۔ جھوٹ اور رشوت کے ساتھ دنیا میں حق و عدل کا کبھی بول بالا نہیں ہوا ہے۔ حق و عدل دو چیزوں کا سہارا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ حق کی بے لاگ شہادت دینے والے موجود ہوں، دوسرے یہ کہ قانون عدل و قسط کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے ہوں۔ جھوٹ اور رشوت ان دونوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ شہادت علی الناس اور قیام حق جیسے فرض کی ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب تم کو جھوٹ اور رشوت کی چاٹ نہ لگے۔ اگر جھوٹ اور رشوت کی بیماری معاشرے میں عام ہو جائے تو سمجھ لو کہ معاشرے سے حق و انصاف کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ قرآن نے منافقین و یہود کی اس بیماری کو بیان کرنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے کہ آپ ان کے درمیان جب فیصلہ کریں تو عدل و انصاف پر مبنی کریں۔ ان کے جھوٹ اور

افادات شیخ الاسلام

ان کی رشوت کا میل بھی آپ کے فیصلے پر ڈالتے۔ یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے پوری امت سے کہا جا رہا ہے کہ فیصلہ یگانوں کے کسی معاملہ کا ہو یا بیگانوں کا بہرحال بلے لاگ لپیٹ قانون عدل و انصاف کے مطابق ہو۔

شریعت سے یہود کی گریزپائی

۴۳۔ اور یہ لوگ تمہیں منصف کیسے بناتے ہیں جبکہ تورات ان کے پاس موجود ہے اس میں اللہ کا حکم ہے اس کے باوجود وہ اس سے روگرداں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ ایمان والے نہیں ہیں۔ یعنی تعجب کی بات ہے کہ آپ کو حکم ٹھہراتے ہیں اور جس تورات کو آسمانی کتاب مانتے ہیں اس کے فیصلے پر بھی راضی نہیں ہیں تو حقیقت میں ان کا ایمان کسی پر نہیں ہے۔ نہ قرآن پر نہ تورات پر۔ اگلے رکوع میں تورات و انجیل کی مدح فرما کر متنبہ کیا ہے کہ کیسی عمدہ کتاب اور کیسے علوم و ہدایت تھے جن کی ان نالائقوں نے بے قدری کی اور انہیں ایسا ضائع کیا کہ آج اصل چیز کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آخر حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے بالکل آخر میں وہ کتاب بھیجی جو ان سب پہلی کتابوں کے مطالب اصلیہ کی محافظ اور مصدق ہے اور جس کی ابدی حفاظت کا انتظام نازل کرنے والے نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ مذہبی لوگ جنہوں نے تمام عرب پر دینداری اور اپنے علم کتاب کا سکہ جما رکھا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ جس کتاب کو خود اللہ کی کتاب مانتے ہیں اور جس پر ایمان کے مدعی ہیں اس کے حکم کو چھوڑ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لاتے ہیں جن کو وہ پیغمبر ہی نہیں مانتے ہیں۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ لوگ کسی چیز پر بھی صداقت سے ایمان نہیں رکھتے اور اصل میں ان کا ایمان اپنے نفس اور اپنی خواہشات پر ہے جسے وہ کتاب اللہ کہتے ہیں اس سے صرف اس لیے روگرداں ہیں کہ اس کا حکم ان کی خواہشات اور مفادات کا ساتھ نہیں دیتا اور جن کی نبوت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے پاس صرف اس پر آتے ہیں کہ شاید وہاں کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جو ان کی خواہشات اور مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ تورات میں بھی زانی کے لیے سنگسار کرنے اور قاتل کے لیے قتل کا حکم دیا گیا ہے لیکن جب

[1] افادات شیخ الاسلام

کسی بڑے آدمی سے یہ جرائم سرزد ہوتے تو یہودیوں کے دنیا پرست علماء انہیں سزا سے بچانے کے لیے دور از کار تاویلیں کرتے اور طرح طرح کے شرعی حیلے نکالتے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا جیسا کہ پیچھے پڑھ چکے ہو۔ یہاں اسی معاملہ کی طرف اشارہ ہے فرمایا کہ جب ان کے پاس تورات موجود ہے تو کیوں اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے اور کیوں تمہارے پاس فیصلے کے لیے آتے ہیں اس لیے کہ دولت مند مجرموں سے رشوت لے کر یا ان کی جاہ سے مرعوب ہو کر انہیں سزا سے بچانا چاہتے ہیں۔ بس معلوم ہوا کہ یہ لوگ کتاب الٰہی پر ایمان ہی نہیں رکھتے اگر ایمان رکھتے تو راست بازی کے ساتھ اس کے حکموں کا اعلان کرتے۔

یہاں قرآن کے اعجاز کے لیے یہ دلیل بھی بجائے خود کافی ہے کہ یہود کی ساری اخفائی کوششوں کے باوجود زنا کاروں کے لیے رجم کی سزا کسی نہ کسی صورت میں آج تک باقی ہے۔ ارشاد میں فیھا حکم اللہ کا انداز بتا رہا ہے کہ جہاں تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے وہاں ایسے احکام بھی ہیں جو حکم اللہ نہیں ہیں۔ اگر ساری تورات زمانہ نبوت میں حکم اللہ پر مشتمل ہوتی تو قرآن کا انداز تعبیر یہ ہوتا " وھو کتاب اللہ یعنی ان کے پاس تورات ہے اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس انداز کو چھوڑ کر فیھا حکم اللہ کی تعبیر یہی بتانے کے لیے اختیار کی ہے کہ اس میں سارے احکام تو خداوندی نہیں ہیں مگر رجم ضرور اللہ کا حکم اس میں موجود ہے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَا ٱلتَّوْرَىٰةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا
ٱلنَّبِيُّونَ ٱلَّذِينَ أَسْلَمُوا۟ لِلَّذِينَ هَادُوا۟ وَٱلرَّبَّٰنِيُّونَ
وَٱلْأَحْبَارُ بِمَا ٱسْتُحْفِظُوا۟ مِن كِتَٰبِ ٱللَّهِ وَكَانُوا۟ عَلَيْهِ
شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا۟ ٱلنَّاسَ وَٱخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِى ثَمَنًا
قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَٰفِرُونَ ۝
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ ٱلنَّفْسَ بِٱلنَّفْسِ وَٱلْعَيْنَ بِٱلْعَيْنِ وَ
ٱلْأَنفَ بِٱلْأَنفِ وَٱلْأُذُنَ بِٱلْأُذُنِ وَٱلسِّنَّ بِٱلسِّنِّ وَٱلْجُرُوحَ
قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ
أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ۝ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم بِعِيسَى
ٱبْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ ۖ وَءَاتَيْنَٰهُ ٱلْإِنجِيلَ
فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَ
هُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ ٱلْإِنجِيلِ بِمَآ

أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

الْفَاسِقُونَ ﴿٤٧﴾

بلاشبہ ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے[109]۔ اللہ کے پیغمبر جو احکام الٰہی کے فرمانبردار تھے اسی کے ذریعے یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے نیز یہودیوں کے مشائخ اور علما بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے[110]، کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس کی خبر گیری پر متقرر تھے[111]۔ لہٰذا تم لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور سستے داموں پر میری آیات کی نہ خرید و فروخت کرو[112]۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں[113]، اور ہم نے تورات میں یہودیوں کے لیے لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،

کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم ہیں"۔ پھر جو کوئی بدلہ لینا معاف کر دے تو وہ گناہ کے لیے کفارہ ہے"، اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا تو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں"۔ اور پھر ہم نے ان نبیوں کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو روانہ کیا، تورات کی تصدیق کرتا ہوا جو اس کے سامنے موجود تھی، اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تورات کی جو اس کے سامنے تھی سراسر تصدیق ہے اور متقیوں کے لیے نصیحت اور ان کو راہ بتانے والی ہے"۔ اور انجیل والوں کو اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے نازل کی اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو یہی لوگ فاسق ہیں"۔

کتب الٰہی کا چہرہ اور ان کی قانونی حیثیت

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے۔ تورات جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل اور خود قرآن ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس جگہ صرف تین کتابوں کا ذکر کیا ہے یعنی تورات، انجیل اور قرآن۔ یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے۔ لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے۔ فی الواقع قرآن کی یہ تعلیم دنیا کی اہم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔

یہ تعلیم صرف نظریاتی نہیں ہے بلکہ عملاً اس پر اسلامی مملکت کے احکام و قوانین کی تشکیل ہوتی ہے اور قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو قرآن نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق بتاتے ہیں۔ یہ تقسیم حسب ذیل ہے۔

۱۔ مسلمان، ۲۔ اہل کتاب، ۳۔ شبہ اہل کتاب، ۴۔ کفار و مشرکین۔

قرآن نے ان کتابوں کا چہرہ بتاتے ہوئے اعلان کیا ہے فیہ ھدی و نور ان آیات میں کس خوبی کے ساتھ قرآن نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی۔ اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لاتے اپنی اپنی کتب منزل پر عمل کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی ان کو بتا دیا ہے کہ نسوا حظاً مما ذکروا بہ یعنی جن کتابوں کی حفاظت و نگرانی ان کے سپرد کی گئی تھی ان کا بیشتر حصہ طاق نسیان ہو چکا ہے اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے ان کے ماننے والوں نے اسے چھوڑ کر غلط خواہشوں کی پیروی شروع کر دی۔ یہ خواہشیں کیا ہیں کتاب الٰہی میں تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الٰہی کے مقابلے میں انسانی فکر کی آمیزش ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے اہل کتاب کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہے اور اسلام قبول کرنے پر ان کو ہدایت تامہ کی بشارت دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری کتابوں کے مقابلے میں قرآن ہدایت تامہ کاملہ ہے۔ یہی وہ دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ نے کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ کے ذریعے دوبارہ دنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ نامکمل تھی۔

اور قرآن جس کو لے کر آیا ہے وہ تمام اور کامل ہے۔ قرآن کا تورات و انجیل کے مقابلہ میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور بقیہ کتابیں موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی اور کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب انبیاء لے کر آئے تھے چونکہ ان کے پیرو اپنی تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لے کر آخری دفعہ تشریف لائے ہیں اب وہ ہمیشہ کامل رہے گی۔ کبھی ناقص نہ ہوگی۔ کیونکہ قرآن تحریف و اختلاف سے محفوظ رہے گا۔

الغرض دین محمدی کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیرووں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا، اسی کو قرآن لے کر آیا ہے۔ اس سورت کے آغاز میں تکمیل دین کا اعلان کیا تھا اور درمیان میں اس کے علم و عمل کو نور کہا تھا۔ آئندہ آیات میں اعلان ہو رہا ہے کہ قرآن تمام صحف الٰہی مہیمن اور حاوی ہے۔ اس لیے ہدایت تامہ نجات عمومی اور سنجات کامل اور فلاح عالم اب صرف محمد رسول اللہ کے علم و عمل میں ہے۔

۱۰۹- بلاشبہ ہم نے تورات نازل کی اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ یعنی وصول الی اللہ کے طالبین کے لیے ہدایت اور شبہات و مشکلات میں پھنسنے والوں کے لیے روشنی کا کام دیتی ہے۔[1] یہ تورات کی قدر و قیمت واضح کی ہے کہ اللہ نے اس کو زندگی کے اعلیٰ اقدار کے تحفظ کا وسیلہ، اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کی طرف رہنمائی کا ذریعہ صراط مستقیم کی ہدایت اور خواہشات و بدعات کی تاریکیوں سے نکالنے والی روشنی بنا کر اتارا تھا۔

تورات صرف یہودیوں کے لیے دستور تھا

۱۱۰- اللہ کے پیغمبر جو احکام الٰہی کے فرمانبردار تھے اسی کے ذریعے یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے نیز یہودیوں کے مشائخ اور علماء بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ یعنی تورات میں ایسا عظیم الشان دستور اور آئین ہدایت تھا کہ کثیر التعداد پیغمبر اور اہل اللہ اور علماء برابر اسی کے موافق حکم دیتے تھے اور نزاعات کا فیصلہ کرتے رہے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ ہم نے تورات کو احکام و قوانین کا امین بنا کر اتارا تھا۔ حضرت موسیٰ اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کے بعد انبیاء بنی اسرائیل ایک زمانے تک اسی تورات کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔ اس فقرے میں تورات کے بارے میں یہ باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ اس کے ذریعے یہودیوں کی زندگی کے معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ اور تمام اجتماعی و سیاسی اور قانونی معاملات اسی کی ہدایات کے مطابق اور اسی کی روشنی میں انجام پاتی تھیں یہاں خاص طور پر للذین ھادوا فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ تورات صرف یہودیوں کے لیے آئین ہدایت اور دستور زندگی تھی۔ اس کی حیثیت عمومی دستور کی نہ تھی۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہودیوں کے فیصلے تورات کے مطابق انبیاء کرتے تھے۔ آیت میں النبیوں کی صفت الذین اسلموا لا کر یہ بتایا ہے کہ یہ انبیاء جو تورات کے ذریعے یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ صرف دوسروں ہی کے لیے تورات کو واجب العمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود بھی خدا کے فرمانبردار اور تورات کے احکام و قوانین کے پابند تھے۔ لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ انبیاء کا چہرہ اسلام سے کیوں پیش کیا گیا ہے۔ دراں حالانکہ اسلام ایک صفت ہے جس میں امتی بھی شریک ہیں۔ گویا اس میں امت بھی انبیاء کی شریک ہے۔ اگر علامہ زمخشری کی یہ بات مان لی جائے کہ یہ صفت بطور مدح لائی گئی ہے۔ اس سے تفصیل و توضیح مقصود نہیں بلکہ یہود کفار پر ایک لطیف تعریض ہے جنھوں نے تورات کو زندگی کے معاملات سے بالکل بے دخل کر رکھا تھا پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ نبوت کی زندگی تو سراپا اسلام ہوتی ہے۔ صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ نبی ہے نبی ہونے کے ساتھ زندگی کا اسلامی ہونا ناگزیر ہے اس لیے اسلام نبوت کے لیے کوئی تعریفی پیمانہ نہیں۔ مدح کے لیے ضروری ہے کہ ایسی صفات خاصہ سے ہو جس سے ممدوح اپنے سے کمتر لوگوں سے ممتاز ہو جاتے۔ اور ظاہر ہے کہ اسلام ایک صفت عامہ ہے جس کے انبیاء کی امتیں اور ان کے متبعین بھی علم بردار ہوتے ہیں۔ کیا آپ حضور انور کی مدح میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور ایک مرد مومن اور مسلم تھے۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ امتی بھی یہ شرف رکھتا ہے۔ یہاں علامہ ناصر کی انتصاف میں وہ رائے بے حد پسند آئی ہے جو علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں پیش کی ہے،

> جیسا صفت کے ذریعے موصوف کی عظمت بیان کی جاتی ہے ایسا ہی کبھی موصوف کے ذریعے صفت کی عظمت ظاہر کی جاتی ہے۔ یہاں ایسا ہی ہے، بتایا یہ جا رہا ہے کہ اسلام تو وہ عظیم الشان راہ ہے جس پر اولو العزم انبیاء بھی چلتے رہے

ہیں تمہاری ترحیثیت ہی کیا ہے۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ حضرت اسحاق کے بارے میں ہے و بشرناہ باسحاق نبیا من الصالحین یعنی صلاحیت تو وہ مقام ہے جس کے نبی ہونے کے باوجود حضرت اسحاق بھی حامل تھے۔ اس میں صلاح کو نبی کی صفت بنا کر نبی کی نہیں بلکہ صلاح کی شان دوبالا کی گئی ہے اور لوگوں کو اس صفت کے حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس آیت میں اسلام کی شان کو دوبالا کرنے کے لیے انبیاء کی صفت بنا کر پیش کیا ہے۔ عربی ادب میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک شاعر حضور کی مدح میں کہتا ہے۔

فان مدحت محمد القصیدۃ

فلقد مدحت قصیدتی بمحمد

یہاں ہم اگر یہ نکتہ آفرینی ذکر یں تو بلاغت قرآنی کا خون ہو کر رہ جاتے۔ اب فقرے کا حاصل یہ ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اسلام کے نام سے دعوت پیش کر رہے ہیں یہ انبیاء کی مشترکہ دعوت ہے اور یہ وہ عظیم دعوت ہے جسے انبیاء نے اپنایا اور قبول کیا ہے۔ وہ سب کے سب مسلم تھے برخلاف تمہارے کہ تم اسلام سے ہٹ کر یہودی بن گئے ہو۔

تیسری بات اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ ربانیوں اور احبار تورات کے قوانین کے مطابق یہودیوں کے مقدمات و معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔

ربانیون جمع ربانی کی ہے۔ اس سے مراد روحانی اور محاسن آداب سے آراستہ اشخاص ہیں۔ یعنی مشائخ۔ حضرت علی فرماتے ہیں انا ربانی ھذہ الامۃ اور احبار جمع حبر کی ہے اس کے معنے عالم کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشائخ اور علماء حقانی ان اوقات اور ان جگہوں میں جہاں کہ انبیاء نہ ہوتے تھے۔ تورات کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ گویا وقت کے علماء اور مشائخ یہود پر لطیف طنز ہے کہ تم جن اسلاف کے خلاف ہو ان میں ایسی برگزیدہ ہستیاں بھی گزری ہیں جو تمہاری طرح اللہ کی کتاب کے معاملہ میں چور اور بددیانت نہ تھے۔

عہد الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری

۱۱۱۔ کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس کی خبرگیری پر مقرر تھے۔ یعنی تورات کی حفاظت کا ان کو ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ قرآن حکیم کی طرح انا لہ لحافظون کا وعدہ

نہیں تھا۔ تو جب تک علماء و مشائخ نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا تورات محفوظ و معمول رہی۔ آخر کار بنیاد سست علماء سوء کے ہاتھوں سے تحریف ہو کر ضائع ہو گئی۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ تورات کی حفاظت اور زندگی میں عمل درآمد کے لیے یہودیوں کے اکابر علماء و مشائخ کی سپردگی میں دے دی گئی تھی۔ استحفاظ کے معنے کسی سے حفاظت و نگہداشت میں رکھنے کے لیے سوال کرنے کے ہیں۔ یعنی ان مشائخ اور علماء کو اللہ نے اپنی کتاب کا محافظ، امین اور لوگوں کے سامنے اس کا شاہد اور گواہ بنایا تھا۔ یہ اندازِ بیان بھی وقت کے یہودیوں پر ایک میٹھی سی تعریض ہے کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ نگران اور پاسبان ہو کر انہوں نے خدا کے حرم میں کس طرح نقب لگائی ہے اور گواہ ہو کر کس طرح کتمانِ شریعت میں مہارت دکھائی ہے۔ استحفاظ سے آیت میں صیغہ مجہول آیا ہے۔ اس میں دونوں احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ نے ان سے اسے محفوظ رکھنے کا مطالبہ کیا، دوسرے یہ کہ انبیاء نے ان سے اس کا مطالبہ کیا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کا عہد پہلے پڑھ چکے ہو، اور یہ بھی فرمایا وکانوا علیہ شھداء اور وہ اس کے گواہ تھے۔ یعنی ان کے اسلاف مشائخ و علماء اس امر کے گواہ تھے کہ یہ کتابِ الٰہی ہے قولی شہادت بھی دیتے تھے اور عملی شہادت۔ قولی شہادت تو یہ ہے کہ تورات میں بیان کردہ بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک بنی اسرائیل کے سامنے موزوں ترین الفاظ میں وعظ و ارشاد کے درس و تدریس کے ذریعے پیش کرتے، تاکہ یہ دین ان کے کمل کتاب بن جاتے اور ان کے لیے دینِ موسیٰ کی صداقت ایک واقعہ بن جاتے۔ اور عملی شہادت یہ ہے کہ تورات کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جاتے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں دیکھ لی جاتے یہ نہ ہو کہ دوسروں کو تو وعظ و ارشاد کے ذریعے تورات کی دعوت دیں لیکن خود اپنے آپ کو اس کا مخاطب نہ سمجھیں۔ قرآن حکیم نے

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم

کے الفاظ سے ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اعلانِ حق میں کسی کی پروا نہ کرو

۱۱۲۔ لہٰذا تم لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور سستے داموں پر میری آیات کی خرید و فروخت

لہ، افادات شیخ الاسلام

ذکرو۔ یعنی لوگوں کے خوف یا دنیوی طمع کی وجہ سے آسمانی کتاب میں تبدیل و تحریف نہ کرو۔ اس کے احکام اخبار کو مت چھپاؤ اور خدا کی تعذیب و انتقام سے ڈرتے رہو۔ تورات کی عظمت شان اور مقبولیت جتلانے کے بعد یہ خطاب یا تو ان رؤسا و علماء یہود کو کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے کیونکہ انہوں نے حکم رجم سے انکار کیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیوں کو چھپاتے اور ان کے لکھنے میں عجیب طرح کے ہیر پھیر کرتے تھے اور یا درمیان میں اُمت مسلمہ کو نصیحت ہے کہ تم دوسری قوموں کی طرح کسی سے ڈر کر یا حب مال و جاہ میں پھنس کر اپنی آسمانی کتاب کو ضائع مت کرنا۔ چنانچہ اس اُمت نے بحمد اللہ ایک حرف بھی اپنی کتاب کا گم نہیں کیا۔ اور آج تک اسے مبطلین کی تغییر و تحریف سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی ۔ اور ہمیشہ رہیں گے ۔[1]

اس فقرے کی نشست متعین کرنے میں شارحین قرآن کا کچھ اختلاف ہے۔ علامہ زمخشری نے تو سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کا مخاطب اُمت اسلامیہ کے حکمرانوں کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ :

اس میں حکمرانوں کو اپنی حکومت میں اللہ کے سوا کسی سے ڈرنے سے اور مداہنت کرنے سے روکا گیا ہے کہ کسی ظالم بادشاہ کے خیال سے یا رشتہ داروں اور دوستوں کی کسی تکلیف کے اندیشہ سے خدا کے حکم کے خلاف فیصلہ نہ کرو۔

لیکن علامہ ابوالسعود اور دوسرے شارحین قرآن کہتے ہیں کہ بطور التفات یہ زمانہ نبوت کے علماء اور رؤسا یہود کو خطاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب صورت حال یہ ہے تو تم لوگوں سے ڈر کر احکام الٰہی کو نہ چھپاؤ بلکہ مجھ سے ڈرو اور میرے سے وفاداری کرو۔ اور کسی دنیوی منفعت کی خاطر کتاب الٰہی کو بیان کرنا، اس پر عمل کرنا اس پر فتویٰ دینا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہرگز نہ چھوڑو۔ یہاں خلقت سے ڈرنا ان کا یہ ہے کہ اگر ہم نے حسب بشارات تورات نبوت محمدی کی تصدیق کر دی تو ہمارے عوام ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ علماء یہود کے لیے قبول حق یا تصدیق محمدی سے پہلا مانع یہی حب جاہ تھا۔ سب سے پہلے یہ اسی پر ضرب ہے اور دوسرا مانع حب مال تھا۔ اس پر ولا تشتروا سے متنبہ کیا کہ یہ نذرانے وغیرہ جو عوام سے ملتے ہیں ان کے بند ہو جانے کا اندیشہ نہ کرو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور کچھ لوگوں نے اس کا تعلق وکانوا علیہ شہداء سے قائم کر کے یہ مطلب بتایا ہے کہ ان شہداء ہی سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ان سے ڈرنا انسانوں سے نہ ڈرنا۔ یعنی چونکہ تمہیں کتاب الہٰی کا گواہ بنایا گیا ہے اس لیے واجب ہے کہ تم صرف خدا ہی سے ڈرو دوسروں کا خوف و رعب اپنے سینے سے نکال دو، اس کے بغیر ہر طرح کے حالات میں اس کے لیے کتاب الہٰی کی شہادت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح جو جماعت کتاب الہٰی کی امین بنائی گئی ہے اس پر حرام ہے کہ وہ اپنے دنیوی مفادات و اغراض کی خاطر خدا کی اس امانت میں خیانت کرے اور کتاب الہٰی میں تاویل و تحریف کرے۔ حافظ ابن کثیر کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ گویا دراصل اس فقرے میں شہادت کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ یہ رکاوٹیں دو ہی ہیں حُبّ جاہ اور حبِ مال۔ لا تخشوا الناس میں حب جاہ اور لا تشتروا میں حبِ مال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی نہ تو جاہ منصب، قیادت زعامت اور حکومت کو خاطر میں لاؤ اور نہ مفادات، منفعتوں اور خواہشوں کو دھیان میں لاؤ۔ ان سب سے بالا ہو کر فرضِ شہادت انجام دو۔

قضا و افتا میں قانون الہٰی کی خلاف ورزی

۱۱۳۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔ ما انزل اللہ کے موافق حکم نہ کرنے سے غالباً مراد یہ ہے کہ منصوص حکم کے وجود ہی سے انکار کر دے اور اس کی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کرے جیسا کہ یہود نے حکم رجم کے متعلق کیا تھا تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ ما انزل اللہ کو عقیدۃً ثابت مان کر پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے تو کافر سے مراد عملی کافر ہے یعنی اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے[1]

یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے کچھ گوشوں پر یہاں اجمالی تبصرہ کر دیا جائے۔ شیخ الاسلام نے نچوڑ اور خلاصہ کے طور پر جو کچھ فرمایا ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ہے لیکن بہت مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے معالم القرآن کے قاریوں کی تشنگی دور نہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوگی اس لیے عرض ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، کفر کا لفظ بولا ہے اور آگے دو آیتوں میں ظلم اور فسق کہا ہے۔ کچھ نے یہ کہہ کر اس آیت کی زد سے بچنے کی کوشش کی کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے اور کچھ نے کہا یہ تینوں آیتیں کفار کے متعلق ہیں اور کچھ نے کفر کے معنے میں اپنی طبعی جولانی دکھائی ہے۔ یہ بات کہ یہ آیات یہودیوں کے بارے میں ہیں یا یہ کافروں سے متعلق ہیں بالکل صحیح ہے اور اس میں دو رائیں نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت براء بن عازب کہتے ہیں کہ یہ آیات کافروں کے حق میں ہیں اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد ہے کہ یہ آیات قریظہ اور نضیر یہود کے بارے میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کا پس منظر یہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اسی جرم کا اگر مسلمان ارتکاب کریں تو ان کے حق میں یہ جرم نہیں ہے۔ کیونکہ اعتبار تو قرآن کے عام الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ پس منظر اور اسباب کا۔ شاید حضرت حذیفہ کے سامنے اسی قسم کے ذہن رکھنے والے نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئی ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف کیا وہی کافر ہے وہی ظالم ہے وہی فاسق ہے اس پر حضرت صدیقہ نے فرمایا کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کڑوا کڑوا سب ان کے لیے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے ہے ہرگز نہیں بخدا تم بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلو گے یہ صرف حضرت حذیفہ ہی کا تاثر نہیں بلکہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور تابعین میں سے الحسن البصری اور ابراہیم نخعی بھی یہی کہتے ہیں۔

ان ھذہ الایات الثلاث عامۃ فی الیھود وفی ھذہ الامۃ

یہ تینوں آیتیں یہود کے اور امت محمدیہ کے حق میں آئی ہیں۔

علامہ اسماعیل قاضی نے احکام القرآن میں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ جو شخص بھی یہودیوں جیسا کردار پیش کرے گا اور خدا کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے قانون پر عمل کرے گا وہ اسی وعید کا مستحق ہے حاکم ہو یا مفتی یا کوئی اور۔

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی و ظاہر ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی وجہ شرعی کے خدا کے احکام کی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کرے یا دوسروں کے تصنیف کردہ کو نافذ کرے اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے وہ یقیناً کافر بھی ہے ظالم بھی ہے اور فاسق بھی۔ کافر اس لیے کہ اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کے ہم معنے ہے، ظالم اس لیے کہ اس کا

یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے اور فاسق اس لیے کہ بندہ ہونے کے باوجود وہ اپنے مالک کے قانون کے دائرے سے نکل رہا ہے۔ اسلامی زندگی کا مدار ہی اللہ کی حاکمیت ہے اور شریعت کے نزدیک اس فعل سے بڑھ کر اور کون سا فعل ہے جو ایک مسلمان کے لیے کفر، ظلم اور فسق کا مستوجب ہو گا! — یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کردار کے لیے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کے لیے نہیں فرمائی یعنی فاولٰئک ھم الکافرون۔ سارے قرآن میں یہ اندازِ وعید کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح ایمان و اسلام کی ستر سے اوپر کچھ شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اس کے بھی مراتب ہیں۔ اسی لیے صحابہ و سلف سے مروی ہے کفر دون کفر و ظلم دون ظلم۔ امام بخاری نے کتاب الایمان میں باب باندھا ہے کفران العشیر وکفر دون کفر لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے ماخوذ ہے جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطاء ابن ابی رباح کے طریق سے روایت کیا ہے اور امام ابوالحسن الاشعری نے بھی مقالات طوائف الاسلامیہ میں لکھا ہے کہ یہ متعدد صحابہ سے منقول ہے۔[1]

پھر جس طرح ایمان اعتقادی بھی ہے اور عملی بھی۔ یعنی اعتقادات و افکار میں سے بھی ہے۔ اور عملیات و ظواہر میں سے بھی۔ فکر بھی ہے اور فعل بھی ایمان باللہ والرسل بھی ایمان ہے اور نماز بھی ایمان ہے۔ ٹھیک اسی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ ایک کفر اعتقادات و افکار کا ہے اور ایک اعمال و افکار کا۔ شرک کفر اعتقادی ہے اور ترک صلاۃ متعمداً کفر عملی۔ لہٰذا یہ جو فرمایا کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون۔ تو اس میں اور عموم کفر و ایمان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ نہ لفظ کفر کی یہاں کوئی تاویل کرنی چاہیے اور نہ یہودیوں سے مخصوص کرنا چاہیے۔ قرآن نے جس فعل کو کفر کہا ہے وہ کفر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی رہے گا۔ ہاں یہ کفر بھی دوسرے اعمال کفریہ کی طرح کفر عملی ہے نہ کہ کفر اعتقادی و مخرج من الملت، اس کا کرنے والا ویسا ہی فعل کفر کا مرتکب ہو گا جیسا نماز جان کر چھوڑ دینے والا لیکن یہ وہ کفر نہیں جو ملتِ اسلامیہ سے نکال دیتا ہے۔ جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس دروازے سے اسلام میں داخل ہوا تھا

[1] تفصیلات حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان میں ہیں۔

اس وقت تک اس معنے میں کافر نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنا اور خود تراشے ہوئے یا انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر فیصلہ کرنا قرآن کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملاً کفر ہیں اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں ہے اور قریب ہے کہ اس کا مرتکب اس کفر کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ قرآن میں جن لفظوں میں اس کا ذکر کیا ہے وہ عام گناہوں کے لیے کبھی اختیار نہیں کیا جاتا۔ یہ انداز بیان اتنا شدید ہے کہ اول تو کافر کہا جا رہا ہے پھر تاکید پر تاکید اور قصر الصفۃ علی الموصوف کے ذریعے اس میں اس قدر سنگینی پیدا کر دی گئی ہے کہ جس دل میں رائی برابر بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو اس کو لرزا دینے اور خوف الٰہی سے بدحال کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جاتے ہیں اس سے سرزد ہو سکتے ہیں مگر اس کفر کے ارتکاب کا کبھی دھیان بھی نہیں کر سکتا۔ اس تاکید اور زور کے ساتھ ان کو کافر قرار دینے کی وجہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی شریعت اور کتاب کی تعلیم دینے اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے اور اس راہ کے خطرات سے متنبہ کرنے کے لیے فرمایا۔ قرآن نے جن اعمال پر جو تعبیر اختیار کی ہے اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصل زور گھٹا دیں ایسی کوششیں جن لوگوں نے کی ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔ یہ جو آج تمام عالم اسلامی میں تقریباً دو تہائی مسلمان عملاً ایک قسم مرجی و جہمی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی فتنہ تاویل ہے۔ اسی بدعت کی وجہ سے اعمال کی اہمیت مطلوبیت بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے ہمیشہ ایسی تاویلوں سے انکار کیا اور ان تمام راہوں سے بچتے رہے جو رستے اور تعمق کی بدعتوں کی طرف لے جانے والی ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے براء بن عازب، حذیفہ ابن الیمان، عبداللہ بن عباس، ابو محسن، ابو رجاء، عکرمہ، عبیداللہ بن عبداللہ اور الحسن البصری کا یہ خیال نقل کر کے: نزلت ھذہ الآیات فی بنی اسرائیل صحابہ اور تابعین سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حسن بصری کہتے ہیں کہ ان آیات کا وجوب ہم پر بھی ہے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ یہ آیات بنی اسرائیل کے باب میں ہیں لیکن اس امت کے لیے بھی اللہ کی رضا یہی ہے۔ عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ مسلمان کا یہ فعل حکم خداوند کے انکار کا ہم معنے

ہے۔ عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ کفر ہے۔ عطا ابن ابی رباح کہتے ہیں کہ یہ کفر دون کفر ہے۔ ان سب بزرگوں کا مقصود یہی تھا کہ اس کی تاویل نہ کرنا چاہیے۔ آیت کا صاف مطلب یہی ہے کہ جو غیر شرعی احکام کو شرعی احکام قرار دے اور انسانی قانون کو خدائی قانون کے مقابلے میں چلاتے۔ بڑی جسارت رکھنے والوں کے کفر میں شک کیا ہو سکتا ہے!

یہودیوں کا ضابطہ فوجداری

۴۴۱۱۔ اور ہم نے تورات میں یہودیوں کے لیے لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسے زخم ہیں۔ یعنی قصاص کا یہ حکم شریعتِ موسوی میں تھا اور بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ جو پچھلی شرائع قرآن کریم یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل فرمائی ہیں بشرطیکہ ان کی نسبت کسی جگہ حضور نے کوئی انکار یا ترمیم نہ فرمائی ہو تو وہ اس امت کے حق میں بھی تسلیم کی جائیں گی گویا بدون انکار کے ان کا سنانا تلقی بالقبول کی دلیل ہے[1]

یہ بھی یہودیوں پر طنز ہے کہ تورات میں تو اللہ نے تمہارے لیے یہ قانون بنایا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اور تم نے یہ کر لیا کہ اگر نضیر کا آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو مار ڈالے تو قصاص نہیں لیتے اور آدھی دیت لے کر چھوڑ دیتے ہو۔ اگر قریظہ کا کوئی آدمی نضیر کے کسی آدمی کو مار ڈالے تو اس سے پوری دیت لیتے ہو۔ امیر غریب کی یہ تفریق تورات میں کہاں تھی۔ یہ تو کھلم کھلا خدائی قانون کی بغاوت ہے۔ ہم نے تورات میں بلا تفریق قصاص کا حکم دیا تھا۔ تم نے یہ تفریق کہاں سے نکالی ہے۔ اگرچہ ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیات زنا کے کیس میں نازل ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے مگر امام احمد نے مسند میں اور ابن جریر نے تفسیر میں یہ واقعہ بھی عبداللہ بن عباس کے حوالے سے لکھا۔ ابوداؤد اور نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ قتادہ اور مقاتل بھی یہی کہتے ہیں۔ اسباب میں تعدد ہو سکتا ہے۔ دونوں واقعات پیش آئے ہوں اور وحی الٰہی نے ایک ہی جگہ اتحاد نوعیت کی وجہ سے دونوں کا مداوا کر دیا۔

اس آیت سے بہت سے اصولیین اور فقہاء نے اسلامی قانون کے اس موقف کو واضح کیا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ اسلام سے قبل کے قوانین بھی اسلامی حکومت کے لیے قانونی حیثیت رکھتے ہیں بشرطیکہ ان کا نسخ ثابت ہوا ہے۔ چونکہ یہاں اس ضابطہ فوجداری کے منسوخ ہونے کا کوئی اشارہ تک نہیں اس لیے تمام مدارس قانون کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہی اسلام کا قانون فوجداری ہے۔ ابو منصور بن الصباغ کی کتاب الشامل کے حوالہ سے القاسمی نے نقل کیا ہے کہ تمام اُمت کے اہل علم کی اجتماعی قوت اس کی پشت پر ہے۔

جس ضابطہ فوجداری کا تورات کا نام لے کر یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ تورات میں سارے تحریفی انقلابات کے باوجود یہ حکم کتاب خروج ۲۱، ۲۳، ۲۵ کتاب احبار ۲۴، ۲۰ اور کتاب استثنا ۱۹، ۲۱ میں صراحۃً موجود ہے۔

سارے ائمہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اور امام ابوحنیفہؒ النفس بالنفس کے عموم سے اپنے اس قانونی موقف پر بھی استدلال کیا ہے کہ مسلمان اگر قاتل ہو اور مقتول کافر بشرطیکہ اسلامی مملکت کا شہری ہو اور ایسے ہی اگر آقا قاتل ہو اور غلام مقتول ہو تو مسلمان قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ اگرچہ دوسرے مدارس فقہ کو اس موضوع پر ابوحنیفہ سے اختلاف بھی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ راویوں کی تعبیرات سے الگ ہو کر اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن کا رجحان یہی ہے۔ یہاں تورات کے اس ضابطہ فوجداری پیش کرنے کی رُوح یہ ہے کہ تورات میں واضح احکام کے باوجود یہ یہود کیسے آپ کو حکم بنا کر فیصلے سے گریز پاتی کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ حدود ہی کے معاملات تھے جو یہود کے لیے سب سے بڑا پرچہ امتحان بنے ہوئے تھے۔ ان کی دینی زندگی کا سب سے بڑا جرم حدود و تعزیرات سے فرار تھا۔ وجوہ و اسباب کے تجزیے سے ہٹ کر اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور کے مسلمانوں کی اسلامی زندگی میں بھی آپ کو حدود و تعزیرات ہی سب سے بڑی آزمائش محسوس ہوں گے۔

آیت میں والجروح قصاص سے مراد یہ ہے کہ زخم بھی محل قصاص ہیں۔ یعنی جسم انسانی میں ہر زخم کا قصاص لیا جائے گا لیکن جس زخم کے دینے سے موت کا اندیشہ ہو یا زخم کا طول و عرض اور عمق معلوم نہ ہو سکے تو ان صورتوں میں تاوان لیا جائے گا جس کو قانون کی زبان میں ارش کہتے ہیں

معافی گناہوں کا کفارہ ہے

۱۱۵۔ پھر جو کوئی بدلہ لینا معاف کر دے تو وہ گناہ کے لیے کفارہ ہے۔ یعنی مجروح کے قصاص کو

معاف کر دینا مجروح کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس آیت کو جارح کے حق میں رکھا ہے۔ یعنی اگر مجروح نے جارح کو معافی دے دی تو اس کا گناہ معاف ہو جائے گا والراجح ہو الاول [1]

اصل میں آیت میں لفظ لَہٗ کی ضمیر کے متقرر کرنے میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے۔ کچھ کی رائے ہے کہ اس کا مرجع مجروح یعنی وہ شخص ہے جسے زخمی کیا گیا ہے اور جو معاف کر رہا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح اپنے مجرم کو معاف کر دے اور اس سے بدلہ نہ لے تو اس کی یہ نیکی اس کے گناہوں کے لیے کفارہ ہو جائے گی۔ اس طرح یہ آیت مجروح کو معاف کرنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ امام شعبی بھی یہی فرماتے ہیں اور بیشتر مفسرین کی رائے بھی یہی ہے۔ ارشادِ نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے فرمایا جس کے جسم میں کوئی زخم لگایا گیا اور اس نے معاف کر دیا تو جس درجہ کی یہ معافی ہو گی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ درجات کی تشریح حضور ہی نے اس ارشاد میں فرمائی ہے جو بحوالہ عبداللہ بن عمر دیلمی نے نقل کیا ہے کہ:

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور بتایا کہ اس کا مصداق وہ شخص ہے جو کسی کا دانت توڑتا ہے یا اس کو زخمی کرتا ہے اور مجروح اسے معاف کر دیتا ہے تو مجروح کے اس قدر گناہ معاف ہو جاتے ہیں جتنی اس نے معافی دی ہے اگر آدھی دیت معاف کی ہے تو آدھے گناہ اور اگر چوتھائی معاف کی ہے تو چوتھائی گناہ۔ اگر تہائی دیت معاف کی ہے تو تہائی گناہ اور اگر ساری دیت معاف کی ہے تو سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس عبداللہ بن عباس، مجاہد اور حضرت جابر یہ فرماتے ہیں کہ لَہٗ میں ضمیر کا مرجع مجروح نہیں بلکہ جارح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح مجرم کو معاف کر دے تو یہ معافی مجرم کے لیے کفارہ بن جائے گی۔ عدالت اس پر کوئی مقدمہ نہ چلائے گی اور قانون اس سے کوئی باز پرس نہ کرے گا۔

قانونی اور اخلاقی تقاضا

دونوں تشریحات میں ایک جوہری فرق ہے۔ پہلی رائے محض ایک اخلاقی وعظ و تلقین ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جبکہ دوسری رائے ایک قانونی ضابطہ فراہم کرتی ہے وہ یہ کہ مجروح کے معاف کرنے کے بعد عدالت کو مجرم پر مقدمہ چلانے اور اسے سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ قانونی اور اخلاقی ہدایات کی یہ تقسیم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسانی زندگی کو پوری طرح قانون کے شکنجے میں کس دینا نہ تو مناسب اور مفید ہے نہ ممکن العمل۔ اسی طرح ہر ہدایت کو اختیاری اور اخلاقی درجہ دینا انسان کو ہلاکت کے غار میں دھکیل دینے کے مترادف ہے۔

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق، اگرچہ منشا دونوں کا ایک ہے مگر منزل مقصود تک پہنچنے کی راہیں مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا۔ جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال جن مفسرین کی نظر اخلاق پر ہے انہوں نے لہٗ کی ضمیر کا مجروح کو قرار دیا اور آیت قرآنی سے عفو کی ترغیب معلوم کی اور جن کے پیش نظر قانون ہے انہوں نے ضمیر کا مرجع جارح کو بتایا اور اس سے عدلیہ کے لیے ایک قانونی دفعہ معلوم کر لی اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور دونوں کو سلف کی حمایت حاصل ہے۔

خدائی قانون کے خلاف فیصلہ کرنے والے ظالم ہیں

۱۱۶۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا تو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں۔ یہود نے حکم قصاص کے خلاف بھی تعامل قائم کر لیا تھا۔ ان میں بنی نضیر جو زیادہ معزز اور قوی تھے۔ بنو قریظہ سے پوری دیت وصول کرتے اور جب ان کو دینے کی نوبت آتی تو نصف دیت ادا کرتے۔ بنی قریظہ نے اپنی کمزوری کی وجہ سے ان سے اس طرح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ اتفاقاً بنی قریظہ کے ہاتھ سے بنی نضیر کا آدمی مارا گیا۔ انہوں نے دستور سابق کے موافق ان سے پوری دیت طلب کی۔ بنو قریظہ نے جواب دیا کہ جاؤ وہ زمانہ گیا جب ہم نے تمہاری قوت سے مجبور ہو کر یہ ظلم منظور کیا تھا۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آ چکے ہیں، ان کا دور دورہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ جو دیت تم سے لیتے ہیں اس سے دگنی ادا کریں۔ اس سے غرض یہ تھی کہ جناب محمد رسول اللہ کی موجودگی میں یہ محال ہے کہ کوئی قوی ضعیف کو کچل ڈالے۔ کیونکہ سب کو یقین تھا کہ آپ ہر ضعیف و قوی کے ساتھ یکساں

انصاف کرتے ہیں اور طاقتوروں کے مظالم کے مقابلے میں ضعفاء کی دستگیری فرماتے ہیں۔ انجام کار یہ معاملہ حضور کی عدالت میں پیش ہوا اور بنی قریظہ نے جو خیال اس پیکر عدل وانصاف کے بارے میں ظاہر کیا تھا۔ بلاکم وکاست صحیح نکلا۔ حکم قصاص کے بعد ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الظٰلمون۔ فرمانے سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ رجم کی طرح قصاص کے حکم شرعی ہونے کا صریحاً انکار نہیں کیا تھا بلکہ آپس کی مفاہمت سے خلاف حکم شرعی ایک دستور قائم کر لیا تھا تو قانون کی یہ اعتقادی نہیں صرف عملی مخالفت تھی اس لیے یہاں کافروں کی جگہ ظالمون فرمایا یعنی یہ ظلم صریح ہے کہ قوی سے کم اور ضعیف سے زیادہ دیت لی جائے۔[1]

یہاں فوجداری قانون ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں کو ظالم کہا ہے جو عدل وانصاف کے اس خداوندی قانون کو محض طاقت کے گھمنڈ میں نظر انداز کرتے ہیں وہ اپنی ذات پر اور اپنے معاشرے پر سب سے بڑا ظلم کرتے ہیں۔ قتل دنیا میں سب سے بڑا ظلم ہے۔ اسی بنا پر ارشاد فرمایا ہے کہ اول ما یقضی بین الناس الدماء قیامت کے روز سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ چکایا جائے گا وہ انسان کا خون ہے۔

شاید یہاں ذہن میں آپ یہ خلش محسوس کریں کہ یہ حدیث مشہور حدیث محاسبہ صلوٰۃ کے معارض ہے کیونکہ نماز کے متعلق قضا (فیصلہ) کا نہیں بلکہ حساب کا لفظ آیا ہے۔ بخاری کی روایت میں اول ما یحاسب بہ الصلاۃ۔ قیامت میں سب سے پہلے آدمی سے جس عمل کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں محاسبہ ہوگا ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے لیکن جن کاموں میں فیصلہ چکایا جائے گا ان میں سب سے پہلا معاملہ قتل کا ہوگا۔ ان میں سب سے پہلے معاملہ خون کا معاملہ ہوگا لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ محاسبہ اور قضا میں فرق ہے۔ کچھ کام انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ دوسروں کے حقوق سے۔ شریعت نے اسی فرق کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے تعبیر کیا ہے۔ پہلی قسم کے کاموں میں قضا اور فیصلہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اس کا کوئی دوسرا مدعی نہیں ہے۔ اس میں بازپرس ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسری قسم کے لیے پرسش کافی نہیں فیصلہ چکانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ایسے کام ہیں جن میں دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں اور وہ بحیثیت مدعی حاضر ہوں گے۔ نماز پہلی

[1] افادات شیخ الاسلام

قسم کے اعمال میں سب سے اہم ہے اور قتل کا معاملہ دوسری قسم میں سب سے زیادہ اہم ہے لہٰذا حساب کے موقع پر سب سے پہلے نماز کی پوچھ گچھ ہوگی اور جب فیصلہ چکایا جائے گا تو سب سے پہلے قتل نفس کا معاملہ پیش ہوگا۔ مالیات کے موضوع پر صرف یہ آتا ہے کہ

بندے قیامت کے روز اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے جب تک چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہوں گے ان میں ایک بڑا سوال یہ ہوگا کہ مال کن کن ذرائع سے حاصل کیا اور کن راہوں پر خرچ کیا۔

تورات کی تصدیق

۱۱۷- اور پھر ہم نے ان نبیوں کے بعد حضرت عیسیٰ بن مریم کو روانہ کیا تورات کی تصدیق کرتا ہوا جو اس کے سامنے موجود تھی، اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تورات کی جو اس کے سامنے ہے تصدیق کرتی ہے اور متقیوں کے لیے نصیحت اور ان کو راہ بتانے والی ہے۔ یعنی ان کے نقش قدم پر حضرت عیسیٰ بھی چلتے تھے وہ خود اپنی زبان سے تورات کی تصدیق فرماتے تھے اور جو کتاب انجیل ان کو دی گئی تھی وہ بھی تورات کی تصدیق کرتی تھی، اور انجیل کی نوعیت بھی نور و ہدایت ہونے میں تورات کی طرح تھی، احکام و شرائع کے اعتبار سے دونوں میں بہت ہی قلیل فرق ہے جیسا کہ ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ فرق تورات کی تصدیق کے منافی نہیں ہے جیسے ہم آج قرآن کو مانتے اور صرف اسی کے احکام کو ماننے کے باوجود بحمد اللہ تمام کتب سماویہ کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔[1]

اصل ارشاد قفینا آیا ہے یہ لفظ قفا سے لیا گیا ہے یعنی گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں۔ قفیتہ اور قفیت بہ۔ اور قفیت بہ علی اثرہ سب کے معنے پیچھے چلنے اور نقش قدم پر چلنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان ہی انبیاء کے نقش قدم پر جو تورات کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ ہم نے حضرت عیسیٰ کو روانہ کیا۔ یعنی ان کی شریعت بھی تورات ہی تھی اور حضرت عیسیٰ کو ہم نے انجیل دی۔ حضرت مسیح اور انجیل دونوں تورات کی تصدیق کرتے تھے۔ یہ تصدیق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی من جملہ علامات نبوت ایک تھی جس طرح ایک ہی درخت کے برگ و بار میں مماثلت ہوتی ہے اسی طرح اس مقدس گروہ کے افراد میں ایک دوسرے کی تصدیق میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ان میں ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اس میں بھی یہود پر طنز ہے کہ ان کو نہ مان کر تم نے اپنی بے بصیرتی کا ثبوت دیا ہے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ حضرت مسیح کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین جو پچھلے انبیا کا متفقہ دین تھا مسیح کا بھی دین تھا اور اسی کی طرف ان کی دعوت تھی۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانے میں محفوظ تھا اس کو مسیح خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی۔ چنانچہ اس انجیل میں بھی ہے کہ

یہ نہ سمجھو کہ میں تورات کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ متی باب ۵ آیت ۱۷، ۱۸

یہاں انجیل کے بارے میں اور پچھلے تورات کے بارے میں یہ ایک جملہ آیا ہے کہ فیہ ھدی و نور کہ تورات میں ہدایت اور روشنی ہے اور انجیل میں ہدایت اور روشنی ہے۔ دو باتیں الگ الگ ہیں ایک کسی چیز کا ہدایت و روشنی کے لیے ظرف ہونا اور دوسرے کسی چیز کا بجائے ظرف ہونے کے خود ہدایت اور روشنی ہونا۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اتنا ہی فرق جیسے ایک کسی کے لیے رحمت کا ظرف ہونا اور کسی کا خود رحمت ہو جانا۔ دوسرے انبیاء کے لیے رحمت ظرف ہے ادخلنا ھم فی رحمتنا اور حضور کی ذات گرامی خود سراپا رحمت ہے اس میں اشارہ ہے کہ قرآن سے پہلے ہر کتاب اور حضور انور سے پہلے ہر نبی اسلام کے باغ میں درخت کی اور مکان میں کمرے کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کتاب کو اسلام کا پورا باغ اور پورا مکان اور جس ذات کو ساری بارات کا دولہا بنا کر روانہ کیا گیا ہے وہ قرآن حکیم اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی لیے جیسے قرآن کو سراپا ہدایت، رحمت اور نور کہا ہے ایسے ہی حضور انور کو رحمۃ للعالمین ہدیٰ اور نور کہا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ قرآن اور محمد رسول اللہ جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ مکمل اور ان کے ذریعے دین الٰہی اپنے تمام اصول و فروع کے لحاظ سے پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور انور سے پہلے آنے والوں میں سے ہر ایک نے یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور کتاب اور نبوت آئے گی جو اللہ کے دین کی تکمیل کرے گی چنانچہ تورات کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ سے خدا نے فرمایا۔

میں ان کے بھائیوں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔

اور انجیل میں ہے ،

لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ خدا میرے نام سے بھیجے گا ، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں یاد دلائے گا۔ یوحنا ۱۴ - ۲۶ -

آخر وہ نور ، ہدایت ، رحمۃ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں برہان ہوں ، نور ہوں ، ہدایت ہوں ، اور رحمت للعالمین ہوں - میری کتاب نور مبین ہے رحمت ہے ہدایت کاملہ ہے اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان عام کیا ۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ۔

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ آپ نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے سبب ان پر عائد تھے ، اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے ۔ یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں ۔ اسی لیے آپ نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی ، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی ، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ سراپا شریعت ، نور رحمت ہونے کے بعد کسی نئے آنے والے ، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کی گنجائش کہاں ؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما انزل من قبلک پر ایمان لانے کی تاکید کی اور ما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا ۔

اور یہاں انجیل کے تعارف میں یہ جو فرمایا ہے ھدی و موعظۃ للمتقین تو یہ تورات و انجیل کے باہمی فرق کی طرف اشارہ ہے کہ تورات محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق ہے ۔ تورات کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے اس کا حکم ہے ۔

جو انسان مار ڈالے گا یا مار ڈالا جائے گا . . . اور اگر کوئی اپنے ہمسائے کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا ۔ توڑنے کے بدلے توڑنا ، آنکھ کے بدلے آنکھ ، دانت کے بدلے دانت (احبار)

اور انجیل کی تعلیم سرتاسر عفو ہے ۔

تم سن چکے ہو کہ کہا گیا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت پھر تمہیں میں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے ۔ (متی)

قرآن کی اہلِ انجیل کو تنبیہہ

۱۱۸۔ اور انجیل والوں کو اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے نازل کی اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو یہی لوگ فاسق ہیں۔ یا تو عیسائی جو نزول کے وقت موجود تھے ان کو یہ حکم دیا گیا تھا اسی کو یہاں نقل فرمائے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو عیسائی مخاطب تھے ان سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کے موافق ٹھیک ٹھیک حکم کریں یعنی ان پیشین گوئیوں کو چھپانے یا لغو اور مہمل تاویلات سے بدلنے کی کوشش نہ کریں جو انجیل میں پیغمبر آخرالزمان اور مقدس فارقلیط کی نسبت حضرت مسیح کی زبانی کی گئی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی سخت نافرمانی ہوگی کہ جس ہادی جلیل اور مصلح اعظم کے متعلق حضرت مسیح یہ فرمائیں کہ جب وہ روح حق آئے گی تو تمہیں سچائی کی ساری راہیں بتائے گی۔ اسی کی تکذیب پر کربستہ ہو کر اپنے لیے ابدی خسران قبول کرو۔" کیا مقدس مسیح اور اس کے پروردگار کی فرمانبرداری کے یہی معنے ہیں [1]

مطلب یہ ہے کہ اہلِ انجیل کو انجیل دیتے وقت ہم نے کہا تھا کہ اپنے احوال و ظروف کو انجیل کی ترازو میں رکھ کر تولیں ورنہ فاسق ہوں گے۔ اس صورت میں اصل عبارت یوں ہوگی۔ قلنا لیحکم اھل الانجیل الخ اور یا مطلب یہ ہے کہ اب ان سے کہا جا رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں اہلِ انجیل کو فیصلہ انجیل کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت یہی پیش پا افتادہ مسئلہ ہے اور لفظ فاسق یہاں فقہی اصطلاح میں عادل کے مقابلہ پر نہیں ہے بلکہ خدا سے غداری، عہد شکنی اور سرکشی کے معنے میں ہے۔ قرآن میں پڑھ چکے ہو۔

الفاسقین الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ

فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں

لفظ فاسق قرآن کے مصطلحات میں سے ہے، ورنہ ائمہ لغت لکھتے ہیں کہ فاسق کے استعمال کی قرآن سے پہلے عربی زبان میں عادت نہ تھی۔ فیروزآبادی فرماتے ہیں کہ عرب جاہلیت کے نظم و نثر میں عربی ہونے کے باوجود لفظ فاسق کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ اور ابن الاعرابی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے ادبی ذخیرے میں لفظ فاسق نہیں ہے۔ فسق بحیثیت فعل بے جان چیزوں کے لیے ضرور استعمال ہوتا تھا لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال کلام عرب میں انسان کے لیے نہیں ہے۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ
وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ
عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ
اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ
تَخْتَلِفُونَ ﴿۴۸﴾ وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ
إِلَيْكَ فَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ
ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿۴۹﴾ أَفَحُكْمَ
الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۵۰﴾

اور ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری، یہ ان
کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو سامنے موجود ہیں اور ان پر

نگہبان"[119]۔ لہٰذا تم ان کے درمیان خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق
فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آچکا ہے اس سے ہٹ کر ان
کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو"[120]۔ تم میں ہر گروہ کے لیے ہم نے
ایک شرعہ اور ایک منہاج مقرر کر دی"[121]۔ اور اگر خدا چاہتا تو
تم سب کو ایک اُمّت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا
اور اس لیے نہیں کیا تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں
تمہیں آزمائے"[122]۔ لہٰذا نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے
بڑھو، تم کو بالآخر اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ
تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتائے گا جن میں تم اختلاف رکھتے
تھے"[123]، اور اے پیغمبر ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ خدا نے
اتارا ہے اس کے مطابق ان لوگوں کا فیصلہ کرو اور اُن کی
خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اور ان کی جانب سے چوکنے رہو،

کہیں تمہیں اس قانون کے کچھ حصہ سے نہ بچلا دیں جو اللہ نے نازل کیا ہے[124]۔ پس اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے ان پر افتاد آئے اور یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں میں اکثریت نافرمانوں کی ہے[125]۔ اگر لوگ اللہ کا حکم نہیں چاہتے ہیں تو کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اور ایمان و یقین والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟[126]۔

قرآن کا چہرہ

دنیا میں وقتاً فوقتاً انبیا کے ذریعے پیغام آتے رہے ہیں۔ موسیٰ تورات لے کر آئے اور عیسیٰ انجیل لے کر، لیکن یہ خاص زمانہ اور قوم کے لیے اور وقتی تھے اور اس لیے ان کی دائمی حفاظت کا سامان نہ ہوا۔ ان کی اصل برباد ہو گئی، مدتوں کے بعد مرتب کیے گئے اور ان میں تحریفیں کی گئیں۔ ان کے ترجموں نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ ان کی تاریخی سند کا کوئی ثبوت باقی نہیں۔ بہت سے جعلی پیغام ان میں شریک کر دیے گئے۔ اگر خدا کا کام مصلحت اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے تو ان کا مٹنا اور برباد ہونا ہی ان کے وقتی فرمان اور عارضی تعلیم ہونے کا ثبوت ہے لیکن جو پیغام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آیا وہ مہیمن ہو کر آیا دائمی اور عالمگیر ہو کر آیا اسی لیے وہ جب سے آیا اب تک پوری طرح محفوظ ہے اور رہے گا کیونکہ اس کے بعد کوئی نیا پیغام آنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

کسی گزشتہ پیغام کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اس کی تکمیل ہو چکی ہے اور ان تمام تعلیمات برحق کو جو پچھلی آسمانی کتب میں دی گئی تھیں اس کے اندر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور وہ ان پر نگہبان ہے۔ یہ صرف قرآن کے بارے میں فرمایا ہے۔ دُنیا کے وہ تمام صحیفے جو گم ہو چکے ہیں ان کا گم ہو جانا ہی ان کے وقتی اور عارضی ہونے کی دلیل ہے اور جو موجود ہیں ان کی ایک ایک آیت تلاش کر لو ان کی تکمیل اور حفاظت کے وعدہ کے متعلق ایک حرف نہ پاؤ گے بلکہ اس کے خلاف ان کے نقص کے اشارے اور تصریحات ملیں گی۔

تورات میں ہے

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ہوگی۔

(استثنا ۲۳،۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تورات آخری اور دائمی پیغام کی حیثیت سے نہیں آئی تھی اور یہ تمام پچھلی صداقتوں کی نگران اور محافظ نہ تھی۔

انجیل اعلان کرتی ہے:

میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا فارقلیط بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔ (یوحنا ۱۴،۱۶)

اس سے پتہ لگ گیا کہ انجیل خدا کا آخری پیغام اور دائمی نہیں اور دوسری صداقتوں کی نگران تو کیا وہ خود کامل بھی نہیں ہے۔

یہ صرف قرآن ہے جو اپنے بارے میں اعلان کرتا ہے کہ وہ پچھلی تمام صداقتوں کا محافظ اور نگران ہے اور کامل ہے، آخری پیغام ہے، سب کے لیے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ قرآن نے کسی آیت میں کسی بعد آنے والے پیغام کے لیے یہ کہہ کر دھیمتا جیسے کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے اسی لیے حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے۔

۱۱۹۔ اور ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو سامنے موجود ہیں اور ان پر نگہبان۔ مہیمن کے کئی معنے بیان کیے گئے ہیں۔ امین غالب حاکم محافظ و نگہبان اور ہر معنے کے اعتبار سے قرآن کریم کا کتب سابقہ کے لیے مہیمن ہونا صحیح ہے۔ خدا

کی جو امانت تورات و انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں ودیعت کی گئی تھی وہ سب شے زائد قرآن میں محفوظ ہے جس میں کوئی خیانت نہیں ہوئی ہے اور جو بعض فروعی چیزیں ان کتابوں میں اس زمانے یا ان مخصوص مخاطبین کے حسبِ حال تھیں ان کو قرآن نے منسوخ کر دیا اور جو حقائق نا تمام تھیں ان کی تکمیل فرما دی ہے اور جو حصہ اس وقت کے اعتبار سے غیر مبہم تھا اسے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ لے

اس آیت میں قرآن کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ کتاب چار اوصاف کی حامل ہے، اول یہ کہ اللہ کی جانب سے ہے۔

دوم یہ کہ اس کا نزول بالحق ہوا ہے یعنی یہ کتاب بجائے خود بھی اور ہر شک و شبہ سے بالا ایک حقیقت، قول فیصل اور ان مٹ ہمیشہ رہنے والی ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ گزشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یعنی یہ بتانے والی ہے کہ وہ بھی منزل من اللہ ہیں، اس تصدیق سے ان کتابوں کی تحریفات کی تصدیق ہرگز لازم نہیں آتی۔ اس آیت میں قرآن کی مصدق کی حیثیت بتاتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ قرآن اپنے سامنے موجود کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، بلکہ فرمایا کہ قرآن الکتاب کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن اور وہ تمام کتابیں جو مختلف زمانوں اور متفرق زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں سب کی سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں ایک ہی ان کا مصنف ہے، ایک ہی ان کا مدعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعے سے نوع انسانی کو عطا کیا گیا ہے۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ بس حقیقت صرف اتنی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں مؤید ہیں تردید کرنے والی نہیں مصدق ہیں بلکہ اصل حقیقت اس سے بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی الکتاب کے مختلف ایڈیشن ہیں ٹے

چہارم یہ کہ قرآن بقیہ کتابوں پر مہیمن ہے۔ عربی میں مہیمن کے معنے محافظت، نگرانی، شہادت امانت تصدیق اور حمایت کے ہیں۔ قرآن کو الکتاب پر مہیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی آسمانی کتابوں میں دی گئی تھیں اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے وہ ان پر نگہبان ہے اس معنے میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا وہ ان کی مؤید ہے

لے افادات شیخ الاسلام ٹے تفہیم القرآن۔

اس معنے میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ ان پر گواہ ہے اس معنے میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام میں جو آمیزش ہو گئی ہے قرآن کی شہادت سے اسے پھر چھانٹا جا سکتا ہے جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام ہے۔

مصدق اور مہیمن ان دو صفات کے لانے سے قرآن عزیز کی دو حیثیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک یہ کہ پہلی کتابوں کے سارے مضامین اس کے اندر آ گئے اور اس میں جمع ہیں، دوسرے یہ کہ قرآن ان کتابوں پر بطور نگران کے بھی کام دے گا۔ یعنی ان کی تحریفات و تصرفات کے لیے ایک کسوٹی کا بھی کام دے گا۔ اسے ذرا اس طرح سمجھئے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یہ پیغام یعنی قرآن دنیا میں آیا تو اس نے خدا کے سب دینوں کی عظمت از سر نو زندہ کر دی۔ سب رسولوں کا احترام کرنا فرض و لازم قرار دیا۔ حضرت عیسیٰ کے منکر کو اسی طرح کافر ٹھہرایا جیسا کہ حضور انور کے منکر کو۔ اس نے پہلے پیغمبروں کے سر جو تہمتیں لگا دی گئی تھیں تحقیق و تنقید کی روشنی میں ان کو غلط ثابت کیا۔ خدا کی مقدس کتابوں میں سازشوں کا انکشاف کیا اور اس طرح ان کی عظمت رفتہ کو از سر نو قائم کیا۔ اس نے پچھلے رسولوں سے کٹ کر اور پچھلے دینوں کو جھوٹا کہہ کر کسی نئے دین کی دعوت نہیں دی بلکہ اسی حقیقت کی طرف بلایا جس کی انبیاء دعوت ہمیشہ دیتے رہے۔ تورات یہ نہیں کہتی کہ انجیل کو نہ مانو اور انجیل یہ نہیں کہتی کہ تورات غلط ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ تورات و انجیل خدا کی نازل کردہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے ماننے والوں پر یہ بھی لازم قرار دیتا ہے کہ تم ان کتابوں کو بھی خدا ہی کی تصور کرو۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ میرے سوا کسی رسول پر ایمان نہ لاؤ بلکہ سب سے پہلے وہ خدا کے مقدس رسولوں کی عظمت کا سکہ دلوں میں جماتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ جو کتاب اپنے مہیمن ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے اسے ایسی ہی تعلیمات کا مجموعہ بن کر آنا چاہیے جس میں تمام عالم کے لیے یکساں جاذبیت موجود ہو اور زمانہ ماضی میں کسی صداقت پر عمل کرنے والے کی تغلیط نہ کرتا ہو اور آج جب اپنی طرف دعوت دے تو یہ کہہ کر دعوت دے کہ تم میری دعوت کی اپنی کتاب سے تصدیق کر لو۔ قرآن ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ نہیں کرتا جو ان کی کتابوں کے خلاف ہو۔ وہ مطالبہ کرتا ہے تو یہ کہ تم نے صحیح طور پر حضرت عیسیٰ کا مقام نہیں پہچانا۔ حضرت موسیٰ کی شخصیت کو ٹھیک نہیں سمجھا، تورات و انجیل کی صحیح تعلیمات تم نے حاصل نہیں کی۔ تم ایک فرضی عیسیٰ ایک موہوم موسیٰ، ایک خود تراشیدہ تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہو آؤ مجھے مان لو میں تمہارے رسولوں اور تمہاری کتابوں کی تعلیمات کا محافظ بن کر آیا ہوں۔

قرآن خدا کی تمام صداقتوں کو اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے نازل ہوا ہے۔ کیا وہی صداقت اگر تورات میں ہو اور انجیل میں ہو تو قابلِ پذیرائی ہے اور وہی اگر قرآن میں ہو تو قابلِ انکار ہو سکتی ہے۔ وہی رسُول جس کی بشارت تورات اور انجیل دیں تو قابلِ انتظار ہو اور اسی کی آمد کو قرآن بتائے تو نا قابلِ قبول ہو۔

پھر صرف ان چند مسائل کی بنا پر جو تمہارے ہی لیے تخفیف تمہارے ہی لیے سہولت کا ذریعہ بنے یہ عداوت یہ ضد کیوں ہے۔ ایسی عالمگیر تعلیم، جذبات سے اتنی خالی فرقہ پرستی اور تعصب سے اتنی دور گزشتہ اور موجودہ ادیانِ سماویہ کا اتنا احترام سکھانے والی، پھر ضروریاتِ زمانہ کے لیے اتنی مناسب اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایک ایک شوشے کے ساتھ اتنی محفوظ۔ اگر قرآن سے پہلے کوئی کتابِ الٰہی دانستہ اور نادانستہ تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی۔ لاکھوں انبیاؑ میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دُنیا میں باقی نہیں رہا۔ اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے قالب میں بدلتا رہا ہے تورات جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مہیمن محافظ دائمی اور آخری کتاب بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا لیکن قرآن کی نسبت پہلے یہ دعویٰ ہوا و انزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب و مھیمنا علیہ اور یہ وعدہ ہوا کہ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون۔ اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس حق میں کسی باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی و انہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ اس کتاب کو عزیز فرمایا گیا یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پچھاڑ دے گی۔ باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنے کی طرف سے۔

اُمتِ اسلامیہ کی ذمہ داری

۱۲۰۔ لہٰذا تم ان کے درمیان خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آ چکا ہے اس سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ یہود میں باہم کچھ نزاع ہو گئی تھی ایک فریق جن میں ان کے بڑے مشہور علما۔ اور مقتدر شامل تھے۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور فصلِ نزاع کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ عموماً قوم یہود ہمارے

اختیار و اقتدار میں ہے۔ اگر آپ فیصلہ ہمارے موافق کر دیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور ہمارے اسلام لانے سے جمہور یہود اسلام قبول کر لیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشوتی اسلام کو قبول نہ کیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے صاف انکار فرما دیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں (ابن کثیر) [1]

یہ قرآن سے متعلق عہد میثاق کی ایک دفعہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے آپ کی اُمت سے لیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی کتاب حق و باطل کی کسوٹی اور احکام الٰہی کا قابل اعتماد مجموعہ ہے تم لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس سے ہرگز منحرف ہو کر منافقین اور یہود کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہ کرو۔ اس آیت میں یہ بات بالکل واضح طور پر فرمائی گئی ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر کسی اور کتاب کے مطابق فیصلے کرنا منع ہے خواہ یہ کتاب تورات ہو یا انجیل۔ یعنی اہل کتاب کا انکار اسلام میں ٹھیک وہی حیثیت رکھتا ہے جو دوسرے کافروں کے انکار کی ہے اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب یہودی اور عیسائیوں کے لیے اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔ پھر یہ بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لو کان موسٰی حیاً ما وسعہ الا اتباعی اگر موسٰی زندہ ہوتے تو ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں۔ یہ ارشاد نبوت مسئلہ کو اس حد تک واضح کر دیتا ہے جس کے بعد وضاحت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا ہے۔ جس نبی کی حیثیت یہ ہو کہ دوسرے انبیاء اگر اس کے زمانے میں موجود ہوتے تو وہ بھی اسی کے امتی اور پیروکار بنتے اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کی پیروی کی گنجائش جب خود ان کے لیے باقی نہیں ہے تو قرآن کی پیروی کی ذمہ داری اور ضرورت سے بھلا کوئی عام انسان کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اور جب قرآن کی موجودگی میں نبیوں کی لائی ہوئی کتابوں کی پیروی نہیں کی جا سکتی اور ان کی پیروی قرآن کی نظر میں اتباع ہوا ہے تو پھر غیر انبیاء مثلاً دانشور، وکلاء، زعماء، قومی اسمبلی کے ممبران، ملک کے حکام اور حکومت کے انتظامی ارکان، عدلیہ کے ججوں اور گورنروں کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کی پیروی کی، قرآن کب اجازت دے سکتا ہے اور ان کے مطابق قرآن کو نظر انداز کر کے معاملات کا فیصلہ کرنا کب روا ہو سکتا ہے اس آیت میں قرآن سے ہٹ کر تورات و انجیل کے مطابق معاملات کے فیصلہ کرنے کو قرآن نے اتباع اہواء، خواہشوں کی پیروی کہا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن نے ایک اصول مستقر رکھا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور وہ یہ کہ جب تمہارے عمل کے لیے الحق خدا کی جانب سے قرآن کی صورت میں آچکا ہے تو اب پہلی کتاب سے بحث کرنا ہی غلط ہے ظاہر ہے کہ اگر پہلی کتابوں کو قائم رکھنا منظور ہوتا تو ضرور ان کو محفوظ بھی رکھا جاتا لیکن جب محفوظ نہیں رکھا گیا تو معلوم ہو گیا کہ آئندہ قدرت کو اس پر عمل دوام بھی منظور نہیں ہے۔

غرض تمام سماوی گو سب حق تھیں مگر تحریف کے بعد ان میں بہت باطل داخل ہو چکا ہے جو نامعلوم ہے۔ اب اس سے بحث کا ماحصل یہی ہے کہ اگر تصدیق کرتے ہو تو باطل کی تصدیق کا احتمال ہے اور تکذیب کرتے ہو تو حق کی تکذیب کا احتمال ہے۔ اس لیے جب عمل کے لیے ایک راہ موجود ہے تو پھر اس گرداب میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر تسلیم ہی کر لیا جائے کہ ان میں تحریف نہیں ہوئی تو بھی ہر صداقت پر عمل کرنا اسی وقت موجب نجات ہو سکتا ہے جبکہ وہ وقت کی کتاب بھی ہو اگر اس کی بجائے دوسری کتاب آچکی ہے تو اب پہلی صداقت پر عمل کرنا وقتی کتاب کی توہین ہوگی۔ اگر دین صرف اپنی رائے پر ہوتا تو شریعت اور کتاب کی حاجت نہ ہوتی اور جب کتاب کی ضرورت تسلیم ہے تو صرف کسی صداقت کا صداقت ہونا نجات کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ اس کا وقتی ہونا بھی ثابت نہ ہو جائے۔ ہر صداقت کا شریعت ہونا لازمی نہیں ہاں ہر شریعت کا صداقت پر مبنی ہونا ضروری ہے اس لیے یہ محض ایک بے بنیاد خیال ہے کہ جب سب ادیان سماوی حق ہیں قرآن پر عمل کرنا بھی نجات کے لیے کافی ہونا چاہیے جس دور میں خود موسیٰ علیہ السلام کو وقت کی صداقت پر عمل کرنا ضروری ہے اس میں تورات کا ذکر بے معنے ہے۔

کیا یہ آیت منافی عصمت ہے؟

حیرت ہے کہ اس قدر واضح بات کو جو اس آیت میں بتائی گئی ہے لوگوں نے کچھ سے کچھ بنا دیا کتنی صاف بات ہے اور کیسی بے غبار ہے کہ اس حق کو نظر انداز کر کے لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو۔ حضرت مولانا عثمانی شیخ الاسلام نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے آپ بھی مستفید ہوئیے۔ فرماتے ہیں کہ ،، گزشتہ ان آیات کی جو شان نزول ہم لکھ چکے ہیں اس سے صاف عیاں ہے کہ آیت کا نزول بعد اس کے ہوا کہ آپ ان کی خوشی اور خواہش پر چلنے سے انکار فرما چکے تھے تو یہ آیات آپ کی استقامت کی تصویب اور آئندہ بھی ایسی ہی شان عصمت پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کے لیے نازل ہوئیں۔ جو لوگ اس قسم کی آیات کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عصمت کے خلاف تصور کرنے بیٹھے وہ نہایت ہی قاصر الفہم ہیں اول تو کسی چیز سے منع کرنا اس کی دلیل نہیں کہ جس کو منع

کیا جا رہا ہے وہ اس ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا چاہتا تھا، ثانیاً انبیا علیہم السلام کی معصومیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی معصیت ان سے صادر نہیں ہو سکتی یعنی کسی کام کو یہ سمجھتے ہوئے کہ خدا کو ناپسند ہے ہرگز اختیار نہیں کر سکتے۔ اور اگر اتفاقاً کسی وقت بھول چوک یا رائے و اجتہاد کی غلطی سے راجح و افضل کی جگہ مرجوح و مفضول کو اختیار کر لیں یا غیر مرضی کو مرضی سمجھ کر عمل کر لیں جس کو اصطلاح میں زلہ کہتے ہیں تو اس طرح کے واقعات مسئلہ عصمت کے منافی نہیں جیسا کہ حضرت آدم اور بعض دیگر انبیا علیہم السلام کے واقعات شاہد ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق اور واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک اور اسی طرح کی دوسری آیات کا مطلب سمجھنے میں کوئی خلجان نہیں رہتا کیونکہ ان میں صرف اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان ملعونوں کی طمع کاری اور سخن سازی سے قطعاً متاثر نہ ہوں اور کوئی ایسی رائے قائم نہ فرمائیں جس میں بلا قصد ان کی خواہشات کے اتباع کی صورت پیدا ہو جائے مثلاً اسی قصہ میں جو ان آیات کی شان نزول ہے۔ یہود نے کیسی عیارانہ اور پُر فریب صورت حضور کے سامنے پیش کی تھی کہ اگر آپ ان کے حسب منشا فیصلہ کر دیں تو سب یہود مسلمان ہو جائیں گے وہ جانتے تھے کہ اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز آپ کے نزدیک محبوب اور عزیز نہیں۔ ایسے موقع پر امکان تھا کہ بڑے سے بڑا مستقیم انسان بھی یہ رائے قائم کرلے کہ ان کی چھوٹی سی خواہش قبول کر لینے میں جبکہ اتنی عظیم الشان دینی منفعت کی توقع ہو کیا مضائقہ ہے۔ اس طرح کے خطرناک مزلۃ الاقدام موقع پر قرآن حکیم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو بھول کر بھی کوئی ایسی رائے قائم نہ کر لیجیے جو آپ کی شان رفیع کے مناسب نہ ہو حضور کا کمال تقویٰ اور انتہائی فہم و تدبر تو نزول آیت سے پہلے ہی ان ملاعین کے مکر و فریب کو رد کر چکا تھا لیکن فرض کیجیے اگر ایسا نہ ہو چکا ہوتا تب بھی آیت کا مضمون جیسا کہ ہم تقریر کر چکے ہیں حضور کی شان عصمت کے اصلاً مخالف نہیں۔ [1]

ہر اُمت کے لیے شرع اور منہاج

۱۲۱۔ تم میں سے ہر گروہ کے لیے ہم نے ایک شرع اور ایک منہاج مقرر کر دی۔ یعنی خدا نے ہر اُمت کا آئین و دستور کار اس کے احوال و استعداد کے مطابق جداگانہ رکھا ہے اور باوجودیکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تمام انبیاء اور رسل سماویہ اصول دین اور مقاصد کلیہ میں جن پر نجات ابدی کا مدار ہے باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق رہے ہیں۔ پھر بھی جزئیات و فروع کے لحاظ سے ہر امت کو ان کے ماحول اور مخصوص استعداد کے موافق خاص احکام و ہدایات دی ہیں۔ اس آیت میں اسی فروعی اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو سب انبیاء علیہم السلام کو آپس میں علاتی بھائی فرمایا ہے جن کا باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اصول سب کے ایک ہیں اور فروع میں اختلاف ہے اور چونکہ بچہ کی تولید میں باپ فاعل و مفیض اور ماں قابل اور محل فاعلہ بنتی ہے اس سے نہایت لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ شرائع سماویہ کا اختلاف مخاطبین کی قابلیت اور استعداد پر مبنی ہے ورنہ مبدأ فیاض میں کوئی اختلاف و تعدد نہیں ہے سب شرائع و ادیان سماوی کا سرچشمہ ایک ہی ذات اور اس کا علم ازلی ہے۔ [1]

دراصل یہ استیناف بیانی ہے اور مخاطبوں کے ذہنوں میں اٹھتے ہوئے سوال کا تذکرہ ہے سوال یہ ہے کہ اگر قرآن تورات و انجیل ایک ہی صداقت کی دعوت ہیں اور قرآن تمام پچھلی صداقتوں کا مصدق ہے تو پھر شرائع و احکام میں اختلاف کیوں ہے ایسا کیوں ہوا ہے کہ عبادات کی صورتوں میں حلال و حرام کی قیود میں اور قوانین تمدن و معاشرت کے فروع میں مختلف انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف ہے۔

واقعی قرآن کی یہی تعلیم ہے کہ اسلام اسی ایک دین کا نام ہے جو آدم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے آتا رہا۔ یہ قرآن کا بتایا ہوا راز ہے کہ دین الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نور معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں سارے پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک سارے انبیاء آتے رہے۔ اس میں زمان و مکان کے تغیر کو دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ واحد حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں۔ یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کے صفات کاملہ، انبیاء کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اخلاق فاضلہ، اچھے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور بُرے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے۔ اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی آمیزش ہوئی ہے۔

دوسری چیز جس کو قرآن نے شرعہ اور منہاج کہا ہے وہ جزئیات احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جداجدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں مثلاً عبادت الٰہی، ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریق عبادات میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر آسمانی مذہب میں موجود ہے۔ عبادت کے لیے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے۔ اسی طرح اعمال قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے مگر اس کے انسداد کے رستے اور طریقے جداجدا غرض یہ رستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح و تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی طاقت ہے ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصلی مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام و جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں۔

اس آیت میں یہی انکشاف کیا گیا ہے کہ ہم نے ہر جماعت کے لیے ایک شرع اور منہاج ٹھہرا دی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ایک دین ٹھہرا دیا کیونکہ دین تو سب کا ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد اور تنوع نہیں ہو سکتا۔ البتہ شرع اور منہاج سب کے لیے یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ ضروری تھا کہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوں لہٰذا انبیاء کی دعوتوں کا اختلاف اصل کا اختلاف نہیں ہے محض فروع کا اختلاف ہے۔

آیت کا یہ ٹکڑا اپنے سیاق و سباق کی رُو سے اہل کتاب سے رواداری کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویہ سے بیزاری کے اظہار کے لیے ہے۔

یہاں کلم سے مراد وہی تین گروہ ہیں جن کا شروع سے ذکر آ رہا ہے۔ یعنی مسلمان یہودی اور عیسائی۔ فرمایا کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شرعہ اور منہاج مقرر کیا ہے۔ شرعہ اور منہاج سے مراد شریعت کا وہ ظاہری ڈھانچہ اور قالب ہے جو دین کے حقائق کو بروئے کار لانے کے لیے ہر مذہب میں اختیار کیا گیا ہے مثلاً عبادت ایک نظریہ ہے جس کی واقعاتی صورت

مختلف مذاہب میں نماز روزہ، قربانی اور حج کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعض حقائق کے لیے قالب خود اللہ سبحانہ نے مقرر فرمایا ہے اور بعض کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی نے مقرر فرمایا ہے شاید اسی کی رعایت سے آیت میں شرعہ اور منہاج کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

وحدت دین اور قرآن

اس سے یہ بات بھی واضح ہو کر سامنے آگئی کہ وحدت دین کا قرآنی منشا کیا ہے یہ اور صرف یہ کہ جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر رہیں گے اور اس معاملہ میں انبیاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یعنی اصل دین ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء نے پیش کیا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے ہاتھوں میں تحریف و تصرف کی وجہ سے بگڑتا رہا۔ اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت، دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کی وجہ سے ہمیشہ قائم اور باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ یہی دین ازلی ہوگا جس کا نام اسلام ہے اور نوحی، ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا۔

قرآن کے پیش کردہ وحدت دین کے نظریے کا یہ ہرگز مفہوم نہیں ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں۔ سبھی خدا تک پہنچانے والے ہیں اور سب کے سب آخرت کی فلاح و نجات کا یکساں ذریعہ ہیں۔ یہ وحدت دین نہیں وحدت ادیان ہے یقیناً قرآن وحدت دین کا قائل ہے مگر وحدت ادیان کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔

اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور ہر رسول کی پیروی کا یکساں طور پر حق ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام لانے کی دعوت نہ دیتے کیونکہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبہ پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برعکس آپ ان سے صرف یہ کہتے کہ تورات و انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں اپنی نبوت کے تسلیم کرنے اور قرآن کی پیروی کا تم سے کوئی مطالبہ نہیں کرتا لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے انہیں بھی اسلام لانے کی اسی طرح دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔

یا ایہا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ایمان لاؤ اس کتاب پر جو ہم نے اتاری ہے۔ اور جو اس کتاب کے عین مطابق بھی ہے جو تمہارے پاس ہے۔

نہ صرف یہ کہ قرآن نے ان کو اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں کافر ہی نہیں بلکہ پکا کافر اولٰئک ھم الکافرون حقاً کہا ہے۔ ان کے جس طرزِ عمل پر اولٰئک ھم الکافرون حقاً کا فتویٰ لگایا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کے رسول اور دوسرے کتابوں کو اللہ کی کتاب مانتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور قرآن کو اللہ کی کتاب نہ مانتے تھے۔ قرآن عزیز نے ایک اور جگہ اہل کتاب کے اس انکارِ اسلام کا تذکرہ اور پھر اس پر اپنا تبصرہ ان لفظوں میں کیا ہے۔

و اذا قیل لھم آمنوا بما انزل اللہ قالوا نؤمن بما انزل علینا و یکفرون بما وراءہ

دعوتِ اسلام کے جواب میں وہ یہ جو کہتے تھے اسے غور سے دیکھئے۔ یہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدتِ ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ آخر پھر کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں ہو۔ وہ اپنی جگہ حق یہ اپنی جگہ حق۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فیصلے کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہا بلکہ اسے صاف طور پر کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے اور انہیں یہ بھی حق وہ بھی حق کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر کافر ٹھہراتا ہے اس لیے آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں سبھی خدا تک پہنچانے والی راہیں ہیں اور سب کے سب آخرت کی فلاح و نجات کا یکساں ذریعہ ہیں۔ یہاں قرآن نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مختلف دعوتوں کا ذکر کیا ہے ذکر حضرت موسیٰ کی تورات سے شروع ہوتا ہے انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور پھر حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے ثم قفینا علی آثارھم بعیسی ابن مریم حضرت مسیح کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا وانزلنا الیک الکتاب پھر ان مختلف دعوتوں کے ذکر کے بعد وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا اس میں پوری انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر امت کے لیے ایک شریعت اور منہاج مقرر کی تھی۔ ہر امت اپنے دور میں اپنی شریعت کی حامل تھی۔ امت موسیٰ حضرت عیسیٰ

کے ظہور تک شریعت موسیٰ کی حامل اور علمبردار رہی تھی اور یہی اس کی شریعت تھی۔ اُمت عیسیٰ اپنے زمانے میں محمد رسول اللہ کے زمانہ ظہور تک حضرت عیسیٰ کی شریعت انجیل کی حامل اور ذمہ دار تھی۔ اور اب تم سب محمد رسول اللہ کے ظہور کے بعد اُمت محمد ہو اور تمہاری شریعت قرآن ہے لہٰذا اس پر ایمان لاؤ اس میں یہودی، عیسائی بلکہ ساری انسانیت برابر ہے۔

اختلافِ شریعت تقاضائے حکمت ہے

۱۲۲۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے یعنی کون تم میں خدا کی مالکیت مطلقہ، علم محیط، اور حکمت بالغہ پر یقین کرکے ہر نئے حکم کو حق و صواب سمجھ کر بطوع و رغبت قبول کرتا ہے اور ایک وفادار غلام کی طرح ہر جدید حکم کے سامنے گردن جھکا دینے کو تیار رہتا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کر کے سب کو ایک اُمت بنا دیا جاتا۔ لیکن وہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاءؑ کی شریعتوں کے درمیان رکھا ہے اس کے اندر دوسری مصلحتوں کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقے سے لوگوں کی آزمائش لینا چاہتا تھا جو لوگ اصل دین اور اس کی روح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں اور دین میں ان ضوابط کی حقیقی حیثیت کو جانتے ہیں اور کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، وہ حق کو جس صورت میں بھی وہ آئے گا پہچان لیں گے اور قبول کر لیں گے ان کو اللہ کے پیچھے ہوتے سابق احکام کی جگہ بعد کے احکام تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے کہ جو لوگ دین کی روح سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھتے ہیں اور جنہوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حاشیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصب اختیار کر لیا ہے وہ ہر اس ہدایت کو رد کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں خدا کی طرف سے آئے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کو ممیز کرنے کے لیے یہ آزمائش ضروری تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا ہے۔[2]

آیت کا مطلب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر طبقہ کے لیے ایک خاص شریعت اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

خاص طریقِ عمل بنایا ہے جس میں اصول مشترک اور متفق علیہ ہونے کے باوجود فروعی احکام میں کچھ اختلاف بمصلحت ہوتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا سب کی ایک ہی کتاب ایک ہی شریعت ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے پسند نہیں کیا کہ لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ ہیں جو عبادت کی حقیقت سے واقف ہو کر ہر وقت گوش بر آواز رہتے ہیں کہ حکم ملے اس کی تعمیل کریں۔ جو نئی کتاب یا نئی شریعت آتے اس کا اتباع کریں اور پہلی شریعت و کتاب ان کو کتنی ہی محبوب ہو اور آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اس کا ترک کرنا ان پر کتنا ہی شاق ہو مگر وہ ہر وقت گوش بر آواز طاعت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور کون ہیں جو اس حقیقت سے غافل ہو کر کسی خاص شریعت یا کتاب کو مقصد بنا بیٹھے اور اس کو ایک آبائی مذہب کی حیثیت سے لیے ہوتے ہیں اس کے خلاف کسی حکم خداوندی پر کان نہیں دھرتے ہیں [1]

اور یہ بھی مطلب بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ہر اُمت کے لیے شرعۃ اور منہاج الگ بنائے ہیں اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی منہاج دیتا لیکن اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہوا کہ منہاج کی اس تبدیلی کو لوگوں کے امتحان کا ذریعہ بنائے اور دیکھے کہ کون حق کا طالب بنتا ہے اور کون صرف لکیر کا فقیر اور رسوم و ظواہر کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ اللہ عقل، اختیار اور شریعت کی جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ لوگوں کا امتحان کرتا رہتا ہے کہ کون ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے ان کی قدر کر رہا ہے ان کے مغز و قشر میں امتیاز رکھتا ہے اور کون بالکل اندھا بہرہ بن کر محض اسم کا پجاری بن کر رہ گیا ہے [2]

یہ بھی لکھا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام نوعِ انسانی کو ایک ہی اُمت بنا دیتا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ الگ الگ قومیں ہوتی ہیں، الگ الگ احوال ہوتے، الگ الگ ضرورتیں ہوتیں۔ بس ضروری تھا کہ فروع اور ظواہر کے طور اور ڈھنگ بھی الگ ہوں [3]

ہم نے بالارادہ یہاں سب بزرگوں کی تشریحات نقل کر دی ہیں۔ یہ سب تشریحات اپنی جگہ بالکل برمحل اور بجا ہیں۔ مگر پڑھنے والا ان کو پڑھ کر یہ تاثر لیتا ہے کہ شرائع کا یہ اختلاف شاید ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں رونما ہوا ہے اور گویا مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کو قرآن مخاطب کر کے ان کے بالفعل باہمی اختلاف کی یہ توجیہ پیش کر رہا ہے اور

---

[1] معارف القرآن م ش [2] تدبر قرآن [3] ترجمان القرآن۔

ہو رہا ہے کہ تمہارے درمیان یہ اختلاف اس لیے ہے کہ اللہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صورتِ حال یہ نہیں ہے بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مخاطبوں کے گروہ کے ذہن میں یہ بات ڈالنا چاہتا ہے کہ اے انسانو! اگر خدا تمہیں ایک شریعت والی ایک اُمت بنانا چاہتا تو بنا دیتا۔ اس طرح کہ تمام انسانوں کو روزِ اول ہی ایک ہی طرح کی طبیعت ایک ہی طرح کی استعداد اور ایک ہی طرح کی فکری و عملی حالت پر بنا دیتا۔ تمہارے اخلاق ایک ہوتے، تمہارے اطوارِ معیشت ایک ہوتے اور ہر زمانے کے انسانوں کے احوال و ظروف میں یکسانی اور ہم آہنگی ہوتی اور اس طرح ہر دور میں شریعت و قانون بھی ایک ہی ہوتا۔ لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان تمام مخلوقات میں ایک ممتاز نوع ہو جو اطوارِ حیات میں بتدریج ترقی کرے۔ آگے بڑھنے کی استعداد اور ہر طرح کی راہ اس کے سامنے کھلی ہوئی ہے اسی تنوعِ استعداد کے نتیجہ میں ارتقاء کا تنوع رونما ہوا۔ چھکڑے سے ترقی کرکے راکٹ چلانے۔ انفرادی زندگی سے نکل کر بین الاقوامی زندگی قبول کرے۔ اسی ارتقاء کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف اطوار میں شریعتیں مختلف آتی رہی ہیں۔ انسانیت کے بچپنے میں جو شریعت تھی وہ یقیناً انسانیت کے لڑکپن میں نہ تھی اور جو لڑکپن میں شریعت تھی وہ انسانیت کی جوانی میں نہیں ہے اور جو جوانی میں تھی وہ اب رشد و کمال کے زمانہ میں نہیں ہے۔ اب جبکہ پوری انسانی زندگی رشد و کمال کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے اس کے لیے ایک ایسے خاتم الشرائع خاتم الکتب اور خاتم الانبیاء کی ضرورت تھی جو اس ترقی یافتہ دنیا کی ضروریات کی کفالت کر سکے۔ چنانچہ ہمیشہ کے لیے وحی کا دروازہ بند کرکے دنیا کو وحی کے بدلے اجتہاد پر مبنی شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملی ہے۔

آیت میں لیبلوکم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بجائے تم سے تمہاری استعداد و صلاحیت کے مطابق ایک مستحق کا معاملہ کرتا ہے اور اس کا یہ امتحانی معاملہ اولین مخاطبوں سے ہو رہا ہے یعنی پوری دنیا کو چھوڑ کر تمہیں جو بین الاقوامی شریعت کی نعمت عطا کی ہے۔ اس میں تمہارا امتحان مقصود ہے کہ تم کہاں تک اس میں پورے اترتے رہو۔ اور یا مطلب یہ ہے کہ ساری مخلوقات کو چھوڑ کر جو اس شریعت کو اپنانے کی ذمہ داری نوعِ انسانی پر حیوانیت اور ملکیت کا معجون ہونے کی وجہ سے ڈالی گئی ہے اس سے مقصود تمہارا امتحان ہے۔ اللہ جیسے اپنے تمام شانوں میں نرالا بے مثل اور بے نظیر ہے۔ اسی طرح ابتلاء و امتحان کا جو فعل خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا لیتی ہے قطعاً مختلف ہے اور اس کو مختلف ہونا چاہیے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اللہ کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں ابتلاء و امتحان یا آزمانے جانچنے کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ بھی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ آخر سب جانتے ہیں کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص حالت و کیفیت ہی نہیں بلکہ جس زندگی کو ہم زمین پر گزار رہے ہیں۔ یہ پوری کی پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان ہے خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو اور خاص رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی امتحان و ابتلاء کی زندگی ہے اور یہ کیا ہے۔ تمام آفاق کائنات کے مقابلے میں انسانی فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے دراصل فطرت کے اسی اقتضاء کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان کی زندگی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خدا کی طرف ابتلاء و امتحان کے الفاظ منسوب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا وہ امتحان لے کر جان لے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح استعمال کا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔ یہ پوری دُنیا امتحان گاہ ہے۔ حکومت و اقتدار مال و دولت سب کچھ یہاں پرچہ امتحان ہیں۔ آیت قرآنی میں ما اتٰکم یعنی شریعت محمدیہ کو پرچہ امتحان بنایا ہے یگانوں کے لیے بھی اور بیگانوں کے لیے بھی۔ بیگانوں کے لیے اس طرح کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا اور یگانوں کے لیے اس طرح کہ ماننے کے بعد کون کرتا ہے، اور کون نہیں کرتا۔

خیر میں پیش رفت مقصودِ شریعت ہے

۱۲۳۔ نیکی کی راہ میں آگے بڑھو تم کو بالآخر اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا ان باتوں کی حقیقت جن میں تم اختلاف رکھتے تھے۔ یعنی شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر خواہ مخواہ کی قیل و قال اور کج بحثوں میں پڑ کر وقت ضائع نہ کرو، وصول الی اللہ کا ارادہ کرنے والوں کو عملی زندگی میں اپنی دوڑ دھوپ رکھنی چاہیے اور جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی خوبیاں آسمانی شریعت پیش کر رہی ہے اس کے لینے میں چستی دکھلانی چاہیے اور اسی کام کا خیال کر کے حسنات و خیرات کی تحصیل میں مستعدی دکھانی چاہیے۔ اختلافات کی سب حقیقت وہاں جا کر کھل جائے گی۔ ؎

ؔ افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ شریعت سے اصل مقصود نیکیوں کی فراہمی ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو حکم ملا ہو اس کی پیروی کی جائے۔ لہٰذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناہج کے تنوع پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود تعصب ہٹ دھرمی اور ذہن کی اپچ سے خود پیدا کر لیے ہیں ان کا آخری فیصلہ نہ مجلس مناظرہ میں ہو سکتا ہے نہ میدان جنگ میں۔ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جبکہ حقیقت بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گی۔¹

اصل ارشاد فاستبقوا الخیرات ہے فا کے ذریعے یہ اپنے ماقبل سے مربوط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر صورت حال وہی ہے جو سن چکے ہو کہ تمہیں بھی سابقہ امتوں کی طرح شریعت و مناہج دے کر روانہ کیا ہے تو پھر نیکیوں کی راہ میں تمہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تمہیں امتوں کی جاہ تلاشی کے لیے نہیں بلکہ خیرات کی فراہمی کے لیے روانہ کیا ہے۔ خیرات کا لفظ سب خوبیوں کا جامع ہے اس میں اخلاقی قدریں، اجتماعی قدریں اور احسانی قدریں سب گھلی ہوئی ہیں یہ نہیں فرمایا کہ نیکی کرو بلکہ فرمایا کہ نیکیوں اور بھلائیوں کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر کرو یہ گویا اشارہ ہے کہ جو منصب تمہیں دیا گیا ہے اس کی ذمہ داریوں سے تم صرف ذاتی نیکی نہیں بلکہ اجتماعی نیکی کے ذریعے عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔

قرآن نے دوسری جگہ یہ بتاتے ہوئے کہ نبوت کو قرآن اگر وحی کے ذریعے ملا ہے تو اس امت کو جسے اللہ نے نبوت کے کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ قرآن نبوت سے وراثت کے ذریعے ملا ہے، ارشاد ہے:

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا

پھر ہم نے وارث بنایا اس کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان پوری نوعِ انسانی میں چھانٹ کر اس کام کے لیے منتخب کیے گئے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کے وارث ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے بوجھ کو اٹھائیں۔ یہی امانت کا

۱۔ تفہیم القرآن ۵

وہ منصب جلیل ہے جس کا ذکر قرآن میں شہداء علی الناس میں کیا گیا ہے۔ یہ بتانے کے بعد یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ اس وراثت کو پانے والے تین قسم کے مسلمان ہوں گے۔

فمنہم ظالم لنفسہ ومنہم مقتصد ومنہم سابق بالخیرات
باذن اللہ ذالک ہو الفضل الکبیر۔

ظالم یعنی وہ لوگ جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ کو ایمانداری کے ساتھ اللہ کا رسول مانتے ہیں مگر عملاً نبوت کے علم وعمل کی پیروی کا حق نہیں ادا کرتے۔ بعض ہیں مگر نافرمان ہیں۔ مقتصد میانہ رو یعنی وہ لوگ جو فرمان بردار تو ہیں مگر اپنی ذات کی حد تک اور سابق بالخیرات وہ لوگ ہیں جو ذاتی طور پر نیکیاں کرتے ہیں اور جو کچھ مانتے ہیں اسے دنیا سے منوانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہیں۔ یہی دراصل امانت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ نبوت کے لاتے ہوئے علم وعمل سے رشتہ استوار کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اللہ سبحانہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں پیش پیش دین حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں پیش پیش اور بھلائی کے ہر کام میں گویے جنت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں فاستبقوا الخیرات کہہ کے قرآن امت سے کہہ رہا ہے کہ مقصد کی لگن کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی پوری طاقت سابق بالخیرات بننے پر لگا دو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ امانت کا حق ادا ہو۔ اسی قسم کی بات البقرہ میں بھی فرمائی گئی تھی، ولکل وجہۃ ہو مولیہا فاستبقوا الخیرات۔ مطلب یہ ہے کہ قبلہ کا معاملہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت نہیں ہے دنیا میں جو امتیں آئی ہیں سب ہی کا قبلہ ایک نہ ایک رہا ہے تو پھر قبلہ کے موضوع کو بحث وجدال کا موضوع بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل نظر تو مقاصد پر ہونی چاہیے اور مقصد ہی کے پیش نظر محنت اور کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ شریعت اور منہاج کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں نبیوں کی جو امتیں آتی رہی ہیں ہر امت کو شریعت اور منہاج ملتا رہا ہے اور اب تمہیں بھی یہ نعمت ملی ہے۔ تمہاری نظر محنت اور کوشش پر ہونی چاہیے اور تمہیں تو نیکیاں فراہم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہیے۔ بات ناتمام رہ جائے گی۔ اگر ہم یہاں یہ نہ بتائیں کہ ابوحیان اندلسی نے تصریح کی ہے۔ کہ یہاں استباق تسابق کے معنے میں ہے یعنی انفرادی اور ذاتی عمل کا مطالبہ نہیں بلکہ اجتماعی عمل کا قرآن مطالبہ کر رہا ہے۔

خیرات میں مسابقت کا قانون

اور پھر بے قید استباق کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ خیرات میں مسابقت کا مطالبہ کیا ہے۔ یعنی تم سے صرف

فعل خیرات مطلوب نہیں بلکہ افعال خیریہ میں پوری اُمت کے افراد کا اشتراک اور اس میں مسابقت مطلوب ہے۔ قرآن نے انبیاء کی امامت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا واوحینا الیھم فعل الخیرات اس طرح یہ آیت قرآنی اہل ایمان کی اجتماعی فلاح کے لیے ایک رہنما اصول فراہم کر رہی ہے کہ اُمتوں کو مسابقت کا جذبہ کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتا ہے۔ مقاصد کی خاطر مسابقت کی کشش امتوں میں ان کی جدوجہد کا اصل محرک ہے۔ مسابقت ہی حیات ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کامیابی اور عزت ان ہی افراد کے حصہ میں آتی ہے جو مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں اور مقصد کے حصول میں زندگی کی دوسری دلچسپیوں کو قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ جسے اپنے مقصد کا شعور نہیں یا مقصد کی خاطر، جذبہ مسابقت نہیں رکھتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مسابقت ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ اور انسانی قومیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں اُمت مسلمہ کو اسی قانون مسابقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ خیرات کا لفظ قرآن میں ان اعمال کے لیے استعمال ہوا ہے جن سے اخلاق حسنہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ گویا اُمت کا اُمت ہونے کی حیثیت سے نصب العین یہ بتایا گیا ہے کہ خیرات میں مسابقت کی جائے اور اسی الخیرات میں بھرپور اور سرتوڑ کوشش کی وجہ سے اُمت کو خیر امت کہا ہے، اشارۃً بتا دیا ہے کہ یہ اُمت انسانیت کے امن و سلام، مساوات و اخوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی علمبردار اُمت ہے۔ اخلاق اور معنوی خوبیاں اس کا جماعتی اور قومی نشان ہیں۔

دام ہم رنگ زمین

۱۲۴۔ اور اے پیغمبر ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے اس کے مطابق ان لوگوں کا فیصلہ کرو، اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ اور ان کی جانب سے چوکنے رہو کہیں اس قانون کے کچھ حصہ سے نہ بہکا دیں جو اللہ نے نازل کیا ہے یعنی آپس کے اختلافات میں خواہ دنیا کیسی ہی دست نگر یار ہے آپ کو یہی حکم ہے کہ ما انزل اللہ کے موافق حکم دیتے رہیں اور کسی کے کہنے سننے کی کوئی پروا نہ کریں۔[1] دوسرے شارحین قرآن نے تو اس کو پہلے سے مربوط کیا ہے اور درمیان کے جملے کو جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کا عطف کتاب پر ہے اور ابوالبقاء نے یہاں امر کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو سعد ماننا ہے لیکن علامہ طیبی کی رائے میں یہ فقرہ پہلے فاحکم کے ساتھ مربوط ہے ان کے درمیان اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کیجیے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے اور اب کہا جا رہا ہے کہ ان کے معاملات کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق کیجیے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے اور مزید یہ کہ ہوشیار رہیے کہ مبادا وہ آپ کو قانون الٰہی کے کسی حصہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ یہاں حالتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ اہل ایمان غیر مسلموں کی وجہ سے خدا کے نازل کردہ شریعت سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ ایک کھلی حالت ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اہل ایمان غیر مسلم شہریوں یا مسلمان نما شہریوں کی سازش کا شکار ہو کر پورے قانون الٰہی سے تو نہیں کچھ سے دستبردار ہو جائیں اور یہ دستبرداری اسلام بیزاری کی بنا پر نہیں بلکہ اسلام سے ہمدردی کی بنا پر اختیار کر لی جائے۔ مثلاً یہ کہ غیر مسلم آبادی مسلمانوں کو اپنے مسلمان ہونے کی رشوت دے اور کہے اگر اسلام کے سیاسی اور فوجداری ضابطہ کو بس انداز کیا جائے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے فرمایا کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے بچ کر رہنا، پہلی حالت ظاہر ہے اور اس سے بچنا ممکن ہے دوسری حالت دام ہم رنگ زمین ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ مرحلہ کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ مخالف قوتیں اس کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں کہ تعزیری اور فوجداری ضوابط کو چھوڑ کر اسلام کو پیش کیا جائے۔ یہ کون لوگ ہیں وہی جو مسلمانی کا لباس پہن کر یہودیوں سے ملے ہوئے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ

سنطیعکم فی بعض الامر

کچھ باتوں میں ہم تمہاری مان لیں گے۔

ان ہی کا قرآن نے آغاز میں من الذین قالوا اٰمنا بافواھھم ولم تؤمن قلوبھم کے الفاظ میں چہرہ پیش کیا تھا۔ فتنہ کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ یہ لوگ نبوت اور اہل ایمان کو کچھ اسلام سے ہٹانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے۔ اسی خطرے کی اہمیت کے پیش نظر پہلے پورے فقرے کو دہرایا ہے اور تاکید کر دی ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی زور لگائیں اور کتنا دباؤ ڈالیں اور کیسا خوشنما سبز باغ دکھائیں اور کیسی ملکی اور قومی مصلحتیں درمیان میں لائیں تمہیں بہر حال اللہ کے پورے قانون کو دنیا میں نافذ کرنا ہے۔

اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں علانیہ محسوس ہوگا کہ عملی طور پر تو گویا پوری طرح ہم بعض ما انزل اللہ سے دستبردار ہو چکے ہیں اور فکری طور پر بھی دین کی یہ ہمہ گیری ایک بھولی بسری داستان بن چکی ہے۔

قانونِ الٰہی سے روگردانی کرنے والوں کو ڈانٹ

۱۲۵ - بس اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے ان پر افتاد آئے اور یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں میں اکثریت نافرمانوں کی ہے پوری سزا تو قیامت میں ملے گی لیکن کچھ تھوڑی سی سزا دے کر یہاں بھی مجرم کو یا دوسرے دیکھنے والوں کو ایک گونہ تنبیہہ کر دی جاتی ہے اور آپ ان لوگوں کے اعراض وانحراف سے زیادہ ملول نہ ہوں دنیا میں فرمانبردار بندے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں وما اکثرالناس ولوحرصت بمومنین[1]

مطلب یہ ہے کہ آپ پورے ما انزل اللہ پہ جمے رہیں۔ یہ اگر ما انزل اللہ کو چھوڑ کر اپنے رسوم و رواج کے بنائے ہوئے گھروندے کی پیروی پر اڑے رہے تو سمجھ لو کہ وہ وقت دور نہیں کہ اللہ ان کو ان کچھ جرائم کی پاداش میں جلدی سزا دے۔ ان کا یہ جرم کہ مقدمات کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق نہ کرانا اتنا سنگین جرم ہے کہ اس دنیا ہی میں ان کو اس کی سزا ملے گی۔ عام شارحینِ قرآن تو یہی لکھتے ہیں کہ یہ یہودی ہیں اور روایاتِ تفسیری میں جو واقعات اور پس منظر بتائے گئے ہیں وہ بھی یہی تاثر دیتے ہیں کہ یہ یہودی ہیں لیکن اگر یہ ضابطہ درست ہے اور درست نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ علماء کا طے کردہ ہے کہ العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب اعتبار تو قرآن کے عموم کا ہوگا خاص اسباب کا نہ ہوگا تو پھر قرآن کا سیاق و سباق یہ کہتا ہے کہ یہ ان تمام لوگوں کا حکم ہے جو قانونِ الٰہی کی موجودگی میں اپنے مفادات، اپنی مصالح کی وجہ سے وضعی قوانین کو اپناتے ہیں۔ اس جرم کی سنگینی کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ قرآن اس کو بعض ذنوب کہہ رہا ہے اور اس کی سزا کو وہ آخرت پر موقوف نہیں کرتا بلکہ دنیا ہی میں اس کی دھمکی دے رہا ہے۔ اگر ایک یہودی یہودی ہو کر اللہ کے قانون سے روگردانی کرتا ہے اس کی سزا یہ ہے تو ذرا غور فرمائیے ایک مسلمان مسلمان ہو کر اگر یہی جرم کرے تو پھر جرم کی سنگینی کیسی ہوگی۔ ان کو اگر دنیا میں اس جرم کی سزا ملے گی تو کیا اہلِ ایمان کو یہ سزا معاف کر دی جائے گی۔ ہم جیسے دوسروں کو سزا دینے میں سخی ہیں ایسے ہی اپنے کو رعائتیں دینے میں بڑے فراخ دل ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قانونِ الٰہی اور قانونِ وضعی کا تقابل

۱۲۶۔ اگر یہ لوگ اللہ کا حکم نہیں مانتے تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور ایمان و یقین والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ یعنی جو لوگ خدا کی شہنشاہیت، رحمتِ کاملہ اور علمِ محیط پر یقین کامل رکھتے ہیں ان کے نزدیک دُنیا میں کسی کا حکم خدا کے حکم کے سامنے لائقِ التفات نہیں ہو سکتا پھر کیا یہ لوگ احکامِ الٰہیہ کی روشنی آجانے کے بعد ظنون و اہوا اور کفر و جاہلیت کے اندھیرے ہی کی طرف جانا پسند کرتے ہیں[1]

اس آیت میں اسلامی قانون کا غیر اسلامی قانون سے مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی قانون اگر ما انزل اللہ اور حکم اللہ ہے تو غیر اسلامی قانون حکم الجاہلیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اسلامی قانون سے روگردان ہو کر جاہلی قانون کے متلاشی ہیں۔ جاہلیت سے مراد غیر اسلامی قانون ہے۔ یعنی ہر ایسا قانون جو خدائی قانون کے مقابلے میں انسانی دماغ نے بنایا ہو ایک نے بنایا یا جماعت نے۔ اسلامی قانون سرتاسر علم ہے کیونکہ اس کو بنانے والا خدا ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہو جاہلیت کا طریقہ ہے۔ قرآن کی زبان ما انزل اللہ کے مقابلہ میں جو نظام ہے وہ نظامِ جاہلیت اور اس دور کے مقابلے میں جس میں اسلام یعنی ما انزل اللہ بروئے کار ہے۔ وہ دور دورِ جاہلیت ہے اور ان افکار کے مقابلہ میں جو ما انزل اللہ نے بتلائے ہوں، ہر فکر فکرِ جاہلیت ہے۔ قرآن میں صرف حکم الجاہلیہ نہیں بلکہ ظن الجاہلیہ، حمیۃ الجاہلیہ اور تبرج الجاہلیہ کی بھی مخالفت آئی ہے اس لیے جاہلیت وہ نظامِ قانون، نظامِ تہذیب اور وہ نظامِ تمدن ہے جو اسلامی قانون، اسلامی تہذیب، اور اسلامی تمدن کے مقابلہ پر ہو۔ یہاں اسلامی قانون کے مقابلے میں غیر اسلامی قانون کو حکم الجاہلیہ کہا ہے۔ یہ طریقِ کار جہاں اور جس زمانے میں انسان اختیار کریں بہرحال جاہلیت ہی کا طرزِ عمل ہوگا۔ احادیث میں بھی جاہلیت کا اطلاق اسلامی نظامِ حیات کے مقابلے پر ہوا ہے۔ اسلام سے پہلے اہلِ عرب پر جو زمانہ گزرا ہے اس کو بھی اسی لیے جاہلیت کہا گیا ہے کہ وہ نبوت کے علم و عمل سے بے پروا ہو کر گمراہی میں زندگی گزار رہے تھے۔

قانونِ الٰہی کے مقابلے میں ہر دور کا بنایا ہوا قانونِ وضعی جاہلیت ہے خواہ اس کے بنانے والے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فضلاء اور دانشور ہوں۔ چونکہ یہاں حکم الجاہلیہ ما انزل اللہ کے مقابلہ پر آیا ہے، اس لیے ہر وہ قانون جو خدا کے آتارے ہوئے قانون کے خلاف ہو وہ جاہلیت کا قانون ہے چاہے وہ زمانہ گزشتہ میں اسلام سے پہلے ہو اور چاہے آج بیسویں صدی کی روشنی ہیں۔ حافظ ابن کثیر تاتاریوں کے عہد میں ہوتے ہیں۔ ان تاتاریوں نے بھی اپنی مملکت میں ایک اپنا خود ساختہ قانون نافذ کر رکھا تھا۔ اسی کا ذکر کرتے ہوتے ابن کثیر نے ان لوگوں کو تاڑا ہے جو خدائی قانون کے مقابلے اور اسے کلاً یا جزئاً بے دخل کر کے غیر قوموں کے قانون چلاتے ہیں ان کو قطعی کافر قرار دیا ہے، لکھا ہے۔

> قرآن کی یہ آیت ان لوگوں کے خلاف کھلا چیلنج ہے جو اللہ کے نازل کردہ قانون سے ہٹ کر آراء و اہواء اور اصطلاحات کو اپناتے ہیں جیساکہ زمانہ جاہلیت والوں کا دستور تھا اور جیساکہ تاتاری ملکی سیاسیات میں اس قانون کو استعمال کرتے ہیں جو ان کو چنگیز خاں سے ملا ہے۔ چنگیز خاں کا قانونی مجموعہ ان قوانین کو کہتے ہیں جس میں متفرق مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے قوانین کو منتخب کیا گیا ہے اور اس میں اس کے علاوہ اور بھی قوانین ہیں۔ تاتاری اپنی مملکت میں اسی قانون پر عمل پیرا ہیں۔ جو بھی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ کر اس قانون کو اپناتا ہے وہ کافر ہے اس سے قتال واجب ہے۔

کیسا سخت ہے یہ فیصلہ اور کس قدر سنگینی ہے اس میں۔ یہ تو تاتاریوں کے زمانے میں مسلمانوں کے بارے میں ابن کثیر کا فیصلہ ہے۔ آئیے ذرا انگریز کے دور میں انگریز کے بناتے ہوتے قانون کو چلانے والے مسلمانوں کے بارے میں کچھ غور فرمالیجئے اور ان کے اعمال و افکار کا بھی جائزہ لیجئے آپ محسوس کریں گے کہ بہت بڑی حد تک اسلامی قانون، اسلامی نظام ایک بھولی بسری داستان بن چکی ہے۔

عملی صورتِ حال یہ ہے کہ انسان کے پردہ باطن سے لے کر اس کی اجتماعی زندگی کے آخری کنارے تک چھا جانے والا یہ دین مسجدوں اور خانقاہوں کی محدود ترین چار دیواری میں محدود ہو چکا ہے اور اس کی اس قید مسلسل پر اس کے پیروؤں نے قریب قریب مکمل صبر و رضا کا رویہ اختیار کر لیا ہے زندگی کے اکثر و بیشتر حصوں سے خصوصاً اس کے اجتماعی شعبوں سے اللہ کے دین کی اس بے دخلی پر ان کا ایمانی احساس جیسے راکھ کا ڈھیر بنا ہوا ہے اور اس معاملے میں عوام و خواص، دنیادار اور دیندار، مفاد پرست اور اہل اخلاص کی کوئی تفریق ہی نہیں ہے۔ اگر ایک طرف دنیادار مسلمان تعلق

معیشت اور سیاست کے میدانوں میں اپنی اغراض اور جاہ طلبیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا دین بازاروں، منڈیوں، عدالتوں، قانون ساز اداروں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی ان کے افکار و اعمال کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے اور پھر اپنی اس نامبارک روش پر پردہ ڈالنے کے لیے پوری شدت سے یہ پُر فریب نعرے بھی لگاتے ہیں کہ مذہب ہر شخص کی ایک مقدس مگر ذاتی متاع ہے لہٰذا دنیوی معاملات میں دخیل بنانا اور سیاسیات میں گھسیٹتے پھرنا اس کی عظمت و حرمت کی توہین کرنا ہے تو دوسری طرف مخلص حاملانِ دین کو بھی اس صورت حال پر کوئی بے چینی محسوس نہیں ہوتی حالانکہ ان کے دلوں کا خدا سے تعلق بھی ہے اور اسلام کا درد بھی ہے اور دین کے معاملے میں ان کے احساسات بڑے ہی نازک ہیں۔ اگر ایک مسجد کی دیوار بلکہ اگر کسی مزار کی جالی بھی توڑ دی جاتے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ کسی نے ان کے دل پر ہتھوڑا رکھ دیا ہے مگر دین ہی کا جو ایک خاص بڑا حصہ معطل پڑا ہوا ہے اس کے لیے ان کے دلوں میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ ۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ
فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ
أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا
فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ۝ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ
الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ ا
أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ ۝

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ[127]، یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں[128]۔ اور تم میں سے جو بھی ان کو اپنا رفیق بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا اللہ ظلم کرنے والوں کو رہنمائی نہیں کرتا ہے۔[129] بس تم دیکھ رہے ہو کہ جن کے دلوں

میں نفاق کا روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑ رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم پر افتاد آن پڑے گی۔[130] وہ وقت دُور نہیں ہے کہ اللہ تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کامیابی کی کوئی بات لے آئے گا تو اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو چھپا رکھی ہے[131]، اور ایمان والے کہیں گے کیا یہ ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور وہ ناکام و نامراد ہو کر رہے۔[132]

یہود و نصاریٰ سے ترکِ موالات

اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں تشریف آوری کے بعد یہود مدینہ سے صلح و مصالحت کا پیمان کیا اور ایک دستاویز کی صورت میں یہودیوں سے عہد و پیمان کیا۔ اس دستاویز میں یہ بات خاص طور پر لکھی تھی کہ یہودیوں سے جو بھی ہمارے ساتھ رہے گا اس کی مدد کی جائے گی اور صلح و فلاح کی حد تک اس دستاویز میں یہ دفعہ بھی درج تھی کہ

یہود جب تک اہل ایمان کے ساتھ ہو کر دشمن کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے اپنے مصاریف خود ہی برداشت کریں گے۔

اور یہ بھی لکھا تھا۔

بنو عوف کے یہودی ایمان والوں کے ساتھ ایک امت متصور ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر رہنے کے مجاز ہوں گے اور مسلمان اپنے دین پر خواہ موالی ہوں، البتہ جو لوگ ظلم یا زیادتی کے مرتکب ہوں گے وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں نہ ڈالیں گے۔

یہ دستاویز ۵۳ دفعات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس معاہدے کو جسے صحیفہ کا نام دیا گیا ہے دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور قرار دیا ہے۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو آپ کے مخالف تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔
ایک قسم ان لوگوں پر مشتمل تھی جن سے حضور انور نے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا، وہ کافر ہوتے ہوئے ایک پُرامن شہری کی حیثیت سے رہتے ان کی جان اور ان کے مال کی حفاظت ہوتی تھی ان کو معاہدین کہتے ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان جنگ کیا تھا اور اسلام اور مسلمان کی عداوت ہی کو اپنا رکھا تھا یہ لوگ محاربین کہلاتے ہیں۔

تیسری قسم اُن لوگوں کی تھی جن سے نہ جنگ تھی اور نہ صلح تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو حالات کو دیکھ رہے تھے، حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے کون غالب ہوتا ہے۔ حضور انور یا آپ کے مخالفین۔ ان میں وہ بھی تھے جو دل سے حضور انور کے غلبے کے خواہاں تھے اور حالات کے دباؤ سے مجبور تھے، اور ان میں وہ بھی تھے جو بظاہر مسلمان تھے مگر اندر سے دشمن کے ساتھ تھے۔ قرآن نے ان کو ہی منافقین کہا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب سے الگ الگ معاملہ کیا ہے۔ یہودیوں سے مصالحت کی۔ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع نے بدر کے بعد اعلانِ جنگ کیا۔ بنو نضیر نے جیسا کہ امام بخاری نے کہا ہے بدر ہی کے چھ ماہ بعد عہد شکنی کی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی۔ اور بنو قریظہ نے غزوہ خندق میں عہد شکنی کی۔ عیسائیوں کا بھی یہی حال تھا۔ ان ہی اسباب کی بنا پر یہاں قرآن نے مسلمانوں پر ان سے موالات پر پابندی عائد کی ہے۔

آیات کا پس منظر

ان آیات کے پس منظر کے موضوع پر شارحین قرآن کے مختلف خیالات ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں یہ آیتیں رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کے باب میں نازل ہوئی ہیں۔ یہود سے اس کے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت مغلوب ہوگئی تو یہود سے ہماری دوستی کام آئے گی۔ اسی واقعہ کے متعلق اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

امام تفسیر ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد اطراف مدینہ کے یہود و نصاریٰ سے ایک معاہدہ کیا تھا لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمنی کی وجہ سے اس معاہدہ پر قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ سے سازش کر کے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کے لیے خط لکھ دیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپ نے ان کے مقابلے کے لیے مجاہدین کا ایک دستہ روانہ کر دیا۔ بنو قریظہ کے یہودی ایک طرف تو مشرکین مکہ سے یہ سازش کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کیے ہوتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کا کام کرتے تھے اس لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے عطیہ ابن سعد کے حوالے سے بتایا ہے کہ عبادہ ابن الصامت نے حضور انور کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر یہود کی موالات سے بیزاری کا اعلان کیا اور عبداللہ ابن ابی نے یہود کی موالات کو چھوڑنے سے انکار کیا تو اللہ نے یہ آیات نازل کیں۔

"تاریخی روایات سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہی احوال و ظروف کے بعد ان آیات کا نزول ہوا ہے اور ان واقعات کو سبب نزول کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات میں ان کا حل موجود ہے۔

۵۱ اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ اولیاء جمع ولی کی ہے ولی دوست کو بھی کہتے ہیں، قریب کو بھی ناصر اور مددگار کو بھی۔ غرض یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کفار سے جیسا کہ سورہ نساء میں تصریح کی گئی ہے۔ مسلمان دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں۔ اس موقع پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ موالات، مروت و حسن سلوک، مصالحت، رواداری اور عدل و انصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں۔ اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے صلح و مصالحت اور عہد و پیمان مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله۔ عدل و انصاف کا حکم

جیساکہ گزشتہ آیات سے معلوم ہو چکا۔ مسلم و کافر ہر فرد و بشر کے حق میں ہے۔ مروت، رواداری یا حسن سلوک کا برتاؤ ان کفار کے ساتھ ہو سکتا ہے جو جماعت اسلام کے مقابلے میں دشمنی اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں جیسا کہ سورہ ممتحنہ میں تصریح ہے۔ باقی موالات یعنی دوستانہ اعتماد اور برادرانہ مناصرت و معاشرت تو کسی مسلمان کو حق نہیں کہ یہ تعلق کسی غیر مسلم سے قائم کرے۔ البتہ صوری موالات جو ۱۷۱ ان تتقوا منہم تقاۃ کے تحت میں داخل ہو۔ اور عام تعاون جس کا اسلام اور مسلمان کی پوزیشن پر کوئی برا اثر نہ پڑے اس کی اجازت ہے۔ بعض خلفائے راشدین کے بارے میں جو غیر معمولی تشدید و تضییق منقول ہے اس کو محض سد ذرائع اور مزید احتیاط پر مبنی سمجھنا چاہیے۔

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات جن میں ترک موالات کا حکم آیا ہے یعنی اس بات پر زور دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ یا دوسرے کافروں سے رفاقت و اعانت کے تعلقات نہ رکھو۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے احکام احکام جنگ سے ہیں نہ زندگی کے عام احکام یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے مخالفین سے میل جول، رواداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سفارش سے اس کے مٹانے اور برباد کرنے کے درپے ہوں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹانے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی حالت قائم ہو یا غلط شبے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں۔ اور یہ بات بھی ایک بے غبار حقیقت ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان حق کی خاطر جس قدر محبت ہو گی فطرۃً ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری بھی ہو گی جو اس حق کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہل حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے قرآن نے روکا ہے قرآن کے اس قسم کے احکام کے وہی معنے ہیں جو شہزادہ امن کے اس اعلان کے ہیں۔

یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں ہے۔ (متی کی انجیل باب ۱۰ ۳۴)

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحمدلی نہیں جو دوسروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے

خطاب کرتے تھے۔ جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمان کی جنگ چھڑی، اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں تاکہ ان کے مقابلے میں اگر مسلمان کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے ہٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اے ایمان والو یہود و نصاریٰ سے رفاقت کے تعلقات نہ رکھو، ورنہ جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے۔ اصل اس میں محبت و شفقت، ہمدردی و سلوک اور تعاون و سازگاری ہے اس کے سوا کوئی بات نہیں ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو، ہم نسل ہو یا نہ ہو، ہم عقیدہ ہو یا نہ ہو اور امتیاز کی وہ تمام باتیں جو اس انسانی بھائی چارگی کا رشتہ قطع کرتی ہیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں خود انسانوں کی گھڑی ہوئی ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سب سے زیادہ اعتراف اسی حقیقت کا ہوتا تھا۔ انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ لیکن جب تمام ملک و قوم نے اس دعوت کو نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اہل ایمان پر محض اختلاف افکار کی بنا پر ظلم و ستم کرنے لگے تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اب دو فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے ایک فریق مسلمانوں کا تھا جو اپنا بچاؤ کر رہا تھا دوسرا دشمنوں کا تھا جو حملہ آور تھا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ دوستوں اور دشمنوں میں صاف امتیاز ہو جائے جو دوست ہیں وہ دشمن کے کیمپ سے تعلق نہ رکھیں۔ جو دشمن ہیں وہ دوستوں سے کسی طرح کی سازش نہ کریں۔ قرآن میں جس قدر احکام عدم موالات ہیں وہ سب اسی صورت حال سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن کی یہ آیت بھی اسی سے متعلق ہے۔

قرآن نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی ہے تمام غیر مسلم خواہ کتابی ہوں یا غیر کتابی۔ ان کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے، یہ نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں نہ ان پر حملہ آور ہوتے ہیں نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان کوئی علاقہ نہ رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں میں ہو گا۔

یہود و نصاریٰ کا سیاسی گٹھ جوڑ

۱۲۸ ۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یعنی مذہبی فرقہ بندی اور اندرونی بغض و عداوت کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ یہودی یہودی کا اور عیسائی عیسائی کا دوست بن سکتا ہے لیکن اہل ایمان کے مقابلے میں سب کفار ایک دوسرے کے دوست اور معاون بن جاتے ہیں۔ الکفر ملۃ واحدۃ[1] آیت کے آغاز میں اہل کتاب کی تعبیر چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کہنے کی وجہ یہی ہے کہ ان کی یہ عداوت نبوت اور اسلام سے کتابی ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہود و نصاریٰ کی سیاسی سنگٹھن کی وجہ سے ہے ورنہ ان کی کتاب تو ان کو یہ نہیں کہتی ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے مشترک طور پر ایک سیاسی خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے باہم ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ انفرادی نہیں بلکہ جماعتی بنیاد پر ہونا چاہیے، جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف بحیثیت جماعت واحدہ ہیں اسی طرح مسلمان بھی ان کے مقابلے میں ملت واحدہ بنیں۔ جماعت سے الگ ہو کر مسلمانوں کا کوئی گروہ ان کے کسی گروہ کے ساتھ اپنے ذاتی اغراض و مصالح یا ذاتی تعلقات و مراسم کی بنا پر اتحاد و دوستی کا ربط و ضبط نہ رکھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی یہودی اور نصرانی نصرانی تو باہم دوست ہوتے ہی ہیں باقی خود یہود و نصاریٰ کے درمیان بھی بہت کچھ مناسبت ہے۔ کم از کم یہی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پر دونوں متحد ہیں۔ ان کے آپس میں اگر تمہارے خلاف ساز باز ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ آج بھی اگر اس سیاسی گٹھ جوڑ اور بعضھم اولیاء بعض کا تماشا دیکھنا چاہتے ہو تو سرزمین فلسطین میں یہودیوں اور عیسائیوں کا مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ دیکھ لو۔

دشمن کا دوست دشمن ہے

۱۲۹ ۔ اور تم میں سے جو بھی ان کو اپنا رفیق بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا اللہ ظالم لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ یعنی فی الواقع یہود کے ساتھ منافقین کی موالات کا اصل منشا یہ ہے کہ یہود جماعت اسلام کے مدمقابل اور مذہب اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہود و نصاریٰ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یا کسی جماعت کفار کے ساتھ اس نیت اور حیثیت سے موالات کرے کہ وہ دشمنِ اسلام ہے۔ اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ منافقین میں کچھ لوگ اور بھی تھے جنہوں نے جنگِ احد میں لڑائی کا پانسہ بدلا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کیا تھا کہ ہم تو اب فلاں یہودی یا فلاں نصرانی سے دوستانہ گانٹھیں گے اور ضرورت پیش آنے پر ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں گے۔ اس قماش کے لوگوں کی نسبت بھی ومن یتولہم منکم فانہ منہم کا ظاہری مدلول علانیہ صادق ہے جب وہ مسلمان جو اس قسم کی نیت اور خشا سے خالی ہو کر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کریں۔ چونکہ ان کی نسبت بھی قوی خطرہ رہتا ہے کہ وہ کفار کی حد سے زیادہ ہم نشینی اور اختلاط سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں یا کم از کم شعائرِ کفر اور رسومِ شرکیہ سے کنارہ اور نفور نہ رہیں۔ اس اعتبار سے فانہ منہم کا اطلاق ان کے حق میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ حدیث المرء مع من احب نے اس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور جو لوگ کہ دشمنانِ اسلام سے موالات کر کے خود اپنی جان پر اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور جماعتِ اسلام کے مغلوب و مقہور ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ ایسی بدبخت، معاند اور دغاباز قوم کی نسبت یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کبھی راہِ ہدایت پر آئے گی[1] مطلب یہ ہے کہ جو جماعت سے الگ ہو کر ان کو اپنا دوست اور معتمد بنائے گا اس کا شمار ان ہی میں ہوگا۔ اس کا دعویٰ اسلام بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا۔ یعنی جن یہود و نصاریٰ کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے ان سے اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان نہ رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے شریعت درگزر کر سکتی ہے لیکن اس قسم کے یہود و نصاریٰ سے محبت کرتا ہے یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے تو یہ گناہ نہیں نفاق ہے اور منافق مومن نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ ان اللہ لا یہدی القوم الظالمین، ہدایت سے یہاں منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے اور ظالمین سے مراد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ اسلام اور اہلِ ایمان کے مقابل میں ایمان و اسلام کے دشمنوں کو اپنا دوست و معتمد بنائیں گے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کریں گے اور ایسے لوگ راہ یاب نہ ہوں گے اس لیے کہ انہوں نے راہِ راست پر چلنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

منافقین کے دل کا چور

۱۳۰۔ پس تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم پر کوئی افتاد آن پڑے گی۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں شک اور نفاق کی بیماری ہے جن کو خدا کے وعدوں پر اعتماد اور مسلمانوں کی حقانیت پر یقین نہیں۔ اسی لیے دوڑ دوڑ کر کافروں کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں تاکہ ان کے موہوم غلبہ کے وقت ثمرات فتح سے متمتع ہو سکیں۔ اور ان کے زعم میں جو گردشیں اور آفات جماعت اسلام پر آنے والی تھیں ان سے محفوظ رہیں نخشیٰ ان تصیبنا دائرۃ کے یہی معنے ان کے دلوں میں پوشیدہ تھے لیکن یہی الفاظ جب پیغمبر اسلام اور مخلص مسلمانوں کے سامنے یہود سے دوستانہ رکھنے کی معذرت میں رکھتے تھے تو گردش زمانہ کا یہ مطلب ظاہر کرتے کہ یہود ہمارے ساہوکار ہیں۔ ہم ان سے قرض لے لیتے ہیں۔ اگر کوئی مصیبت قحط وغیرہ آن پڑے تو وہ ہمارے دوستانہ تعلقات کی وجہ سے آڑے وقت میں کام آجائیں گے ان ہی خیالات کا آگے جواب آرہا ہے۔[1]

اس وقت تک عرب میں کفر اور اسلام کی کش مکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنے پیرووں کی سرفروشیوں کے سبب ایک طاقت بن چکا تھا لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں۔ اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا ویسا ہی کفر کی فتح کا بھی تھا، اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے وہ اسلامی جماعت میں رہتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ربط ضبط رکھتے تھے تاکہ یہ کشمکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جائے پناہ محفوظ رہے۔ علاوہ ازیں اس وقت عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کی معاشی قوت سب سے زیادہ تھی، ساہوکاری سب سے زیادہ تھی۔ ساہوکارہ بیشتر انہی کے ہاتھ میں تھا۔ عرب کے بہترین سرسبز و شاداب خطے ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی سود خواری کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا معاشی اسباب کی بنا پر بھی یہ منافق لوگ ان کے ساتھ اپنے سابق تعلقات برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اگر اسلام و کفر کی اس کش مکش میں بے سوچے سمجھے منہمک ہو کر ہم نے ان سب قوموں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے جن کے ساتھ اسلام اس وقت برسرپیکار ہے تو یہ فعل سیاسی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

سارے شارحین قرآن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں منافقین کا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ان میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح اور آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے وہ ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہ تھا بلکہ صرف منافع و مصالح پر ان کا سہارا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ دنیوی کامیابی اور مادی فوائد و منافع ان کا منتہائے نظر تھا۔ اصول و اخلاق معیار منافع و فوائد کے مقابلے میں ان کے یہاں بے قیمت تھے۔ یسارعون فیھم کے انداز بیان نے اس سلسلے میں ان کی تگ و دو، بھاگ دوڑ، محنت اور جانفشانی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہر دور میں منافقین کا یہی حال ہوتا ہے۔ سیاسی زندگی میں سیاسی پارٹیوں سے ساز باز اور اقتدار بدلنے کے ساتھ پارٹیوں کی تبدیلی ان ہی لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

مستقبل میں ان کی ندامت کا سامان

۱۳۱۔ وہ وقت دور نہیں ہے کہ اللہ تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کامیابی کی کوئی بات لے آئے گا تو اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو چھپا رکھی ہے۔ یعنی وہ وقت نزدیک ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کو فیصلہ کن فتوحات اور غلبہ عطا فرمائے اور مکہ معظمہ میں بھی جو تمام عرب کا مسلم مرکز تھا حضور کو فاتحانہ داخل کرے یا اس کے ماسوا اپنی قدرت اور حکم سے کچھ اور امور بروئے کار لائے جنہیں دیکھ کر ان منافقین کی ساری باطل توقعات کا خاتمہ ہو اور انہیں پتہ لگ جائے کہ دشمنان اسلام کی موالات کا نتیجہ دنیوی ذلت و رسوائی اور اخروی عذاب الیم کے سوا کچھ نہیں۔ جب فضیحت و رسوائی کے یہ نتائج سامنے آ جائیں گے اس وقت بجز پچھتانے کے اور کف افسوس ملنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

الآن قد ندمت وما ينفع الندم

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلام کے عام غلبے اور فتح مکہ وغیرہ کو دیکھ کر تمام اعدائے کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہت سے یہود مارے گئے۔ بہت سے جلا وطن ہوئے۔ منافقین کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مسلمانوں کے سامنے صریح طور پر جھوٹے ثابت ہو گئے۔ موالات یہود میں جو کوششیں کی تھیں وہ اکارت گئیں اور اخروی و دنیوی ہلاکت ابدی کا طوق گلے میں پڑ گیا۔ اگلی آیت میں

اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں یہ ڈر سمایا ہوا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور اسلام کے مخالفین کے درمیان جو کشمکش برپا ہے معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا ہو سکتا ہے کہ فتح بالآخر مخالفین کی ہو۔ چونکہ ان منافقین کا قلبی رشتہ مخالف اسلام طاقتوں کے ہی ساتھ تھا اس وجہ سے وہ اس بات پر یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھے کہ اسلام کے مقابلے میں ان کے ٹھہرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھایا اور بتایا کہ آخری اور مکمل فتح آنے والی ہے جس کے بعد دشمن کی قوت بالکل ختم ہو جائے گی او امر من عندہ یا اللہ کی طرف سے کوئی خاص بات ایسی نمایاں ہو جائے گی جس سے منافقین کا سارا بھرم کھل جائے گا۔ یعنی فیصلہ کن فتح سے کمتر درجہ کی کوئی ایسی چیز جس سے عام لوگوں کو یقین ہو جائے کہ مستقبل میں میدان اسلام کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس وقت یہ لوگ مایوس ہوں گے اور یہود کی دوستی جسے اب تک وہ چھپائے ہوئے تھے اس پر پچھتائیں گے۔

منافقین کی روش پر اہل ایمان کا تعجب

۱۳۲۔ اور ایمان والے کہیں گے کیا یہ ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور وہ ناکام و نامراد ہو کر رہ گئے۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے ان منافقین کے حال پر اس وقت اظہار ہو گا جب ان کا سارا راز فاش ہو جائے گا اس وقت مسلمان باہم کہیں گے۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے زور شور سے قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس سے مقصد منافقین کو تنبیہ ہے کہ کب تک اپنی سازشوں کو راز بنائے رکھو گے بالآخر ایک روز برسر عام رسوائی ہونی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ حبطت اعمالھم یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہے کہ ان کے سارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور یہ نامرادیوں کی تصویر بن کر رہ جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ اسلام کی پیروی میں کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوٰۃ دی، جہاد میں شریک ہوئے۔ اسلامی اخلاق و آداب کو اپنایا۔ یہ سب کچھ اس لیے ضائع ہو گیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہ تھا۔ اعمال کے مثمر ہونے کا انحصار تمام تر ایمان و اخلاص پر ہے۔ نفاق کے ساتھ دینداری کی جو نمائش کی جاتی ہے وہ محض نمائش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوتی ہے۔ حقیقت کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ ایک مطلب تو یہی ہوتا ہے لیکن علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ان کے وہ اعمال رائیگاں ہو جائیں گے جو وہ یہودیوں سے موالات کی خاطر کرتے تھے اور وہ تمام کوششیں بیکار ہو کر رہ گئیں جو اب تک وہ اس راہ میں کرتے تھے۔

اعجاز قرآنی کا ایک نمونہ

اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے اور وجہ اعجاز کیا ہے؟ ان وجوہ اعجاز میں ایک وجہ اعجاز قرآن مجید کا اظہار غیب اور پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں صراحۃً غیب کی خبر دی گئی ہے۔ اگرچہ عسیٰ کے ذریعے دی گئی ہے اور وہ اصلاً امکان غالب اور ظن غالب ہی کے لیے آتا ہے لیکن جہاں موقع دلیل ہو تو عسیٰ وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف انداز بیان ہے، یہاں اسی مفہوم میں ہے۔ یہاں فتح مکہ کی خبر دی گئی ہے۔ اور دنیا نے یہ تماشا آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اپنے بندے کو فتح و نصرت سے نوازا اور مدمقابل ساری طاقتوں کو مکمل شکست دی۔ اس سورت کا زمانہ نزول سنہ ۶ھ کا اواخر یا سنہ ۷ھ کا اوائل ہے اور فتح مکہ ۲۰ رمضان سنہ ۸ھ یعنی ۱۱ فروری سنہ ۶۳۰ء میں ہوئی ہے۔ قرآن میں اس قسم کی خبریں اور بھی ہیں۔ اہل کتاب اس قسم کی غیب کی خبروں ہی کو نبوت کہتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ذرا قرآن کی اس معجزانہ بلاغت کو پیش نظر رکھیے کہ اس آیت میں کس قدر خوبصورت انداز میں مختلف طریقوں سے اہل ایمان کو یہود و نصاریٰ کی موالات سے روکا ہے۔

۱۔ بصیغہ نہی موالات سے روکا اور نام لے کر روکا۔
۲۔ ان کے سیاسی گٹھ جوڑ کی نشاندہی فرما کر موالات سے روکا۔
۳۔ یہ کہہ کر روکا کہ ان سے موالات کرنے والے کا شمار ان میں ہی ہو گا۔
۴۔ یہ کہہ کر روکا کہ ایسا کرنے والے ظلم کار ہیں۔
۵۔ یہ کہہ کر روکا کہ وہ اللہ کی رہنمائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔
۶۔ یہ کہ موالات شک و نفاق کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔

۷- یہ کہہ کر روکا کہ موالات کا نشہ ان کو ہوتا ہے جو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

۸- یہ خبر دے کر موالات سے روکا کہ فتح و نصرت عنقریب اسلام کی ہوگی اور تمہارے اندیشوں کا گھروندا بگڑ جائے گا۔

۹- یہ کہہ کر جن کے اقتدار کے اندیشے سے تم موالات کررہے ہو وہ ذلیل ہوں گے۔

۱۰- یہ بتا کر موالات سے روکا کہ تمہیں اپنے موجودہ کردار پر مستقبل میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔

۱۱- یہ کہہ کر موالات سے روکا کہ وقت آرہا ہے جب تم سرِعام رسوا ہوگے اور اہلِ ایمان کو تم پر حیرت ہوگی۔

۱۲- یہ کہہ کر روکا کہ موالات کے سلسلے میں تمہاری ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔[1]

---

[1] المحاسن التاویل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ
يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ
لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ
يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝

اے اہل ایمان! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو قریب ہے کہ اللہ ایسا گروہ پیدا کر دے جنہیں خدا دوست رکھتا ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں، مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوتے لیکن دشمنوں کے مقابلے

نہایت سخت، اللہ کی راہ میں جان لڑا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ [١٣٣] یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرمائے اور وہ بڑی ہی وسعت والا اور جاننے والا ہے۔ [١٣٤] تمہارا رفیق و مددگار تو اللہ ہے اس کا رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں جو نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے جھکے ہوتے ہیں [١٣٥] اور دیکھو جو بھی اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی رکھے گا تو بلا شبہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔ [١٣٦]

مستقبل میں غلبہ اسلام کی پیشین گوئی

یہ آیات دراصل پہلے ہی موضوع کا تتمہ ہیں۔ پہلے یہ بات کھول دی گئی ہے کہ کافروں سے موالات کرنے والوں کو کافروں ہی میں شمار کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس بیماری میں آج مبتلا ہیں وہ مستقبل میں کھل کر اسلام کے مخالف کیمپ میں جا کھڑے ہوں اور اس طرح وہ ارتداد اختیار کر لیں فرمایا اگر مستقبل میں ایسا ہوا تو اللہ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے ان کی پروا نہیں ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کے ذریعے اقامت دین کا کام کرائے گا جو صرف اہمیت ہی نہیں بلکہ عشق و شیفتگی کی ایسی تصویریں ہیں جو مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح جھیلتے ہی نہیں بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و سرور

حاصل کرتے ہیں۔ راہِ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں انہیں ایسی راحت محسوس ہوتی ہے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ اس راہ میں مصیبتیں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں۔ اتنی ہی زیادہ ان کے دل کی خوشحالیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آرہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں ہیں۔ عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ دورِ اول کے مسلمانوں کی محبت کا یہی حال تھا۔ ہر شخص جو ان کی زندگی کی سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہِ حق کی مصیبتیں صرف جھیلی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالی۔ ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں شریک ہوئے ان پر شب و روز کی جانکاہیوں اور قربانیوں کے پورے ۲۳ سال گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہ دی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کسی طور نمایاں ہو۔ انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ گوارا کی گویا دنیا جہاں کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہو گئی ہیں۔ وہ یحبھم و یحبونہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ تاریخ انسانی ان کی قربانیوں کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ایمان خالص کا معیار یہی پیش کیا ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ دنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشاتِ نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جان نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبر گیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ بھی کار فرما ہو سکتا ہے غریب رشتہ داروں کی امداد میں نوعِ انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے دین کے لیے سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کی طلب کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

۱۳۳۔ اے اہلِ ایمان جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو قریب ہے کہ اللہ ایسا گروہ پیدا کر دے جنہیں خدا دوست رکھتا ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں۔ مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جان لڑا دیں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ اس آیت میں اسلام کی بدی بقا حفاظت کے متعلق عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی ہے۔ پچھلی آیات میں کفار کی موالات سے منع

کیا گیا تھا۔ لیکن تھا کہ کوئی شخص یا قوم موالات کفار کی بدولت صریحاً اسلام سے پھر جائے جیسا کہ ومن یتولھم منکم فانہ منھم میں تنبیہ کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے نہایت قوت اور صفائی کے ساتھ آگاہ کر دیا کہ ایسے لوگ اسلام سے پھر کر کچھ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ حق تعالیٰ مرتدین کے بدلے میں یا ان کے مقابلے میں ایسی قوم لے آئے گا جن کو خدا کا عشق ہو اور خدا ان سے محبت کرے وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان اور دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں غالب اور زبردست ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی بحول اللہ و قوتہٖ ہر قرن میں پوری ہوتی رہی۔ ارتداد کا سب سے بڑا فتنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبر کے عہد میں پھیلا۔ کئی طرح کے مرتدین اسلام کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے مگر صدیق اکبر کی ایمانی جرأت اور اعلیٰ تدبر اور مخلص مسلمانوں کی سرفروشانہ اور عاشقانہ خدمات اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور سارے عرب کو متحد کر کے از سرِ نو اخلاص ایمان کے راستہ پر گامزن کیا۔ آج بھی ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جب کبھی چند جاہل اور طامع افراد اسلام کے حلقہ سے نکلنے لگتے ہیں تو ان سے زیادہ اور ان سے بہتر تعلیم یافتہ اور محقق غیر مسلموں کو اسلام فطری کشش سے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے خدا ایسے وفادار اور جاں نثار مسلمانوں کو کھڑا کر دیتا ہے جنہیں خدا کے راستہ میں کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کی پروا نہیں ہوتی[1]

ان آیات میں پہلے اسلام کے لیے ایک رکاوٹ کا ذکر کر کے پھر اُمت مسلمہ کو بتایا ہے کہ اس رکاوٹ کے بارے میں اُمت کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟۔

یہ دُنیا خیر و شر کا مسکن ہے، یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں موجود ہیں اور بُرائی کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ یہ دونوں باہم ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور یہ رکاوٹ کبھی اندر سے ہوگی اور کبھی باہر سے۔ باہر سے رکاوٹ کا نام کفر ہے اور اندر کی رکاوٹ کا نام نفاق ہے۔ کفر اگر ایمان کا مقابل ہے تو نفاق اخلاص کا۔ ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں بھی یکساں نہیں ہوتی ہیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تعلق کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ یہاں اسی کی ترقی یافتہ صورت کو ارتداد کہا ہے۔

تاریخ اسلام بتاتی ہے کہ زمانہ نبوت میں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد اسلام کو ارتداد کے فتنہ سے دوچار ہونا پڑا۔ تاریخ میں اس کی تفصیلات محفوظ ہیں۔ ہم اسی کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ،

اس آیت قرآنی کا مقصد دو باتیں ہیں ایک اس حادثہ کی خبر دینا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں پیش آیا اور آپ کی وفات کے بعد ترقی کر گیا۔ دوسرے اس تدبیر سے آگاہ کرنا جو خدا نے غیب الغیب میں اس حادثہ کے لیے مقرر فرمائی ہے تاکہ جس وقت حادثہ رونما ہو لوگ اس سے کچھ باخبر ہوں اور ان کے دلوں میں کوئی اضطراب نہ ہو اور جب غیب سے وہ تدبیر ظاہر ہو تو اس میں پورے اہتمام سے کوشش کریں اور اسے پورا کرنے میں بھرپور حصہ لیں۔

حادثہ ارتداد کی تاریخ

حضور انور کے زمانے میں جو لوگ ارتداد کا شکار ہوئے ان میں بنو مدلج، بنو حنیفہ اور بنو اسد کے تین خاندان ہیں۔ بنو مدلج میں اسود عنسی نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہوا اور یمن کے شہروں پر قابض ہو گیا اور فیروز دیلمی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ بنو حنیفہ میں مسیلمہ نے دعویٰ نبوت کیا۔ اور بنو اسد میں سے طلیحہ بن خویلد نے دعویٰ نبوت کیا۔

حضرت ابوبکر کے زمانہ خلافت میں سات خاندان فزارہ، غطفان، بنو سلیم، بنو یربوع، تمیم، کندہ، بنو بکر میں نوفل ارتداد کا شکار ہوئے۔ اور غسان کا قبیلہ حضرت عمر کے زمانے میں مرتد ہوا۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ عرب کے گیارہ قبیلے مرتد ہوئے، تین قبیلے تو حضور انور کے آخری زمانے میں۔ باقی حضرت ابوبکر اور عمر کے زمانے میں اور علامہ خطابی رقمطراز ہیں کہ جن لوگوں نے راہ ارتداد اختیار کی تھی وہ دو قسم کے تھے کچھ تو وہ تھے جو اسلام ہی کو کلی طور پر خیرباد کہہ چکے تھے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حضور کی نبوت کے منکر تھے اور دوسرے وہ جو اسلامی قوانین کی بالادستی نہ مانتے ہوئے نماز اور زکوٰۃ چھوڑ بیٹھے تھے۔ اور ایک قسم وہ تھی جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتی تھی، زکوٰۃ سرکار کو نہ

دیتی تھی۔ یہ لوگ درحقیقت باغیوں کے زمرے میں داخل ہیں لیکن اس دور میں ردۃ کے غلبہ کے پیشِ نظر ان کو باغی نہیں بلکہ مرتد کہہ دیا گیا ہے۔

شوکانی نے نیل الاوطار میں اس طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں۔

وہ مانعین زکوٰۃ جو اصل دین پر قائم ہوں وہ باغی ہیں ان کو علیحدہ کرکے کافر نہیں کہا گیا۔ اگرچہ ارتداد کی نسبت تاریخ میں ان کی طرف ہے کیونکہ وہ مرتدین کے اس معاملہ میں ہمنوا تھے۔ لغت میں ارتداد کے معنے پلٹنے کے ہیں ہر شخص جو اختیار کردہ راہ سے ہٹتا ہے وہ مرتد ہے اس معنے لغوی کے لحاظ سے مانعین زکوٰۃ میں طاعت سے انحراف کار فرما تھا اس لیے ان کو مرتد کہہ دیا گیا ہے[1]

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں اس حادثہ ارتداد پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ بہت قیمتی ہونے کے ساتھ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے اس لیے میں یہاں وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں، فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں عرب کے تین فرقے مرتد ہو گئے اور ہر فرقہ میں سے ایک ایک شخص دعویٰ نبوت لے کر اٹھا اور اس کی قوم نے اس کی تصدیق کی اور ایک فتنۂ عظیم برپا ہو گیا۔ اول ذوالخمار عنسی نے جو کہانت اور شعبدہ بازی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ قبیلہ مذحج میں دعویٰ

---

[1] قرطبی نے یہ بات لکھی ہے کہ مرتد اپنے ارتداد میں دو قسم کے تھے۔ ایک قسم تو وہ تھی جس نے اسلام بالکل چھوڑ دیا تھا اور ایک قسم وہ تھی جس نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ اس تشریح میں اور علامہ خطابی و شوکانی کے بیان میں جوہری فرق ہے۔ اس تشریح کی صورت میں ان سب سے قتال ارتداد کی بنا پر ہوا لیکن خطابی اور شوکانی کی تشریح پر سب سے قتال ردۃ کی بنا پر اور مانعین زکوٰۃ سے قتال بغاوت کی بنا پر تھا۔ امام بخاری نے صحیح میں عنوان ہی میں اس طرف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں قتل من ابی قبول الفرائض و ما نسبوا الی الردۃ۔ ان لوگوں کو قتل کرنا جو فرائض کا انکار کر دیں لا یکمان کو مرتد نہیں کہا گیا۔ مجھے کرمانی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہاں ما نافیہ ہے۔ اس میں امام بخاری نے اشارہ کیا کہ اگر قبول فرائض کا انکار ہو تو یہ طاعت سے روگردانی ہے اور یہ باغی ہیں اور ان کی طرف ارتداد کی نسبت نہیں ہے۔ ان سے قتال انکار قبول کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ حافظ عسقلانی نے ما کو مصدریہ اور حافظ عینی نے ما کو موصولہ قرار دیا ہے لیکن کرمانی کی بات جی کو لگتی ہے۔

نبوت کر اٹھا تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو اور ان تمام مسلمانوں کو جو ان کے ہمراہ تھے خط لکھا کہ ذوالخمار سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ حضرت فیروز دیلمی نے معاذ کے حکم سے ذوالخمار کو قتل کر ڈالا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی بذریعہ وحی اطلاع ہو گئی اور فرمایا فاز فیروز، فیروز کامیاب ہو گیا۔ اور بظاہر اس واقعہ کی خبر ربیع الاول کے آخر میں حضور کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر کو ملی۔ دوسرا مسیلمہ کذاب ہے قبیلہ بنی حنیفہ میں شہر یمامہ میں دعویٰ نبوت لے کر کھڑا ہوا اور بارگاہِ نبوت میں اس گستاخ نے ایک خط بھی لکھا جس کا مضمون یہ تھا،

مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کو واضح ہو کہ ملک آدھا میرا ہے اور آدھا آپ کا۔

یہ خط مسیلمہ نے بارگاہِ نبوت میں دو آدمیوں کے ہاتھ روانہ کیا۔ آپ نے ان دونوں سے دریافت کیا کہ کیا تم دونوں اس کی شہادت دیتے ہو کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے، ان دونوں نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ اگر قاصد کو قتل نہ کرنے کا دستور نہ ہوتا تو تمہاری گردن مارنے کا میں ضرور حکم دیتا۔ اس کے بعد حضور انور نے اس خط کا جواب لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

محمد رسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کو معلوم ہو کہ ملک اللہ کا ہے جس کو چاہتا ہے اس کو مالک بناتا ہے اور انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے اور بالآخر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ صدیق اکبر نے بڑے لشکر کے ساتھ حضرت خالد بن الولید کو مسیلمہ کذاب کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔

تیسرا طلیحہ اسدی ہے یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قبیلہ بنی اسد میں دعویٰ نبوت لے کر اٹھا آپ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر نے خالد بن الولید کو اس جماعت کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا حضرت خالد نے ان کو شکست دی اور طلیحہ بھاگ گیا۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا اور جنگ قادسیہ میں خوب کام کیا۔

اس کے بعد ارتداد کی آگ خوب پھیل گئی۔ حرمین اور قریہ جواثی کے علاوہ سارا عرب اس کی لپیٹ میں آ گیا اور ایک گروہ نے زکوٰۃ دینی بند کر دی۔ اسی گروہ کے بارے میں فقہائے صحابہ میں باہم مباحثہ ہوا کہ یہ لوگ اہل قبلہ ہیں ان سے قتال جائز نہیں ہے۔ ان فقہائے صحابہ میں فاروق اعظم تھے۔ آپ حضرت ابو بکر سے فرماتے تھے کہ آپ ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جو لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔ حضور انور

کا ارشاد ہے، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں تاآنکہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ لیں، جو یہ کہہ دے گا اس کی جان اور مال محفوظ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرتا ہے کیونکہ زکوٰۃ حق مال ہے، بخدا اگر وہ ایک بکری کا بچہ جو زمانہ نبوت میں ادا کرتے تھے اب نہ دیں گے تو میں ان سے اس کے نہ دینے پر بھی جنگ کروں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ بس میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے۔

مستقبل میں اس حادثہ کی خبر کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مداوا کیا ہے اور اسلام کی راہ میں اس عظیم رکاوٹ کو ہٹایا کیسے جائے گا۔ قرآن نے اس سوال کا جواب فسوف یاتی اللہ بقوم میں دیا ہے کہ اللہ کی جانب سے اس رکاوٹ کو ہٹانے کا یہ کام ان لوگوں کے سپرد کیا جائے گا جن کا چہرہ قرآن کے لفظوں میں یہ ہوگا۔

صحابہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے

اصل ارشاد میں یحبھم و یحبونہ آیا ہے یعنی جن سے خدا محبت کرتا ہے اور جو خدا سے محبت کرتے ہیں، دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندے کے ساتھ ہو۔ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر عبادات کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو سب دیتے ہیں مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے۔ اس کا جواب قرآن نے دیا ہے مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز افکار و اعمال، اخلاق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے فرمایا

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن کا چہرہ یہاں یحبھم کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے یعنی صحابہ کرام ان کے افکار، اعمال، اخلاق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کا پورا پورا عکس اور کاپی تھے۔ اگر ان کے افکار، اعمال اور اخلاق اس تعلیم کے پیمانے سے ذرا بھی ہٹے ہوئے ہوتے تو قرآن ان کا چہرہ یحبھم سے پیش نہ کرتا اور صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ تو مختصر بات ہے بلکہ قرآن نے نام بنام بتایا ہے کہ اللہ کی محبت کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ خدا کن لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ پڑھیے اور ٹھنڈے دل سے

پڑھیے اور پھر سوچیے کہ قرآن نے یحبھم ... ور جیسے ... آ ... جن ... ہے ... ان ...
کا الگ الگ ہی ذکر کیا ہے جن سے اللہ محبت کرتا ہے مثلاً ان اللہ یحب المحسنین اور ان اللہ یحب
التوابین اور ان اللہ یحب المتوکلین اور ان اللہ یحب المقسطین، ان اللہ یحب المتقین اور
واللہ یحب الصابرین اور واللہ یحب المطھرین اور ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا

اس کا مطلب صاف اور کھلے لفظوں میں یہ ہے کہ جن اشخاص کے بارے میں یہاں قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے وہ حضرات اگر ایک طرف اپنے افکار، اعمال اور اخلاق میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار، اعمال اور اخلاق کا کامل ترین نمونہ ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن میں محمد رسول اللہ کے ساتھ والذین معہ نہ ہوتا۔ دوسری طرف یہ حضرات احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور اللہ کی راہ میں جہاد کے اوصاف سے بھی موصوف ہیں، کیونکہ یحبھم کے ذریعے اعلان کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں یہ صفات موجود ہیں اور ساتھ ہی یحبھم کا اطلاق بتاتا ہے کہ خدا کے ان محبوبوں کے دامن ان رذائل سے بھی پاک ہیں جو محبت الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کر دیتے ہیں۔ مثلاً کفر، فخر و غرور، بدلہ لینے میں حد سے بڑھ جانا، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ و تکبر، قرآن میں ان آیات کا مطالعہ کرو جن میں ان رذائل کا نام لے کر بتایا ہے کہ خدا ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا جن میں یہ اوصاف موجود ہوں مثلاً ان اللہ لا یحب الکافرین اور ان اللہ لا یحب المعتدین اور ان اللہ لا یحب کل خوان اثیم، ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا، ان اللہ لا یحب الفرحین۔ ان اللہ لا یحب المفسدین، لا یحب المسرفین، انہ لا یحب المستکبرین انہ لا یحب الظالمین وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت میں یحبھم کا مطلب یہ ہے کہ محبت سے جن کا یہاں تعارف کرایا جا رہا ہے وہ اگر ایک طرف ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور جہاد جیسے اخلاقی فضائل کی دولت سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے بڑھ جانا، فخر و غرور، کبھی خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، استکبار، ظلم جیسے رذائل کا بھی ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے کیونکہ یہ وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبت الٰہی کے سائے سے دور کرتی ہیں۔

ان کی خدا سے محبت

صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے بلکہ فرمایا یحبونہ وہ بھی اللہ سے

محبت کرتے ہیں۔ یہ فقرہ بتاتا ہے کہ ان کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خم خانہ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلاتے ہیں۔ ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حب الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے کہ اہل ایمان کی جماعت کرام کو نصیب ہو چکی تھی۔ زبان الٰہی نے اس کی شہادت دی۔ والذین آمنوا اشد حبا للہ۔ اس نشہ محبت پر باپ ماں اولاد بھائی بیوی جان مال اور خاندان سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے یہاں یحبونہ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ وہ اس راہ کی ساری منزلوں سے عملاً گزر چکے تھے۔ ایمان باللہ کا حقیقی امتحان محبت میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ اسی پر زندگی کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسی سے نظریہ ایک جاندار، انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل بنتا ہے۔ اس کا خمیر عشق کی والہ انگیزیوں اور جنوں نوازیوں سے تیار ہوتا ہے۔ اسی میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے جن سے پہلے یہ کہا گیا تھا کہ

ان کان اباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ

اگر تمہارے والدین تمہاری اولاد تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان تمہارا جمع کردہ سرمایہ تمہارا کاروبار جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہاری پسندیدہ رہائش گاہیں، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں محنت سے زیادہ محبوب ہیں تو بس انتظار کرو۔

اب یہاں ان ہی کے بارے میں پوری دنیا کو سنایا جا رہا ہے کہ یحبونہ وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

یہ بات کہ اللہ سبحانہ محبت کرتے ہیں اور اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ اپنے حقیقی معنے میں ہے لیکن اس کی محبت بھی اس کے علم، اس کی قدرت کی طرح بے مثال ہے اس لیے زمخشری کی ہمنوائی میں محبت کی تاویل ثواب دینے سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تفسیر خالص حکمانہ ہے زمخشری نے اس کا بھی انکار کیا ہے کہ بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ تاویل کرتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کرتے ہیں۔ صاحب انتصاف نے زمخشری کی بھرپور تردید کی ہے امام غزالی نے احیاء العلوم میں حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین اور روضۃ المحبین میں علامہ مرتضیٰ زبیدی

نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اگر ہمیں اس جلد کی ضخامت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم اس موضوع پر یہاں تفصیل بحث کرتے تاہم مختصر کے طور پر اتنا سمجھ لیجیے کہ لغت میں محبت نام ہے صاحب محبت کے محبوب کی طرف مائل ہونے کا۔ جن لذتوں کی وجہ سے انسان محبت کرتا ہے وہ دو قسم کی ہیں حسی اور عقلی۔ حسی جیسے کھانے میں ذوق کی لذت خوبصورتی میں نگاہ کی لذت، خوشبوؤں میں ناک کی لذت، نغموں میں کان کی لذت اور عقلی جیسے جاہ و منصب، امامت و حکومت اور علوم و فنون کی لذت اور عقلی لذتوں میں بھی فرق مراتب ہے۔ علوم کی لذتیں معلومات کے تابع ہوتی ہیں۔ معلومات میں اللہ سے زیادہ کامل اور جمیل کوئی معلوم نہیں ہے۔ اللہ کی معرفت اور اس کے جلال و کمال کی معرفت سے حاصل شدہ لذت تمام لذتوں سے بالا ہے اور جو محبت اس راہ سے آئے گی وہ سب محبتوں سے برتر ہوگی اور یہی محبت خدا کی طاعت کا باعث ہے اس سے معلوم ہوا کہ بندے کا اللہ سے محبت کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ امر واقعہ ہے۔ یہ لوازم و شرائط ایمان سے ہے۔ لوگ اس محبت میں فرق مراتب رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی! فرمایا تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے۔ انھوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے کہا کہ یا رسول اللہ میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ صرف اللہ و رسول کی محبت ہے اور بس فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ ہے گا۔ صحابہ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بندے کو چاہتا ہے تو　　　　حضرت جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندے کو پیار کرتا ہوں تم بھی پیار کرو تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرتا ہے لیکن اس کی آخری منزل اس راہ میں یہ ہے جیسے ہیں کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام سوا کی محبتیں ہیچ ہو کر رہ جائیں۔

اہل ایمان کے سامنے بچھے ہوئے اور کفر کے مقابلے میں تنے ہوئے

ان لوگوں کا چہرہ بیان کرتے ہوئے جن کے ذریعے قرآن فتنہ ارتداد کی سرکوبی کر کے اسلام کا بول بالا کرنا چاہتا ہے دوسری صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اپنوں کے سامنے بچھے ہوتے اور غیروں کے

مقابلے میں نرم رہتے ہیں۔ اصل ارشاد میں اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین کی تعبیر آئی ہے۔ زمخشری
نے لکھا ہے کہ اذلۃ ذلیل کی جمع ہے اور اس کے معنے خاکسار نیازمند اور متواضع کے ہیں۔ یہاں بجائے
اذلۃ للمومنین کے اذلۃ علی المومنین کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی ہے کہ یہ نیازمندی اور
خاکساری رحمت و شفقت کی بنا پر ہے اور رفعت شان اور علو مرتبہ کے باوجود وہ اہل ایمان کے سامنے
بچھے رہتے ہیں اور آخر میں اعزۃ علی الکافرین پہلے فقرے کی تکمیل ہے ممکن ہے کوئی اذلۃ علی المومنین
کا بول سن کر یہ خیال کرے کہ ان میں عزت نفس اور خودداری نہیں ہے اس لیے خاکسار میں فرمایا نہیں
اس لیے نہیں بلکہ ان میں عزت نفس اور خودداری بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ خاکساری اہل ایمان کے مقابلہ
میں اختیاری ہے ورنہ وہ کافروں کے مقابلہ میں عزیز ہیں۔ زمخشری نے کشاف میں ابن حیان نے البحر المحیط
میں قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اور ابن کثیر نے تفسیر میں اس آیت کو اشداء علی الکفار
کا مرادف قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس آیت کے وہی معنے ہیں جو اشداء علی الکفار رحماء بینہم
کے ہیں الفاظ مختلف ہیں روح دونوں کی ایک ہے اعزۃ علی الکافرین اور اشداء علی الکفار کے
معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بد اخلاقی سے پیش آتے ہیں بلکہ معنے
یہ ہیں کہ یہ اہل ایمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور قوت ایمان کے سبب سے ایسے سخت
ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اس لیے محاورے کے مطابق اشداء کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ
وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابلہ میں
کافی مضبوط ہیں۔ اس سے یہ بات اشارۃً معلوم ہو گئی کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ جس شدت اور
عزت کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی قومی، ملکی اور لسانی نفرت و بیزاری نہیں بلکہ وہ صرف حق
کی نصرت اور کفر کی نفرت کے لیے دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و
انصاف اور نیک برتاؤ سے نہیں روکا۔

تصحیح اخلاق کا اسلامی طریقہ

اخلاقیات پر خود مسلمانوں نے بھی بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں لیکن اگر اسے جرأت بے جا نہ قرار دیا
جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں زیادہ غیر اسلامی مکاتب کے افکار کی تقلید کی گئی ہے
اور بزور اسلامی اخلاق پر ان کو چسپاں کرنے کی لاحاصل بلکہ ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اخلاقی مسائل
جن کا بالکلیہ عمل اور صرف عمل سے تعلق تھا ان کو فلسفہ اور نظریات کی بھول بھلیوں میں اس طرح

گم کر دیا ہے کہ عمل کے لیے مشکل ہی سے ایک عام آدمی ان کتابوں کی روشنی میں کسی لائحہ عمل کا انتخاب کر سکتا ہے۔ قرآن نے اخلاقِ انسانی کے اس مسئلہ کو اس آیت میں کس خوبصورتی سے حل کر دیا ہے: اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین۔ اس مختصر سے فقرے میں فطرتِ انسانی کے وہ سارے اوصاف جن کی شدت و حدت سے دنیا چیخ رہی ہے۔ غصہ، عداوت، حسد الغرض وہ سب کچھ جن سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ بجائے اس بات کے مسلمانوں کو حکم دیا جاتا کہ اپنے کو ان رذائل سے پاک کرو، کفر کی طرف ان کا رخ پھیر کر عزت کی ان ہی صفات کو قرآن نے کتنا کارآمد اور قیمتی بنا دیا۔ کفر کس چیز کا نام ہے۔ ان ہی چیزوں کا جنہیں اختیار کر کے اپنے ہاتھوں آدمی خود اپنے آپ کو اپنی توانائیوں کو خطرناک انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ کیسا لطیف انداز ہے کہ جن صفات کی سختیوں سے انسانیت بے تاب تھی صرف ایک لفظ میں قرآن نے ان ہی کو خس و خاشاک کے اس انبار کی صفائی کا ذریعہ بنا دیا جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں کفر ہے جن سے زحمت ہو رہی تھی وہ ہی اولادِ آدم کی خدمت کا وسیلہ بن گئے اس طرح اس آیت میں ہمیں تصحیحِ اخلاق کا قرآنی طریقہ بتا دیا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار خوب جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے قوتِ غضب اور قوتِ شہوت۔ مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور قرآنی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے بچا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ امام غزالی کے بقول قرآن نے غصہ کے دبانے کی تعریف کی ہے غصہ کے مٹانے کی نہیں۔ اس نے والکاظمین الغیظ فرمایا ہے والفاقدین الغیظ نہیں فرمایا۔

دنیا میں علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جد و جہد جو کچھ ہے وہ ان ہی دو قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں۔ اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی و سعادت اور خوش بختی کی آدمی دنیا مر جاتے۔ فلسفہ اخلاق میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے بلکہ بے جا غصہ اور بے محل خواہش بری چیز ہے۔ قرآن نے اپنے پیرووں میں ان دو قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں اذلۃ علی المومنین کہا ہے وہیں [illegible] نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ اعزۃ علی الکافرین [illegible] کر بتایا کہ عزت [illegible] اللہ، رسول اور [illegible] کے فرمانبرداروں کے لیے ہے۔

خدا کے لیے محبت اور ناراضی

[illegible] آپ کے ذہن میں یہاں یہ خلش ہو کہ قرآن نے [illegible] سے نفرت [illegible] کے بجائے [illegible]

ہی کا خاتمہ کیوں نہ کر دیا۔ یہ سا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی ہے۔ محبت، عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضگی انسان کے فطری جذبات اور دنیا کے تمام کام تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد ان ہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں۔ اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کے نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے برف کا تودہ بن جائے اس لیے یہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضگی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے چنانچہ قرآن نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لیے ہو۔ صلح و جنگ، دوستی و دشمنی خوشی و ناخوشی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لیے ہو الحب للہ والبغض للہ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی کے جذبات سے انسان کو پاک ہونا چاہیے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی ناراضی کو سرے سے تنہا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی چیز سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے ضرور نفرت کرے گا وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہو گا وہ نیکیوں سے دوستی کرے گا تو شروں سے علیحدہ بھی ہو گا جب اہل ایمان کے لیے خاکسار ہو گا تو اہل کفر کے لیے سنگین بھی ہو گا۔ انسان کے سینے میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی چیز کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ہے۔ ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ۔ سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔

گویا اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مومنوں پر نرم ہیں یعنی اہل ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ان کی ذہانت، ان کی ہوشیاری، ان کی قابلیت، ان کا رسوخ و اثر ان کا مال ان کا زور اور کوئی چیز بھی مسلمانوں کو دبانے اور ستانے کے لیے نہ ہو مسلمان اپنے درمیان ہمیشہ نرم خو، رحمدل، ہمدرد اور حلیم ہی پائیں اور کفار پر سخت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مومن اپنے ایمان کی پختگی، دینداری کے خلوص، اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے مخالفین

اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہوں کہ کسی طرح کسی لالچ کسی مفاد کی وجہ سے اپنے مقام سے نہ ہٹائے جا سکیں وہ کبھی ان کو موم کی ناک اور نرم چارہ نہ پائیں انھیں جب بھی اہل ایمان سے سابقہ پڑے ان کو پتہ لگ جائے کہ یہ اللہ کے بندے مر سکتے ہیں مٹ نہیں سکتے۔

راہ خدا میں جہاد

ان لوگوں کا چہرہ پیش کرتے ہوتے جن کے ذریعے فتنہ ارتداد کو ختم کر کے اسلام کو دنیا میں بالادستی دینی ہے تیسری صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کریں گے۔ اصل ارشاد میں عربی تعبیر یجاھدون فی سبیل اللہ ان ہے۔ جہاد سے یہاں مقصود ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے کی جائے۔ یہی ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودان باطل کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بیتاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑا دینے پر آمادہ ہو جائے۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشات نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اپنی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی اور قومی مفاد کی آمیزش شامل ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

> من مات ولم یغز ولم یحدث به نفسه مات علی شعبة من النفاق
>
> جس کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا۔

اسلام کے لیے وہ بیباک ہیں

ان کی آخری صفت یہ بتائی گئی ہے کہ لا یخافون لومة لائم یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں اس کے احکام پر عمل کرنے میں۔ اور اس دین کی رو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اسے باطل کہنے میں انہیں کوئی باک نہ ہو گا کسی کی مخالفت کسی کی طعن و تشنیع کے

اعتراض اور کسی کی پھبتی اور آوازے کی وہ پروا نہ کریں گے۔ اگر بخشتے عام اسلام کے خلاف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنے اپنے آپ کو دنیا میں لکھو کے ہوں تب بھی وہ اسی لو پر چلیں گے جیسے وہ سچے دل سے حق جانتے ہیں[1] زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فقرے میں واو کو حالیہ قرار دیا جائے اور مطلب یہ ہو کہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے تمام مفادات اور دوسری دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے جہاد کے میدان میں اترتے ہیں۔ جو شخص ہر قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھے گا اور اپنے ناصحوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹائے گا عرب شعراء جب اولوالعزمی، بہادری اور فیاضی کی داستان سناتے ہیں تو اس کی تمہید میں ملامت گروں کی ملامت کا ضرور ذکر کرتے ہیں اس لیے کہ اس راہ کی سب سے بڑی آفت یہی ہے لیکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم لے کر اٹھے اور دائیں بائیں سے کچھ ناصح اور کچھ ملامت گر دامن گیر نہ ہو جائیں یہ اس راہ کی پہلی آزمائش ہے اور زمخشری نے یہ بھی بتایا ہے کہ واو عاطفہ ہو اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ ان کے اوصاف میں سے جہاد ہے اور یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنے دین میں اتنے پختہ ہیں کہ جب دین کا کوئی کام شروع کر دیتے ہیں تو اس میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان کو کسی معترض کا اعتراض کسی ملامت گر کی ملامت مرعوب نہیں کرتی ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ بلاغت اس میں ہے کہ یہ مستقل وصف ہو اور بتایا جا رہا ہے کہ دین میں ان کے قدم اس قدر مضبوط اور ایمان میں ان کو اس قدر ثبات حاصل ہے کہ وہ کسی قسم کی ملامت کی قطعاً پروا نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کی عملی زندگی میں کوئی اقدام نہ ریا لوگوں کی واہ واہ کے لیے ہوتا ہے اور نہ کسی اندیشہ کی خاطر ہوتا ہے بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ احقاق حق اور ابطال باطل ہو اور بس۔

مسند امام احمد میں حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہے کہ مجھے حضور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کاموں کا حکم دیا ہے ایک مساکین سے محبت کرنے اور ان سے قرب ہونے کا، دوسرے اپنے سے کمتر کو دیکھنے اور اپنے سے بالا کو نہ دیکھنے کا تیسرے صلہ رحمی کرنے کا، چوتھے کسی سے سوال نہ کرنے کا پانچویں حق کہنے کا چاہے کیسا ہی تلخ ہو، چھٹے اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کرنے کا اور ساتویں لاحول ولا قوۃ الا باللہ بکثرت کہنے کا۔

---

[1] تفہیم القرآن

واقعات کی روشنی میں مصداق آیت

واقعات کی روشنی میں اس آیت قرآنی کا مصداق تاریخ اسلام میں کون ہے اور اللہ سبحانہ کا یہ وعدہ کب پورا ہوا اس کے لیے ہم یہاں حضرت شاہ ولی اللہ کا وہ بیان نقل کرتے ہیں جو انھوں نے ازالۃ الخفاء میں پیش کیا ہے اور واقعات کی روشنی میں اس کا مصداق بتایا ہے۔

اللہ سبحانہ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن یہ وعدہ حضور انور کے زمانے میں پورا نہیں ہوا کیونکہ آپ کے زمانے میں مرتدوں کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں ہوئی اور شیخین یعنی ابوبکر و عمر کے بعد بھی تاریخ میں ایسی کسی فوجی مہم کا ذکر نہیں ہے جس میں مرتدوں کی سرکوبی کی گئی ہو۔ تاریخ میں اس کا مصداق صدیق اکبر کی فوجی مہم کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ کی فوج ظفر موج، کہ مرتدوں کی سرکوبی کے لیے میدان میں آئی اور اس نے بہت جلد اور نہایت عمدہ طریق پر اس فرض کو انجام دیا اور چونکہ فوج کی مہم رسائی اور اہل ارتداد سے لڑنا خلافت خاصہ کے لوازم سے ہے کیونکہ خلافت راشدہ کہتے ہی اسے ہیں جو اقامت دین کی خاطر دشمنان خدا سے جہاد کرے اور کلمۃ اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہو۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ مرتدوں سے جہاد کرنا اقامت دین کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ اور اہل ارتداد سے جہاد کرنے والوں کی تعریف ان آیات میں دوپہر کے آفتاب سے زیادہ واضح ہے۔

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ سبحانہ نے پوری قوت سے یہ بات فرمائی ہے کہ یہ جماعت مرتدین سے قتال کے وقت میں اللہ کی محبوب اور اللہ کی محب ہونے کے ساتھ مختلف صفات سے موصوف تھے اور یہ تمام صفات کمال ہیں۔ لہٰذا اگر صدیق اکبر اپنی خلافت میں برحق نہ ہوں تو لازم آتا ہے کہ جس جماعت نے ان کے حکم کی تعمیل میں جہاد کیا اور صدیق اکبر سے بیعت کی اور ان کو خلیفہ بنانے پر راضی ہوتے وہ اوصاف کمال سے تہی دامن ہوں۔ اور یہ بات صراحۃً قرآن کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فتنہ ارتداد پیدا ہوا تو اللہ سبحانہ نے حضرت صدیق اکبر کے دل میں ان مرتدین سے جہاد کرنے کا داعیہ پیدا فرمایا اور آپ نے عزم کی پوری قوت اور ہمت و استقلال سے جماعت صحابہ کے ذریعے اس فتنہ کا استیصال کیا۔ تاریخ میں اس کام کی اہمیت اور عظمت لگانے کے لیے

شاہ ولی اللہ کا یہ بیان پڑھیے۔

حضرت صدیق اکبر کے دل میں جو داعیہ رونما ہوا اس کی حیثیت ایک روشن چراغ کی تھی جو بھی سامنے آتا اس چراغ کی روشنی میں منور ہو جاتا۔ تمام صحابہ ابوبکر کے ہم نو ہو گئے اور مہم پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ابوحصین کہتے تھے کہ انبیا کے بعد حضرت ابوبکر سے افضل کوئی نہیں۔ انہوں نے زمانہ ارتداد میں وہ کام کیا جو ایک نبی ہی کر سکتا ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضور انور کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر پر وہ افتاد پڑی کہ اگر پہاڑوں پر پڑتی تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ نفاق تمام مدینے میں پھیل گیا اور اہل عرب مرتد ہو گئے۔ بخدا لوگوں نے ایک نقطہ میں بھی اختلاف کیا تو میرے والد اسے ختم کرنے کے لیے اڑ کر گئے۔ (ازالۃ الخفا)

عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم ابتداء میں اس لڑائی کو پسند نہ کرتے تھے مگر آخر میں تو ہم ابوبکر کے شکر گزار ہوئے کہ اسلام کو ایک بڑے فتنہ سے بچا لیا۔ اور فاروق اعظم فرماتے تھے کہ اگر صدیق اکبر میری تمام عمر کی عبادت لے لیں اور مجھے صرف اپنی ایک رات اور ایک دن دے دیں تو میں راضی ہوں۔ رات سے غار ثور کی رات مراد ہے اور دن سے فتنہ ارتداد کا دن مراد ہے اور حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ قام فی الردۃ مقام الانبیاء یعنی فتنہ ارتداد میں ابوبکر نے انبیاء والا کام کیا ہے۔

اللہ کی بڑی مہربانی اور فضل

۱۳۴۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرمائے اور اللہ بڑی وسعتوں والا اور بڑے علم والا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی سعادت اور اس پر خدا کا بڑا فضل یہ ہے کہ وہ فتنہ کے وقت خود جادہ حق پر ثابت قدم رہے، دوسروں کو ہلاکت سے بچانے کی فکر کرے۔ خدا جن بندوں کو چاہے اس سعادت کبریٰ اور فضل عظیم سے حصہ وافر عطا فرماتا ہے۔ اس کا فضل غیر محدود ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ کون سا بندہ اس کا اہل ہے کیونکہ جن کو چاہتا ہے سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت کے مطابق اس کے اہل ہوتے ہیں۔ ذالک سے اشارہ ایمان اور

لہ افادات شیخ الاسلام

ان اوصاف و اعمال کی جانب ہے جو ابھی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اس کے یہاں وسعتیں اور گنجائشیں لامتناہی ہیں وہ چاہے تو سب کو ان اوصاف کا حامل بنا دے لیکن ان اوصاف سے ان ہی کو موصوف کرتا ہے جو اس کے علم کامل میں اس کے اہل ہوتے ہیں۔

اس فقرے پر پوری آیت کے ساتھ مربوط کر کے حکیم الامت نے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے اسے یہاں نظرانداز کر دینا علم کی ناقدری ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ جو فرمایا ہے فسوف یاتی اللہ بقوم۔ اللہ ایک قوم کو لائے گا حالانکہ ظاہر میں مسلمانوں کو مرتدین کی سرکوبی کے لیے جمع کرنے والے حضرت صدیق اکبر تھے اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے بدر کے موقع پر حضور انور کی مشت خاک کو اللہ نے اپنی مشت خاک بتایا وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی۔ فی الواقع ان اوصاف کی حامل جماعت کو میدان میں لے آنا اللہ سبحانہٗ کا کام تھا۔ حضرت صدیق اکبر کی حیثیت تو آلہ جارحہ کی تھی غور کرنا چاہیے کہ اس مرتبہ کے بعد کون سا مرتبہ اس سے بالا ہو سکتا ہے جو ابوبکر کو ملا ہے اور نبوت کے بعد ابوبکر جیسا کون کامل اور مکمل ہو سکتا ہے یہ اللہ ہی کا فضل ہے جسے چاہے وہ نوازتا ہے۔[1]

موالات کے لیے اہل ایمان کا میدان

۱۳۵۔ تمہارا رفیق و مددگار اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے جھکے ہوتے ہیں۔ پچھلی آیتوں میں یہود و نصاریٰ کی موالات اور رفاقت سے روکا تھا جس کو سننے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسلمانوں کے تعلقات وداد اور معاملات رفاقت کس سے ہونے چاہئیں؟ اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ ان کا رفیق اصلی خدا، پیغمبر اور مخلص مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں ہے[1]

یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الیہود والنصاریٰ اولیاء۔ میں جو بات منفی انداز میں کہی گئی تھی اور جس کے لیے ایک سے زیادہ تعبیری انداز اختیار کیے گئے تھے اس کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ پھر ہمارے تعلقات کا دائرہ کیا ہے اور ہماری موالات کا میدان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہاں تک ہے؟ اسی کے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ اہل ایمان کی موالات اللہ سے، پھر اللہ کے رسول سے اور پھر اہل ایمان سے ہوتی ہے جو نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے ہوئے پوری زندگی میں اللہ کے سامنے جھکے ہوتے ہوں۔ راکعوں رکوع سے ہے اور رکوع یہاں اصطلاحی معنے میں نہیں بلکہ لغوی معنے میں ہے عام شارحین قرآن تو اس کو یقیمون اور یوتون کی ضمیر سے حال قرار دیتے ہیں لیکن میں اسے پورے جملہ حال سمجھتا ہوں، یعنی الذین یقیمون الصلاۃ و یوتون الزکوٰۃ سے اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کے یہ دونوں شعائر ادا کرتے ہوئے وہ پوری زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، منافقین کی طرح نہیں کہ کچھ زندگی میں اسلام کو مانیں اور کچھ میں نہ مانیں۔ اور جو لوگ اس کو یقیمون اور یوتون سے حال بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ دل کی پوری خوشنودی اور رضامندی سے ادا کرتے ہیں۔

اللہ کی جماعت کو غلبہ ہوتا ہے

۱۳۶۔ اور دیکھو جو بھی اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی رکھے گا تو بلاشبہ اللہ کا گروہ غالب آنے والا ہے۔ کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ کوئی ضعیف القلب اور ظاہر بین مسلمان اس تردد میں پڑ جاتا کہ تمام دنیا سے موالات منقطع کرنے اور چند مسلمانوں کی رفاقت پر اکتفا کر لینے کے بعد غالب ہونا تو درکنار، کفار کے حملوں سے اپنی زندگی اور بقاء کی حفاظت بھی دشوار ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے فرمایا کہ مسلمانوں کی قلت اور ظاہری بے سروسامانی پر نظر مت کرو۔ جس طرف خدا، اس کا رسول اور سچے وفادار مسلمان ہوں گے وہی پلہ بھاری ہوگا۔ اس آیت نے گویا حضرت عبادہ ابن الصامت کی حوصلہ افزائی کی جن کے یہود بنی قینقاع سے بہت دوستانہ تعلقات تھے مگر اللہ و رسول کی موالات اور مومنین کی رفاقت کے سامنے انہوں نے اپنے سارے تعلقات منقطع کر لیے[1]۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہاں نہایت بلیغ ایجاز سے کام لیا گیا ہے پوری بات یوں ہے کہ جو لوگ اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے موالات کرتے ہیں وہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔ اللہ کی ولایت تو حقیقی ہے کیونکہ وہ ہر خیر کے فیضان کی علت ہے، اللہ کے پیغمبر کی ولایت اس فیضان میں واسطہ ہونے کی وجہ سے ہے اور اہل ایمان کی ولایت اس فیضان کا ظرف ہونے کی وجہ سے جیسے محبوبیت میں بالذات اللہ کی محبت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے اور پیغمبر کی محبت اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے ہے اور اہل ایمان سے محبت خدا کے بندے ہونے کی وجہ سے ہے۔

ان دونوں آیتوں یعنی ۵۵ اور ۵۶ کو آیات ولایت کہتے ہیں۔ اس سے ہمارے جعفری دوستوں نے حضرت علی کی حضور انور کے بعد بلا فصل امامت کی صحت پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ شیخ ابو علی الفضل بن الحسن الطبرسی اپنی مشہور تفسیر مجمع البیان میں رقمطراز ہیں۔

هذه الاية من اوضح الدلائل على صحة امامة على بعد النبي بلا فصل

اور اس دعوے کے ثبوت میں جو دلائل قائم فرمائے ہیں وہ بھی ذرا ان ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں الذین آمنوا سے جماعت نہیں بلکہ حضرت علی مراد ہیں۔ اس سے کام نہ چلا تو ایک قدم آگے بڑھایا کہ حضرت علی نے حالت رکوع میں ایک سوال کرنے والے کو اپنی انگشتری دے دی تھی یہ اس آیت کے نزول کی وجہ ہے پھر جب اس من گھڑت روایت سے بھی دعویٰ کا پیٹ نہ بھرا تو اس پر یہ اضافہ فرمایا کہ یہاں لفظ ولی رفیق و مددگار کے معنے میں نہیں بلکہ یہ ولایت سے ہے اور صاحب حکومت اور صاحب اقتدار کے معنے میں ہے۔ اس سے بھی جب دعوے کی تشنگی دور نہ ہوئی تو بلا فصل کا اضافہ اپنی طرف سے کیا۔ اور آیت کا مطلب یہ بتایا کہ اے مسلمانو! تمہارے بلا فصل حاکم حضرت علی ہیں جو اہل ایمان ہیں، نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور حالت رکوع میں خیرات کرتے ہیں۔

یہی بات طبرسی نے احتجاج میں، محقق عارف محمد بن المرتضیٰ محسن نے الفیض الکاشانی میں اور مشہور مفسر قرآن فتح اللہ کاشانی نے منہج الصادقین میں لکھی ہے۔ آئیے ہم ذرا ان کے اس دعویٰ اور دعویٰ کے ان دلائل کا مطالعہ کریں اور آزاد ماحول میں معلوم کریں کہ ان میں کس قدر جان ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ولی اس آیت میں بمعنے حاکم ہے۔ ولی کے یہ معنے خلاف لغت عرب ہیں یہاں اسی ولی کی جمع اولیاء آئی ہے بعضهم اولياء بعض اور ۷ تخذوا اليهود والنصارى اولياء ولی کے جو معنے وہاں ہیں وہی معنے یہاں بھی ہیں۔ مصدر دو آتے ہیں ایک ولی اور دوسرے ولایت ہے۔ ولی کے معنے لگاؤ اور تعلق کے آتے ہیں۔ اسی سے ولی صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ اسی کی جمع اولیاء آئی ہے۔ مصدر اگر ولایت ہو تو المبرد کی تصریح کے مطابق ریاست کے معنے میں آتا ہے اسی سے والی صفت کا صیغہ آتا ہے جس کے معنے حاکم کے ہیں۔ فقہائے کرام کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر کسی جنازے میں ولی اور والی دونوں موجود ہوں تو امامت کس کا حق ہے۔ معلوم ہوا کہ ولی اور والی میں فرق ہے۔ خود قرآن کی متعدد آیات میں یہ لفظ محب اور دوست کے معنے میں آیا ہے مثلاً

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض اور الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم الا لفظ ولی قرآن میں بغیر اضافت ۳۴ جگہ پر آیا ہے اور لفظ اولیاء بلا اضافت ۴۲ بار استعمال ہوا ہے۔ سب جگہ یہی معنے ہیں۔ یہاں آیت کا سیاق و سباق بھی یہی نشاندہی کر رہا ہے کہ ولی کے معنے یہاں دوست اور رفیق کے ہیں کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی رفاقت سے منع فرمایا ہے۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ رفاقت کا دائرہ خدا، اللہ کے رسول اور اہل ایمان تک محدود رکھو۔ اگر اس آیت میں معنے رفاقت کے نہ لیے جائیں تو بات بے ربط ہو کر رہ جائے گی اور یہ قرآن کی بلاغت کے خلاف ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ الذین آمنوا سے حضرت علی مراد ہیں یہ بھی قرآن کے ساتھ نہیں بلکہ خود زبان کے ساتھ بھی بہت بڑی بے انصافی ہے۔ آیت کے الفاظ قطعاً عام ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم صرف حضرت علی کو مراد لیں، سارے اہل ایمان جن میں یہ اوصاف ہوں اس میں داخل ہیں۔ عموم ہی کی وجہ سے جابر بن عبداللہ نے اس کا مصداق عبداللہ بن سلام کو قرار دیا ہے۔ چونکہ ان کو یہود نے مسلمان ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ حضرت علی بھی اس کا ایسا ہی مصداق ہیں جیسے حضرت ابوبکر اور دوسرے صحابہ کرام چنانچہ امام ابو جعفر محمد بن علی الباقر کے حوالہ سے امام بغوی رقمطراز ہیں کہ یہ آیت اہل ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے ان سے کہا گیا کہ یہ تو حضرت علی کے متعلق ہے فرمایا کہ حضرت علی بھی اہل ایمان میں داخل ہیں۔

اس کے لیے اس افسانہ کا سہارا لیا کہ حضرت علی نماز پڑھ رہے تھے کہ سائل نے آکر سوال کیا، حضرت علی نے نماز پڑھنے کی حالت میں بحالت رکوع اپنی انگوٹھی نکال کر اس کو دی۔ اس کہانی کی محققین کے یہاں تاریخی طور پر کوئی قیمت نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ

> اس قصہ کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند ہی کمزور اور اس کے راوی مجہول ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ کی چوتھی جلد میں اس پر مبسوط بحث کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

> شیعہ لوگ جو ایک جھوٹا قصہ روایت کرتے ہیں اور ترکیب نحوی میں ھم راکعون کو یؤتون الزکوۃ کا حال بتاتے ہیں اور حالت رکوع میں حضرت علی کا ایک فقیر کو انگوٹھی دینا بیان کرتے ہیں اس طرح آیت قرآنی کا سیاق و سباق درہم برہم کرتے ہیں۔

اور پھر اس پر بھی ذرا غور فرمایئے کہ اگر اس آیت میں ولی سے مراد والی اور حاکم ہوتا تو دوسری آیت کے معنے کیا ہوں گے؟ ومن یتول اللہ ورسولہ والذین آمنوا۔ کیا اس کے معنے یہ کیے جائیں گے کہ جو شخص اللہ، رسول اور اہل ایمان پر حاکم بنے گا۔ یہ معنے کوئی صاحب ایمان نہیں کر سکتا۔ دراصل اینٹ کا پہلا رواہی غلط ہے اس پر جو عمارت اٹھے گی وہ غلط ہوگی۔ اگر اس جلد کے ضخیم ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس پر تفصیل بحث کرتے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا
وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ
اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِذَا نَادَيْتُمْ
اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ
اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ
وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ
ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ
عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ
الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۤئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ
السَّبِيْلِ ۝ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا
بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا

يَكْتُمُونَ ۞ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ

وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا

يَعْمَلُوْنَ ۞ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ

قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا

يَصْنَعُوْنَ ۞

اے اہلِ ایمان تم ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق و تفریح کا سامان بنالیا ہے یعنی اہلِ کتاب اور دوسرے کفار کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ، اگر ایمان والے ہو تو متقیانہ سیرت اپناؤ[۱۳۶]۔ اور دیکھو جب نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اس کا بھی مذاق بناتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے[۱۳۷]۔ ان سے کہو کہ اے اہلِ کتاب تم جس چیز کا ہم سے انتقام لینا چاہتے

ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور جو کچھ ہم سے پہلے نازل ہوئی ہم اسے بھی مانتے ہیں، اور تم میں اکثریت فاسقوں کی ہے۔[۱۳۹] اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کروں جن کا انجام خدا کے یہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے، وہ جن پر خدا نے لعنت کی جن پر خدا کا غضب ٹوٹا جن میں سے بندر اور سؤر بنا دیئے گئے، جنہوں نے شریر قوتوں کی بندگی کی، یہی لوگ سب سے زیادہ بدتر درجے میں ہوں گے اور سب سے زیادہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوتے۔[۱۴۰] جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے حالانکہ وہ کفر لیے ہوتے آتے تھے اور کفر ہی لیے ہوتے واپس ہو گئے اور اللہ خوب جانتا

ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپاتے ہوتے ہیں[۱۴۱]۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کا مال کھاتے ہیں بہت بُری حرکات ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں[۱۴۲]۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے یقیناً بہت ہی بُرا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں[۱۴۳]۔

اخلاقی اور دینی زندگی کا انحطاط

اُمتوں میں جب اخلاق اور دین بگڑتے بگڑتے اس درجے پر آجاتے ہیں جس کی عکاسی ان آیات میں کی گئی تو پھر اہل ایمان کے لیے ان سے رفاقت کے تعلقات خود اہل ایمان کے لیے زہر بن جاتے ہیں۔ اُمت کی تعمیر فضائل اخلاق پر کرنے کے لیے رذائل کا جیتا جاگتا تصور تحریکوں کے سامنے رکھنا ناگزیر ہے۔ اہل ایمان میں اخلاق فضائل کو عام کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے ہیں تعلیم و عظ و نصیحت کے ذریعے کہیں کہیں اچھی اور بُری شخصیتوں کے ذریعے کہیں اس کے اچھے یا بُرے نتائج کو کھول کر اور کہیں اُمتوں کے اخلاق رذائل کا نقشہ اس طرح پیش کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس کو چھوڑنے اور فضائل کو اپنانے کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہودیوں کے اخلاق رذائل کا نقشہ پیش کیا اور ان کی ان شقاوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا خود یہودیوں کو بھی اعتراف ہے اور جو ان کے یہاں مسلّم روایتیں ہیں۔ مثلاً اللہ کے دین کا مذاق اڑانا، اور ان پر آوازے کسنا، احکامِ الٰہی کی نافرمانی کی وجہ سے ایک گروہ کا ملعون ہونا، ان کا ایمان و کفر کو یکجا کرنا، ظلم اور حرام خوری میں تیز گام ہونا۔ ان کے علماء اور مشائخ کا جھوٹ بولنے اور حرام کھانے میں بے باک ہونا۔ یہ وہ رذائل

ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے جن سے بچنے کا حکم اللہ نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں نافرمان ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا ہے اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی اور دنیوی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور سعادت و اقبال کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے یہودیوں کی اخلاقی اور دینی زندگی کا یہ نقشہ پیش کر کے اہل ایمان سے کہا ہے کہ کیا تم ان سے موالات کے خواہاں ہو۔ اور ان کی برائیاں اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہو۔ قرآن دراصل کسی شخص سے شخص کی حیثیت سے نفرت پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے یہاں یہودیوں سے ترک موالات کا حکم دینے کے بعد ان کے اعمال و اخلاق کا نقشہ پیش کیا ہے ورنہ قرآن میں شخصی، نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

۵۷۔ اے اہل ایمان تم ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق و تفریح بنا لیا ہے۔ یعنی اہل کتاب اور کفار کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ، اگر ایمان والے ہو تو متقیانہ سیرت اپناؤ۔ کفار سے مراد یہاں مشرکین ہیں جیسا کہ عطف سے ظاہر ہے۔ گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو موالات کفار سے منع فرمایا تھا۔ اس آیت میں ایک موثر انداز سے اسی ممانعت کی تاکید کی گئی ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے مذہب سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر طعن و استہزاء کرتے ہیں اور شعائر اللہ اذان وغیرہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو ان میں خاموش ہیں وہ بھی ان افعال شنیعہ کو دیکھ کر اظہار نفرت نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ کفار کی ان احمقانہ اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی فرد مسلم جس کے دل میں خشیت الٰہی اور غیرت ایمانی کا ذرا سا شائبہ ہو کیا ایسی قوم سے موالات اور دوستانہ راہ و رسم پیدا کرلے، قائم رکھنے کو ایک منٹ کے لیے گوارا کرے گا۔ اگر ان کے کفر و عناد اور عداوت اسلام کو بھی نظر انداز کر دیا جاتے تو دین قیم کے ساتھ ان کا یہ تمسخر و استہزاء ہی علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترک موالات ہے۔[1]

یہ گویا اہل کتاب اور دوسرے کافروں سے رفاقت و نصرت کے تعلقات ختم کرنے کے لیے یہ بات سمجھائی ہے کہ جو اہل کتاب اور کفار اس قسم کے رذائل کا شکار ہیں کہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ افسوس ہے کہ تم ان سے رفاقت کے تعلقات رکھو۔ تمہیں ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے ایمان میں بہت زیادہ حساس ہونا چاہیے۔ یہاں موالات کی ممانعت کے لیے یہود و نصاریٰ اور کفار کے اس گندے کردار کو کہ وہ مسلمانوں کے دین کا مذاق اڑاتے ہیں بطور بنیاد پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے عدم موالات کی علت یہی ہے اور یہ علت جہاں بھی موجود ہو وہ دوستی و رفاقت کے لائق نہیں بلکہ بغض و بیزاری اور علیحدگی کے لائق ہے۔ آخر میں ان کے جذبہ ایمان کو ابھارا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اس کا تقاضا پورا کرو۔ ایمان کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ان سے موالات چھوڑ دو۔

اذان کا مذاق اڑانا عقل سے محرومی ہے

۱۳۸۔ اور دیکھو جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے ہیں۔ یعنی جب اذان کہتے ہو تو وہ اس سے جلتے ہیں اور ٹھٹھا کرتے ہیں، جو ان کی کمال حماقت اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ کلمات اذان میں خداوند قدوس کی عظمت و کبریائی کا اظہار، توحید کا اعلان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیائے سابقین اور کتب سماویہ کے مصدق ہیں۔ ان کی رسالت کا اقرار، نماز جو تمام اوضاع عبودیت کو جامع اور غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے۔ اس کی طرف دعوت فلاح دارین اور اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے بلاوا ان چیزوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ پھر ان میں کون سی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے لائق ہو۔ ایسی نیکی اور صداقت وحق کی آواز پر مسخرا پن کرنا صرف اسی شخص کا کام ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک و بد کی قطعاً تمیز باقی نہ رہے۔ بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی جب اذان میں اشہد ان محمدا رسول اللہ سنتا تو کہتا قد حرق الکاذب جھوٹا جل گیا یا جل جاتے۔ اس کی نیت تو ان الفاظ سے جو کچھ ہو مگر یہ بات بالکل اس کے حسب حال تھی، کیونکہ وہ خبیث جھوٹا تھا اور اسلام کا عروج و شیوع دیکھ کر آتش حسد میں جلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک شب کوئی چھوکری آگ لے کر اس کے گھر میں آئی، وہ اور اس کے اہل و عیال سو رہے تھے۔ ذرا سی چنگاری نادانستہ اس کے ہاتھ سے گر گئی جس سے سارا گھر مع سونے والوں کے جل گیا اور اس طرح خدا نے دکھلا دیا کہ جھوٹے لوگ دوزخ کی آگ سے پہلے ہی دنیا کی آگ میں کس طرح جل جاتے ہیں۔ اذان کے ساتھ استہزاء کرنے کا ایک اور واقعہ صحیح روایات میں منقول ہے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد آپ حنین سے واپس ہو رہے تھے۔ راستہ میں حضرت بلال نے اذان

کہی - چند نو عمر لڑکے جن میں ابو محذورہ بھی تھے ، اذان کی ہنسی اور نقل اتارنے لگے - آپ نے سب کو پکڑ بلوایا - آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ابو محذورہ کے دل میں خدا نے اسلام ڈال دیا اور حضور نے ان کو مکہ کا مؤذن مقرر فرما دیا ، اس طرح خدا کی قدرت نقل سے اصل بن گئی ۱؎

الجصاص نے لکھا ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ نماز کے لیے بلانے کی خاطر اذان ہوتی تھی اور زمخشری رقمطراز ہیں کہ اس آیت کے ذریعے اذان قرآن سے ثابت ہے اور اس آیت سے صرف یہی نہیں کہ اذان کا ہونا معلوم ہوتا ہے بلکہ اذان کے عظیم شعائر دین میں سے ہونا بھی معلوم ہو رہا ہے - اذان کا آغاز کیسے ہوا ، کب ہوا ، یہ ایک متذکرہ بحث ہے - ان شاء اللہ اس پر ۲۸ جلد میں سورہ جمعہ میں سیر حاصل بحث ہوگی - یہاں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھ لیجئے کہ اذان جس شکل میں موجود ہے اس کو امت کے تواتر قولی اور عملی کے ساتھ قرآن کی تصدیق و تصویب حاصل ہے -

شعیرہ ہونے کی حیثیت سے اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اسلامی ملک میں اس کا اظہار واجب کہا گیا اور اس شعیرہ پر تدغن قائم کرنے والوں سے قتال واجب بتایا ہے - بلکہ بعض مدارس فقہ نے تو اذان جمعہ اور عیدین کو ملک کے اسلامی مملکت ہونے کی علامت قرار دیا ہے -

کلمات اذان کا روحانی تاثر

اذان اسلام کے امتیازات خصوصی میں سے ہے - اس کی خوبصورتی کا اندازہ تقابل سے ہوتا ہے عبادت سے اعلان دعوت کا ایسا ڈھنگ کہیں نہیں ہے ۔ اس کی عمدگی یہ ہے کہ یہ عبادت کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ بجائے خود بھی عبادت ہے - اس کے کلمات میں ایک خاص منطقی ربط ہے - جب موذن چار بار اللہ اکبر کہتا ہے تو سننے والے سن کر چونک جاتے ہیں اور موذن کا حیرت سے منہ تکنے لگتے ہیں اور ان کی حیرت موذن کے لیے ایک سوالیہ فقرہ بن جاتی ہے گویا پوچھ رہے ہوں کہ اگر وہ سب سے بڑا ہے تو ہم کیا کریں موذن فوراً جواب دیتا ہے اور زور دے کر دوبارہ کہتا ہے کہ اشہد ان لا الہ الا اللہ سننے والے یہ سن کر سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ بات بڑے پتے کی ہے اور اونچی ہے مگر اے منادی کا تجھے کس نے بتائی ہے موذن سننے والوں کے چہروں سے سوال پڑھتا ہے اور جواب میں کہتا ہے اشہد ان محمد رسول اللہ سننے والے یہ سن کر پھر مجسم سوال بن جاتے ہیں اور گویا پوچھ رہے ہیں کہ کہیں

۱؎ ملفوظات شیخ الاسلام

کیا کرنا چاہیے موذن فوراً کہتا ہے حی علی الصلاۃ موذن اس کہنے کے ساتھ سننے والوں کے ضمیر و دماغ میں یہ سوال ابھرنے لگتا ہے کہ نماز میں ہمیں کیا ملے گا کہ موذن کہتا ہے حی علی الفلاح اب سننے والوں کے قدم ایک غرض مند کے قدم بن کر اٹھنے والے ہوتے ہیں کہ موذن اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کو دہرا کر اس کی نفسیات کا علاج کرتا ہے کہ قدم بے غرض ہو کر اٹھاکر انمازی اب اس تاثر سے دب کر نماز کی طرف جاتا ہے کہ

ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

لوگ اسی کا مذاق اڑاتے، نقلیں اتارتے، قرآن نے آخر میں کہا ہے کہ ان کی یہ حرکتیں محض بے عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو اہل ایمان سے اختلاف رکھنے کے باوجود ایسی ہلکی حرکتیں نہ کرتے۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کر سکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے منادی کرے تو اس کا مذاق اڑایا جائے۔

یہود کی یاوہ گوئی کی وجہ

۱۳۹- ان سے کہو کہ اے اہل کتاب تم جس چیز کا ہم سے انتقام لینا چاہتے ہو وہ اس کے سوا کیا ہے؟ کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ہم سے پہلے جو نازل ہوئی تھی ہم اسے بھی مانتے ہیں اور تم میں اکثریت فاسقوں کی ہے۔ کسی کام پر طعن کرنا مذاق اڑانا دو وجہ سے ہو سکتا ہے یا تو وہ کام ہی قابل استہزاء ہو یا کام کرنے والے کی حالت قابل استہزاء ہو۔ پچھلی آیت میں بتلایا گیا تھا کہ اذان کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بجز پرلے درجے کے احمق اور خفیف العقل کے کوئی شخص طعن یا استہزاء کر سکے۔ اس آیت میں اذان دینے والوں کے مقدس حالات پر بعنوان سوال متنبہ کیا گیا ہے۔ یعنی استہزاء کرنے والے جو غیر سے اہل کتاب اور عالم شرائع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ذرا سوچ کر انصاف سے بتائیں کہ مسلمانوں سے ان کو اتنی ضد کیوں ہے۔ اور کیا ایسی برائی وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں جو ان کے خیال میں لائق استہزاء ہو۔ بجز اس کے کہ ہم اس خدائے وحدہ لاشریک پر اور اس کی اتاری ہوئی تمام کتابوں پر اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں اور اس کے بالمقابل استہزاء کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ نہ خدا کی سچی اور صحیح توحید پر قائم ہیں اور نہ تمام انبیاء و رسل کی تصدیق و تکریم کرتے ہیں۔ اب تم ہی انصاف سے کہو کہ انتہا درجے کے نافرمان کو خدا کے

فرمانبردار بندوں پر آوازہ کسنے اور طعن وتشنیع کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے ؟[1]

اصل ارشاد میں "تنقمون" آیا ہے۔ یہ نقم سے بنا ہے نقم کے معنے انتقام لینا بدلہ لینا اور کسی پر غصہ کھا لینے کے ہیں۔ قرآن یہودیوں سے دریافت کر رہا ہے کہ تم ہم سے کس چیز کا انتقام لے رہے ہو یا کس بات پر ہم پر غصہ نکال رہے ہو۔ وجہ نزاع تو بتاؤ کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ ہم نے انبیاء ورسل کا انکار کر دیا ہے یا ہم ان کے نوشتوں کو نہیں مانتے، یا یہ ہے کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کی سچائی صرف ہمارے حصہ میں آئی ہے اور ہم سے پہلے سچائی سے سب محروم تھے! یا پھر ہم نے دین کے نام پر کوئی ایسی چیز پیش کر دی ہے جو تمہارے لیے انجان ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں تو اس ساری دشمنی کی علت اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہماری نیکی تمہارے لیے بدی بن گئی ہے۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے یہی نا کہ خدا کو مانتے ہوئے اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم سے پہلے اتاری گئی ہیں۔ یعنی تمہارے نزدیک ہمارا قصور یہی ہے نا کہ ہم ساری صداقتوں کو مانتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی مانتے ہیں اور قرآن کے ساتھ تورات وانجیل کو بھی مانتے ہیں برعکس اس کے تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں۔ نہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور نہ اس کتاب پر ایمان لانے کو تیار ہو جو ہم پر اتاری گئی ہے۔ اس طرح قرآن نے اس آیت میں یہودیوں کی بے راہ روی پر یہ کہہ کر مہر لگا دی ہے کہ تم ایمان کی بنا پر ہم سے ناراض ہو، حالانکہ اس میں غصہ اور ناراضگی کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں تمہارے لیے مذاق کا کوئی جواز ہے۔ قرآن نے یہ انداز بیان عرب بلغاء کے مطابق اختیار کیا ہے۔ علمائے بیان اسے تاکید المدح لمایشبہ الذم یا تاکید الذم لمایشبہ المدح کہتے ہیں۔ قرآن کی یہ آیت دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں ان کی کافرانہ زندگی پر طنز کے ساتھ نیکی کا مقابلہ بدی سے کرنے پر تعریض بھی ہے اور اکثریت کو فاسق کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جو اقلیت دولت ایمان سے مالا مال ہو چکی ہے وہ فاسق نہیں ہے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔ حافظ ابن جریر نے بحوالہ عبداللہ ابن عباس اس آیت کا جو پس منظر نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اولین مخاطب وہ یہودی علماء ہیں جنہوں نے قرآن کی آیت ایمان سننے کے بعد حضرت عیسیٰ کی نبوت پر اظہارِ ناراضگی کیا تھا۔ بلاشبہ آیت کا مصداق اول وہی ہیں اور اپنے عموم کے لحاظ سے ہر نا قوم اس کا مصداق ہے۔

یہود کی ملعونیت اور مغضوبیت

۱۴۰۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کر دوں جن کا انجام خدا کے یہاں فاسقوں کے انجام سے بدتر ہے۔ وہ جن پر خدا نے لعنت کی جن پر خدا کا غضب ٹوٹا جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے اور جنہوں نے شریر قوتوں کی بندگی کی یہی لوگ سب سے زیادہ بدترین درجہ میں ہوں گے اور سب سے زیادہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے۔ یعنی اگر ایمان باللہ پر مستقیم ہونا اور ہر اس چیز کی جو خدا کی طرف سے کسی زمانے میں نازل ہو چکی دل سے تصدیق کرنا ہی تمہارے زعم میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم ہے اور سب سے بڑی برائی ہے اور اسی وجہ سے تم ان کو مورد طعن و ملام بناتے ہو تو آؤ کہ میں تم کو ایک ایسی قوم کا پتہ بتلاؤں جو اپنی شرارت اور گندگی کی وجہ سے بدترین خلائق ہے جن پر خدا کی لعنت اور غضب کا اثر آج بھی نمایاں طور پر آشکارا ہے جس کے بہت سے افراد اپنی مکاری اور بے حیائی اور حرص دنیا کی سزا میں بندر اور سور بنائے جا چکے ہیں اور جس نے خدا کی بندگی سے نکل کر شیطان کی غلامی اختیار کر لی اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بدترین اور گمراہ قوم ہی اصلی معنے میں تمہارے طعن و استہزاء کی مستحق ہو سکتی ہے اور وہ خود تم ہی ہو۔ ؎

آیت میں لطیف اشارہ ہے خود یہودیوں کی طرف جن کی اپنی تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ بارہا وہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت میں مبتلا ہوئے، سبت کا قانون توڑنے پر ان کی قوم کے بہت سے لوگوں کی صورتیں مسخ ہوئیں۔ حتیٰ کہ وہ تنزل کی اس انتہا کو پہنچے کہ طاغوت کی بندگی تک انہیں نصیب ہوئی۔ بس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تمہاری بے حیائی اور جرأت بے باکی کی کوئی حد بھی ہے کہ خود فسق و فجور اور انتہائی اخلاقی تنزل میں مبتلا ہو اور اگر کوئی دوسرا گروہ خدا پر ایمان لا کر سچی دینداری کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہو۔

؎ افادات شیخ الاسلام

گویا ان سے کہا گیا ہے کہ تمہارے نزدیک تو اس دُنیا میں ہم سب سے بُرے ہیں اور اس وجہ سے ہم تمہارے غصّہ اور ناراضی کا نشانہ ہیں۔ لیکن کچھ پتہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اپنے انجام کے لحاظ سے سب سے بُرا کون ہے یہ وہ ہے جس پر اللہ کا غضب ہوا، جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس کو اللہ نے بندر اور خنزیر بنا دیا اور جس نے طاغوت کی پرستاری کی۔

من لعنہ اللہ ترکیب میں بشّر سے بدل ہے اور مضاف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی بشّر من ذالک مثوبۃ من لعنہ اللہ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی بدلے میں بدترین وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت ڈالی، اپنی رحمت سے دُور کر دیا، ان کے کفر اور معاصی میں انہماک کی وجہ سے ان پر ناراض ہوا، کچھ کو بندر اور کچھ کو سور بنا دیا۔ ایک تو یہ کہ واقع میں بندر اور سور بنا دیا جیسا کہ عام شارحین قرآن کا خیال ہے لیکن یہ رائے بھی سلف ہی سے منقول ہو کر آئی ہے کہ مسخ محض معنوی ہوا تھا۔ انسان کے عمل اور ارادے کے درمیان سے جب عقل و ارادہ کی کڑی غائب ہو جاتے اور وہ یکسر اپنی خواہشوں کا غلام بن کر رہ جاتے تو پھر اس کے اور حیوانات کے درمیان کوئی جوہری فرق باقی نہیں رہتا۔ یہ چیز اس کے باطن کو بالکل مسخ کر دیتی ہے اور باطن کے مسخ ہو جانے کے بعد ظاہر بھی بالتدریج مسخ ہو کے رہ جاتا ہے۔ جو نگاہیں حقیقت بیں ہوتی ہیں وہ سیرت کا عکس صورت میں بھی دیکھ لیتی ہیں۔ اگرچہ کچھ مفسرین نے اس کو مسخ معنوی ہی قرار دیا ہے مگر میرے قلب کا میلان قرآن کے اندازِ بیان کے پیشِ نظر یہی ہے کہ مسخ صوری تھا۔ قرآن میں لفظ جَعَلَ دو مفعول چاہتا ہے۔ اگر مفعول ثانی ایسی چیز ہو جو پہلے کے خلاف نہ ہو تو تعبیر میں کوئی بلاغت نہیں رہتی۔ مثلاً یوں کہیں جعل القردۃ قردۃ تو اس میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہاں یوں کہیں جعلھم قِرَدَۃً کہ اللہ نے ان کو بندر بنا دیا اور پھر سورہ بقرہ میں فجعلنٰھا نکالا میں بھی کوئی معنویت نہیں رہتی۔ جسمانی سزا پر تو نکال بولا جا سکتا ہے مگر عقائد و اخلاق فاسدہ تو خود سزا کا سبب ہیں نہ کہ سزا۔ بہرحال اصل یہی ہے کہ یہ مسخ صوری تھا اور جنہوں نے اسے معنوی کہا ہے یہ ان کی رائے ہے اور رائے کسی کی فہم قرآن میں کسی پر حجت نہیں ہے۔

عبد الطاغوت میں لفظ عبد فعل ماضی ہے اور اس کا پیوند عطف کے ذریعے من لعنہ اللہ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی وہ بھی انجام کے لحاظ سے بدترین ہو گئے اور دوسری قرأت میں اس کو عبد کی جمع بنا کر پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں عبد کا عطف لفظ والخنازیر پر ہو گا اور معنے ہوں گے کہ انہیں بندر سور اور پرستار شیطان بنا دیا۔ طاغوت کی

بندگی اور پرستاری خدا کے نزدیک اتنا بڑا سنگین جرم ہے کہ اس کو سزا کی جگہ میں پیش کیا ہے گویا فرمایا کہ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر طاغوت کی بندگی کی وہ انجام کی فکر کریں۔ ہمیں بُرا بھلا کہنے اور ہم پر لال پیلا ہونے سے ان کو کیا ملے گا۔

آخر میں فرمایا ہے اولٰئک شر مکانا واضل عن سواء السبیل اس کے دو حصے ہیں اور دونوں میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ پہلے حصہ میں ان کے آخرت میں انجام کا ذکر ہے اور دوسرے میں دُنیا میں ان کی بے راہ روی کو بتایا ہے گویا آخرت میں ان کے بدترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دُنیا کی زندگی میں گمراہ اور جادۂ حق سے ہٹے ہوئے تھے۔ مکان کو بُرا کہا گیا ہے مکان والوں کے بُرا ہونے سے گویا ان کی شرارت اس قدر عظیم ہے کہ اس سے جگہ بھی متاثر ہوگی۔

یہودیوں کا سازشی گروہ

۱۴۱۔ جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے حالانکہ وہ کفر لیے ہوئے آتے تھے اور کفر ہی لیے واپس ہو گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہوتے ہیں۔ یہاں ان ہی استہزاء کرنے والوں کے بعض مخصوص افراد کا بیان ہے جو غائبانہ تو مذہب اسلام پر طعن و تشنیع کرتے اور مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں سے ملتے تو ازراہِ نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے۔ حالانکہ شروع سے آخر تک ایک منٹ کے لیے بھی انہیں اسلام سے تعلق نہیں ہوا۔ نہ پیغمبر علیہ السلام کے ربانی وعظ و تذکیر کا کوئی اثر انھوں نے قبول کیا۔ کیا محض لفظ ایمان و اسلام زبان سے بول کر وہ خدا کو معاذ اللہ دھوکہ دے سکتے ہیں۔ اگر اس عالم الغیب والشہادت کی نسبت جو ہر قسم کے ضمائر و سرائر پر مطلع ہے۔ ان کا گمان یہ ہو کہ محض لفظی ایمان سے اسے خوش کر لیں گے تو اس سے بڑھ کر کون سی حرکت قابلِ استہزاء و تمسخر ہو سکتی ہے۔ گویا اس آیت سے یہود و نصاریٰ کے ان مضحکہ خیز افعال و حرکات کا بیان شروع ہوا جن پر متنبہ کیے جانے کے بجائے انہیں خود اپنا استہزاء کرنا چاہیے۔ [1]

یہ بھی یہودیوں کا ذکر ہے یعنی ان لوگوں کا جو اپنے کفریہ عقائد کے باوجود مسلمانوں کی مجلس میں آکر اپنے کو اہل ایمان میں سے ظاہر کرتے۔ مطلب یہ کہ یہ تو ان کا آپ سے دور ہو کر حال تھا اور جبکہ

[1] افادات شیخ الاسلام

آپ کے پاس آتے تو کہتے آمنا ہم بھی رسول پر اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ عام مسلمان ان کی باتوں سے دھوکہ میں آجاتے اور ان سے ایک قسم کے حسن ظن میں مبتلا ہو جاتے۔ قرآن نے یہاں ان کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اہل ایمان میں سے نہیں ہیں کیونکہ جس کفر کے ساتھ وہ آتے ہیں اسی کفر کے ساتھ واپس جاتے ہیں۔ ایمان نہ مجلس میں آتے وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ واپسی کے وقت۔ ایمان کا دعویٰ کر کے تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ خوب جانتا ہے۔

یہودی عوام اخلاقی جرائم کے خوگر ہیں

۱۴۲۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں اور مال حرام کھاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت بری حرکات کرتے ہیں۔ غالباً اثم سے لازمی اور عدوان سے متعدی گناہ مراد ہیں۔ یعنی ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ بہت شوق اور رغبت سے ہر قسم کے گناہوں کی طرف جھپٹتے ہیں، خواہ ان کا اثر اپنی ذات تک محدود ہو یا دوسروں تک پہنچے۔ جن کی اخلاقی حالت ایسی زبوں ہو اور حرام خوری ان کا شیوہ ہو، ان کی برائی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے یہ تو ان کے عوام کا حال ہے آگے خواص کا حال بیان ہو رہا ہے۔[1]

یہ یہودی عوام کی اخلاقی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی بڑی تعداد اثم اور عدوان اور حرام خوری میں حد سے زیادہ تیز گام ہے۔

اصل ارشاد میں یسارعون فی الاثم آیا ہے۔ مسارعت کے معنے تیز روی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گویا ان کے معاشرے میں ان برائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اور بھرپور محنت ہو رہی ہے اور مسارعت کے ساتھ قرآن میں الیٰ آتا ہے جیسے سارعوا الی مغفرۃ لیکن یہاں الیٰ نہیں بلکہ فی یہ بتانے کے لیے لایا گیا ہے کہ ان کے عوام اثم عدوان اور حرام خوری میں بالفعل مبتلا ہیں۔ اگر الیٰ آتا تو یوں سمجھا جاتا کہ ان برائیوں میں مبتلا نہیں بلکہ ان تک پہنچنے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ اثم اور عدوان میں ایک فرق تو وہی ہے جس کی نشاندہی شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ اثم سے لازمی اور عدوان سے متعدی گناہ مراد ہیں۔ لیکن

[1] فوائد شیخ الاسلام

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ یہ دونوں یکجا بھی آتے ہیں اور علیٰحدہ علیٰحدہ بھی، ویسے عدوان نام ہے ان کاموں کے کرنے کا جن سے اللہ پاک نے روکا ہے یا ان کاموں کے ذکر نے کا جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے لہٰذا ہر عدوان اثم ہے لیکن جب دونوں یکجا آئیں تو اثم نام ہے ان گناہوں کا جن کی جنس ہی حرام ہو جیسے جھوٹ، زنا، شراب نوشی اور عدوان نام ہے اس گناہ کا جس میں مقدار زیادت حرام ہو، ایک چیز کی مقدار مقررہ حلال ہے اس سے تجاوز کر کے زیادہ لینا عدوان ہے اور یہ تجاوز مال میں جان میں اور آبرو میں ہوتا ہے۔ آپ نے کسی کو دو گاجریں دی ہیں اب اس کے بدلے میں اس کے گاجروں کے ٹکڑے پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی دوات کسی سے ٹوٹ گئی ہے اس کے بدلے میں آپ اس کی تین دواتیں توڑ رہے ہیں۔ آپ کو کسی نے خبیث کہا ہے اس کے بدلہ میں آپ اس کو ماں بہن کی مغلظ گالیاں دے رہے ہیں۔ عدوان، حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں ہوتا ہے حلال بیوی کو چھوڑ کر حرام کی طرف قدم بڑھانا عدوان ہے۔ جسے یہاں عدوان کہا ہے اسی کو سورۃ اعراف میں بغی کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی عوام جھوٹ، زنا، شراب نوشی اور فوجداری، دیوانی اور اخلاقی جرائم میں بے لگام ہیں اور یہ جرائم ان میں اتنے عام ہیں اور سان کر ان میں اس قدر انہماک ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ پورا معاشرہ کبڈی کھیل رہا ہے اکلھم السحت میں سود، رشوت یا جبر اور مکر سے حاصل کی ہوئی ہر آمدنی داخل ہے۔ اگرچہ عدوان میں یہ داخل ہے مگر اس کی شناعت کی وجہ سے اسے علیٰحدہ ذکر کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس دعویٰ ایمان کو قطعاً بے وزن سمجھتا ہے جس کے ساتھ رات دن بھاگ دوڑ حق تلفی، تعدی اور حرام خوری کی راہ میں ہو رہی ہو۔

علماء و مشائخ کا کردار

۱۲۳۔ کیوں ان کے علماء و مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے۔ یقیناً یہ بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔ جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اس کے عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس کے خواص یعنی درویش اور علماء گرگے شیطان بن جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا یہی حال ہوا کہ لوگ عموماً دنیوی لذات و شہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کے قوانین و احکام کو بھلا بیٹھے۔ اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انہوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک

کر دیا کیونکہ دُنیا کی حرص اور اتباعِ شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے۔ مخلوق کا خوف یا دُنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا۔ اسی سکوت اور مداہنت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں۔

اسی لیے اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کو قرآن و حدیث کی بے شمار نصوص میں بہت ہی سخت تہدید و تاکید کی گئی ہے کہ کسی وقت اور کسی شخص کے مقابلہ میں اس فرضِ امر بالمعروف کے ادا کرنے سے تغافل نہ برتیں۔[1]

پہلی آیت میں یہودی عوام کا کردار پیش کیا تھا۔ اس آیت میں ان کے خواص یعنی علماء و مشائخ کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ عوام کا گناہ اگر یہ تھا کہ وہ گناہوں میں جھوٹ اور بے لگام ہو گئے تھے تو ان کے علماء و مشائخ کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو حرام خوری اور گناہوں کی گفتار سے کیوں نہ روکتے تھے عوام کا جرم یہ تھا کہ وہ منکرات میں مبتلا تھے اور ان کی ساری زندگی گناہ کی زندگی تھی اور ان کے علماء اور مشائخ کا جرم یہ تھا کہ سارے اختیارات کے باوجود وہ لوگوں کے اعمال پر کوئی گرفت نہ کرتے تھے۔ مجرم دونوں ہیں، عوام بھی کہ وہ گناہ کر رہے ہیں اور خواص بھی کہ وہ گناہوں کو روک نہیں رہے ہیں۔ لیکن تقابلی مطالعہ میں قرآن کا اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ بڑے مجرم علماء و مشائخ ہیں اسی بنا پر حافظ ابن جریر نے اس آیت کے بارے میں علماء کا یہ تاثر نقل کیا ہے کہ پورے قرآن میں علماء کو ڈانٹ والی آیت اس سے زیادہ سخت کوئی نہیں ہے۔ زمخشری نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت سخت ترین ہے اور مشہور تابعی ضحاک کہتے ہیں کہ پورے قرآن میں اس سے زیادہ خوفناک آیت کوئی نہیں ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں خلش ہو کہ ایسا کیوں ہے!

اس لیے کہ عوام اور خواص کے بارے قرآن کا اندازِ تعبیر مختلف ہے۔ عوام کی بدکرداری، بے ایمانی کو قرآن نے بدعملی لبئس ما کانوا یعملون کہا ہے جبکہ علماء کے کردار کو بدعملی نہیں بلکہ بدسازی اور بدکاری کہا ہے۔ اشارہ کیا ہے کہ علماء و مشائخ کا نہ روکنا صرف ان کے فرض کی ادائیگی سے تغافل نہ تھا بلکہ یہ ان کا پیشہ تھا اور اس میں وہ فن کار تھے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ علماء، مشائخ کے جرم پر صنعت کا لفظ بول کر ان کو جرائم کے مرتکب لوگوں سے زیادہ گنہگار بنا دیا گیا عوام اگر ارتکابِ جرم کر کے مجرم ہیں تو ان کے علماء اپنے کردار کی وجہ سے صرف مجرم نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ جرم پیشہ ہیں کوئی عامل صالح اور کوئی عمل صنعت اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عمل میں مشق و تمرین کے ذریعے فن کاری دا آ جائے ۔

شاید قرآن یصنعون کی تعبیر سے ان کے دینی اور دینی علوم میں کاروباری ہو لے کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔ اب تو یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی حلقوں اور اداروں کی تاریخ منضبط ہو چکی ہے اس پر نظر ڈالی جاتی تو قرآن کے لبئس ما کانوا یصنعون کی تفسیر میں بے شمار باتیں سامنے آئیں گی لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ بات قابل غور ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآری کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیتے اور اس کے فتوے دے کر انعام و اکرام لیتے ۔ حلال کو حرام بنا دینے اور حرام کو حلال بنا دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تورات کے کسی حکم سے انکار کر دیتے تھے بلکہ یہ ہے کہ اس کے حکموں کو توڑ مروڑ کر یا طرح طرح کے حیلے بہانے نکال کر ایسی صورتیں نکال لیتے کہ امیروں کی ہوائے نفس پوری ہو جائے ۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا
قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ ۱۱
كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ
وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ
كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي
الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَوْ أَنَّ
أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَ
لَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ
وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ
سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾

اور یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ [۱۴۴]

انہی کے ہاتھ بندھ جائیں اور ان کے کہنے کی وجہ سے ان پر
لعنت پڑ گئی[۱۴۵]۔ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں[۱۴۶] خرچ
کرتا ہے جیسے چاہتا ہے[۱۴۷]۔ اور خدا کی طرف سے جو کچھ تم پر
نازل ہوا ہے یہ ان میں سے بہتوں میں سرکشی اور کفر میں
اضافہ کا سامان ہو گا[۱۴۸]۔ اور ہم نے ان کے درمیان روز قیامت
تک عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے[۱۴۹]۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ
سلگاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈی کر دیتا ہے اور یہ لوگ زمین
میں فساد برپا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اللہ فساد
کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے[۱۵۰]۔ اور اگر یہ اہل کتاب
ایمان لے آتے اور متقیانہ سیرت اختیار کرتے تو ہم ان کی
برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ہم ان کو نعمت کے باغات
میں پہنچا دیتے[۱۵۱]۔ اور اگر یہ لوگ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو

اور اس کو جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر نازل ہوا ہے تو ضرور وہ بہرہ مند ہوتے اس رزق سے جو اوپر سے برستا اور ان کے قدموں کے نیچے سے اُبلتا[۱۵۲]۔ ان میں کچھ لوگ میانہ رو بھی ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ کرتے ہیں بُرائی ہی بُرائی ہے[۱۵۳]۔

داستان شقاوت کی ایک اور تصویر

ہر دعوت کے ابتدائی دور کی طرح اسلام کا ابتدائی زمانہ بھی تنگی اور سختی کا زمانہ تھا۔ اور اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے مال کی ضرورت برابر پیش آتی رہتی تھی۔ منافقوں پر یہ بات شاق گزرتی تھی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ وہ کہتے کہ یہ جو بار بار خدا کے نام پر مال طلب کیا جا رہا ہے تو کیا خدا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور محمد بن اسحاق نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے اسی زمانہ کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر ایک روز یہود کے بیت المدراس میں گئے وہاں بہت سے یہودی اپنے بڑے عالم فنحاص کے گرد جمع تھے۔ فنحاص کے ساتھ ان کا ایک اور بہت بڑا عالم بھی موجود تھا جس کا نام اشیع تھا۔ حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ اے فنحاص تو اللہ سے ڈر اور اسلام قبول کرلے تو خوب جانتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تمہارے پاس اللہ کی جانب سے حق لے کر آئے ہیں۔ اور آپ کی صفات تم تورات و انجیل میں پاتے ہو۔ اس پر فنحاص نے کہا کہ مجھ کو ایسے اللہ کی کوئی ضرورت نہیں جو فقیر ہے اور ہم سے قرض مانگتا ہے۔ یہ بات غالباً اس لیے کہی کہ قرآن نے جب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی اور اس دعوت کے لیے یہ موثر انداز اختیار کیا ہے من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً تو یہود نے اسلام

اور قرآن کی تحقیر کے لیے اس دعوت کو مذاق بنا لیا۔ فنحاص کے اس کہنے پر کہ اللہ فقیر ہے۔ حضرت ابو بکر نے فنحاص کے منہ پر چپت مارا اور فرمایا کہ اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا۔ فنحاص کی اس بات کی یہود نے کوئی تکذیب نہیں کی تو گویا سب کی فنحاص کو تائید حاصل تھی اس لیے یہاں یہ بات سب کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ کچھ بزرگوں نے اس پس منظر سے ہٹ کر آیت کی تشریح کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ تورات کے بعد کوئی کتاب نہیں آسکتی اور نہ بنی اسرائیل کے بعد کسی دوسری قوم کو برکت و سعادت حاصل نہیں ہوسکتی ہے خدا کے خزانے میں سب کچھ ہے مگر اس کے ہاتھ بندھ گئے اب وہ کسی دوسری قوم کو برکت و سعادت نہیں دے سکتا۔ یہاں ان کی اسی شقاوت کی طرف اشارہ ہے اس طرح اس کی نسبت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ یہودی دنیا اسی کے قابل ہے۔

۶۴۔ اور یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہل کتاب کے قلوب ان کی شرارت، کفر و طغیان، بدکاری، حرام خوری وغیرہ کی ممارست سے اس قدر مسخ ہوگئے تھے کہ بارگاہ ربوبیت میں گستاخی کرنے سے بھی ان کو کچھ باک نہ ہوتا تھا خداوند قدوس کا احترام ان کے یہاں ایک معمولی انسان سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ حق تعالیٰ کی جناب میں بے تکلف ایسے واہی تباہی کلمات بک دیتے تھے جنہیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں کبھی یہ کہ ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء کبھی یہ الفاظ منہ سے نکالتے ید اللہ مغلولۃ۔ اس سے مراد یا تو وہی ہوگی جو ان اللہ فقیر سے تھی کہ خدا معاذ اللہ تنگدست ہوگیا اور اس کے خزانہ میں کچھ نہیں رہا۔ یا غل ید کنایہ ہے بخل و امساک سے۔ یعنی تنگدست تو نہیں مگر آج کل بخل کرنے لگا ہے العیاذ باللہ۔ بہر حال کوئی معنے ہوں اس کلمۂ کفر کا منشاء یہ تھا کہ جب تمرد و طغیان کی پاداش میں حق تعالیٰ نے ان طاعین پر ذلت و نکبت، ضیق عیش، بدحالی اور تنگ حالی مسلط فرما دی تو بجائے اس کے کہ اپنی سیہ کاریوں اور شرارتوں پر متنبہ اور نادم ہوتے اُلٹے حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخیاں کرنے لگے۔ شاید یہ خیال ہوا ہوگا کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد ہیں، خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے تھے۔ پھر کیا معاملہ ہونے لگا۔ آج بنی اسماعیل تو دنیا میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ زمینی فتوحات اور آسمانی برکات ان پر کشادہ ہو رہی ہیں اور ہم۔ بنی اسرائیل کہ خدا صرف ہمارا اور ہم اس کے تھے۔ اس طرح ذلیل و مغلوب اور خستہ حال ہو کر در بدر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہم تو وہی اسرائیل کی اولاد اور ابناء اللہ و احباء۔ آج بھی ہیں جو پہلے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا کے ہم اولاد اور محبوب تھے معاذ اللہ

اس کے خزانہ میں کمی آگئی یا آج کل بخل وامساک نے اس کا ہاتھ بند کر دیا ہے۔ احمق اتنا نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کے خزائن تو لامحدود اور اس کے کمالات غیر متبدل اور غیر متناہی ہیں۔ اگر معاذ اللہ اس کے خزانے میں کمی آگئی یا مخلوق کی تربیت واعانت سے وہ ہاتھ کھینچ لیتا تو دنیا کا نظام کسی طرح قائم رہ سکتا تھا اور جو روز افزوں عروج وفروغ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کا تم آنکھوں سے دیکھتے ہو یہ کس کے خزانہ اور دست کرم کا رہین منت ہوتا۔ لہٰذا تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا ہاتھ بند نہیں ہوا۔ البتہ گستاخیوں اور شرارتوں کی وجہ سے خدا کی جو لعنت اور پھٹکار تم پر پڑی ہے اس نے تمہارے حق میں خدا کی زمین باوجود ساری وسعتوں کے تنگ کر دی اور آئندہ اور زیادہ تنگ ہونے والی ہے۔ اپنی اتنی تنگ حالی کو خدا کی تنگدستی سے منسوب کرنا تمہاری انتہائی سفاہت ہے [1]

حضرت شیخ الاسلام نے غل ید کو بخل کے لیے کنائی زبان بتا کر جو تشریح کی وہ قرآنی سیاق وسباق اور لغت عرب کے بہت زیادہ قریب ہے۔ واقعی عربی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بندھے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطاء وبخشش سے اس کا ہاتھ رکا ہوا ہے یعنی اللہ معاذ اللہ بخیل ہے۔ غل ید اور بسط ید دونوں عربی میں بخل وسخاوت کے لیے بولے جاتے ہیں اسی سے قرآن میں یہ آیت ہے لا تجعل یدك مغلولة الی عنقك

وجہ اس کی یہی ہے کہ ہاتھ اکثر کاموں میں بطور آلہ استعمال ہوتا ہے بالخصوص دولت کے دینے اور خرچ کرنے میں۔ سبب بول کر مسبب مراد لیتے ہیں۔ اسی لیے سخی کو فیاض الکف مبسوط الید اور بخیل کو کز الید صالح اور مقبوض الکف کہتے ہیں۔ لہٰذا یہود کے اس کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے چونکہ یہودی نحوستِ بخت میں مبتلا تھے اور اس کی گزشتہ عظمت محض ایک افسانہ پارینہ بن کر رہ گئی تھی جس کے پھر واپس آنے کا کوئی امکان انہیں نظر نہیں آتا تھا اس لیے بالعموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بیہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ خدا آخر بخیل ہو گیا ہے۔ اس کے خزانے کا منہ بند ہے۔ ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات ومصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ یہودیوں تک محدود نہیں۔ دوسری قوموں کے جہلاء کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے وہ جل جل کر اس قسم کی گستاخانہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

گستاخیوں کی پاداش میں لعنت

۱۴۵- انہیں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ان کے کہنے کی وجہ سے ان پر لعنت پڑی۔ یہ دعا کے رنگ میں حیثیت گرتی ہے یا ان کی واقعی حالت کی خبر دی گئی ہے چنانچہ واقع میں بخل ومسک لے ان کے ہاتھ بالکل بند کر دیے تھے۔[1]

ان کی اس گستاخی پر لعنت اور پھٹکار ہے۔ اس فوری لعنت اور پھٹکار کی وجہ یہ ہے کہ یہود اللہ اور اس کی شان سے بے خبر نہ تھے وہ ہر چیز سے واقف تھے لیکن قرآن اور حضور انور کی عداوت میں ایسے اندھے بہرے ہو گئے کہ ان کو یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں حضرت مولانا تھانوی کی یہ نکتہ آفرینی بہت خوب اور اسلام میں تکفیر کے لیے قانونی موقف کی اچھی توضیح ہے کہ یہود کا یہ کہنا خواہ ان کے اعتقاد پر مبنی نہ ہو لیکن کلمہ کفر کا تلفظ بھی بلاضرورت اور بغیر تردید کے کفر ہی ہوتا ہے اسی لیے بما قالوا کو لعنوا کی علت بنایا گیا ہے۔ شاید اسی بنا پر فقہا نے ایمان میں زبان کے اقرار کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ اقرار کی ایمان میں حیثیت کیا ہے۔ ایک جماعت رکن کی حیثیت بتاتی ہے۔ اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک قسم کی تصدیق ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے اور ایک زبان سے۔ اقرار زبان کی تصدیق ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن اور دوسری شرط قرار دی جاتے یہ اور بات ہے کہ تصدیق قلبی رکن اصلی ہے یعنی کسی حالت میں یہاں تساہل برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اقرار رکن زائد یعنی بعض صورتوں میں یہاں اغماض وچشم پوشی کر لینا بھی ممکن ہے جیسا کہ اکراہ میں۔ شیخ ابو منصور ماتریدی الشیخ ابوالحسن اشعری اور امام نسفی کا میلان خاطر اقرار کی شرطیت کی طرف ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوت اسلام سے قبل ہی احکام اسلام کا نافذ کرنا تو غیر معقول ہے لیکن زبانی اقرار کے بغیر ہمارے پاس اسلام کی کوئی شہادت نہیں اس لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ اسلام کا وفادار شہری کہنے کے لیے اقرار کو شرط قرار دیا جائے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گویا ایمان و کفر دونوں کے لیے زبان کی گفتار معتبر ہے۔ اگر زبان سے اقرار کرتا ہے اور قلب سے تصدیق نہیں کرتا ہے، اور اگر زبان سے انکار کرتا ہے اور قلب سے تصدیق کرتا ہے تو پہلی صورت میں ہم مسلمان اور دوسری صورت میں کافر تسلیم کریں گے جیسے گفتار ایمان کے لیے شرط ہے ایسے ہی گفتار کفر کے لیے بھی شرط ہے۔

صفات باری کیف و کم سے بالا ہیں

۱۴۶ - اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے ان آیات پر جو فائدہ لکھا ہے اس میں دو ہاتھوں سے مراد مہر اور قہر کا ہاتھ لیا ہے۔ یعنی آج کل مہر کا ہاتھ امت محمدیہ پر اور قہر . . . . کا بنی اسرائیل پر کھلا ہوا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیتوں میں اشارہ فرمایا[1] یہود اس حقیقت سے باخبر تھے کہ عربوں کو قرآن کا ملنا صرف قرآن ہی کا ملنا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ امامت اور سیادت بھی ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے اس حسد نے ان کو جناب الٰہی میں گستاخ بنا دیا۔ اسی کا جواب یہاں قرآن دے رہا ہے کہ اللہ کی ذات بخل کے شائبہ سے بھی پاک ہے اس کے جود و سخا اور کریمی و رزاقی برابر جاری ہے۔

یہاں اللہ سبحانہٗ کے لیے ید کے استعمال نے بہتوں کو چونکا دیا۔ زمخشری نے اپنی شان اعتزال کو باقی رکھنے کے لیے علی الاعلان کہہ دیا کہ اللہ سبحانہٗ کے لیے ہاتھ کا ثابت کرنا ٹھیک نہیں ہے اور زمخشری ہی کی پیروی میں اردو شارحین قرآن میں سے بعض نے بھی یہ بات لکھ دی کہ

> ید اللہ کے لفظ آ جانے سے حق تعالیٰ کے لیے اثبات ید کا قطعاً کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ (تفسیر ماجدی)

لیکن خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حضرت مولانا شیخ الاسلام عثمانی کو کہ وہ یہ مفید بات لکھ گئے۔

حق تعالیٰ کے لیے جہاں ہاتھ، پاؤں، آنکھ وغیرہ لفظ ذکر کی گئی ہیں ان سے بھول کر بھی یہ وہم نہ ہونا چاہیے کہ وہ معاذ اللہ مخلوق کی طرح جسم اور اعضائے جسمانی رکھتا ہے بس جس طرح خدا کی ذات اور وجود، علم، حیات وغیرہ تمام صفات کی کوئی نظیر، مثال اور کیفیت اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سوا بیان نہیں ہو سکتی۔

اے برتر از خیال و قیاس و گماں و وہم
از ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اسی طرح ان نعوت وصفات کو خیال کرو۔ خلاصہ یہ کہ جیسے خدا کی ذات بے چون و بے چگوں ہے اس کے سمع و بصر ید وغیرہ نعوت وصفات کے معانی بھی اس کی ذات اور شان اقدس کے لائق اور ہمارے کیف وکم اور تعبیر و بیان کے احاطہ سے بالکل وراء الوراء ہیں لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر۔ [1]

حافظ ابن عبدالبر شرح موطا میں رقمطراز ہیں کہ

اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاق ہے کہ قرآن وسنت میں حق تعالیٰ کے لیے جو صفات آئی ہیں وہ اپنے معنے حقیقی پر محمول ہیں معنے مجازی پر نہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ ان کی کیفیت اور کمیت سے بحث نہیں کرتے ہیں۔

اور قاضی ابو یعلی اپنی کتاب ابطال التاویل میں رقمطراز ہیں۔

ان احادیث کو جن میں صفات الٰہی کا چہرہ بیان ہوا ہے نہ رد کیا جا سکتا ہے اور نہ تاویل کی جا سکتی ہے۔ ظاہری پر محمول کرنا چاہیے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوقات میں سے ان صفات کے موصوفین اللہ کی ذات مشابہ نہیں ہے، اور تشبیہ کا کسی درجے میں بھی اعتقاد نہ ہونا چاہیے۔ صحابہ اور تابعین کا صفات کو ظاہر پر محمول کرنا اور کوئی تاویل نہ کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان کے یہاں تاویل پسندیدہ نہ تھی۔

اور امام ابوالحسن اشعری کتاب الابانہ میں فرماتے ہیں۔

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ اللہ کے دو ہاتھوں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو ہم جواب دیں گے کہ ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو قرآن کہتا ہے ید اللہ فوق ایدیھم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لا خلقت بیدی اور جو کچھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔

اور اس موضوع پر طویل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی ابوبکر الباقلانی نے الابانہ میں اور شیخ تقی الدین نے رسالہ مدنیہ میں اس پر لطیف بحث کی ہے۔ علامہ آلوسی نے سلف امت کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے اس میں مسلک تاویل نہیں مسلک تفویض کر اپنا نا سلامتی کی راہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن نے اس موضوع پر جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے درجہ کمال تک پہنچا دیتا ہے، دوسری طرف تعطیل سے بچا لیتا ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات اور افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کر دیتا ہے وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے اور سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسانوں کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں انہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں ہیں بل یداہ مبسوطتان لیکن یہ بھی صاف اور بے لچک کہتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں وہ عدیم المثال ہے لیس کمثلہ شیئ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا اس کا دیکھنا سننا جاننا ویسا نہیں ہو سکتا جس طرح کے دیکھنے سننے اور جاننے کا ہم تصور کر سکتے ہیں اس کا ہاتھ آنکھ چہرہ ضرور ہے لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں متشکل ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون انفاق

۶۴۱۔ وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ یعنی اس کو ہی خوب جانتا ہے کہ کس وقت کس پر کس قدر خرچ کیا جائے۔ کبھی ایک وفادار کو امتحان یا اصلاح حال کی غرض سے تنگی اور عسرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی اس کی وفاداری کے صلے میں نعمائے آخرت سے پہلے دنیوی برکات کے دروازے بھی کھول دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل ایک مجرم متمرد پر کبھی آخرت کی سزا سے پہلے تنگ حالی، ضیق عیش اور مصائب و آفات دنیوی کی سزا بھیجتا ہے اور کسی وقت دنیوی ساز و سامان کو فراخ کرکے مزید مہلت دیتا ہے کہ یا خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر اپنے فسق و فجور پر کچھ شرمائے یا اپنی شقاوت کا پوری طرح پیمانہ لبریز کرکے

انتہائی سزا کا مستحق ہو۔ ان مختلف احوال واغراض اور متنوع حکمتوں کی موجودگی میں کسی شخص کے مقبول یا مردود ہونے کا فیصلہ خدا کی اطلاع یا قرائن واحوال خارجیہ کی بنا پر کیا جا سکتا ہے جس طرح ایک چور کا ہاتھ کاٹتے ہیں یا ڈاکٹر کسی مریض کا ہاتھ کاٹے دونوں کی نسبت ہم احوال خارجہ اور قرائن سے سمجھ لیتے ہیں کہ ایک بطور سزا اور دوسرا بطور شفقت وعلاج کاٹا گیا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ان گستاخوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اب جو فیضان الٰہی سے تم محروم ہو چکے ہو اس کی وجہ نہ فیض میں کمی ہے اور نہ فیاض میں بخل ہے بلکہ اس کی اصل وجہ تمہارے اعمال ہیں ورنہ اس کا فیضان تو اس کی مشیت کے تابع ہے اس کی مشیت میں کوئی دخیل نہیں ہے۔ امتوں کی دوسری گمراہیوں کی طرح ایک فکری گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ اکثر نیک لوگوں کی بہ نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت بھی عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ یہودیوں کے سخن ابناء اللہ واحباؤہ سے مفہوم ہوتا ہے۔ قرآن نے یہاں اس دقیق غلطی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے۔ اس کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے۔ تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے تابع ہیں۔ اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں ہے لیکن یہودیوں نے اللہ کی مشیت میں اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ قرآن نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الٰہی کے علاوہ اور کوئی مشیت نہیں ہے۔ اور یہاں امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی بھی خوب ہے کہ اس آیت میں کھلے بندوں ان ارباب اعتزال کی بھی تردید ہو رہی ہے جو کہتے ہیں خدا پر مطیع کو ثواب دینا واجب ہے۔ خدا پر کوئی چیز واجب نہیں وہ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔

اسلام کی ترقی سے بیماری میں اضافہ

۱۴۸۔ اور خدا کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے یہ ان میں سے بہتوں میں سرکشی اور کفر میں اضافہ کا سامان ہوگا ان کی گستاخی کا جواب دیا جا چکا ہے لیکن قرآن کے ایسے معجزانہ جوابات سے ان معاندین اور سفہاء کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ کلام الٰہی سن کر شرارت اور انکار میں اور زیادہ ترقی کریں گے۔ اگر غذائے صالح ایک بیمار کے معدہ میں پہنچ کر اس کے مرض کو زیادہ کر دیتی

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے تو اس میں غذا کا قصور نہیں ہے مریض کے مزاج کی خرابی ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ کے پیغمبر اللہ سبحانہ آپ پر جو انعامات فرما رہا ہے یہ انعامات ہی آپ کے مخالفین یعنی یہود کے حق میں عذاب کا سامان ہو جائیں گے۔ اہل ایمان میں یہ انعامات اگر ایمان و عمل صالح میں ترقی کا ذریعہ ہیں تو اہل کفر میں یہی انعامات حسد کی آگ بھڑکائیں گے اور حسد کے نتیجے میں وہ کفر اور سرکشی میں بڑھتے جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کلام کو سن کر وہ کوئی مفید سبق لیتے اپنی غلطیوں اور غلط کاریوں پر متنبہ ہو کر ان کی تلافی کرتے اور اپنی گری ہوئی حالت کے اسباب معلوم کر کے اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان پر اس کا الٹا اثر یہ ہوا ہے کہ ضد میں آ کر انہوں نے حق وصداقت کی اور مخالفت شروع کر دی ہے۔ خیر و صلاح کے بھولے ہوئے سبق کو سن کر خود راست پر آنا تو درکنار ان کی الٹی کوشش یہ ہے کہ جو آواز اس سبق کو یاد دلا رہی ہے اسے دبا دیں تاکہ کوئی دوسرا بھی اسے سننے نہ پائے۔

یہودی اور عیسائی میں آگ پانی کا بیر ہے

۱۴۹۔ اور ہم نے ان کے درمیان روز قیامت تک عداوت اور دشمنی ڈال دی۔ اگرچہ قریب میں خاص یہود کا مقولہ ہے لیکن الیقینا بینہم سے مراد غالباً وہ اور ان کے بھائی سب ہیں یعنی یہود و نصاریٰ سب اہل کتاب کا حال بیان فرمایا ہے جیسا کہ پہلے اسی سورت میں گزرا۔ اور اگلی آیت میں بھی سب اہل کتاب کو خطاب فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جوں جوں ان کی شرارت اور انکار کو ترقی ہو گی اسی قدر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور منصوبے زیادہ باندھیں گے اور لڑائی کی آگ سلگانے کے لیے تیار ہوں گے لیکن ان کے آپس میں پھوٹ پڑ چکی ہے جو مٹ نہیں سکتی۔ اس سبب سے اسلامی برادری کے خلاف ان کی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔[1]

عام شارحین قرآن کی رائے یہی ہے کہ بینہم کی ضمیر کا مرجع یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔ ابن جریر نے امام مجاہد سے بھی نقل کیا ہے۔ ابن جریر کے علاوہ دوسرے شارحین نے الحسن البصری کی ہمنوائی بھی نقل کی ہے۔ زمانہ نبوت ہی میں نہیں آج بھی جرمن، انگلینڈ اور فرانس میں یہی حال ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ یہودیوں کے بارے میں ہے۔ چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> عیسائیوں کی طرح یہودی بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں اور مذہبی فرقہ بندی نے ہمیشہ کے لیے ان میں باہمی بغض و عناد کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔

حافظ ابن کثیر کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی یہ نکتہ آفرینی داد کے قابل ہے کہ

> تمہاری مخالفت اور تکذیب کے بعد بھی یہودی کبھی حق پر جمع نہ ہوں گے۔

اب جو دنیا میں اجتماعیت نظر آ رہی ہے یہ حق پر نہیں بلکہ باطل پر ہے روحانیت پر نہیں مادیت پر ہے۔ بہرحال تفسیریں دونوں ہیں اور قرآن کے الفاظ میں گنجائش ہے۔

اہل ایمان کو تسلی کہ یہود کامیاب نہ ہوں گے

۱۵۰- جب کبھی یہ جنگ کی آگ سلگاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈی کر دیتا ہے اور یہ لوگ زمین میں فساد بپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل اسلام میں جب تک باہمی محبت اور اخوت مستحکم رہے گی اور رشد و صلاح کے طریق پر گامزن ہو کر فتنہ اور فساد سے مجتنب رہنے کا اہتمام رہے گا جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھا۔ اس وقت تک اہل کتاب کی ساری کوششیں ان کے مقابلے میں بیکار رہیں گی۔[1]

یہ دراصل اہل ایمان کو تسلی ہے کہ اگرچہ عداوت اور حسد کے جوش میں یہ اندھے ہو رہے ہیں اور برابر تمہارے خلاف جنگ کی آگ بھڑکانے میں کوشاں رہیں گے مگر اللہ سبحانہ ان کو کوششوں کو کامیابی عطا نہیں کرے گا بلکہ جب بھی یہ آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ بجھا دے گا۔ اس طرح آگ بھڑکانا کنایہ ہے جنگ سے اور آگ بجھانا کنایہ ہے جنگ کی مدافعت سے۔ اس میں تاریخ کی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کفار نے جب بھی اہل ایمان پر چڑھائی کی ہے۔ اس میں یہود کی سازش کا ضرور تعلق رہا ہے۔ جمہور مفسرین اسے استعارہ کہتے ہیں اور کچھ اسے کنایہ کہتے ہیں۔ جو استعارہ کہتے ہیں وہ آگ کے روشن کرنے سے اہل ایمان کے خلاف سازش مراد لیتے ہیں اور جو کنایہ کہتے ہیں ان کی رائے میں آگ بھڑکانے سے جنگ مراد ہے۔ آلوسی کا فیصلہ یہ ہے کہ کنایہ والی بات زیادہ لطیف ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے ویسعون فی الارض فسادا کہ ان کا پیش نہاد اس کردار میں اخلاق و اعمال اور اجتماعی احوال و ظروف کی درستگی اور اصلاح نہیں بلکہ نرا فساد ہی فساد اور بگاڑ ہی بگاڑ ہے ان کی کوشش کا مقصد یہ ہے کہ اہل عرب میں افتراق کی جگہ اجتماعیت، نادانی اور جہالت کی جگہ علم و دانش اور شرک و بت پرستی کی جگہ توحید اور یگانہ خدا کی عبادت نہ آنے پائے تاکہ ان کی مصنوعی قیادت کا گھروندا قائم رہے اور اللہ روئے زمین میں مفسدین کو پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ اللہ کے تکوینی اور تشریعی نظام میں تصادم واقع ہوتا ہے جس سے زمین کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور اس سے ان فتنوں کو راہ ملتی ہے جن کی وجہ سے دنیا شیطان کی بازی گاہ بن جاتی ہے۔ اللہ سبحانہ کو دنیا کی صلاح و فلاح مطلوب ہے اس لیے وہ ان مفسدانہ کوششوں کو اسی حد تک پہنچنے کا موقع دیتا ہے جہاں تک اس کے قانون ابتلا کا تقاضا ہوتا ہے۔ اللہ کو پسند ان لوگوں کی جدوجہد ہے جو اس دنیا میں نظام حق و عدل کے علمبردار ہیں یہی چیز اس کائنات کے مجموعی نظام سے ہم آہنگ اور فطرۃ اللہ کے موافق ہے۔ اس وجہ سے وہاں کی جو حق و عدل کی شہادت کے تقاضے پورے کرتے ہیں مدد فرماتا ہے اور مفسدین کی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں اور جنگ آزمائیوں کے مقابلے میں ان کو فتحیاب کرتا ہے۔ اس آیت نے بتا دیا کہ دنیا میں قانون الٰہی کے نفاذ کی مخالفت کرنا خواہ وہ کسی عنوان سے ہو بہرحال اور بہرصورت فساد فی الارض ہے۔

اہل کتاب کو خاتم النبیین پر ایمان کی دعوت

۱۵۱ - اور اگر یہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور متقیانہ سیرت اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ہم ان کو نعمت کے باغات میں پہنچا دیتے۔ یعنی باوجود ایسے شدید جرائم کے اور حد شرارتوں کے اگر اب بھی اہل کتاب اپنے رویہ سے تائب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو دروازہ توبہ کا بند نہیں ہوا حق تعالیٰ کمال فضل و رحمت سے ان کو اخروی و دنیوی نعمتوں سے سرفراز فرما دیتا۔ اس کی رحمت بڑے سے مجرم کو بھی جب وہ شرمسار و معترف ہو کر آئے تو مایوس نہیں کرتی۔ [1]

اصل ارشاد آمنوا آیا ہے یہاں آمنوا کا مفعول محذوف ہے کچھ شارحین قرآن تو یہی کہتے ہیں کہ یہاں ایمان سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی اختیار کیا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن علامہ آلوسی نے سیاق و سباق کی رعایت سے آمنوا کا مفعول یہ بتایا ہے بما فی ضمنہم الایمان یعنی اگر وہ ایمان لے آتے جس کی ان سے نفی کی گئی ہے۔ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان داخل ہے لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ یہاں ایمان سے حضور ہی پر ایمان مراد ہے۔ سید رشید رضا اپنی مشہور تفسیر المنار میں فرماتے ہیں :

اگر اہل کتاب خاتم النبیین پر ایمان لے آتے اور تقلیداً سیرت اختیار کرتے یعنی ان خرابیوں اور ریشہ دوانیوں سے دامن بچا کر رکھتے جن کا ارتکاب بے ایمانی کی حالت میں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیتا اور ان کو اپنی نعمت کے باغوں میں داخل کرتا۔

علامہ زمخشری یہاں بھی چھپے اور چوٹ کر ہی گئے کہ ایمان میں عمل کے بغیر نجات کی ہرگز ضمانت نہیں ہے کیونکہ یہاں آمنوا کے ساتھ واتقوا بھی آیا ہے۔ صاحب انتصاف نے یہاں بھی موصوف کا اچھا تعاقب کیا ہے کہ اس پر معتزلہ اور اہل سنہ دونوں متفق ہیں کہ ایمان کی طاقت ماضی کی غلط کاریوں کو ختم کر دیتی ہے۔ قرآن میں ہے

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

اگر ایک شخص ایمان لاتے ہی موت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے تو سب کے نزدیک اس کی تکفیر سیئات ہو جائے گی پتہ چلا کہ دونوں کا اجتماع شرط نجات نہیں ہے۔

اہل کتاب کے ایمان کی آرزو

۱۵۲ - اور اگر یہ لوگ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو اور اس کو جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر نازل ہوا ہے تو ضرور وہ بہرہ مند ہوتے اس رزق سے جو اوپر سے برستا اور ان کے قدموں کے نیچے سے ابلتا۔ یعنی اگر تورات و انجیل کو اور قرآن حکیم کو جو تورات و انجیل کے بعد ان کی تنبیہ اور ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس کو قائم کرتے کیونکہ اس کے تسلیم کے بدون تورات و انجیل کی بھی صحیح معنے میں اقامت نہیں ہو سکتی بلکہ تورات و انجیل اور جملہ کتب سماویہ کی اقامت کا مطلب ہی اب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم جو کتب سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق بھیجے گئے ہیں ان کو قبول کیا جائے گویا اقامت تورات و انجیل کا حوالہ دے کر آگاہ فرما دیا کہ اگر قرآن کو انہوں نے قبول نہ کیا تو اس کے معنے یہی ہیں کہ اپنی کتابوں کے

قبول کرنے سے بھی منکر ہو گئے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو کھاتے یعنی تمام ارضی وسماوی برکات سے ان کو متمتع کیا جاتا اور ذلت وبدحالی اور ضیق عیش کی جو سزا ان کے عصیان وتمرد پر دی گئی تھی وہ اٹھا لی جاتی۔ [1]

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے ما انزل الیھم من ربھم کے بارے میں دو مختلف موقف اختیار کیے ہیں۔ ایک تو وہی ہے جس کی ترجمانی شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ ما انزل الیھم من ربھم سے مراد قرآن ہے اس کے قائم کرنے کے ساتھ تورات اور انجیل کے قائم کرنے کے حوالے سے مقصود ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس کو قائم کرنا صرف اسی کو قائم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت تورات اور انجیل سب کی تکمیل کرنے والی اور محافظ ہے، دوسرا یہ کہ اہل کتاب نے محض دُنیا کی متاع حقیر کے لیے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا اور تورات و انجیل کو برباد کیا اور اب اسی دُنیا کی محبت انہیں قرآن کے قبول کرنے سے مانع ہے۔ اگر یہ تورات و انجیل کو قائم کرتے اور اب اللہ کی اس آخری کتاب کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں شریک ہوتے تو آسمان و زمین دونوں ان کے لیے اپنے خزانے اگلتے۔

قائم کرنے سے مراد زندگی کے معاملات کا اللہ کی کتاب سے تعلق قائم کرنا ہے۔ یعنی لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے احکام و قوانین کے مطابق قائم کریں۔ اگر زندگی کتاب الٰہی سے بے تعلق ہو جائے تو چاہے زبان سے کتاب الٰہی کی مدح میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کی جاتی رہے کتاب الٰہی کو قائم کرنا ہے اور نہ اس قصیدہ خوانی سے کسی کو قوامین للہ کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

اس رائے کو بڑے بڑے جلیل القدر مفسرین کی ہمنوائی حاصل ہے حافظ ابن کثیر نے عبداللہ ابن عباس کی یہی رائے بتائی ہے۔ آلوسی، قرطبی، نسفی، ابن جریر، رازی اور نیشاپوری وغیرہ نے اسی کو اولیت دی ہے۔ رشید رضا، المراغی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ ما انزل الیھم من ربھم سے انبیاء بنی اسرائیل کی کتابیں جیسے کتاب اشعیا، کتاب حزقیل، کتاب حبقوق، کتاب دانیال وغیرہ مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی تورات و انجیل اور اپنے انبیاء کے دوسرے صحائف پر عمل کرتے اور ان میں بتائی ہوئی بشارتوں پر عمل کرتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مان لیتے تو بلاشبہ ہر قسم کی نعمتوں سے ہمدوش ہوتے۔ ابوحیان

[1] افادات شیخ الاسلام

نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ محاسن التاویل میں القاسمی کا رجحان بھی یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اسی تعلیم پر قائم رہتے جو ان کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رو گروہ پائے جاتے اور انہیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں ہے۔

میانہ رو اُمت

۱۵۳- ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو بھی ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں کہ جو کچھ بھی کرتے ہیں برا ہی برائی ہے۔ یہ وہ معدودے افراد ہیں جنہوں نے فطری سعادت سے توسط و اعتدال کی راہ اختیار کی اور حق کی آواز پر لبیک کہی۔ مثلاً عبداللہ بن سلام اور ملک حبشہ نجاشی وغیرہ[1] اصل ارشاد میں امۃ مقتصدہ آیا ہے اقتصاد قصد سے بنا ہے اس کے معنے عمل میں راہ اعتدال اختیار کرنے کے ہیں۔ فلاں اقتصد فی امرہ وہ اپنے معاملہ میں میانہ رو ہے۔ اس سے کون لوگ مراد ہیں، کچھ کی رائے ہیں وہ لوگ جو دین میں اعتدال کو اپناتے ہوتے تھے، نہ تو افراط کے ذریعے غلو کرتے اور نہ تفریط کے ذریعے اسے بیکار کرتے، کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو گئے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اُمت اعتدال پسند طبقہ سے خالی نہیں ہوتی لیکن اُمت کے زمانہ ارتقاء میں اس طبقہ کی بہتات ہوتی ہے اور زمانہ تنزل میں اور انحطاط میں یہ طبقہ قلیل ہو جاتا ہے۔ یہی اعتدال پسند طبقہ نبوت کی اصلاحی دعوت کا استقبال کرتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت میں مدینہ میں اہل کتاب کے اسی اعتدال پسند طبقہ نے اپنے عرب بھائیوں کے ساتھ مل کر حالات کے ہمہ گیر بگاڑ کے باوجود اسلام کو قبول کیا۔

اقتصاد یعنی اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ افراط و تفریط سے ہٹ کر نقطۂ اعتدال پر ہے۔ قرآن پاک میں اُمت مسلمہ کو اُمت وسطاً کا خطاب جن وجوہ سے دیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے اس لیے اس نے بیشتر معاملات میں اعتدال و اقتصاد اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے یہاں مزید تفصیل کا موقع نہیں ہے ۲۱ اور ۲۲ پاروں میں اس کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ
فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٦٧﴾ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ
حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ
وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا
وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا
وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت

کرے گا اللہ کافروں کو بامراد نہیں کرے گا[۱۵۴]۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم کچھ نہیں ہو جب تک تم تورات وانجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اب روانہ کیا گیا ہے قائم نہ کرو اور اے پیغمبر جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر اتارا گیا ہے وہ ان میں اور زیادہ سرکشی اور انکار کا اضافہ کرے گا آپ ان منکرین پر افسوس نہ کریں[۱۵۵]۔ بلاشبہ اہل ایمان ہوں یا یہودی اور صابی اور نصاریٰ کوئی ہو جو کوئی بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا اور نہ کسی طرح کی غمگینی[۱۵۶]۔

پوری دنیا کو اسلام کی دعوت

ان آیات اور بعد کی آیات میں یہودی و نصاریٰ کی دینی حیثیت پر آخری ضرب لگائی جا رہی ہے اور عین اس وقت لگائی جا رہی ہے کہ جب وہ پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ مسلمان ان کی دینی حیثیت تسلیم کر لیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پورے عرب میں اسلام کی اپوزیشن مدینے میں آنے کے بعد یہودیوں کی طاقت تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے

ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مضبوط قلعے تھے۔ فن جنگ سے واقف تھے۔ سامان اور اسلحہ وافر رکھتے تھے دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر قبضہ تھا۔ عرب کے تمام مادی فلاتع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے۔ قرآن نازل ہوا اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا۔ اس لیے انھیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں ابھر کر ان کو بنیاد سے اکھاڑ دے گی۔ چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک تیماء، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمیندار سوداگر، مہاجن، اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں، اور دین توحید کے مقابلے میں انہوں نے اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب اور غطفان کے معرکے پیش کیے۔ عرب کے سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں تھیں۔ عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کی شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا۔

یہاں قاضی عبدالجبار الہمدانی ۴۱۵ھ میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب تثبیت دلائل النبوۃ میں بڑی مفید بات لکھ گئے کہ:

> مدینہ میں حضور انور کی تشریف آوری کے بعد یہود اوس اور خزرج قبیلوں کے پاس چل کر آتے اور پوچھتے کہ تم نے اس شخص کو یعنی حضور انور کو نبی مان کر اپنے خلاف پوری دنیا کا چیلنج قبول کیا ہے۔ یہی بات اوس و خزرج سے عیسائیوں نے بھی کہی اور ان کو عرب میں نصاریٰ کی طاقت سے ڈرایا اور ساتھ ہی روم کے شاہی طاقت کے اندیشے کا بھی ذکر کیا ــــــ ادھر مکہ والے یہود و نصاریٰ کو انگیخت دے رہے تھے کہ کسی نہ کسی صورت سے حضور انور کو قتل کر دیا جائے۔ ایک طرف اوس و خزرج کو باہم ٹکرانے کی سازشیں کر رہے تھے۔ دوسری طرف ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے ــــــ یہود کی مدینہ، حجاز اور جزیرہ عرب میں بہت بڑی تعداد تھی، ان کی بستیاں تھیں، ان کے قلعے تھے، ان کے پاس سامان جنگ کی فراوانی تھی۔ ان کے بادشاہوں سے تعلقات تھے اور عرب کے نصاریٰ ان سے بھی زیادہ طاقتور تھے اور ان کی عددی طاقت بھی یہودیوں سے زیادہ تھی۔
>
> تثبیت دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۴۰۲

یہاں نبوت کا ان ہی دونوں طاقتوں سے مقابلہ ہے۔ قرآن نے ان کے بھی مقابلہ میں اپنے

پیغمبر سے کہا اور یا ایہا الرسول کے عنوان سے مخاطب کر کے فرمایا کہ اب ڈنکے کی چوٹ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجئے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے۔ آپ کے مقابلہ میں کفر ہرگز کامیاب نہ ہوگا۔

۱۵۴۔ اے رسول تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ اس کو اچھی طرح پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغام نہیں پہنچایا اور ان لوگوں سے تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ کافروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ پچھلی آیات میں اہل کتاب کی شرارت اور نیسہ کاریوں کا ذکر کر کے تورات و انجیل اور قرآن اور کل کتب سماویہ کی اقامت کی ترغیب دی گئی تھی۔ آئندہ قل یا اھل الکتاب لستم علی شیئ الخ سے اہل کتاب کے مجمع میں اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اس اقامت کے بغیر تمہاری مذہبی زندگی بالکل صفر اور لاشے محض ہے یا ایہا الرسول بلغ میں اسی دو ٹوک اعلان کے لیے حضور کو تیار کیا گیا ہے۔ یعنی آپ پر جو کچھ پروردگار کی طرف سے اتارا جائے خصوصاً اس طرح کے فیصلہ کن اعلانات آپ بے خوف و خطر اور بلا تامل پہنچاتے رہیے اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول ہونے کے رسالت و پیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔ بلاشبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فریضہ تبلیغ کی انجام دہی پر بیش از بیش ثابت قدم رکھنے کے لیے یا ایہا الرسول سے بڑھ کر کوئی موثر عنوان نہ ہو سکتا تھا۔ آپ نے بیس بائیس سال تک جس بے نظیر اولوالعزمی، جانفشانی مسلسل جدوجہد اور صبر و استقلال سے فرض رسالت و تبلیغ کو ادا کیا۔ وہ اس کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر اپنے فرض منصبی کی اہمیت کا احساس ہے۔ حضور کے اس احساس قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے حالات کے تحت وظیفہ تبلیغ میں مزید استحکام و تثبیت کی تاکید کے موقع پر موثر ترین عنوان یہی ہو سکتا تھا کہ حضور کو یا ایہا الرسول سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرض محال تبلیغ میں ادنیٰ سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کی تمام کوششوں کا مقصد وحید ہی یہ تھا کہ آپ خدا کے سامنے فرض رسالت کی انجام دہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائیں لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذرا سی کوتاہی کریں۔ عموماً یہ تجربہ ہوا ہے کہ فریضہ تبلیغ ادا کرنے میں انسان چند وجوہ سے متفکر رہتا ہے یا تو اسے اپنے فرض کی اہمیت کا کافی احساس

نہیں ہوتا یا لوگوں کی عام مخالفت سے نقصان شدید پہنچنے یا کم ازکم بعض مفادات کے خطرے میں پڑ جانے کا خوف ہوتا ہے اور یا مخاطبین کے عام تمرد و طغیان کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ پچھلی اور اگلی آیات میں اہل کتاب کی نسبت بتلایا گیا ہے۔ تبلیغ کے مثمر اور منتج ہونے سے مایوسی ہو۔ پہلی وجہ کا جواب یا ایھا الرسول سے فما بلغت رسالتہ تک ہے دوسری کا واللہ یعصمک من الناس میں ہے اور تیسری کا ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ میں ہے۔ یعنی اپنا فرض ادا کیے جاؤ اللہ تعالیٰ آپ کی جان اور عزت وآبرو کی حفاظت کرنے والا ہے وہ تمام روئے زمین کے دشمنوں کو بھی آپ کے مقابلے میں کامیاب نہیں کرے گا۔ باقی ہدایت وضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی قوم جس نے کفر و انکار ہی پر کمر باندھ لی ہے۔ اگر راہ راست پر نہ آئی تو غم نہ کرو اور نہ مایوس ہو کر اپنے فرض کو چھوڑو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت ربانی اور امین آسمانی کے موافق امت کو ہر چھوٹی بڑی چیز کی تبلیغ کی۔ نوع انسانی کے خواص وعوام میں جو بات جس طبقہ کے لائق اور جس کی استعداد کے مطابق تھی۔ آپ نے بلا کم وکاست اور بے خوف وخطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کر دی۔ اور وفات سے دو ڈھائی ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں چالیس ہزار سے زیادہ فدایان اسلام اور عاشقان رسول کا اجتماع تھا۔ آپ نے علی رؤس الاشہاد اعلان فرمادیا کہ۔

"اے خدا گواہ رہ میں تیری امانت پہنچا چکا ہوں،" [1]

سلاطین ورؤسا کو دعوت اسلام

پہلے سن چکے ہو کہ سورہ مائدہ کا نزول سنہ کے اواخر یا سنہ کے اوائل میں ہوا ہے اس سورت کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت تغیر واقع ہو چکا تھا۔ اب اسلامی اصول اور نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق معاشرت تمدن ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممتاز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نماز باجماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین دیوانی وفوجداری بڑی حد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مکمل تفصیل کے ساتھ بن چکے ہیں اور اسلامی عدالتوں کے ذریعے نافذ ہو رہے تھے۔ لین دین اور خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا نکاح اور طلاق نے قوانین زنا اور قذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا میں اس طرف سے قطعاً مایوسی ہو چکی تھی کہ یہ لوگ جن کا اپنا تمدن بن چکا ہے پھر کبھی ان میں آ ملیں گے۔ اس موقع پر قرآن نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ کا پیغام صرف عرب کے لیے نہیں پوری کائنات انسانی کے لیے ہے۔ اس کے ہر پہلو کی حیثیت عالمی اور آفاقی ہے۔ اور یہ عالمیت و آفاقیت اصل پیغام کے عالمگیر اور آفاق گیر ہونے کی روشن ترین دلیل ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں قرآنی تاریخ کی روشنی میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ معاہدہ حدیبیہ کے بعد جب آپ مدینہ منورہ پہنچے تو آپ کو قرآن نے حکم دیا کہ آپ اس پیغام کو پورے عالم میں پہنچایئے اور تمام طاقتوں کو دعوت دیجئے۔ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک چنانچہ محرم ۷ھ کو اسی ارشاد کی تعمیل میں چھ دعوت نامے تیار کیے گئے۔ چونکہ اواخر محرم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر روانہ ہو گئے تھے اس لیے اغلب یہی ہے کہ دعوت نامے اوائل محرم میں روانہ کیے گئے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھا ہے کہ ۷ھ کے محرم کی پہلی تاریخ تھی۔ یعنی ۱۱ مئی ۶۲۸ء۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیل الگ الگ یہ ہے۔

نجاشی شاہ حبشہ کے نام مکتوب

سب سے پہلا گرامی نامہ اصحمہ شاہ حبش کے نام تھا جس کا لقب نجاشی ہے۔ یہ والا نامہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔ اس کے آغاز میں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی کیفیت قرآنی نقطہ نظر سے ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی تھی جس حصے کا تعلق تبلیغ سے ہے وہ یہ ہے،

> میں تجھے اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اس کی فرمانبرداری پر موالات کی دعوت دیتا ہوں اور اس بات کی کہ تو میری پیروی کر اور اس تعلیم پر ایمان لا جو میرے پاس آئی ہے۔ میں اللہ کا رسول ہوں تجھے اور تیری فوجی طاقت کو اللہ سبحانہ، عز و جل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں یہ پیغام پہنچا چکا ہوں اور نصیحت کر چکا میری نصیحت کو قبول کرو، سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کا پیرو کار ہو۔

نجاشی نے بے تامل اسلام قبول کیا اور اپنے جوابی معروضے میں لکھا کہ یا رسول اللہ آپ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے میں زمین و آسمان کے پروردگار کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حضرت مسیح رتی بھر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ آپ کے عم زاد بھائی اور ان کے رفیق ہمارے مقرب ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

قیصر روم کے نام والا نامہ

دوسرا دعوت نامہ ہرقل قیصر روم کے نام تھا۔ اس کے لیے دحیہ ابن خلیفہ الکلبی کو قاصد یا سفیر مقرر کیا گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عام مکاتیب گرامی کی طرح یہ مکتوب گرامی بھی تکلف سے پاک اور مبرا اور صرف مطلب پر مشتمل تھا۔

> میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر لے ساری آفات سے محفوظ ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دوگنا اجر دے گا اور اگر روگردانی کی تو تیرے سارے شہریوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔ اور اے اہل کتاب اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ کر اس بات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی انسان سے ایسے برتاؤ کا روادار نہ ہوگا گویا خدا کو چھوڑ کر اسے رب بنا لیا۔ پھر اگر اس سے روگردانی کر دگے تو گواہ رہو کہ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں یعنی اسی کو ماننے والے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کو تاکید فرمائی تھی کہ یہ خط حاکم بصریٰ کے ذریعے پیش کیا جائے۔ حضرت دحیہ نے اسی ہدایت پر عمل کیا۔ قیصر اس زمانے میں بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ دحیہ نے مکتوب گرامی حارث غسانی حاکم بصریٰ کی وساطت سے قیصر کے پاس بھجوایا۔ ہرقل اس سے متاثر ہوا جو لوگ عرب کے حالات سے واقف تھے ان سے بھی مختلف باتیں دریافت کیں۔ اتفاق سے وہاں ابوسفیان ایک قافلے کے ساتھ تجارت کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ قیصر نے ابوسفیان سے گفتگو میں بہت سے سوالات کیے۔ اس وقت تک ابوسفیان قریش مکہ کا لیڈر تھا۔ اس کے باوجود وہ کوئی بات ایسی نہ مل سکی جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بطور الزام پیش کر سکتا۔ قیصر کو بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا پختہ یقین ہو گیا۔ پھر اس نے رومیہ کے حاکم اور اسقف ضغاطر کے نام ایک خط دحیہ کو دے کر بھیجا کہ اس کی رائے معلوم کرے۔ ضغاطر کے نام ایک خط حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھی دیا تھا۔ ضغاطر نے رسول اللہ کی رسالت کی تصدیق کی لیکن قیصر یا درباریوں کی مخالفت سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اسلام کے قبول کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے نام

تیسرا دعوت نامہ ایران کے مشہور شہنشاہ خسرو پرویز کے نام تھا، جو فرہاد و شیریں کے سلسلے میں ہمارے فارسی اور اردو ادبیات کی ایک معروف شخصیت بنا ہوا ہے۔ یہ بھی دوسرے دعوت ناموں کی طرح نہایت سادہ اور مختصر تھا جسے ذیل میں من وعن درج کیا جاتا ہے:

> اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے۔ اللہ کے رسول محمد (صلعم) کی طرف سے کسریٰ کے نام جو ایران کا حکمران ہے۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، جسے پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ جو لوگ زندہ ہیں انہیں بدعملیوں کے نتائج سے ڈرایا جائے، اسلام قبول کر ورنہ پوری مجوسی قوم یعنی اس وقت کے اہل ایران کا وبال تیری گردن پر ہو گا۔

یہ دعوت نامہ لے جانے کے لیے عبداللہ بن حذافہ سہمی مقرر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تاکید فرما دی تھی کہ دعوت نامہ حاکم بحرین کے پاس لے جائیں اور اس کی وساطت سے کسریٰ کے دربار میں پیش کریں۔ عبداللہ بن حذافہ نے اس ہدایت پر حرفاً حرفاً عمل کیا۔ جب یہ خسرو کے دربار میں پیش ہوا تو وہ محض رسول اللہ کا اسم گرامی اپنے نام سے پہلے دیکھ کر مشتعل ہو گیا، کیونکہ ساسانیوں کے مقررہ آداب کے مطابق ساسانی شہنشاہ کا نام ہر حال میں پہلے آنا چاہیے تھا۔ عربوں کے طریق مکتوب نگاری کے مطابق کاتب اپنا نام پہلے اور مکتوب الیہ کا نام بعد میں لکھتا تھا اور یہی طبعی و فطری طریق تھا۔

پرویز کی سیہ نصیبی

پھر یہ سنہ ۶۲۳ء کا واقعہ ہے جب پرویز رومیوں پر غیر معمولی فتوحات کے بعد پے در پے شکستیں کھاتا ہوا اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے شدید تشویشات میں مبتلا تھا۔ ۱۲ دسمبر سنہ ۶۲۷ء کو نینوا میں آخری خوفناک شکست نے اس پر اک گونہ وحشت کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات ہر فرد کے احساسات میں غیر معمولی رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں اور وہ بھی معاملے کو معمولات و مروجات

کے رنگ میں دیکھنے کے قابل نہیں رہتا بلکہ ہر معاملے کو اس رنگ میں دیکھتا ہے گویا جو کچھ اس کے سامنے آرہا ہے وہ اس کی شکستوں، ہزیمتوں اور بے چارگیوں کے ہجوم میں دل ہر چیز کے کھلانے کے لیے ہو اہتمام خاص تیار کیا جارہا ہے۔ پرویز نے جوش غیظ و اشتعال میں نامہ مبارک کو چاک کر ڈالا، رسول اللہ کو یہ اطلاع ملی تو فرمایا، خدا اس کے اقتدار سلطنت کو پارہ پارہ کرے۔ یہی ہوا، پہلے پرویز کا ورق تقدیر ٹکڑے ٹکڑے ہوا، پھر وہ جس سلطنت کے عزو و شوکت میں نامہ مبارک چاک کرنے کی جسارت پر آمادہ ہوا تھا وہ تختہ قرطاس کی طرح پارہ پارہ کردی گئی۔

نامہ مبارک چاک کرنے کے بعد پرویز نے یمن کے نائب الحکومت باذان کو حکم دیا کہ حجاز کے مدعی نبوت کو ہمارے پاس بھیجا جائے۔ باذان نے دو آدمی ایک خط دے کر مدینہ منورہ بھیجے جن میں ایک کا نام قہرمانہ تھا۔ حضور انور خط دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، کل مجھ سے جواب لینا، وہ دوسرے روز حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

> "اپنے صاحب (باذان) کو یہ خبر پہنچا دو کہ اس کے رب (پرویز) کو میرے رب (اللہ تعالیٰ) نے قتل کر دیا۔" یہ واقعہ سہ شنبہ کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ (مطابق ۱۴ ستمبر ۶۲۸ء) کو پیش آیا۔ رات کی سات گھڑیاں گزری تھیں (یعنی دو گھنٹے اور اڑتالیس منٹ)

جب کسی قوم پر بدبختی کا دور آتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں اپنا سب کچھ برباد کر ڈالتی ہے۔ شیرویہ نے باپ یعنی خسرو کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ شکستیں کھا رہا تھا اور صلح کے لیے تیار نہ تھا۔ شیرویہ نے بادشاہ بنتے ہی رومیوں کی شرطیں مان کر صلح کر لی۔ شیرویہ نے باپ کو اس لیے قتل کیا ہوگا کہ عسکری اور کشوری سب لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ پھر شیرویہ نے خاندان کے ایک ایک مرد کو چن چن کر قتل کیا تاکہ کوئی مدعی سلطنت باقی نہ رہے۔ صرف وہی ایک دو بچے جو اس کی دسترس سے باہر تھے لیکن خود بھی چھ ماہ کے اندر اندر گناہوں کا گرانبار پشتارہ اٹھا کر اس عالم میں پہنچ گیا، جہاں محاسبہ نیک و بد سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں۔

والی مصر

چوتھا دعوت نامہ مقوقس کے نام تھا جو اسقف اعظم کے منصب پر فائز تھا۔ اور قیصر نے ۶۳۱ء میں اسے ملکی نظم و نسق کے لیے اپنی طرف سے نمائندہ بنا دیا تھا۔ اس دعوت نامے کے لیے

حاطب بن ابی بلتعہ نے لے کر آپ کو پیش کیا اور حضور انور نے فرمایا۔ "بارک اللہ فیک یا حاطب" (حاطب خدا تجھے برکت سے نوازے)۔ اس دعوت نامے کی عبارت بھی وہی تھی جو قیصر روم کے دعوت نامے کی تھی اور وہ اوپر نقل ہو چکا تھا۔

سیوطی نے "حسن المحاضرہ" میں لکھا ہے حاطب سکندریہ پہنچے تو مقوقس کشتی پر دریائے نیل میں سیر کر رہا تھا۔ حاطب نے بھی ایک کشتی کرایہ پر لے لی تاکہ نامہ مبارک جلد سے جلد مقوقس کے پاس پہنچ جائے۔ مقوقس نے پوچھا کہ اگر تمہارا نبی سچا ہے تو خدا سے یہ دعا کیوں نہیں مانگتا کہ اسے وطن سے نکالنے والے مخالفین تباہ ہو جائیں۔

حاطب نے بے توقف جواب دیا کہ آپ کے عقیدے کے مطابق یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی اور سولی ہی پر ان کی موت واقع ہوئی۔ انہوں نے خدا سے دعا مانگ کر دشمنوں کو ہلاک کیوں نہ کرا دیا؟

مقوقس نے جواب دیا کہ بے شک تو خود بھی دانا ہے اور جس کا تو سفیر ہے وہ بھی دانا اور حکیم ہے۔ پھر نامہ مبارک کو ہاتھی دانت کی دو تختیوں کے درمیان رکھوا کر سرکاری خزانے میں محفوظ کرا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عریضہ بڑے اچھے انداز میں لکھا۔ اس میں کہا کہ یہ تو مجھے علم تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن میرا گمان تھا وہ شام میں ظاہر ہو گا۔ ساتھ ہی حضور انور کی خدمت میں دو معزز قبطی لڑکیاں، قیمتی کپڑا اور ایک خچر بھیجا۔ یہی خچر دلدل کے نام سے مشہور ہے جو رسول اللہ کے بعد حضرت علی کے پاس رہا۔

لڑکیوں میں سے ایک حضرت ماریہؓ تھیں جو رسول اللہ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ تھیں۔ دوسری سیرین جسے حضور نے حضرت حسانؓ کے سپرد فرما دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دلدل جیسا خچر اس زمانے میں عرب کے اندر کوئی نہ تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اسے تحفۂ خاص کے طور پر بھیجا گیا۔

حاکم یمامہ

پانچواں دعوت نامہ ہوذہ بن علی حاکم یمامہ کے نام تھا۔ یہ سلیط بن قیس بن عمرو العامری کے ذریعے سے بھیجا گیا تھا۔ یمامہ آجکل دولت سعودیہ کا حصہ ہے۔ اس کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں نجد، مغرب میں حجاز و یمن، جنوب میں احقاف و ربع الخالی، مشرق میں عمان بحرین اور خلیج فارس، بحرین و یمن کی طرح یمامہ بھی ساسانیوں کے زیر اثر آگیا تھا لیکن ہوذہ اور اس کے

ہم قوم عرب تھے۔ ہوزہ کے نام جو دعوت نامہ بھیجا گیا وہ بہت مختصر تھا۔ آغاز میں فرمایا گیا تھا کہ دینِ اسلام عرب و عجم میں ہر جگہ پہنچے گا اور غالب رہے گا۔ پھر وہی دو لفظ تھے جو دعوت ناموں میں عموماً آتے یعنی اسلم تسلم، اسلام قبول کر لے تو محفوظ رہے گا۔

ہوزہ نے نامہ مبارک بھی پڑھا پھر حضورِ انور کے سفیر کی ایک نہایت پُرتاثیر تقریر بھی سُنی۔ یعنی یہ کہ تو ایک بڑی قوم کا سردار ہے، تیری توجہ سے تیری قوم ایمان کی سعادت کبریٰ حاصل کر سکتی ہے میں تجھے بہترین چیز یعنی اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیتا ہوں اور بدترین چیز یعنی کفر سے بچاتا ہوں۔ اللہ کی عبادت کے لیے کہتا ہوں اور شیطان کی عبادت سے روکتا ہوں۔

لیکن ہوزہ اسلام کی دولت سرمدی سے محروم رہا اور حضورِ انور فتح مکہ اور غزوہ حنین و طائف سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ پہنچے تو اطلاع ملی کہ ہوزہ فوت ہو گیا ہے۔ اس کی قوم کے ایک وفد نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا

حارث بن ابی شمر غسانی

چھٹا دعوت نامہ شجاع بن وھب اسدی کے ذریعے سے حارث بن ابی شمر غسانی کو بھیجا گیا۔ حارث کا مرکز دمشق تھا، مگر جب شجاع پہنچے تو حارث سخت مصروف تھا کیونکہ قیصر ہرقل بیت المقدس آ رہا تھا اور اس کے لیے جا بجا رسد اور استقبال کے انتظامات حارث ہی کے ذمے تھے۔ شجاع نے حارث کے ایک حاجب سے رابطہ استوار کر لیے۔ اس نے رسول اللہ کے متعلق حالات سُن کر اسلام قبول کر لیا، پھر دمشق کے ایک دربار میں نامہ مبارک پیش ہوا۔

اس میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ پر ایمان لے آ، وہ یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، تیرا ملک تیرے پاس محفوظ رہے گا۔ حارث نے کہا کہ میرا ملک مجھ سے کون چھین سکتا ہے! پھر قیصر کو لکھا کہ مجھے عرب پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ نیز گھوڑوں کی نعل بندی کا حکم دے دیا، پھر قیصر کی طرف سے جواب آیا کہ بالفعل یہ ارادہ ترک کر دو اور بیت المقدس پہنچو۔ پھر حارث نے ایک سو مثقال سونا شجاع بن وھب کو دینے کا حکم صادر کیا۔ حاجب نے جو خفیہ خفیہ مسلمان ہو چکا تھا زادِ راہ اور پارچے دیے۔

حارث کی وفات ۸ھ میں ہوئی یعنی جس سال مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

مزید قاصد

محرم ۷ھ میں ایک ہی وقت چھ قاصد بھیجے گئے اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً ۱۔ عبداللہ بن حذافہ جو خسرو پرویز کے نام دعوت نامہ لے کر گئے تھے۔ ان کے ہاتھ ایک دعوت نامہ ہرمزان کے نام بھی بھیجا گیا تھا۔ جو اس علاقے کا حکمران تھا جسے آج کل خوزستان کہتے ہیں۔ اہواز، سوس، رام ہرمز اور تستر یا شستر مشہور شہر تھے۔ غالباً اسی کو ایک زمانے میں "سوسیانہ" کہتے تھے۔ یہ نامہ گرامی بھی مختصر تھا۔ ہرمزان نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلام قبول کر لیا۔

۲۔ ایک دعوت نامہ علاء بن حضرمی کے ہاتھ منذر بن ساوی حاکم بحرین کے نام بھیجا گیا تھا۔ یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ منذر بن ساوی اور اس کے بہت سے ہم قوموں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضور انور نے علاء بن حضرمی کو زکوٰۃ و صدقات اور غیر مسلموں سے جزیے کی تحصیل کے لیے مقرر فرمایا۔ ایک نامہ مبارک بعد میں ابو ہریرہ کے ہاتھ بھیجا گیا۔

۳۔ ایک دعوت نامہ جبلہ بن ایہم غسانی کو بھیجا گیا تھا۔ اس نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔ سنہ ۱۴ھ (اوائل سنہ ۶۳۶ء) میں وہ حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ پہنچا۔ طواف میں جبلہ کی چادر کا ایک گوشہ اتفاقاً ایک بدوی عرب کے پاؤں تلے دب گیا۔ جبلہ نے بے تامل بدوی کو طمانچہ رسید کیا۔ معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا تو فیصلہ ہوا کہ جبلہ کو بدلہ دینا ہوگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شہزادے کی عزت عامی شخص کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی۔ جب معلوم ہوا کہ قانون شریعت کی نگاہ میں شاہ و گدا کے درمیان کوئی تمیز نہیں تو وہ رات کو چھپ کر نکلا اور شام پہنچا اور وہاں سے مسیحی بن کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ مگر تمام عمر اس حرکت پر حسرت و افسوس کے آنسو بہاتا رہا۔

۴۔ ایک دعوت نامہ جیفر بن جلندی حاکم عمان کے نام ذیقعدہ ۸ھ = فروری ۶۳۰ء میں بھیجا گیا یہ عمرو بن العاص لے گئے تھے۔ جیفر کا بھائی عبد بہت صالح اور نیک تھا۔ پھر دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا اور اسلامی احکام جاری کر دیے۔ اس میں نیکی اور سعادت کا زیادہ تر حصہ دار عبد ہی تھا۔

۵۔ ایک دعوت نامہ مسعود بن سعد کے ہاتھ فروہ بن عمرو الجزامی کے نام بھیجا گیا جو قیصر روم کی طرف سے معان کا گورنر تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ ایک گھوڑا، ایک سفید خچر، ایک عربی گدھا اور عمدہ پارچات بطور تحفہ بھیجے۔ ان میں ایک عبا سندس کی تھی جس کا حاشیہ سنہری تاروں سے مزین تھا۔ اس پر پادریوں میں شور برپا ہوا۔ قیصر نے فروہ کو اسلام سے منحرف کرنا چاہا لیکن

کامیابی نہ ہوئی لہٰذا پہلے اس مرحوم کو قید کیا۔ پھر فلسطین کے ایک چشمے کے پاس جس کا نام عفرا تھا لے قتل کرادیا۔ فروہ نے راہ حق میں یہ تمام آفتیں صابرانہ برداشت کرلیں۔

دین حق پر فروہؓ کے ثبات و استواری کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سزائے موت کے وقت یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

مسلمان سرداروں تک میری یہ بات پہنچا دو
کہ پروردگار کی راہ میں میرا جسم اور میری عزت نثار ہیں

متفرق دعوت نامے

ان کے علاوہ بے شمار دعوت نامے تھے جن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہیں، ان کے صرف نام لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ ہلال بن امیہ (بحرین کا ایک رئیس)

۲۔ امیر بصریٰ۔ یہی نامہ گرامی تھا جسے پہنچانے کے لیے حارث بن عمیرؓ تجویز ہوئے تھے مگر شرجیل حاکم موتہ نے انہیں راستے ہی میں شہید کرادیا۔ اسی وجہ سے موتہ کی جنگ پیش آئی۔

۳۔ اکیدر حاکم دومۃ الجندل

۴۔ قبیلہ بنی کلب اور اس کے سردار اصبغ بن عمرو

۵۔ ذو کلاع اور ذو عمرو کے قبیلے کا خاندان

۶۔ حکمرانان حمیر کے افراد و خاندان

۷۔ سرداران حضر موت

۸۔ سردار آند

۹۔ البجنت سوار جمر

۱۰۔ بنی حارثہ

۱۱۔ بنی عذرہ

۱۲۔ شاہ سمارہ

۱۳۔ امرائے بنی وائل

۱۴۔ بنی زہیر

۵۔ مختلف سرداران عرب جن کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔

یہ ان دعوت ناموں کی سرسری کیفیت ہے جو مختلف روایتوں میں محفوظ رہ گئے۔ حقیقی تعداد اور کیفیت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ حق ہی کے لیے وقف تھا چونکہ آپ کی رسالت مقامی نہیں بلکہ عالمی و آفاقی تھی اس لیے اس کے لیے تبلیغ کا انتظام بھی خاص اہتمام چاہتا تھا۔ اس آیت میں اسی اہتمام کی طرف آپ کو متوجہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کے فرائض میں داخل ہے کہ عالمی طاقتوں تک آپ یہ پیغام پہنچائیں تاکہ اللہ کی حجت ان پر تمام ہو۔ اس معاملے پر غور کا ایک اور پہلو بھی ہے۔

۱۔ خدا رب العالمین ہے۔

۲۔ اس کا رسول پاک رحمۃ للعالمین ہے۔

۳۔ خود ما انزل الیک ذکر للعالمین ہے۔

۴۔ دین حق کا مرکز مشہود یعنی کعبہ مبارک ہدی للعالمین ہے۔

غرض اس کی ہر حیثیت عالمی اور آفاقی ہے

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کی یہ آیت تبلیغ کے عالمی اور آفاقی کرنے کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کر رہی ہے اور جن حالات میں کر رہی ہے ان کی سنگینی کا حال تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور قرآن میں واللہ یعصمک من الناس کا فقرہ بھی حالات کی سنگینی کو بتا رہا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد رومی عیسائی اہل کتاب ہی ہیں۔ کیونکہ اس وقت اگرچہ ایران کے جہانی فرمانروائی شہنشاہی کے اوراق منتشر تھے لیکن روم کے حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور انور کو اطمینان دلایا کہ حالات کی پرواہ نہ کیجئے آپ کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے۔ چنانچہ حضور انور نے بے دھڑک ہو کر حالات کی ساری سنگینی کے باوجود ارد گرد کے تمام سلاطین و رؤسا کو دعوت دی۔ اللہ سبحانہ نے یہاں دونوں باتیں بتا دی ہیں ایک یہ کہ اللہ آپ کی حفاظت فرمائے گا اور دوسری یہ کہ آپ کے مقابلے میں وہ کامیاب نہ ہوں گے۔ تیسری بات یہاں سے خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ حالات آپ کے ساتھ ہوں گے اور مستقبل میں آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ چونکہ اس وقت رومیوں کی طاقت سب سے بڑی طاقت تھی۔ اس لیے قرآن نے یہاں عیسائیت کا بھرپور چہرہ پیش کیا ہے۔ حبشہ میں عیسائی، روم میں عیسائی، مصر میں عیسائی غرض کہ مدینے کے ارد گرد اصل طاقت کا مرکز عیسائی قوم تھی۔

ادھر یہودی مایوسیوں کے بعد اپنی آخری بازی کھیلنے کے لیے آخری درجہ میں ان طاقتوں کا سہارا لے رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس نقشہ سے ہو سکتا ہے۔ یہ آیت تبلیغ کے نزول کے زمانے کا عرب ہے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ خلیج فارس کی سمت چھوڑ کر عرب کے شمال میں مملکت بنی غسان اور جنوب میں نجران اور بحر ابیض کی جانب سلطنت روم اور بحر احمر کی جانب سلطنت نجاشی حبشہ میں موجود ہے۔

شیعوں کا عجیب استدلال

خبر نہیں ہمارے شیعہ دوستوں کو کیا ہوگیا کہ اس آیت گرامی کی عالمی اور آفاقی حیثیت کو حضرت علی کی خلافت کے مسئلہ کی آڑ میں مجروح کر دیا ہے۔ گویا ان کے خیال میں نبوت کو اسلام کے لیے عالمی طاقتوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا بلکہ حضرت علی کی خلافت کے بارے میں خود اہل ایمان سے خطرہ تھا۔ چنانچہ علامہ طبرسی نے یہی بات مجمع البیان میں لکھی ہے اور اس کو زوردار بنانے کے لیے ایک داستان بھی سنائی ہے یہ بھی خود ان کی زبانی سن لیجئے۔

کلبی ابو صالح کے حوالے سے کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس اور جابر بن عبداللہ نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور انور کو حکم دیا کہ حضرت علی کو امامت کے لیے مقرر فرمائیں اور لوگوں کو اس کی اطلاع کریں لیکن (معاذاللہ) حضور انور ڈر رہے تھے کہ لوگ کہہ دیں گے کہ اپنے بھتیجے کے لیے راہ بنا رہے ہیں۔ اللہ نے آپ پر اس آیت کی وحی فرمائی۔ آپ نے غدیر خم والے روز اس کا اعلان کیا۔

انا للہ فال اللہ المشتکی دیکھ لیا آپ نے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آیت نازل ہو رہی ہے سنہ ھ کے اواخر میں اور اس کی پیوندکاری کی جا رہی ہے سنہ ھ سے حجۃ الوداع کے بعد اگرچہ اس آیت گرامی کا اس سے کوئی پیوند نہیں ہے لیکن آئیے سرراہے اس کے متعلق بھی کچھ کام کی باتیں ذہن میں تازہ کر لیجئے۔

غدیر خم کا خطبہ اور مسئلہ امامت

حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر جب حضور مکہ سے واپس ہوتے اور غدیر خم پر پہنچے۔ خم بضم خا مجرد تشدید میم جحفہ سے تین میل پر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے۔ یہاں ایک غدیر ہے یعنی

آیت تبلیغ کے زمانے کا عرب



نوٹ: خط کشیدہ اسماء مقامات ہیں باقی تمام نام قبائل کے ہیں۔

تالاب ہے۔ اس جگہ جب حضور پہنچے تو ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم کی روایت ہے کہ اس خطبہ میں آپ نے پہلے خدا کی حمد و ثنا بیان کی، پھر وعظ و نصیحت کی، اس کے بعد فرمایا۔

اما بعد۔ اے لوگو میں انسان ہوں۔ شاید میرے پاس میرے رب کا قاصد آئے یعنی ملک الموت اور میں قبول کروں گا اور تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ پہلی چیز کتاب اللہ ہے اس میں ہدایت اور نور ہے تو خدا کی کتاب کو پکڑے رہو اور اسی سے دلیل لیا کرو۔ لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف بہت رغبت دلائی۔ پھر فرمایا کہ دوسری چیز اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم کو خدا کی یاد دلاتا ہوں۔

یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ لیکن امام احمد نے حضرت براء بن عازب اور زید بن ارقم سے روایت کی ہے کہ جب حضور غدیر خم پر ٹھہرے تو حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں مومنین کے لیے اُن کی اپنی ذاتوں سے اولیٰ ہوں سب نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں ہر مومن کے لیے اس کے اپنے نفس سے اولیٰ ہوں، سب نے کہا کہ ہاں۔ تب فرمایا کہ اے اللہ جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی بھی مولا ہے۔ اے اللہ جو علی کو دوست رکھے ان کو تو دوست رکھ۔ اور جو علی سے عداوت کرے اُس سے تو عداوت کر۔ اس کے بعد حضرت علی سے حضرت عمر ملے تو کہا کہ مبارک ہو اے ابن ابی طالب آپ ہر مومن مرد و عورت کے مولا ہو گئے۔

ترمذی میں بھی حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے کہ غدیر خم کے خطبہ میں حضور نے یہ فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ اور طبرانی وغیرہ نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ حضور نے غدیر خم میں شجرات کے نیچے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں کہا کہ میرے رب لطیف خبیر نے مجھ کو خبر دی ہے کہ ہر نبی کی عمر اس کے پہلے نبی سے نصف ہوتی ہے اس لیے میرا گمان ہے کہ اب میں بلایا جاؤں اس کے بعد لوگوں کو اسلامی تعلیمات یاد دلائیں اور ضروریات دین کی تعلیم فرمائی۔ پھر فرمایا:

اے لوگو! بے شک اللہ میرا مولیٰ ہے اور میں مومنین کا مولیٰ ہوں۔ اور ان کے لیے اُن کی اپنی ذاتوں سے اولیٰ ہوں تو جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا یہ مولیٰ ہے یعنی حضرت علی۔ اے اللہ جو علی کو دوست رکھے اس کو تو دوست رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو عداوت رکھ۔

اس خطبہ میں حضور کے اس ارشاد کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ اس کو ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ حافظ شمس الدین جزریؒ نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ حضرت علی کے ساتھ یمن گئے تھے ان میں بعض حضرت علی سے ناراض ہو گئے تھے۔ اور صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بریدہ کو حضرت علی کے ایک فعل کی وجہ سے حضرت علی سے بغض ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تردید کی۔ حافظ ذہبی نے اس کی تصحیح کی ہے کہ حضرت بریدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور حضرت بریدہ خود کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اے بریدہ! کیا میں مومنین کے لیے ان کے نفسوں سے اولیٰ نہیں ہوں، میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے۔

ابوداؤد السجستانی اور حاتم الرازی وغیرہ نے اس روایت کی صحت میں کلام کیا ہے مگر ابن حجر مکی لکھتے ہیں کہ ستو اصحابیوں نے اس قصہ کو روایت کیا ہے اور امام احمد کی ایک روایت ہے کہ تیس ۳۰ صحابہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا اور حضرت علی کی خلافت کے ایام میں جب آپس میں اختلافات پیدا ہوئے تو ان اصحاب نے حضرت علی کی فضیلت پر اس سے استدلال کیا۔ یہ روایت مختلف اسانید سے مروی ہے جن میں بعض صحیح ہیں بعض حسن۔ اس لیے یہ روایت یقیناً صحیح ہے اور بعض ائمہ حدیث کے اختلاف کے باوجود صحیح ہے اور بلاشبہ اس سے حضرت علی کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ آپ تمام مومنین کے مولیٰ ہیں۔ آپ کا دوست خدا اور رسول کا دوست ہے۔ اور آپ کا دشمن خدا اور رسول کا دشمن ہے۔

لیکن شیعوں نے اس روایت کو حضرت علی کی خلافت پر سب سے بڑا استدلال بنایا ہے اور شیخین کی خلافت کے خلاف اس سے استدلال کیا ہے وہ محض لغو ہے اور چونکہ شیعوں کے نزدیک مسئلہ امامت پر صرف متواتر روایات سے استدلال کیا جا سکتا ہے اس لیے وہ اس روایت کو متواتر بھی کہتے ہیں وہ بھی محض جھوٹ ہے۔

معلوم ہو چکا ہے کہ بعض ائمہ حدیث کو اس کی صحت میں بھی کلام ہے، متواتر کہاں۔ بخاری نے اس قصہ کو روایت ہی نہیں کیا، امام مسلم خطبہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے الفاظ بھی روایت کرتے ہیں مگر اس میں وہ الفاظ نہیں ہیں جس پر بحث کی بنیاد ہے یعنی من کنت مولاہ فعلی مولاہ یہ حصہ کثرت طرق کی وجہ سے اگر صحیح بھی ہو پھر بھی امامت پر استدلال اس سے کسی طرح صحیح نہیں۔ مولیٰ چند

معانی میں مشترک ہے۔ معتق، عتیق، ناصر، محبوب، المتصرف فی الامر۔ لیکن کوئی معنی خلافت یا امامت کو مستلزم نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض امام اور مصالح کے معنی بھی اس کے لیے جائیں تو اس کا یہ مطلب تو قطعاً نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی اسی وقت امام المومنین تھے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا، اس لیے کہ اس وقت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے لامحالہ مطلب یہ ہوگا کہ بیعت کے بعد امام حق ہوں گے جیسا کہ ہوتے۔ اس سے شیخین کے مقابلہ میں خلافت وامامت بلافصل پر استدلال کیونکر صحیح ہوگا۔

تعجب ہے کہ یہ لوگ اس زور شور سے اس روایت کو حضرت علی کی امامت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ جس وقت خلافت وامامت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی نہ حضرت علی نے خود اس کو استدلال میں پیش کیا نہ حضرت عباس نے نہ بنی ہاشم نے نہ کسی دوسرے صحابی نے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ جلیل القدر مہاجرین وانصار اس میں شریک تھے اور وہ صحابہ بھی شریک تھے جو غدیر خم کے خطبہ میں موجود تھے۔ اس خطبہ کے بعد صرف دو مہینے درمیان میں گزرے تھے مگر کسی نے امامت پر اس سے استدلال نہیں کیا۔ البتہ انہی لوگوں نے پیچھے حضرت علی کی فضیلت پر اس سے استدلال کیا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت علی نے بار بار تصریح کر دی ہے کہ حضور نے کسی کی امامت یا خلافت کی تعیین وتصریح نہیں کی۔ خلافت کا انعقاد مسلمانوں کے مشورہ سے ہوا۔ بے شمار روایتیں حضرت علی سے اس باب میں مروی ہیں۔ ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ بزار نے بسند حسن اور امام احمد نے بسند قوی روایت کیا ہے کہ حضرت علی سے لوگوں نے استدعا کی کہ اپنا خلیفہ بنائیں تو فرمایا کہ نہیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تمہاری رائے پر چھوڑ دیا اسی طرح ہم بھی تمہاری رائے پر چھوڑتے ہیں اور بزار کی ایک روایت ہے جس کے رجال بخاری کے رجال ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔ دارقطنی، ابن عساکر اور ذہبی وغیرہ نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بصرہ میں بیان کیا کہ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے کوئی عہد نہیں کیا۔ اگر رسول اللہ کا عہد ہوتا تو ہم اپنے بھائی بنی تیم بن مرہ کو اور عمر بن الخطاب کو رسول اللہ کے منبر پر نیابت کرنے دیتے اور اپنے انہی ہاتھوں سے ان کے ساتھ مقابلہ کرتے۔ ابو نعیم روایت کرتے ہیں کہ حسن المثنیٰ سے کہا گیا کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ حضرت علی کی امامت پر استدلال ہے تو انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر مولیٰ سے رسول اللہ کی غرض امیر یا سلطان بنانا ہوتا تو آپ اس

زیادہ صاف اور صریح الفاظ استعمال کرتے۔ کیونکہ آپ فصیح البیان تھے۔ اور اگر امامت کے لیے رسول اللہ حضرت علی کی تعیین فرما دیتے اور حضرت علی اس علم کے باوجود ساکت رہتے اور رسول اللہ کے حکم کو ترک کر دیتے تو سب سے بڑے گنہگار حضرت علی ہوتے، حاشا وکلا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

الغرض اس روایت سے امامت کے مسئلہ پر استدلال کسی طرح صحیح نہیں (نعوذ باللہ) اگر یہ صحیح ہوتا تو صحابہ اس سے استدلال کرتے، بنی ہاشم کرتے، حضرت علی کرتے، حضرت عباس کرتے، مگر کسی نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس وقت نہیں کیا جب اس کے فیصلہ کی اشد ضرورت تھی۔ مولا کے معنی یہاں ناصر یا محبوب کے ہیں اور اس معنی میں کسی طرح کا محذور لازم نہیں آتا۔

تصدیق نبوت محمدیہ کے بغیر ایمان نہیں ہے

۱۵۵۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم جو کچھ بھی ہو جب تک تم تورات اور انجیل کو اور اس کو جو تمہاری طرف اب روانہ کیا گیا ہے لے قائم نہ کرو اور اے پیغمبر جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر اتارا گیا ہے وہ ان میں اور زیادہ سرکشی اور انکار کا اضافہ کرے گا۔ آپ ان منکرین پر افسوس نہ کریں۔ یہ انداز بتا رہا ہے کہ قرآن کا روئے سخن کن کی طرف ہے اور پیغمبر کو کن لوگوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دو اہل کتاب کو عام اس سے کہ یہودی ہوں یا نصرانی ان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو یعنی تمہارا دینی مقام کوئی نہیں ہے اور تمہیں حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ کی نسبت قطعاً سودمند نہیں ہے۔ یہ کلمہ انداز تحقیر ہے انداز تعظیم نہیں ہے۔ جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف تمام صداقتوں کی نگران بنا کر اتاری گئی ہے قائم نہ کرو تم کچھ بھی نہیں ہو۔ یعنی تمہارا کوئی مقام نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا کوئی عمل قبول نہیں ہے کیونکہ قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے اور ایمان کی صحت کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے۔ اس لیے اگر تم سارے رسولوں کو نہیں مانتے ہو تو تم دین و ایمان کے لحاظ سے کچھ نہیں ایک حرف بے معنے ہو۔ تورات و انجیل اور خدا کی اتاری ہوئی چیز کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے مسائل و معاملات سے عملاً ان کا ربط قائم کرو۔ آیت میں ما انزل الیکم من ربکم سے مراد قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم کے سوا کوئی اور چیز مراد لینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اسی آیت میں ایک ہی سانس میں ما انزل الیک من ربک کے الفاظ سے یہ بالکل واضح کر دیا ہے کہ اس سے قرآن ہی مراد ہے۔ یہاں قرآن کے انزال کی ان کی طرف نسبت ان پر ایک شیریں طنز ہے کہ تورات و انجیل دونوں میں

اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ تمہارے پاس ان صفات کا پیغمبر، خدا کا آخری اور کامل صحیفہ لے کر آئے گا تو تم اس پر ایمان لانا۔ اس کی پیروی کرنا، اس کی مدد کرنا اور اس کی گواہی دینا۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے اور اس موقع پر جب کہ قرآن یہ تمام اوصاف لے کر آچکا ہے تو تورات اور انجیل کا قائم کرنا یہی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی اس کتاب کو قائم کریں۔ اس کا قائم کرنا ہی تورات و انجیل کو قائم کرنا ہے دین میں آدم سے لے کر نشو و ارتقا۔ کی جو سنت اللہ نے قائم فرمائی ہے۔ اس کے مطابق قرآن کے ذریعے دین انبیاء کی تکمیل فرمادی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ وہی ہدایت ہے اور اس کے ما قبل میں جو کچھ تھا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اسی کو محمد رسول اللہ لے کر آخری دفعہ تشریف لائے اب وہ ہمیشہ کامل رہے گی کبھی ناقص نہ ہوگی اس سے ہٹ کر اے اہل کتاب تم کچھ نہیں ہو۔ پہلی آیت میں اہل کتاب کے ماضی کو پیش کیا گیا تھا اس آیت میں ان کے حال اور مستقبل کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور سید رشید رضا نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ "اہل کتاب تورات و انجیل کے مطابق اپنی زندگیاں بنانے پر نہ پہلے قادر تھے اور نہ اب قادر ہیں۔ قرآن ان سے کہہ رہا ہے کہ اس صورت حال کے باوجود ختم نبوت سے تم میں پریشان استغنا کیوں ہے۔ ہم بھی اب امریکہ، جرمنی اور انگلستان کے مشنریوں سے کہہ سکتے ہیں کہ تم دنیا کو تورات و انجیل کی دعوت دے رہے ہو، ذرا سوچ کر بتاؤ کہ کس منہ سے تم ایک ایسی چیز کی دنیا کو دعوت دے رہے ہو جس کو تم خود قائم نہیں کر رہے ہو، تم میں سے کتنے ہیں جو اپنے دشمنوں سے پیار کرتے ہیں اور اپنے پر لعنت کرنے والوں کو مبارک باد کے پیغام بھیجتے ہیں۔ قیصر کا قیصر کو کون دیتا ہے اور ہر ظلم و استبداد کے سامنے خدا کی جانب سے سمجھ کر کون سر نگوں ہو کر کون زیادتی کے جواب میں زیادتی نہیں کرتا بلکہ کون دائیں رخسار پر چپت کھا کر بایاں رخسار آگے کرتا ہے۔ تمہاری پوری کی پوری زندگی اپنی کتابوں کی نقیض ہے۔ اسی صورت حال کو قرآن نے لستم علی شیء سے تعبیر کیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل کتاب اس کتاب کے علمبردار ہوتے۔ لیکن ہو رہا ہے کہ قرآن نے ان کی سرکشی اور کفر میں اور اضافہ کر دیا پہلے یہ صرف انکار کرتے تھے اور یہ پوری طاقت سے اس کو ختم کرنے پر تل بیٹھے اور اس کے لیے یہود کے قبائل اور مشرکین عرب سے گزر کر عالمی طاقتوں تک بات پہنچ گئی اور وہ پوری قوت سے حق کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آگئے ہیں اور اس کے لیے سنگین قائم کر رہے ہیں اس کے لیے قرآن نے طغیان کی تعبیر کیسی شاندار اور بلیغ اختیار کی ہے۔

آخر میں مستقبل کے اسی خطرے کے پیش نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے حال پر غم نہ کرو۔ فلا تاس علی القوم الکافرین۔ یعنی اس غم اور افسوس میں پڑ کر تنگ دل نہ ہو۔ اپنا فرض امن واطمینان سے ادا فرماتے رہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں پر آپ کوئی افسوس نہ کریں کہ کفر جن کی طبیعت بن چکا ہے۔ آپ کو اللہ کافی ہے۔

اس آیت میں ہمارے لیے بڑی عبرت ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی تورات و انجیل سے زندگی کے معاملات و مسائل کا عملاً ربط قائم کیے بغیر دین کی زندگی میں کچھ نہیں ہیں تو مسلمان قرآن سے زندگی کے مسائل و معاملات کو عملاً مربوط کیے بغیر دین کی زندگی میں کیوں لستم علی شیئ کے مصداق نہیں ہیں۔ اللہ کی حجت سب کے لیے یکساں ہے کوئی وجہ نہیں کہ اللہ یہودیوں سے برگزیدہ امت ہونے خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے پرگزیدوں اور چہیتوں کی اولاد ہونے کا غرور پسند کرے اور یہی چیز مسلمانوں سے قبول کرے جبکہ پوری زندگی کے عملی روابط نبوت کے لاتے ہوتے علم و عمل سے ٹوٹ چکے ہوں۔ افکار، اعمال، اخلاق اور احوال کے سارے نقشے نبوت سے ہٹ کر بن رہے ہوں، اور حکمت دین اور مقاصد سے بے خبر ہو کر سمجھ رہے ہیں کہ ہماری دینی بنیاد مستحکم ہے یحسبون انھم علی شیئ الا انھم ھم الکاذبون۔

نجات وسعادت کا قانون

۱۵۶ ــ بلاشبہ اہل ایمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا نصاریٰ کوئی ہو جو کوئی بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی طرح کا غم۔ یعنی جو قوم مسلمان کہلاتی ہے یا یہود و نصاریٰ یا صابی یا اور کچھ تمثیلاً چند مشہور مذاہب کا ذکر کر دیا گیا۔ کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل رنگ پیشہ وطن وغیرہ احوال وخصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح اور ذاتی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیاب و مامون و مصئون ہونے کا ایک اور صرف ایک معیار ہے یعنی ایمان و عمل صالح۔ جس قوم کو اپنے مقرب الٰہی ہونے یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اسی کسوٹی پر اپنے کو کس کر دیکھ لے۔ اگر اس میں کھری اترے تو بے خوف و خطر مطلع اور کامیاب ہے ورنہ ہر وقت اپنے خدا کے قہر و غضب کے لیے تیار رہے۔ پچھلی آیات میں خاص اہل

ـــــــــــــــــــ

لہ افادات شیخ الاسلام

کتاب کی تبلیغ تھی۔ اس آیت میں تمام اقوام و ملل کے سامنے بلا رو و رعایت ایسا عجیب و غریب معقول اور منصفانہ قانون پیش کیا گیا ہے جس کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شبہ نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جب تک خدا، اس کے وجود، وحدانیت، صفات کمالیہ، نشانہائے قدرت، تمام احکام و قوانین، کل انبیین و سفراء اور روز جزا پر ایمان نہ لاتے اور نیکی اختیار نہ کرے کیا عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ وہ نعیم دائم رضائے حق اور سرور ابدی سے ہمکنار ہو سکے گا۔ ایمان باللہ کے تحت میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ فرض کرو ایک شخص روشن دلائل نبوت کی موجودگی میں کسی پیغمبر کی توہین کرتا ہے اور اس کو دعوے نبوت میں جھوٹا کہنا بھی اس کی توہین ہے تو کیا کسی حکومت کے پیغمبر کی توہین اور اس کے صاف و صریح اسناد سفارت کی تکذیب اس حکومت کی توہین و تکذیب نہیں ہے! اسی طرح سمجھ لو کہ جو شخص کسی ایک سچے پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اس کو قبول نہیں کرتا وہ فی الحقیقت خدا کے ان صاف و صریح نشانات و دلائل کو جھٹلا رہا ہے جو اس نے تصدیق نبوت کے لیے اتارے تھے۔

فانھم لا یکذبونک ۔ ولکن الظالمین بآیات اللہ یجحدون

یہ دراصل تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم جان کر اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں

سوچئے کیا اللہ کی آیات اور صریح و علانیہ نشانات کو جھٹلانے کے بعد بھی ایمان باللہ کا دعویٰ رہ سکے گا۔ قرآن نے جن تفصیلات کی طرف ایمان باللہ و عمل صالح کے اجمالی عنوان سے یہاں اشارہ کیا ہے دوسرے مقامات پر وہ پوری شرح و بسط سے موجود ہیں۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ صابئین عراق میں ایک فرقہ تھا جن کے مذہبی اصول عموماً حکمائے اشراقیین اور فلاسفہ طبیعیین کے اصول سے ماخوذ تھے۔ یہ لوگ روحانیات کے متعلق نہایت غلو رکھتے تھے بلکہ ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ارواح مجردہ اور مدبرات فلکیہ وغیرہ کی استعانت و استمداد سے ہی ہم رب الارباب یعنی بڑے معبود تک پہنچ سکتے ہیں لہٰذا ریاضات شاقہ اور کسر شہوات سے روح میں تجرد اور صفائی پیدا کر کے عالم روحانیات کے ساتھ ہم کو اپنا رشتہ پیدا کرنا چاہیے۔ پھر ان کی خوشنودی اور دستگیری سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ انبیاء کی اتباع کی ضرورت نہیں ہے۔ کواکب ارواح مدبرہ اور اسی طرح دوسری روحانیات کو اپنے سے خوش رکھنے کے لیے ہیاکل بناتے تھے اور ان ہی ارواح کے لیے نماز روزہ اور قربانی وغیرہ کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ حنفاء کے مقابلے میں صابئین کی جماعت تھی جن کا سب سے بڑا حملہ نبوت اور اس کے لوازم و خواص پر ہوتا تھا حضرت ابراہیم حنیف علیہ الصلاۃ والسلام

کی بعثت کے وقت نمرود کی قوم صابی العقیدہ تھی جس کے رد وابطال میں خدا کے خلیل ابراہیم علیہ السلام نے جانبازی دکھلائی[1]

اس موضوع پر ہم جلد اول میں کچھ اجمالی اشارات کر چکے ہیں۔ یہاں شیخ الاسلام نے جو مربوط اور جامع بات ارشاد فرمائی وہ ان کی علمی بلندیوں کا پتہ دے رہی ہے اور اس پر مزید کچھ کہنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ
كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا
وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا
ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ
بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ
ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَ
رَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ
النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا
إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا
عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝
أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان کی طرف

بہت سے رسول روانہ کیے تھے، جب بھی ان کے پاس کوئی
رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو انہوں نے
کسی کو جھٹلا دیا اور کچھ کو قتل کر دیا[۱۵۷]، اور اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے
ہوتے ہیں کہ کوئی آزمائش نہ ہو گی لہٰذا اندھے اور بہرے ہو گئے
پھر اللہ نے ان سے درگزر فرمایا لیکن اکثر ان میں سے لوگ پھر
اندھے اور بہرے ہو گئے اور اب اللہ ان کے کرتوتوں کو
خوب دیکھ رہا ہے[۱۵۸]۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے
کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے
بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا
رب بھی، جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر
اللہ نے جنت حرام ٹھہرا دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور
ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے[۱۵۹]۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے

جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک معبود
کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز
نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک
سزا دی جائے گی کیا پھر یہ اللہ کے حضور میں توبہ نہ کریں گے
اور اس سے معافی نہ مانگیں گے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (٦٠)

یہود و نصاریٰ کا تاریخی نقشہ

پہلے اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ لستم علی شیئٍ اس کے بعد قانونِ نجات بتایا۔ اب پہلے یہاں یہود کا تاریخی چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس قانونِ نجات کے مطابق ان کی تاریخ کا فیصلہ خود ان کے :ب میں کیا ہے۔ فرمایا کہ ان سے ایمان و عمل صالح کا عہد لیا گیا تھا۔ بائیبل کی کتاب احبار باب ٢٦ اور استثنا باب ٢٨ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں انہوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ اگر تم احکامِ الٰہی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو گے تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے اور اگر کتاب اللہ کو پس پشت ڈال کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح بلائیں اور مصیبتیں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہجوم کریں گے حضرت موسیٰ کی یہ تقریر قرآن کے اس مختصر فقرے کی بہترین تفسیر ہے۔ اسی کی تجدید اور یاد دہانی کے لیے اللہ نے پیچھے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول روانہ کیے۔ لیکن ہوا کیا ہے! ان کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ انہوں نے عہد شکنی کی اور جو رسول اس کی تجدید کے لیے آئے ان کی تکذیب کر دی! ان کو قتل کر دیا۔ قرآن نے اس تاریخی حقیقت کا انکشاف فریقاً کذبوا و فریقاً یقتلون کے مختصر سے مختصر فقرے کے ذریعہ کیا لیکن اسی حقیقت کو انجیل متی میں جس انداز سے حضرت مسیح کی طرف

منسوب کر کے بیان کیا ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجیے۔

اے سانپو اور افعی کے بچو تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے اس لیے میں نبیوں، داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنی عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے

متی ۳۲-۳۴

اس کے بعد قرآن نے بنی اسرائیل کی تاریخ سے ان کے دو دوروں کا پتہ دیا ہے کہ بنی اسرائیل کی قتل انبیاء کے جرم میں اللہ کی جانب سے فوری گرفت نہ ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پکڑ نہیں ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ان پر یکے بعد دیگرے دو تباہیاں آئیں۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ کی جانب سے دوسری رومیوں کے حملے سے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں کی طرف فعموا وصموا ثم عموا وصموا سے اشارہ کیا ہے۔ بنی اسرائیل میں ان دونوں کا تفصیلی تذکرہ آرہا ہے۔ اس تمہیدی بیان کے بعد عیسائیوں کا ذکر شروع ہوا ہے اور بتایا کہ جس طرح یہودی اصل تعلیم سے منحرف ہو کر اندھے بہرے ہو گئے اور اس کے نتیجے میں خدا کی گرفت ان پر آئی ٹھیک اسی طرح عیسائی بھی ایمان و عمل سے منحرف ہو گئے، اور الوہیت مسیح اور تثلیث کا اعتقاد پیدا کر لیا۔ یہاں سے دوسرے رکوع کے ختم تک الوہیت اللہ اور تثلیث کا باطل ہونا مسیح کی صحیح حیثیت، تثلیث کی تاریخ، اس کا ماخذ اور سرچشمہ غرض کہ ہر پہلو کو پورے طور پر کھول کر بیان کیا ہے، پھر آخر میں اخلاقی اور سیاسی طور پر یہودی و نصاریٰ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ آفاقی پیغمبر ہونے کی حیثیت میں نبوت کا مقابلہ بین الاقوامی دنیا میں سب سے پہلے نصرانیت سے ہوا ہے۔ اسی کے نتیجے ایک سال کے بعد ۹ھ میں قیصر روم نے مدینہ پر حملے کا حکم دیا تھا اور پورے عرب کے عیسائی قبائل اس میں شامل ہو گئے۔ یہ نبوت کے لیے پہلا موقع ہے کہ عرب سے باہر کی ایک سب سے بڑی طاقت اور شہنشاہی آمادۂ پیکار ہوئی۔ یہ نبوت کا اعجاز ہے کہ ۸ھ کے اوائل ہی میں اہل ایمان کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا ہے۔ جنگ کے لیے دوسری تیاریوں کے ساتھ سب سے قیمتی تیاری یہی ہے ان ذہنی تحفظات کی روشنی میں قرآن کی تشریحات شارحین قرآن کی زبانی سنیے۔

۱۵۷- ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان کی طرف بہت سے رسول روانہ کیے تھے۔ جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو انہوں نے کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو قتل کر دیا۔ گزشتہ آیت میں عنداللہ قبولیت کا جو معیار بیان ہوا ہے

یعنی ایمان اور عمل صالح یہاں یہ دکھلانا ہے کہ بنی اسرائیل اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ اور سمجھایا ہے کہ ان کا وطیرہ یہ رہا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے عہد پر قائم رکھنے کے لیے جب بھی ان پاس خدا کے رسول ایسا حکم لے کر آتے جو ان کی نفسانی خواہشات کے خلاف ہوتا تو ان کی تکذیب کرتے اور قتل تک کی جرات کر بیٹھتے حالانکہ غلام کی وفاداری کا امتحان اس میں ہے کہ جس بات کو دل نہ چاہے آقا کے حکم سے کر گزرے اور اپنی رائے اور خواہش کو آقا کی مرضی کے تابع بنا دے۔ ورنہ صرف ان چیزوں کا مان لینا جو مرضی اور خواہش کے موافق ہوں یہ کون سا کمال ہے [1]

دراصل یہاں یہود کی تاریخ بیان ہو رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ ان کی یہ گمراہی شروع ہی سے رہی ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلے میں وہ اپنے ہوائے نفس کو بالا رکھتے ہیں اور وحی کے ذریعے جو احکام ان کو اپنی خواہشوں یا اپنی ناقص عقل یا اپنی محدود معلومات کے خلاف نظر آتے ہیں ان کا انکار کر دیتے ہیں اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے ہیں اور یہ امر واقعہ ہے کہ قدیم ترین زمانے سے دنیا میں دو متقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں ایک پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی۔ دوسری انسان کی عبدیت اللہ سبحانہ کے سامنے جوابدہی اور ذمہ داری کی پہلی دعوت کو قرآن کی اصطلاحی زبان میں اتباع ہویٰ اور جاہلیت کہتے ہیں اور دوسری کو اسلام اور اتباع ہدیٰ کہتے ہیں۔ یہودی علماء پہلی دعوت کے علمبردار تھے جبکہ انبیاء دوسری دعوت کے۔ یہودی پیروی نفس اور خواہشوں کے لئے دلدادے تھے کہ انبیاء کی دعوت کا مذاق اڑاتے، ان کی تعلیمات پر حملہ کرتے۔ اور ان کی دعوت کو اس حد تک اپناتے جہاں تک ان کی سیاسی قومی، ملکی، تمدنی خواہشیں اور غرضیں پوری ہوتی نظر آتیں اور جوں ہی انبیاء کی دعوت کا ان کے قومی مفادات ان کی سیاسی اغراض، ان کے ملکی مصالح اور ان کی اقتصادی اور معاشی منفعتوں سے تصادم ہوتا تو انبیاء کے سامنے ایک حریف کی حیثیت سے آ جاتے اور ان کو ناکام بنانے کے سارے حربے استعمال کرتے جہاں تکذیب سے کام چلتا تکذیب کرتے اور اگر تکذیب سے دعوتِ انبیاء ختم نہ ہوتی تو ان کے قتل کے درپے ہو جاتے یہاں اگرچہ علامہ زمخشری نے کلما کا جواب محذوف مان کر یہ بتایا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جبکہ رسول علم و عمل کا پیمانہ ان کی خواہشات کے برعکس لاتا تو وہ رسالت کا مقابلہ کرتے لیکن علامہ ناصر نے الانتصاف میں یہ کہہ کر اور زور پیدا کر دیا کہ جواب محذوف نکالنے کے لیے جدت کی ضرورت نہیں خود قرآن میں

[1] افادات شیخ الاسلام

جوابِ شرط دوسرے مقام پر مذکور ہے۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ

یہاں بھی جواب استکبرتم محذوف ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب نبی نبوت کے علم و عمل کی دعوت لے کر آئے تو وہ سامنے تن گئے۔ یہاں مولانا اشرف علی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ استکبار ہی تمام گناہوں کی جڑ ہے کیونکہ یہاں قرآن نے تکذیب اور قتل انبیاء جیسے سنگین جرائم کو اسی کا نتیجہ قرار دیا ہے یہ علامہ زمخشری نے ماضی اور مضارع کے ذریعے یہاں تنوع پیدا کرنے کی وجہ تو صرف یہ بتائی ہے کہ یقتلون مضارع اس لیے لایا گیا ہے کہ ماضی کیے گئے اس عظیم جرم کی حال میں عکاسی ہو جائے لیکن علامہ بصری نے انتصاف میں یہ کہہ کر خوب نکتہ پیدا کیا ہے کہ حال سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ یہودی اب بھی حضور انور کے قتل کے درپے ہوئے ہیں۔

اگرچہ عام شارحین قرآن نے كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ کو رسلا کی صفت بتایا ہے لیکن زیادہ وزن اس میں ہے کہ اسے استیناف بیانی قرار دیا جائے۔ گویا سننے والے نے جب یہ بات سنی کہ ارسلنا الیھم رسلا، تو ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ پھر یہودیوں کا ان کے ساتھ معاملہ کیا رہا۔ جواب میں ارشاد ہوا كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ الخ ان کا معاملہ ان رسولوں میں سے ایک ایک رسول کے ساتھ یہ رہا ہے کہ وہ ان کی تکذیب کرتے رہے اور قتل کرتے رہے یعنی قتل اور تکذیب میں تکرار رہا۔ اور یہ معاملہ ان کی تاریخ کا ایک واقعہ نہیں بلکہ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں۔

گناہوں کے نتائج سے بے پروائی

۱۵۸- اور اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ کوئی آزمائش نہ ہوگی لہٰذا اندھے اور بہرے ہو گئے، پھر اللہ نے ان سے درگزر فرمایا لیکن ان میں سے اکثر لوگ پھر اندھے بہرے ہو گئے، اور اب ان کے کرتوتوں کو خوب دیکھ رہا ہے یعنی پختہ عہد و پیمان باندھ کر خدا سے غداری کی، اس کے سفراء میں سے کسی کو جھٹلایا کسی کو قتل کیا۔ یہ تو ان کے ایمان باللہ اور عمل صالح کا حال تھا۔ ایمان بالیوم الآخر کا اندازہ اس سے کرو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کر کے بالکل بے فکر ہو بیٹھے گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا اور ظلم و بغاوت کے نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے۔ یہ خیال کر کے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے اور

جو ناکردنی کام تھے وہ کیے حتیٰ کہ بعض انبیا کو قتل کیا اور بعض کو قید کر دیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا۔ پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملوک فارس نے بخت نصر کی قید ذلت سے چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا اس وقت ان لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوتے، خدا نے توبہ قبول کی لیکن کچھ زمانے کے بعد پھر وہی خرابیاں سوجھیں اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرات کی اور حضرت عیسیٰ کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ [1]

یہاں ان کے ان جرائم کا ذکر کیا ہے جن کی پاداش میں بنی اسرائیل کو دو بربادیوں سے دوچار ہونا پڑا، جیسا کہ یشعیا، یرمیاہ اور حزقیل کی کتابوں میں دو بڑے فسادوں اور دو بڑی بربادیوں کا ذکر ہے اور قرآن میں بنی اسرائیل میں اس کو بیان کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں جرائم کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہے اور وہاں نتائج کو بے نقاب کیا ہے۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے حملہ سے ہوئی۔ اس حملے نے صرف یہود کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی لیکن ایک صدی کے بعد گردش زمانہ نے پھر پلٹا کھایا اور کارساز قدرت نے وقت کی سب سے بڑی فاتح شہنشاہیت کو ان کی اعانت و دستگیری کے لیے کھڑا کر دیا یعنی شہنشاہ فارس کو اب یہود کی تمام اجڑی بستیاں پھر آباد ہو گئیں لیکن اس دوسری مہلت کی بھی انھوں نے قدر نہ کی اور اپنی توبہ و انابت کے وہ تمام عہد بھلا دیے جو بابل کی اسیری کے زمانے میں کیے تھے تو پھر دوسری ہلاکت کا وقت نمودار ہو گیا۔ یعنی رومی حملہ کا یہ بنی اسرائیل کی آخری ہلاکت تھی۔ اس کے بعد تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل سنبھل نہ سکے۔

آیت میں جرائم کو عمو و صمو سے تعبیر کیا ہے یعنی اندھے ہونے اور بہرے ہونے سے۔ اندھے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل سے اندھے ہو چکے تھے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود نبوت کے معالم اور مناہج کو نہ دیکھتے، اور یہ دونوں چیزیں ان کے فکر و مطالعہ اور علم و فن کا مرکز نہ تھیں بلکہ اپنی مادہ پرستی میں ان کو اس قدر استغراق ہو چکا تھا کہ نبوت سے ان کا علمی رشتہ منقطع ہو چکا تھا اور بہرے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مجالس میں اپنے اجتماعات میں نبوت کی بات سننے کو بھی تیار نہ تھے۔ گویا یہ یہود کے خواص اور عوام کی حالت بیان ہوئی ہے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پڑھا لکھا طبقہ نبوت کے علم سے بیگانہ تھا اور ان پڑھ طبقہ جن کا آوازہ سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا اور نبوت کے علم و عمل سے اس بیگانگی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی کا ہر شعبہ نبوت سے منقطع تھا۔

آخر میں کثیر منہم سے اس حقیقت سے اشارہ کر دیا کہ سب ایسے نہ تھے بلکہ کچھ اپنے احوال کا رابطہ نبوت کے علم و عمل سے وابستہ کیے ہوئے تھے لیکن اکثریت کا حال وہ کچھ تھا جو بیان ہوا ہے اسی لیے کثیر یہاں بطور بدل آیا ہے یعنی یہ حال سب کا نہیں بلکہ اکثر کا تھا اور جزا و سزا میں اکثر ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ آخر میں فرمایا واللہ بصیر بما یعملون یعنی وہ اگرچہ خدا کے غضب و قہر کی طرف سے اندھے ہو گئے ہیں لیکن خدا ان کی تمام حرکات کو برابر دیکھتا رہا ہے چنانچہ ان حرکات کی سزا اب اُمت محمدیہ کے ہاتھوں دلوا رہا ہے۔[1]

شارحین قرآن نے یہاں بلا وجہ یعملون مضارع کو ماضی کے معنے میں لے کر نکتہ آفرینی کے لیے طبع آزمائی فرمائی ہے لیکن اگر یعملون اپنے ہی معنے میں ہو اور مطلب یہ ہو کہ اب یہودیوں نے خاتم الانبیاء کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا ہوا ہے وہ اللہ کی نگاہ میں ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ان کو اتباع ہوئی یعنی جاہ و منصب کی چاہت نے کیسا اندھا اور بہرا بنا رکھا ہے۔ اور خواہشوں کے ہجوم میں دن دہاڑے آفتاب نبوت نظر نہیں آتا ہے انبیاءؑ کی ساری بشارتوں اور اوصاف سے بے خبر ہو کر وہ اندھے بنے ہوئے ہیں نہ تلاوت آیات سنتے ہیں اور نہ نبوت کے موضوع پر کوئی حجت و برہان پر کان دھرتے ہیں اس کے نتیجے میں وہ وقت قریب ہے جبکہ خدا کا قانون پہلے کی طرح پھر حرکت میں آئے گا۔

عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید

۱۵۹ - یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا اس پر اللہ نے جنت حرام ٹھہرا دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ یہاں سے نصاریٰ کے ایمان باللہ کی کیفیت دکھلائی گئی ہے کہ وہ کہاں تک حقانیت کے اس معیار پر پورے اترے۔ ان کے ایمان باللہ کا حال یہ ہے کہ عقل کے خلاف،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فطرتِ سلیمہ کے خلاف اور خود حضرت مسیح کی تصریحات کے خلاف مسیح ابن مریم کو خدا بنا دیا۔ ایک تین اور تین ایک کی بھول بھلیاں تو محض برتنے نام ہے۔ حقیقۃً سارا زور و قوت صرف حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے حالانکہ خود حضرت مسیح خدا کے رب ہونے اور دوسرے آدمیوں کی طرح اپنے مربوب ہونے کا علانیہ اعتراف فرما چکے ہیں اور جس شرک میں ان کی امت مبتلا ہونے والی تھی اس کی برائی کہیں زور شور سے بیان کر رہے ہیں پھر بھی ان اندھوں کو عبرت نہ ہوئی[1]

قاضی عبدالجبار ہمدانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تثبیت دلائل النبوت میں الوہیت مسیح کے عقیدے کے بارے میں کھول کر بتایا ہے کہ یہ عیسائیوں میں ملکیہ، یعقوبیہ اور نسطوریہ تینوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح عبد صالح اور رسول نہیں ہیں بلکہ فی الواقع الٰہ اور حقیقت میں اللہ ہیں۔ وہی آسمان و زمین کے خالق ہیں، ملائکہ اور انبیاء کے پیدا کنندہ انبیاء کو روانہ کرنے والے اور ان کے لیے معجزاتی قوت عطا کرتے ہیں۔

تسبیحۃ الایمان

عیسائیوں نے ۳۲۰ء میں بمقام نقا ایک مجلس منعقد کی۔ اس میں ۳۱۸ پادری شریک ہوتے مجلس کے انعقاد کا اہتمام قسطنطاس ابن فیلاطس بادشاہ روم نے کیا تمام سب نے مل کر عیسائیوں کے لیے جو تسبیحۃ الایمان تجویز کی جس کے بغیر کوئی عیسائی ایمان کی دولت سے مالا مال نہیں ہو سکتا یہ ہے۔

ہم اللہ یگانہ باپ پر ایمان رکھتے ہیں جو دیکھی اور ان دیکھی مخلوق کا خالق ہے اور ہم یگانہ یسوع مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو اپنے باپ کا اکلوتا اور پہلوٹا فرزند ہے وہ بنایا نہیں گیا بلکہ واقعی اللہ سے الٰہ ہے اور اپنے باپ کے اس جوہر سے ہے جس سے سارے عالم میں حسن و جمال اور ہر چیز کی تخلیق ہوئی ہے جو ہم انسانوں کی خاطر اور ہماری نجات کی خاطر آسمان سے نازل ہوا روح القدس اور مریم البتول سے جسمانی لبادہ لیا مریم اس سے حاملہ ہوئی اور مریم کے پیدا ہوا، گرفتار ہوا، تختہ دار پر چڑھا اور فیلاطس رومی کے سامنے قتل کیا گیا، مر گیا دفن ہو گیا اور تیسرے روز اٹھا، اور آسمان پر چڑھ گیا۔ اور اپنے باپ کی دائیں جانب بیٹھ گیا، اور وہ مردوں اور زندوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے درمیان فیصلہ کرنے کی خاطر آنے کو تیار ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں دائرۃ المعارف برطانیہ کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عبارت بھی علامہ عبدالجبار ہمدانی کے بیان کی صرف تصدیق نہیں کرتی ہے بلکہ اس کی پوری روشنی پڑتی ہے۔

> تیسری صدی عیسوی کے خاتمے سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلے پر کافی بحثیں چھڑی ہوئی تھیں۔ آخرکار ۳۲۵ھ میں نیقیا کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔

اس انکشاف کے بعد قرآن نے واو حالیہ کے ذریعے یہ بھی بتایا ہے کہ حالانکہ مسیح نے یہ بات نہیں فرمائی ہے کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس نے یہ ضرور بتایا ہے کہ اللہ ربی وربکم اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، اس لیے تمہارے عابدانہ تعلقات اللہ سے ہونے چاہییں۔ میں رب نہیں بلکہ اس کا بندہ اور رسول ہوں۔ یہاں بھی صاحب تثبیت دلائل النبوت نے انجیل یوحنا کے اقتباسات لے کر بتایا ہے کہ اس طرف انجیل سے بھی قرآن کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مولانا دریابادی نے یوحنا اور لوقا کے حوالوں سے بھی اس کے قریب قریب تائیدی اقتباسات نقل کیے ہیں۔ یہ بھی نبوت کا اعجاز ہے کہ باوجود اس کے کہ حضور انور نے نہ انجیل پڑھی ہے اور نہ ان سے تاریخ میں حضور کے تعلقات منقول ہیں اس کے باوجود وحی کی رہنمائی میں آپ بتاتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کی اصل تعلیم ہے اور یہ بار لوگوں کا اضافہ ہے۔

توحید کے ساتھ شرک کا ذکر

توحید خالص کی تعلیم کے بعد حضرت مسیح نے شرک پر وعید کا بھی ذکر فرمایا اور بتایا ہے کہ ہر قسم کا شرک خواہ ذاتی ہو یا صفاتی انسان کو نجات سے محروم کر دیتا ہے۔ توحید عبادت کے ساتھ شرک کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہو پاتا ہے جب اس کے مخالف کا تصور بھی ساتھ کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے اس لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدۂ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے

اس لیے ضروری ہے کہ اس کے مخالف نظریہ یعنی شرک کو بھی بتا دیا جائے جیسا کہ یہاں مسیح علیہ السلام نے اپنے طرزِ عمل سے ہمیں ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ نے توحید کی تعلیم دیتے ہوئے بات صرف اسی پر ختم نہیں فرمائی ہے کہ بیگانہ اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ جو شخص بھی شرک کرتا ہے اس پر نہ صرف یہ کہ جنت حرام ہے بلکہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور ہر چیز کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک شرک وہ جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے

دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے

تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہے

پہلے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں ۱۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے، ۲۔ اسے اس کا باپ یا اس کی اولاد سمجھ لیا جائے۔ ۳۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی سے مل کر ایک قالب ہو گیا۔ ۴۔ یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے۔ یعنی کوئی مخلوق اس کا اوتار ہو سکتی ہے مثلاً اہل عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں اور جنوں کو اس کی ذات برادری سمجھتے تھے۔ اسی طرح عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا اور اس کا اوتار قرار دیتے تھے۔

دوسرے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفتوں سے موصوف ہے۔ ان میں سے کسی صفت کو کسی اور کے اندر بھی موجود مان لیا جائے اور اسی معنے و مفہوم میں مان لیا جائے جس معنے و مفہوم میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ حضرت عیسیٰ بھی اسی طرح ہر بات کو جانتے ہیں تو شرک فی الصفات ہو گا۔ اسی طرح نفع و نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت و راحت پہنچاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کر بیٹھے کہ حضرت عیسیٰ بھی ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں یا ہمیں تکلیف اور نقصان پہنچا سکتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت میں اسے ساجھی ٹھہراتا ہے۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفات الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے مخصوص نہ سمجھا جاتے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت اور موجود مان لیا جاتے مثلاً صفات الٰہی کا تقاضا یہ کہ عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص اور کو بھی اس کا مستحق قرار دے تو یہ صفات الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک بنانا ہوگا۔ اسی طرح ان صفات کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کا ہے۔ اس لیے اگر کسی اور کو بھی اللہ کے حکم کے بغیر یہ حیثیت دے دی جاتے تو یہ شرک ہوگا۔ حضرت عیسیٰ نے من یشرک باللہ عام فقرہ بولا ہے اس لیے اس میں شرک کی ساری قسمیں داخل ہیں۔

عقیدہ تثلیث کا گورکھ دھندا

۱۶۰۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک معبود کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہ آتے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جاتے گی، کیا پھر یہ اللہ کے حضور میں توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی حضرت مسیح روح القدس اور اللہ یا مسیح مریم اور اللہ تینوں خدا ہیں۔ العیاذ باللہ ان میں کا ایک حصہ دار اللہ ہوا پھر وہ تینوں ایک اور ایک تین ہیں۔ عیسائیوں کا عام عقیدہ یہی ہے اور اس خلاف عقل و ہدایت عقیدہ کو عجیب گول مول اور پیچدار عبارتوں سے ادا کرتے ہیں اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ایک ماوراء العقل حقیقت قرار دیتے ہیں سچ ہے لن یصلح العطار ما افسد الدھر

العقائد الأخفیہ فی الدیانۃ النصرانیہ کے مصنف نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مسیحیت میں تصور تثلیث دراصل بت پرست قوموں سے مانگا ہوا تصور ہے۔ وہ لوگ جو بت پرستی چھوڑ کر مسیحی ہوتے انہوں نے اپنے بت پرستانہ تصورات کو مسیحیت میں سمو دیا، خود یورپ کے علماء نے یہی بتایا ہے کہ یہ عقیدہ خالصتاً بت پرستانہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تثلیث کا تصور سب سے پہلے ہندوستان کے برہمنوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں لاہوتی عبادت ہی تثلیث ہے اور ان کی ہندی زبان میں اس کا نام "ترنے مورتی" ہے۔ ترنے مورتی سے ان کی مراد برہما وشنو اور شیوجی ہیں اور یہ تینوں مل کر ایک ہیں۔ اسی تثلیث کو وہ مختصر سے مختصر کر کے تین حروف یعنی ا۔ و۔ م سے تعبیر کرتے

ہیں۔ اسی طرح بدھ مذہب والے بھی تاریخ میں اسی بیماری کے شکار ہیں۔ یونانی اور رومانی بھی اسی تصور کے حامل ہیں۔

تاریخی طور پر یہ سوال بلحاظ اہمیت کا حامل ہے کہ عیسائیوں میں یہ تصور کیسے آیا جبکہ حضرت مسیح خالص توحید کے علمبردار تھے۔ اردو کا پتہ نہیں مگر انسائیکلو پیڈیا کے حوالہ سے مولانا مودودی نے لکھا ہے۔

باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذونادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم باپ بیٹا اور روح القدس کے درمیان تعلق کی حیثیت کیا ہے۔ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا فلسفہ ہے۔

رومیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

> دونوں عیسائیت اور بت پرستی باہمی آمیزش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو اجاگر تھیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹیلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا۔

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ پہلے بتایا ہے کہ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے اور اب بتایا ہے کہ ان کا عقیدہ تثلیث ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔ عیسائی مانتے تو یہی ہیں کہ تین اقنوم ہیں باپ بیٹا اور روح القدس مگر عملاً لگ ہو، صرف مسیح ہی مسیح رہ جاتا ہے کیونکہ صفات وہ بندہ وہی کا ہے اور سارا تعلق اسی سے ہے

اور سارا زور اسی کی خدائی ثابت کرنے پر صرف ہوتا ہے اور دنیا میں اسی کی خدائی کی اشاعت ہوتی ہے بس دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک ان کا کتابی عقیدہ ہے اور ایک عمل۔

آخر میں فرمایا ہے کہ افلا یتوبون میں ان کو توبہ کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے لیے توبہ اصلاح کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔ اب بھی اگر وہ اپنی اس بیہودہ سرائی سے باز آجائیں اور قرآن کی دعوت قبول کرلیں تو اللہ غفور ورحیم ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی یاوہ گوئی سے باز نہ آئے اور حلول واتحاد اور تثلیث ہی کے نعرے بلند کرتے رہے تو لازماً ان کو اس کفر کی پاداش میں سزا بھگتنی پڑے گی۔ منھم لاکر بتادیا کہ ان میں سے الذین کفروا کو سزا ملے گی جو لوگ توبہ کر جائیں گے وہ بچ جائیں گے جو بات یہاں اہل کتاب سے کہی گئی ہے وہی دنیا کے سارے کافروں سے کہی گئی ہے

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

اہل کفر سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو پچھلے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور ساری ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سارے اہل ملل کی اس مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے سب جانتے ہیں کہ یہ سب کی خواہش ہے کہ بندہ اپنے خالق کے قہر سے نجات حاصل کرے اور فطرۃً یہی ہر ایک کی خواہش ہونی بھی چاہیے اس لیے قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہر ملک و ملت، ہر نسل و قوم کا جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجات ابدی کے لیے ضامن ہوگا۔

آیت میں گفتار سے باز نہ آنے پر عذاب کو اور توبہ و استغفار پر مغفرت کو موقوف قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ گفتار سے باز آنے سے کفر و شرک کی اصل تاریکی محو ہو جائے گی اب اس کے بعد اس کو ایسے اعمال کی بھی ضرورت ہے جو اس کی نئی زندگی کے لیے نشانی کا کام دیں۔ قرآن کی دونوں آیتوں نے اس کے لیے یہاں دو عمل بتائے ہیں ایک انتہا اور دوسرے توبہ و استغفار یہ دونوں کام اگر پورے شرائط کے ساتھ ادا کیے جائیں تو بقول شیخ الاسلام

یہ اس غفور رحیم کی شان ہے کہ ایسے باغی اور گستاخ مجرم بھی جب شرمندہ ہوکر اور اصلاح کا عزم لے کر حاضر ہوں تو ایک منٹ میں عمر بھر کے جرائم معاف کر دیتا ہے۔

اور ساری دنیائے کفر کے مقابلے میں قرآن لے اور نبوت سے اہل کتاب کو یہ خاص رعایت بھی دی ہے کہ کتابی جو ایمان لاتا ہے اسے دوہرا اجر ملتا ہے۔

ہر شخص کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت ہوتی ہے۔ دوسرا دین اختیار کرنا فطرۃً شاق گزرتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ادیان سماویہ میں کوئی رقابت نہیں ہے یہ ایک ہی صداقت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے، اس لیے اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ گزرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں چلا گیا بلکہ اگر وہ حضور انور پر ایمان لائے گا تو وہ اجر کا مستحق ہوگا، اور یہ یقینی ہے کہ اگر حضور انور پر ایمان نہ لایا تو پہلا ایمان بھی قابل اجر نہ رہے گا کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے موضوع پر تقسیم نہیں ہو سکتی جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر شمار ہوگا۔ اس بشارت میں دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں۔ آپ پر ایمان لانا سب پر ایمان ہے اور آپ کا انکار سب کا انکار ہے۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انْظُرْ
كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝٧٥ قُلْ
أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا
وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝٧٦ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي
دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ
قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝٧٧ لُعِنَ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝٧٨ كَانُوا
لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝٧٩
تَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ
لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ ۝٨٠

وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ

أَوْلِيَاءَ وَلٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ ﴿٨١﴾

مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا ایک رسول

ہے اس سے پہلے بھی کتنے رسول ہو چکے [١٦١]، اور ان کی والدہ

صدیقہ تھیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھو ہم کس طرح ان

لوگوں کے لیے دلائل بیان کر رہے ہیں پھر دیکھو کہ یہ لوگ کس

طرف پھرے جا رہے ہیں [١٦٢]۔ اے پیغمبر ان سے کہو کیا تم اللہ

کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جس کے اختیار میں نہ تمہارا

نقصان ہے نہ نفع اور اللہ ہی سننے والا علم رکھنے والا ہے [١٦٣]۔ کہہ دو

کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں حقیقت کے خلاف حد سے نہ بڑھو

اور اس گروہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے ہی خود

گم کردہ راہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ حق کی سیدھی

راہ کھو بیٹھے۔[164] بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار
کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبانی لعنت ہو چکی ہے، اور
یہ اس لیے ہوا کہ نافرمانی کرتے تھے اور وہ حد سے تجاوز کرتے
تھے۔[165] وہ برائی سے ارتکاب کے بعد باز نہ آتے تھے، کیسا
برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔[166] اے پیغمبر تم دیکھو گے کہ
ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے
مدد رفاقت کا رشتہ رکھتے ہیں کیا ہی برا سامان ہے جو انہوں نے
اپنے لیے آگے روانہ کیا ہے، ان کے خلاف اللہ کی ناراضگی
ہوئی اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔[167] اور اگر
فی الواقع یہ لوگ اللہ کو، اللہ کے رسول کو، رسول پر نازل شدہ
کتاب کو ماننے والے ہوتے تو مشرکین کو مددگار اور دوست
نہ بناتے لیکن ان میں اکثریت ایسی ہے جو جادۂ حق سے ہٹی ہوئی ہے۔[168]

حضرت مسیح کا واقعی چہرہ

ان آیات میں قرآن نے حضرت مسیح کا جو اصلی اور حقیقی چہرہ پیش فرمایا ہے لیکن حق کی حقانیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک باطل کا پورا نقشہ ذہن میں موجود نہ ہو، ظاہر ہے کہ باطل جو کچھ ہے وہ قرآن سے باہر ہے، اس لیے واقعی اور چہرہ جو قرآن نے ہمیں پیش کیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت مسیح کا وہ بناوٹی چہرہ بھی معلوم ہو جو عیسائی پیش کرتے ہیں، کچھ اشارات اس سلسلے میں پہلے ہو چکے ہیں۔ آیئے کچھ اضافہ انہی کی زبانی سن لیجئے۔ عیسائیوں کی مشہور کتاب "دعائے عمیم" میں مسئلہ عقیدہ مقدس اتھاناسیس کا یوں لکھا ہے۔

جو کوئی نجات چاہتا ہے اس کو سب باتوں سے پہلے ضروری ہے کہ عقیدہ جامع رکھے۔ اس عقیدہ کو جو کوئی کامل اور بے داغ نگاہ نہ رکھے وہ بے شک عذاب میں پڑے گا۔

عقیدہ جامع یہ ہے۔

ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کریں نہ اقانیم کو ملائیں نہ ماہیت کو تقسیم کریں کیونکہ باپ ایک اقنوم بیٹا ایک اقنوم اور روح القدس ایک اقنوم ہے مگر باپ بیٹے اور روح القدس ایک اقنوم ہے مگر باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے، جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح القدس ہے۔ باپ غیر مخلوق بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق باپ غیر محدود بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود ہے۔ باپ ازلی بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی۔ تاہم تین ازلی نہیں ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود اور تین غیر مخلوق نہیں بلکہ ایک غیر محدود ایک غیر مخلوق اور یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق، تو بھی تینوں قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا ہی باپ خدا بیٹا خدا اور روح قدس خدا پھر بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا، اسی طرح باپ خداوند بیٹا خداوند اور روح قدس خداوند تو بھی تین خداوند نہیں بلکہ ایک خداوند۔

(دعائے عمیم مطبوعہ [illegible] دہلی ۱۹۰۶ء، ص ۱۲۴)

پادری فنڈر صاحب جو عیسائیوں میں پادری ہونے کی حیثیت میں اونچا مقام رکھتے ہیں بڑی فراخ دلی سے لوگوں کو بتاتے ہیں۔

ایمانداروں پر لازم اور واجب ہے کہ جیسا باپ بیٹے پر ویسا ہی روح القدس پر
ایمان لاکر اس کی عبادت اور بندگی کریں اور عنایت اور نعمت کی اس سے امید باندھیں۔
(مفتاح الاسرار طبع پنجم)

یہ عبارات بتارہی ہیں کہ ہر ایک ان تینوں میں سے مستقل خدا اور معبود ہے، یہ ہے عیسائیوں
کا دعویٰ، اسی مفتاح الاسرار میں یہ بھی صاف صاف لکھا ہے کہ

مسیح نے خدا کی ذات وصفات اور لفظ خدا کو بھی اپنے ساتھ نسبت دیا ہے
چنانچہ آئندہ آیتوں سے معلوم ہوتا ہے اور اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایسے
معنے سے خدا کا بیٹا نہیں ہے جن معنے میں متقی پرہیزگار ایماندار لوگ خدا کے فرزند
کہلاتے ہیں بلکہ اس معنے سے خدا کا بیٹا ہے کہ صفات اور ذات میں خدا کے برابر ہے۔
پرہیزگار اور ایماندار لوگ تو اپنے ایمان کی جہت سے خدا کے بیٹے ہیں لیکن مسیح وحدت
ذات کی نسبت خدا کا بیٹا ہے۔　(مفتاح الاسرار ص ۱۴)

آئیے اب اس کے ابطال میں قرآن کے دلائل سنیئے:

(۱) مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا ایک رسول ہے اس سے پہلے بھی کتنے
رسول ہو چکے ہیں۔ یعنی اسی مقدس جماعت کے حضرت مسیح بھی ایک فرد ہیں انہیں خدا بنا لینا۔
خدا کا بیٹا کہنا یا تین میں سے ایک کہنا تمہاری سفاہت ہے۔[1]

قرآن کی یہ آیت ایک دعویٰ اور دلائل پر مشتمل ہے۔ دلائل اگر حکیمانہ ہوں تو تین قسم کے ہوتے
ہیں ایک کو دلیل خلف دوسرے کو استقراء تیسرے کو تمثیل کہتے ہیں۔

خلف یہ ہے کہ جب دو نقیضوں میں سے ایک کو باطل کر دیا جائے تو دوسری کا وجود ضروری
ہو یا ایک کا وجود ثابت ہو تو دوسرے کا عدم ہو مثلاً ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں رات
نہیں تو دن ضرور ہوگا اور اگر ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں دن ہے تو رات نہ ہوگی۔

استقراء وہ دلیل ہے جس میں حکم بہت سی جزئیات اور نظائر کی تلاش کے بعد لگایا جاتے
مثلاً بہت آدمیوں کو دو پاؤں والا دیکھ کر یہ حکم لگا دینا کہ انسان دو پایہ ہوتا ہے۔

تمثیل وہ دلیل ہے جس میں حکم کی بنیاد مشابہت ہو جیسے شراب کے نشہ پر دوسری نشہ آور

---

[1] اخلاق شیخ الاسلام

چیزوں کا قیاس۔

قرآن کی اس آیت میں ان تینوں دلائل کی طرف اشارہ ہے دعویٰ یہ ہے کہ مسیح اللہ کے رسول ہیں۔ اصل ارشاد ما المسیح ابن مریم الا رسول آیا ہے۔ یہاں یہ فقرہ بطور استیناف لایا گیا ہے گویا سننے والے جب پہلی آیات سن چکے ہیں کہ تثلیث غلط ہے، اللہ کی ذات واحد ہے نہ اس میں اصول کی ترکیب ہے اور نہ اقانیم کی کثرت تو معاً ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی ہے تو پھر حضرت مسیح فی الواقع کیا ہے۔ اسی کا جواب ہے ما المسیح ابن مریم الا رسول مسیح ابن مریم صرف اللہ کے رسول ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ رسول ہونے کی وجہ سے وہ ایک انسان ہیں، نہ وہ خدا ہیں اور نہ خدائی میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ یہ دعویٰ مخاطبوں کے ذہنوں میں واضح طور پر پیش کرنے کے بعد اس کے دلائل پیش کیے۔ اس لفظ میں مسیح اللہ کے رسول میں تمثیل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جیسے رسول ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں اللہ کے دوسرے رسولوں کا مقام ہے وہی مسیح کا مقام ہے۔ انسانیت رسول کا ایک کمال ہے۔ کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا اور جو فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے واقف نہیں وہ کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قرآن عزیز نے جابجا رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ لفظ رسول ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ حضرت مسیح کے واقعی تعارف کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی کلمہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف رہا ہے، اس کے لوازم سب کے ذہن نشین ہیں اس کے فرائض سب کو معلوم ہیں۔ اس کی شخصیت و احترام سے سب آشنا ہیں اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش و کرم کے سوا برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ایک لفظ رسول سے سننے والوں کے دلوں میں وہ ساری عظمتیں دوڑنے لگتی ہیں۔ محبت و توقیر، اطاعت و فرمانبرداری کے وہ تمام جذبات امنڈنے لگتے ہیں جو رسول کے لیے امنڈنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں جو ایک بادشاہ اور اس کے ایلچی کے درمیان فاصل رہنی چاہئیں، اس لیے محبت و طاعت کے جذبات کے ساتھ ان کا جوہرِ توحید شرک کے گرد سے کبھی بے آب نہیں ہوتا۔

اور ساتھ ہی یہ فرما کر قد خلت من قبلہ الرسل کہ حضرت مسیح سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔ استقرا کی طرف اشارہ کر دیا ہے یعنی سارے پیغمبر جو خدا کی طرف سے آئے ہیں وہ نہ خدا تھے

نہ اس کا اوتار و بروز ہے اور نہ اس کے بیٹے اور اقنوم ہے تو پھر حضرت مسیح رسول ہو کر خدا، خدا کے بیٹے اور اقنوم کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت انجام دینے کے لیے دو ہی لفظ ہیں ایک رسول دوسرے وکیل۔ ان دونوں کا تعرف دراصل دوسرے کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں جوہری فرق ہے۔ وکیل کا تعرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ وکیل اپنے موکل کی جانب سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے۔ رسول صرف اس امانت کے پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اسے سپرد کی گئی ہے۔ اسی لیے پیغمبر کو حکم ہوتا ہے کہ اعلان کرو قل لست علیکم بوکیل میں وکیل نہیں ہوں۔

مسیح کے معبود نہ ہونے کی واضح ترین دلیل

۱۶۲ - اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم ان لوگوں کے لیے کس طرح دلائل بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھو کہ یہ لوگ کدھر پھرے جا رہے ہیں۔ جمہور امت کی تحقیق یہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی یہ مردوں ہی کے لیے مخصوص رہا ہے۔ حضرت مریم بتول بھی ایک خدا رسیدہ ولیہ تھیں، نبی نہیں۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہو وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے۔ زمین، ہوا، آگ، پانی، سورج، حیوانات حتیٰ کہ جیلے اور کسانوں سے بھی اسے استغنا نہیں ہو سکتا۔ غذا کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے۔ پھر کھانے سے جو افرات اور نتائج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے۔ احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ہم الوہیت مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے اور جو کھانے پینے سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنے بقا میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ کیوں کر خدا بن سکتی ہے۔ یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں یعنی کھانا پینا الوہیت کے منافی ہے۔ اگرچہ نہ کھانا الوہیت کی دلیل نہیں ہے ورنہ معاذ اللہ تمہارے فرشتے خدا بن جائیں۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن

ان چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہیے کہ فی الواقع وہ کیا تھے؟ تو ان علامات سے بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھے۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو ان تمام حدود و قیود سے مقید اور ان تمام صفات سے متصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا کھاتا تھا گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک ہے لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیح کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اسے خدائی سے متصف قرار دیتے۔ پھر اصرار کیے چلے جارہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس تاریخی مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالم واقعہ میں ظاہر ہوا تھا بلکہ انہوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اسے خدا بنا لیا ہے۔ لہ

اللہ اکبر یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ ایک طرف حضرت مسیح اپنے سارے کمالات بشری کے باوجود خواص بشری سے منزہ نہ ہے اور ماں بیٹا دونوں قواتے بشریہ سے مرکب تھے اور کھانے پینے اور ساری انسانی ضرورتوں کے محتاج اور دوسری طرف یہ لوگ اس طرح کے خرافات میں کھوتے گئے ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس تین جدا جدا اور مستقل اقنوم ہیں۔ عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ایک خدا ہے۔ تین خدا نہیں، بیٹا ازل ہی میں خدا سے پیدا ہوا۔ اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں خدا سے ہوا ہے۔ روح القدس کا صدور اکیلے باپ سے نہیں بلکہ بیٹے سے بھی ہوا۔ خدا ہونے میں تینوں اقنوم برابر کے شریک ہیں۔ ایک ایک پورا اور باقی دونوں اپنی اپنی جگہ جزوی حصہ ہیں۔" یہاں ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی نام ترکیب ہے۔ یاد اس قسم کی دوسری خرافات جو مفتاح الاسرار کے مصنف پادری فنڈر نے اور رسالہ مسیح ابن اللہ کے مصنف نے قدم قدم پر درج کی ہیں۔ ان کو دیکھو اور پھر قرآن کے صاف سادہ اور مختص کی سمجھ میں آنے والے مسیح کے تعارف کو دیکھو اور پھر خود ہی انصاف سے بتاؤ کہ حقیقت وہ گورکھ دھندہ ہے جو مسیحی دنیا بنا رہی ہے یا وہ ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ امام رازی نے اسی سے

لہ تفہیم القرآن۔

پریشان ہو کر سچ کہا ہے۔ سورہ نسا کی تفسیر میں فرماتے ہیں،
بلاشبہ اس موضوع پر نصاریٰ کا مذہب بالکل مجہول ہے۔
اور پھر فرماتے ہیں
خلاصہ یہ ہے کہ جیسا اس مسئلے میں عیسائی مذہب بڑا ہی رکیک اور عقل سے بعید ہے۔ ایسا دُنیا میں کوئی مذہب رکیک اور بعید از عقل نہیں ہے۔
اور پھر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔
دُنیا میں کوئی مقالہ عیسائیوں کے مقالے سے زیادہ فاسد اور باطل نہیں ہے۔
اس موضوع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی کی کتاب احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔

عبادت صرف اللہ کا حق ہے

۱۶۳۔ اے پیغمبر ان سے کہو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جس کے اختیار میں نہ تمہارا نقصان ہے اور نہ نفع اور اللہ ہی سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ یعنی معبود بننا صرف اس ذات کے ساتھ خاص ہے جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک ہو اور پورا با اختیار ہو، کیونکہ عبادت انتہائے تذلل کا نام ہے اور انتہائی تذلل صرف اسی کے سامنے اختیار کر سکتے ہیں جو انتہائی عزت، غلبہ رکھنے والا اور ان سب کی سننے والا اور سب کے احوال کا پوری طرح جاننے والا ہو اس میں تثلیث کے عقیدہ مشرکیہ کے ساتھ تمام مشرکین کا رد ہو گیا[1]
مطلب یہ ہے کہ جب یہ حقیقت بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آچکی ہے کہ حضرت مسیح اور ان کی والدہ اپنے بقاء میں کھانے کی محتاج ہیں تو پھر تمہیں خود سوچ لینا چاہیے کہ جو اپنی ذات تک احتیاجات رکھتا ہے وہ دوسروں کے لیے حاجت روا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ ایک ذات محتاج بھی ہو اور معبود بھی ہو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا ہی کی شان ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محکوم نہیں سب اس کے محکوم ہیں اور جس کا حال یہ ہو کہ کھانا پینا سونا اور جاگنا، بھوک اور پیاس، صحت اور بیماری، موت اور زندگی، گرمی اور سردی سب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس پر حکمراں ہوں اور ان تمام حکومتوں کا اس پر دباؤ ہو اور وہ ان سب کے ناز اور دبدبے کو سہتا ہو اور جو دوسروں کو تو کیا اپنے کو بھی نفع نہ پہنچا سکتا ہو کیا وہ اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس ذات گرامی کی عبادت چھوڑ کر کی جائے جو ہر قسم کے نفع و نقصان کی مالک ہے۔

دراصل یہ بھی مسیحیوں کی غلط فکر کی دوسرے انداز سے تردید ہے اور ما تعبدون سے مراد حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے جیسے اللہ کی ذات تمہاری جانوں اور مالوں، بلاؤں اور مصائب کے ذریعے تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اور ایسے ہی یہ دونوں تمہیں ویسا نفع نہیں پہنچا سکتے جیسے اللہ کی ذات تمہیں تندرستی کی نعمت، اموال میں فراوانی اور زندگی میں خوشحالی دے کر نفع پہنچا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں قطعاً تمہارے نفع و نقصان کے مالک نہیں اس لیے اللہ کی عبادت چھوڑ کر جس کے قبضہ و قدرت میں تمہارا ہر قسم کا نفع و نقصان ہے۔ ان کی عبادت کرنا جو کبھی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں کس قدر عقل کی محرومی اور دانش کی یتیمی ہے۔

فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں کا یہ استنباط لطیف اور بالکل برمحل ہے۔

جب اللہ کا فیصلہ حضرت عیسیٰ کے حق میں نبی ہونے کے باوجود یہ ہے تو اولیاء کے بارے خدا کا فیصلہ کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی صراحت کی ضرورت نہیں ہے۔

عیسائیوں کی دو گمراہیاں

۱۶۴- کہہ دو کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں حقیقت کے خلاف حد سے نہ بڑھو۔ اور اس گروہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود ہی گم کردہ راہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ حق کی سیدھی راہ کھو بیٹھے۔ عقیدہ کا غلو یہ ہے کہ ایک مولود بشری کو خدا بنا دیا۔ اور عمل میں غلو وہ ہے جسے رہبانیت کہتے ہیں۔ یہود کی جو قبائح بیان ہو چکیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دُنیا پرستی میں غرق ہونے کی وجہ سے دین اور دینداروں کی یہاں کوئی عظمت و وقعت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی توہین و قتل وغیرہ ان کا خاص شعار تھا برخلاف اس کے کہ نصاریٰ نے تعظیم انبیاء میں اس قدر غلو کیا کہ ان میں سے بعض کو خدا کا بیٹا کہنے لگے اور ترک دُنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی اور ساتھ ہی بھی بتا دیا کہ دین میں اس بگاڑ کا غلو کی صورت کا سرچشمہ کیا

ہے فرمایا کہ اصل انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں اس عقیدہ کفریہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بعد میں یونانی بت پرستوں کی تقلید میں پولس نے ایجاد کیا۔ اسی پر سب چل پڑے اور اسی پر جمے رہے۔ ایسی اندھی تقلید سے نجات کی توقع رکھنا کسی عاقل کو زیبا نہیں ہے۔ [1]

اس آیت میں دو باتوں سے منع کیا ہے ایک دین میں ناحق غلو سے اور دوسرے گمراہ قوموں کی پیروی سے۔ غلو کے لیے اصل ارشاد یہ ہے لا تغلوا فی دینکم غیرالحق۔ غلا یغلو کے معنے بڑھنے زیادہ ہونے کے ہیں۔ دیگچی میں ابال آجاتے تو بولتے ہیں غلت القدر یہاں غلو کے ساتھ دو قیدیں ہیں ایک فی دینکم اور دوسرے غیرالحق۔ دین میں غلو یہ ہوتا ہے کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ، مرتبہ یا جو وزن اور مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ یہ عقائد میں بھی ہوتا ہے اور اعمال میں بھی۔ عقائد کی حد تک جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور رسول تھے ان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر ان کو خدائی کے عرش پر بٹھا دیا۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا۔ حضرت جبریل خدا کے بندے اور فرشتے تھے ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر خدائی تثلیث میں شریک کر دیا۔ اور اعمال میں غلو یہ ہے کہ جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض و واجب کا درجہ دے دیا جائے۔ حضرت مسیح نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچنے کی تلقین کی تو عیسائیوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ یہ اور اس قسم کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں اور جس طرح مذہب کے معاملہ میں تفریط ایک بہت بڑا جرم ہے اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ افراط ہو یا غلو، تفریط ہو یا عدوان اس سے مذہب کا وہ مزاج جو سرتاسر اعتدال ہے بالکل درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے وہ خدائی ترکیب و تالیف جو دین کے اجزاء کو حسن و جمال کا ایک دلآویز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں اس غلو میں سارے ادیان مبتلا ہیں لیکن نصاریٰ کو اس میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصل بیماری یہی ہے کہ انہوں نے عقائد و اعمال میں غلو کر کے پورے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

یہاں علامہ زمخشری کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ غیرالحق کی قید نے یہ بتا دیا ہے کہ غلو بھی دین میں دو طرح کا ہے ایک غلو حق دوسرے غلو بغیرالحق۔ غلو حق یہ ہے کہ جو کچھ فرمایا جا رہا ہے اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حق کے حقائق کی تلاش وجستجو کی جاتی ہے اس کے بعید سے بعید تر معانی پر غور کرکے اس کے منطوق کے ساتھ اس کے مدلول اور اس کے مفہوم سے قانونی دفعات کا استنباط کیا جاتا ہے۔ یا حق کے ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل کا سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ غلو محمود ہے کیونکہ یہ غلو حق ہے اور غلو غیر حق، یہ ہے کہ دلائل حق سے ہٹ کر اپنی چاہتوں کے مطابق پیمانہ بنا دیا جاتا ہے۔ دونوں روح کے اعتبار سے الگ ہیں اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسے مثالاً یوں سمجھ لیجیے کہ پیمانہ عقیدہ وعمل کا آپ خود بنائیں اور اس کے لیے نبوت کے علم وعمل میں اس کے مذاق کے خلاف دلائل تلاش کریں۔ اور آپ اسے توڑ مروڑ کر اپنے مزعومہ پر چسپاں کریں اور نبوت کے علم وعمل کی کھلی ہدایات سے بے پروا ہو کر اپنے موقف پر جمے رہیں۔ مثلاً یہی مسئلہ تثلیث ہے۔ اس موضوع پر انجیل کی کھلی اور واشگاف آیات کو چھوڑ کر اپنے بھولے نفس کے بنائے ہوئے پیمانے پر اڑے ہوئے ہیں۔ انجیل یہ چیخ رہی ہے کہ۔

ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔
(یوحنا باب ۱۷ آیت ۳)

اس نے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے ۲۹۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے ۳۰۔ اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔
(انجیل مرقس باب ۱۲ آیت ۲۸)

اے استاذ کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔
(مرقس باب ۱۲ آیت ۳۲)

اور جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا کلام نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔
(یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۴)

یسوع نے کیا لکھا ہے کہ تو اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر

افسوس کہ مسیحی ان نصوص صریحہ کے مخالف ہیں اور تثلیث میں بھٹکے جا رہے ہیں۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر پادری فنڈر جو ہندوستان میں عیسائیوں کے امام مناظرہ مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب مفتاح الاسرار اسی غلو کا شاہکار ہے۔ سنیے اور ماتم کیجیے۔

مسیح نے اپنی الوہیت کا اشارہ کرکے یوحنا کے باب ۸ آیت ۲۳ میں یہودیوں سے ایسا فرمایا ہے کہ تم پستی میں ہو اور میں بلندی پر ہوں۔ تم اس جہان کے ہو میں

اس جہان کا نہیں ہوں۔ اور اسی باب کی آیت ۵۸ میں فرمایا ہے کہ پیشتر اس کے کہ ابراہیم سومیں ہوں۔ اور اس آیت کو بیان کر کے یوحنا باب ۱۷ آیت ۵ میں کہا ہے اے باپ اب تو مجھے اپنے ساتھ اس جلال سے جو میں دُنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا بزرگی دے اور مکاشفات کے پہلے باب کی ۱۷ آیت میں فرمایا ہے کہ میں ایفا اور امیگا اوّل و آخر ہوں۔ اب ان آیتوں میں مسیح صاف بیان کرتا ہے کہ میں آسمان سے اترا اور ابراہیم سے پیشتر بلکہ سارے عالم کے پیدا ہونے سے پہلے موجود اور اوّل و آخر ہوں بس ظاہر و عیاں ہے کہ مسیح قدیم اور ازلی ہے۔

(مفتاح الاسرار طبع پنجم)

دیکھا آپ نے کہ کس کس انداز سے آیات کے مطالب کو مسخ کر کے مسیح کی خدائی کا پرچم لہرانے کی کوشش ہو رہی ہے یہی وہ غلو باطل ہے جس سے قرآن اہل کتاب کو روک رہا ہے۔ اسی بناء پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو دین میں غلو سے منع فرمایا ہے۔ مسند امام احمد، نسائی اور ابن ماجہ میں بحوالہ عبداللہ بن عباس جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مسلمانو! تمہیں دین میں غلو سے بچ کر رہنا چاہیئے تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔

امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں بحوالہ حضرت عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

میری تعریف میں حد سے ایسے نہ بڑھ جانا جیسے عیسائی حضرت عیسٰی کی تعریف میں آگے چلے گئے۔ بلاشبہ میں ایک بندہ ہوں، مجھے اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول ہی کہو۔

عیسائیوں کی ضلالت کا سرچشمہ

دوسری بات جس سے اس آیت میں اللہ نے اہل کتاب کو روکا ہے وہ یہ ہے کہ گمراہ قوموں کی پیروی نہ کرو۔ اصل ارشاد یہ ہے لا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل۔ اس میں اشارہ ہے ان گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے لیے، خصوصاً فلاسفر یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراط مستقیم سے ہٹ

گئے جس کی طرف ابتداء ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت و تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں۔ اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اس باب میں خود ایک مسیحی عالم دینیات رلانید چارلس اینڈرسن سکاٹ کا بیان قابل ملاحظہ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسوع مسیح" کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے۔

" پہلی تین انجیلوں متی مرقس لوقا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوتا تھا اور خدا کے ساتھ ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جاتے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو مسیح تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی۔ متی ۱۶-۲۲- لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا۔ لوقا ۲۴، ۱۹) یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اگرچہ مرقس کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ خداوند عام طور پر چل پڑا تھا لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان ہے مگر مرقس کی فدیہ والی عبارت اور آخری فتح کے موقعہ پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنے نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے ہیں۔

اس کے بعد یہی مصنف لکھتا ہے

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعے سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ ابن اللہ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا۔

یہ سوال یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ مسیحیت میں یہ انقلاب یکبارگی آیا یا دھیرے دھیرے؟ اس کا جواب قاضی القضاۃ عبدالجبار ہمدانی نے بڑی تفصیل سے دیا ہے۔ یاد رہے کہ قاضی صاحب موصوف چوتھی صدی میں ہوئے ہیں اور پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں ان کی وفات ہوتی ہے۔ ان کی کتاب تثبیت دلائل النبوۃ دو جلدوں میں ۱۹۶۶ء میں لبنان میں دار العربیہ نے شائع کی ہے اور ڈاکٹر عبدالکریم عثمان نے اس پر تحقیقی کام کیا ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ دین مسیحی میں یکبارگی تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ آہستہ آہستہ مختلف زمانوں میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اہل حق کم ہوتے گئے اور اہل باطل کی تعداد بڑھتی رہی تاآنکہ اہل باطل کا غلبہ ہو گیا اور حق ختم ہو گیا۔

آغاز میں مسیحی اور یہودیوں کی عبادت گاہیں مشترک تھیں، ایک ہی جگہ نمازیں پڑھتے اور تہوار منائے ہیں۔ مسیح کی ذات کی حد تک ان میں باہم اختلاف تھا۔ دونوں رومیوں کی حکومت میں رہتے تھے۔ عیسائی رومی سرکار سے یہودیوں کی شکایات کرتے تھے۔ رومی حکومت ان شکایات کے جواب میں ان سے کہتی کہ یہودیوں سے ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم ان کے دین میں مداخلت نہ کریں گے تم اگر ان سے الگ اپنا دینی ڈھانچہ قائم کر لو اور ان سے بالکل الگ ہو کر ہماری طرح مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو اور جائز و ناجائز ہمارے ہماری طرح سے اختیار کر لو تو ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور اس کے بعد یہود تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔ تم ان سے زیادہ ہمارے یہاں معزز ہو گے ان لوگوں نے جب یہ روم کی سرکار کی بات سنی تو انہوں نے کہا کہ جاؤ اپنے سربراہ اور وہ لوگوں اور اپنی کتاب کو لے کر آؤ۔ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور معاہدے کی کہانی سنائی اور کہا کہ تم بھی چلو اور انجیل بھی لے کر چلو۔ ان لوگوں نے ان معاہدہ کرنے والوں کو سخت سست کہا اور بتایا کہ تم نے جو کچھ کیا غلط کیا، ہم کسی حال میں بھی اپنی دین اور انجیل مقدس نہ دیں گے۔ تم یہ معاہدہ کر کے دین عیسیٰ سے نکل گئے اور مرتد ہو گئے۔ اب ہمارے اور تمہارے تعلقات ختم ہیں بلکہ ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ تمہارا معاشرتی بائیکاٹ کریں اور انجیل مقدس کو بھی تمہیں ہاتھ نہ لگانے دیں۔ اس طرح دونوں میں ایک عظیم کشمکش پیدا ہو گئی۔ بالآخر معاہدہ کرنے والا طبقہ رومی سرکار میں حاضر ہوا اور سرکار سے درخواست کی کہ ان ساتھیوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کریں اور ان سے ہمیں انجیل لے کر دیں۔ سرکار نے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے یہ لوگ روپوش ہو گئے۔ مرکزی گورنمنٹ نے موصل اور جزیرۃ العرب کے گورنروں کے نام ان کی گرفتاری کے بارے میں سرکلر جاری کر دیئے، کچھ پکڑے گئے، جلا دیئے گئے اور قتل کر دیئے گئے اور اسی کشمکش میں انجیل کے نسخے بھی نذر آتش ہو گئے۔ ان سے یکسو ہونے کے بعد ان مسیحیوں کی

ہیسٹنگ ہون جنہوں نے ہر رو سے معاہدہ کیا تھا اور اس میں یہ طے پایا کہ ایک متبادل انجیل ضرور ہونی چاہیے اور اس کے لیے علمی سرمایہ اس طرح فراہم کیا کہ تورات میں انبیاء کی جائے پیدائش، ان کی عمریں، اور تاریخ وفات موجود ہیں اس سے مدد لی جائے اور انجیل جو کچھ جسے بھی یاد ہے لے لکھا جائے اور حضرت کے متعلق جتنی باتیں زبانی یاد ہیں ان کو قلم بند کیا جائے چنانچہ اس طرح کچھ لوگوں نے اس معاہدہ کے مطابق انجیل تیار کر لی۔ پھر بعد ازیں کچھ لوگوں نے اور انجیلیں لکھی ہیں۔ اس طرح یکے بعد دیگرے لکھتے لکھتے اناجیل کی تعداد ۷۰ ہو گئی۔ اور نقل و اختصار کے بعد چار انجیلیں قانونی رہی ہیں باقی غیر قانونی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان اناجیل میں کوئی انجیل بھی حضرت مسیح کی زبان میں نہیں ہے یعنی اس عبرانی زبان میں جس میں انجیل نازل ہوئی تھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت مسیح کی زبان تھی عبرانی زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں میں انجیل کی تدوین ایک گہری سازش کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طریق سے دین مسیحی کو بگاڑنے اور مسخ کرنے کی سازش آسانی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کیونکہ اس دور میں عبرانی زبان دینی سرمایہ کی زبان تھی اور اہل علم کا علمی اثاثہ اسی سے وابستہ تھا۔ اس سے ہٹ کر دوسری زبانوں کی آغوش میں نہ صرف اس لیے لی گئی ہے تاکہ وقت کے اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل رہے اور ان کی سازشوں پر پردہ پڑا رہے اور اس طرح ان کو اپنے دنیوی مقاصد کے حصول میں آسانی ہو۔

اس طرح مسائل میں بھی تدریجی طور پر تغیر رونما ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ایک مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عبارت بھی قابل ملاحظہ ہے

تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا۔ تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے، چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی مدت تک جھگڑا چلتا رہا۔ لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے فیصلے کو ہوئی جسے مشرق و مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح القدس کی الوہیت بھی تسلیم کر لی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور راسخ الوقت شعائر میں باپ بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کہ بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسم ہوئی تھی، ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے۔ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو طبیعتیں ہیں ایک الٰہی طبیعت دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ ہوئی اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں۔ یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا حامل ہے ..... اسی دوران میں کلیسا نے گناہ، اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیرِ بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا، آخر کار ۵۲۹ء میں اورنیج کی دوسری کونسل میں ... یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوطِ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا جب تک وہ اس فضلِ خداوندی سے جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے نئی زندگی حاصل نہ کرے یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد اسے حالتِ خیر میں استقرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضلِ خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ ہو اور فضلِ خداوندی کی وجہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ان تصریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت کی گمراہی کا اصل باعث رومی افکار ہیں۔ الہلالی نے صاف لکھا ہے۔

هذا التثليث الذي للنصارى قد كانت فلاسفة الروم تنحو نحوه

حضرت عیسیٰ اور داؤد نے لعنت بھیجی ہے

۱۶۵ — بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم لعنت ہو چکی ہے اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ یوں تو تمام کتبِ سماویہ میں کافروں پر لعنت کی گئی ہے لیکن بنی اسرائیل کے کافروں پر جب وہ عصیان و تمرد میں حد سے گزر گئے کہ نہ مجرم کسی طرح جرم کے ارتکاب سے باز آتا تھا اور نہ غیر مجرم کو جرم سے روکتا تھا بلکہ سب شیر و شکر ہو کر بے تکلف ایک دوسرے کے ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے ہوئے تھے منکرات و فواحش کا ارتکاب کرنے والوں پر کسی طرح کے انقباض و تکدر اور ترشروئی کا اظہار بھی نہ

ہوتا تھا تب خدا نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی، جیسے گناہوں پر ان کی جسارت حد سے گزر چکی تھی، یہ لعنت بھی جو ایسے جلیل القدر انبیاء کے توسط سے کی گئی۔ غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔

اب روئے سخن عیسائیوں سے ہٹ کر پھر یہودیوں کی طرف ہو گیا ہے۔ بنی اسرائیل پر لعنت کے لیے قرآن نے یہاں حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت داؤد نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے۔

> اے میرے گروہ میری تعلیم پر کان رکھو، میرے منہ کی بات کان دھر کے سن ....
>
> تاکہ آنے والی پشت سے وہ فرزند پیدا ہوں جو سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو نہ بھلا دیں بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں۔ نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے .... باوجود اس سب کے پھر انہوں نے گناہ کیے اور اس کے عجائب قدرت کے سبب اعتقاد نہ کیا .... لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے ساتھ ریاکاری کی، اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے .... کتنی بار انہوں نے بیاباں میں خدا کے ساتھ بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا تس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا، بلکہ برگشتہ ہوتے اور اپنے باپ دادوں کی مانند بیوفائی کی۔ وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔

زبور ۸۱ میں ہے۔

> اے میرے لوگ سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا۔ اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا۔ اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا۔ پھر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا۔ تب میں نے

لہ افادات شیخ الاسلام

ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤد سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ حضرت داؤد نے ان کے متعلق یہ بد دعا کی کر

تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ نہیں رہ سکتے، تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کرے گا ..... اے خداوند اپنی صداقت میں میرا راہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ سیدھی کر . . . ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے .... اے خدا تو انہیں ملزم ٹھہرا، ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں۔ ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔

حضرت عیسیٰ نے بھی بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں، اسی طرح تم ظاہر میں لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو پر باطن میں ریاکاری اور شرارت سے بھرے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے ہو اور راستبازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں شریک نہ ہوتے۔ اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔ (متی ۲۳، ۲۳-۳۳)

برائیوں سے باز آنے کا احساس نہ رہا

۱۶۶ ۔ وہ مجرائی سے ارتکاب کے بعد باز نہ آتے تھے۔ اصل ارشاد میں لا یتناھون ہے۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نہیں رکتے تھے کما فی روح المعانی، دوسرے یہ کہ نہیں روکتے تھے کما ھو المشہور، جب بدی کسی قوم میں پھیل جائے اور روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو تو عذاب عام کا اندیشہ ہے یہ بھی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ عصیان و عدوان کو سن کر مخاطب کے

۱ افادات شیخ الاسلام

ذہن میں خلش ہوتی کہ اس کی صورت کیا۔ ارشاد فرمایا کہ اس طرح کہ برائیوں میں پڑ کر پھر اس سے باز رہنے کا احساس ان میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اُمت کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ برائیوں میں پڑ کر پھر ان سے باز رہنے کا احساس اور ولولہ نہ پیدا ہو اور اپنی حالت پر قانع ہو جائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ برائی اور شقاوت کی انتہائی حالت پیدا ہو گئی۔ یہ ٹکڑا ان کے جرائم کی سنگینی کو کھول کر بتا رہا ہے کہ وہ صرف جرائم کا ارتکاب ہی نہ کرتے تھے بلکہ اس سے انبیاء اور راست بازوں کے روکنے کے باوجود باز نہ آتے تھے اور ان کے روکنے کی کوششوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتے تھے بلکہ ان کے دشمن ہو جاتے۔ کسی قوم کی اخلاقی بربادی اور ایمان میں مفلسی کی یہی وہ حد ہے جس پر پہنچ کر وہ اللہ کی لعنت کی مستحق ہو جاتی ہے۔

بعض شارحینِ قرآن نے یہاں لَا یَتَنَاہَوْنَ کے نہیں روکتے تھے کے معنے لکھے ہیں لیکن ہماری رائے میں اس کے معنے نہیں رکتے تھے، سیاق و سباق اور لغت کے زیادہ مناسب ہیں۔ دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ برائیوں کے دلدل میں اس طرح پھنس گئے تھے کہ باوجود اس کے روکنے والے ان کو روکتے تھے مگر وہ رکتے ہی نہ تھے۔ گویا برائی ان کی طبیعت بن گئی تھی۔ اسی بنا پر قسم کھا کر ان کے اس کردار کی مذمت کی ہے لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ، دوسری صورت یہ ہے کہ ان کو برائیوں پر ٹوکنے والا ہی کوئی نہ تھا اور پورا کا پورا معاشرہ برائیوں میں گھر گیا تھا۔ دونوں معنے صحیح ہیں اور آیت میں دونوں معنے کی گنجائش ہے۔

یہود کی اخلاقی پستی کی انتہا

قت

۱۶۷۔ اے پیغمبر تم دیکھو گے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے مدّ و بہ کار رشتہ رکھتے ہیں کیا ہی بُرا سامان ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے روانہ کیا ہے۔ ان کے خلاف اللہ کا غضب ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔ غالباً اسی لعنت کے نتیجہ میں ان میں کے بہت افراد ظاہراً و باطناً بندر و خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے اور باطنی مسخ کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہوا کہ ان کے بہت سے لوگ آج بھی ان مسلمانوں کو چھوڑ کر جو خدا کی تمام کتب سماوی، تمام انبیاء کی تصدیق و تعظیم کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ سے جو بت پرست اور نیرات وغیرہ سے جاہل محض ہیں مسلمانوں کے خلاف دوستی گانٹھتے ہیں۔ اگر ان اہل کتاب کو خدا پر اور وحی الٰہی پر اعتقاد ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ اس قوم کی ضد میں جو ان تمام چیزوں کو مکمل طور پر مانتے ہیں بت پرستوں

سے ساز باز کرتے تھے۔ یہ بے حسی اور بدمذاقی اور خدا پرستوں سے بھاگ کر بت پرستوں سے دوستی کرنا اسی لعنت اور پھٹکار کا اثر ہے جس نے انہیں خدا کی رحمت عظیمہ سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ پچھلی آیات میں ان کی گزشتہ کفریات اور جرائم کو بیان کیا تھا اور اب ان کے ملعون ہونے کے آثار کو بیان فرمایا تاکہ اب بھی اپنی ملعون حرکات سے باز آ کر حق و صداقت کے راستہ پر چلنے کی کوشش کریں۔ اس رکوع میں ان کی موجودہ حالت پر متنبہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ داؤد اور مسیح علیہما السلام کی زبانی جو لعنت ہوئی تھی اس کے آثار آج تک موجود ہیں۔ اہل اللہ اور عارفین سے نفرت و عداوت اور جاہل مشرکوں سے محبت یہ کھلی دلیل اس کی ہے کہ ان کے قلوب خدائی لعنت کے اثر سے مسخ ہو چکے ہیں۔ اگر اب بھی انہوں نے اپنی حالت کو نہ سنبھالا اور حق کی طرف رجوع نہ کیا تو ایسی شدید لعنت کے مورد بنیں گے جو خدا تعالیٰ خاتم الرسل کی زبان سے ان پر بھیجے گا۔ یہاں کافروں سے مراد مشرکین ہیں اور ان آیات کا مصداق یہودِ مدینہ ہیں جنہوں نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ سازش کر کے مسلمانوں سے لڑائی کی ٹھانی تھی۔[1]

اس آیت میں یہود کی اخلاقی پستی کی یہ انتہا بیان ہوئی ہے کہ وہ مشرکین تک سے اہلِ ایمان کے مقابلے میں دوستی و اعتماد کے نہایت گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ بتاتے تھے۔ یہ گراوٹ اور پستی اخلاق کی انتہا ہے۔ یہ انقلاب انگیز تبدیلی جو یہود کی ذہنیت اور نفسیات میں ہوئی تھی کہ ان میں اصول صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح اور آجل کے مقابلے میں عاجل کو اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا تھا۔ یہی گویا ان کے ملعون ہونے کے اسباب تھے۔

ایمان و کفر میں تضاد ہے

۱۶۸۔ اور اگر وہ فی الواقع اللہ کو، اللہ کے رسول کو، رسول پر نازل شدہ کتاب کو ماننے والے ہوتے تو مشرکین کو مددگار اور دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثریت ایسی ہے جو جادۂ حق سے ہٹی ہوئی ہے۔ النبی سے آیت میں مراد بعض مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بعض نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان یہود کو واقعی یقین حضرت موسیٰ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی صداقت اور تعلیمات پر ہوتا تو نبی آخر الزمان کے مقابلہ میں جن کی بشارت خود حضرت موسیٰ نے دی تھی مشرکین سے دوستی نہ کرتے یا یہ کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مخلصانہ ایمان لے آتے تو ایسی حرکت ان سے سرزد نہ ہوتی کہ دشمنانِ اسلام سے ساز باز کریں اس دوسری صورت میں آیت کا مصداق منافقین یہود ہیں [1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا، نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں انہیں فطرةً مشرکین کے مقابلے میں ان لوگوں سے زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی رکھتے ہوں مگر بہرحال ان ہی کی طرح خدا اور سلسلہ وحی و رسالت کو مانتے ہوں لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہلِ کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کھلم کھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اقرارِ نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں منکرینِ نبوت کے ساتھ ہیں اور پھر بھی وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں [2]

آیت میں بتایا یہ ہے کہ اگر ان کا واقعی اللہ، رسول اور نبوت کی ہدایات پر ایمان ہوتا تو وہ ہرگز ہی اور منافقت کو نہ اپناتے اور دنیوی ترقی اور مادی فوائد ان کا منتہائے نظر نہ ہوتے۔ اصول و اخلاق اور منافع و فوائد کے مقابلے میں اپنی اہمیت نہ رکھتے اور ایمان کے مقابلے میں کفر صریح کو نہ ترجیح دیتے۔ بہرحال اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے ان کو انتہائی پستی میں گرا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اہلِ کتاب ہونے کے باوجود مشرکین سے دوستی و رفاقت رکھتے تھے گویا ان کا تصورِ حق و صداقت ہی تبدیل ہو گیا تھا اور اہلِ کتاب ہونے کا دعویٰ محض نمائشی جس کی حقیقت کوئی نہ تھی۔ دین سے ان کو جو کچھ محبت تھی وہ صرف اپنے دھڑے کے بچانے تک محدود تھی، اس کے نتیجے میں ان میں اتباعِ حق کی جگہ جتھا بندی اور گروہ پرستی کی روح پیدا ہو کر حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ گروہی تعصب چاہتا ہے کہ جس طرح بھی بنے اپنی بات بنائی جائے اور مخالف گروہ کو زک پہنچائی جائے۔ اگر ایسا کرنے میں سلے خود اپنے اصولوں اور عقیدوں کے خلاف بھی جانا پڑے تو بلا تامل چلا جائے۔ یہی حال مدینے کے یہودیوں کا تھا وہ ہمیشہ بت پرستی کے مخالف رہے اور بت پرستوں کی تحقیر کرتے رہے لیکن اب اہلِ ایمان کی ضد میں آ کر بت پرستوں سے دوستی و رفاقت کرتے بلکہ بت پرستوں کی تعریف کرتے اور کہتے کہ ھٰؤلاء

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن۔

اهدى من الذين امنوا ان مسلمانوں سے تو مشرکین ہی زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اسی بنا پر قرآن نے کہا تھا کہ اولئك الذين لعنهم الله یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ یعنی یہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر اغراضِ نفسانی کی وجہ سے طریق کفر کو اسلامی شاہراہ ہدایت سے افضل بتایا ہے ان پر خدا کی لعنت ہے۔

الحمد للہ معالم العرفان کی چھٹی جلد آج مورخہ ۱۰ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۷۹ء بدھ کے روز بوقت ۸ بجے شب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکمل ہوئی۔

رب تقبل منی انك انت السميع العليم